

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2014

نگران اعلیٰ
معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

طاہر جاوید مغل

قلم سے نئی داستان ستاروں کی گم کند
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں



گوری کس کے قصے، آج کی باتیں اور مستقبل
کے انداز سے ایک دلکش ورکی زبانی



سینس کی مجلس مشاورت و تائید کی طرف
شیر کاغذ کے خطوں پر خطوط شمع



ماہی کا آئینہ - بانٹیا دل اور بانٹیا
آواز کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



کھلے آسمانوں کی جستجو میں
بھٹکنے والے لڑکوں کی تلاش



قدیموں کی فہرلی چالوں - پیاری چڑیاؤں
اور بدلتی رتوں کا دریا مان افسانہ طویل سلسلہ



رفیقوں کو محسوس ہونے والے
ایک روایت شکن کا احوال



ایک چھوٹی سی سیلی کے ملنے والے
احسب عظیم کا ایک اثر انگیز واقعہ



مثبت اور حقیقی سوچوں میں الجھے
ایک مسافر کی بے محسوس کا عالم



آپ کے ہاتھوں میں ایک انجمن رنگ و رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ



محبوبوں کے اسیر کسی کی حیا
میں نقیر بننے والوں کا ماحیرا



ایک سوچ کی پیمانی پر چھوٹی مٹی کی
عنائیں اور فاقوں اور تھوڑا سا کیکل کا سلسلہ



بلند و بانگ دعوے کرنے والوں
کے لیے تار یک ٹھوس کا فاسات



آسمانوں کی بسروں میں ڈوبنے،
اُبھرنے والے دلوں کا عبرت اثر منظر



نمروں سے ٹکرانے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا
اترنے والے طویل القدر پیغمبر کی سوانح حیات



چہرہ پر چہرے سے جانے
والے چورسائی کی دوستی کا سنگین احوال



حزبِ بانی استحصال کا شکار
دشمنوں کا عجب گورکھ ہند



زبان کی ترنم غزلیں سے تیار اور گشتِ خواہوں
کی تلاش میں سرگرداں ایک مسافر کی روداد



دنیا بھر سے اوجھڑاؤ سے اپنے، اپنے
انتہائیت، مگر انہیں اور حقیقت پر کھانا آپ کے

اندازہ

جو سانچ افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی کیا باتیں ہیں؟ ہم کو زیب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطہ تک پہنچ چکی ہو۔ اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی معاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جن نقطے پر کھڑے ہیں، وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو بہت شگنی اور زیوں بہتی کے آزار میں مبتلا کرتا ہے۔ ہم اپنی اس پسماندگی و دور ماندگی کے سلسلے میں قابل ملامت بھی ہیں، قابل رحم بھی اور ایک حد تک قابل معافی بھی کیونکہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی تلافی کے لیے جو سہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اسی مختصر سہلت میں ہمیں صدیوں اور نسلوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر فیسے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابل سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا، اصلاح حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طریقہ عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو ہر لینا ایک پس ماندہ اور پریشاں حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس موقع پر کسی شخص سے مواخذہ کیا جائے۔ کسی شخص کا نام لیا جائے کہ یہ سیارہ نامہ بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے۔ ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنوناں اور بجر ماندہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی، ان حضرات نے لکھنؤ سے کر دہ پتی بننے کی جو شان و ادب ہم قہوڑے ہی عرصے میں سر کر لی ہے، اسے دوسرے شاہی صدیوں میں بھی سر نہیں کر سکتے، پاکستان میں اگر کسی طبقے نے اپنی غیر معمولی اور قابل رشک صلاحیتوں سے دنیا کو نبوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے۔ اس کی موجودگی میں جو لوگ ملی وادبی تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں۔ اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگنا ہے تو اس کے لیے دولت کشی اور صنعت انڈسٹری کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور بحیر العقول مجھڑے دکھائے ہیں۔ سانج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند نمائندوں نے ایک ایک رات میں ہجرتیں تو سے نکل آگئے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی قطیلیں کافی ہیں۔ یہ بات انہی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک لغت ہے اور غلامی ایک لغت۔ اگر یہ ارجمندان دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر مہارت آرائی کا ذکر نہیں ہونا چاہیے، ہمارا فرض ہے کہ اس شخص میں پوری متانت اور سنجیدگی سے کام لیں۔ اس گروہ نے سانج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ ”زرگری“ اور ”زر پرستی“ کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے، ان کا صرف ایک نصب العین ہے یعنی دولت کینہہ قوم ہتیم میں جائے۔ انہیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوشیوں کے سنے سنے ڈیزائنوں اور کاروں کے سنے سنے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔

اب یہ سوچنا ہے کہ پاکستان کی فاقہ کشی و فلاکت زدہ اور در ماندہ قوم ان مجنوناں حرکات اور بجر ماندہ رجحانات کی آخر کہاں تک تحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوت برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔



دانت سفید چکاچک



اکتوبر 2014ء کا شمار آپ کی سائنس دانوں کی زندگی کے لیے حاضر ہے۔ حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ملک کے سیاسی حالات و واقعات دلی افسوس کا باعث بنتے چارہ ہیں۔ عوامی مفاد کے نام پر ذاتی مفاد کی جنگ ہر طبقہ فکر میں آشوب کا سبب ہے جبکہ خوش امیدیاں خوش حالی اور خوش گواری مستقبل کی ضمانت ہے عوام کا دامن نواز خالی ہے اور خوش حالی ہے کہ کھلے روٹھ کر بچے ہیں۔ عالمی دنیا کے سحر کرنے والے نظریہ آئی جے تو طاقت کی رسائی کا باعث بننے کے لیے ایک دلچسپ ٹیلی ویژن کی نیاں نیاں آکر آج کے کھیل میں اس مسئلے سے عوام پر آمراست متاثر ہوئے نظر نہیں آتے۔ بالخصوص طالب علم طلبہ تعلیمی ادارے اور اساتذہ کے سامنے ان کیوں کے دنیائی مضامین اثرات سے بے پروا اور دور نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر زبانی نے دے دی ہیں اس کیلئے اور نتیجہ سے ادا کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی زندگی تو معیشت تباہ ہوتی ہے نہ ترقی کے تناظر میں کوئی حوالہ دیا ہوئی ہے جبکہ ہمارے یہاں آئین اور ملک و قوم کے مفاد میں اقتصادی ترقی کی کام چاہت ہو جاتے ہیں۔ نظم و دردی کی خدمت کے ساتھ ساتھ اس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں ملک کے مختلف حصوں میں شدید بارشوں کا سلسلہ خطرناک صورت حال کا باعث بنا۔ اس دوران مختلف حادثات میں کئی کئی جانوں کا زیاں ہوا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ایسا تو ہر سال ہوتا ہے۔ ایک طرف دولت کا بے دریغ استعمال اور دوسری جانب بارشوں کے باعث پھوٹنے والے دیواری امراض کا خطرہ، ہلکے والٹس کی زد و تصویریں۔ بے فکر کرنے والے سیلابی ریلوں کی تباہی سے گھنے کے حفاظتی انتظامات مسترد۔ پانی کی تلاش میں بے چارے عوام آخر تک تک حسرت و پائی کی تصویر بن رہے ہیں۔ سب کا فرض ہے کہ اس مشکل گھڑی میں اپنی ذات کو بھلا کر ان کی مدد کی جائے۔ دوسروں کی مدد میں خوش کرنے اور دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے سب سے کہ اپنی ذات کو مثال بنا کر جی کر دیا جائے۔ "شاید کہ تیرے دل میں آکر جائے میری بات"۔ محققوں کے لیے اشارہ کافی ہے۔ اور جناب اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اس طرف جہاں محققوں کی ایک اور جماعت ہماری منتظر ہے۔

مسافر و عوام، اسے سامع ال سے شریک محفل ہیں "مذہبی سے طبیعت بوجھل بوجھل ہی ہے۔ وطن عزیز کے حالات کو دیکھتا ہوں تو دلی نوت ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ میں جاہلیت دے۔ میدان شامی چونکہ ہمارا پند ہے اور امن پند میدان ہے لہذا سب سے پہلے ہم شعروں پر تبصرہ کریں گے۔ ان خطبات کو طالب علم اور افراتفران کے افسار نے چھوڑ دیا۔ یاد تیر، جیسا کہ ملک بھر میں ناز بھرا سفر ساجد کا انتخاب محمد ہے۔ سو سرور کی جب نظر محفل ہوئی تو جوب محفل سے دور چار ہوئے۔ اس صورت کو خیر نہیں آفرینہ خوف ۱۹۱۹ء کو عبدالرب بھی کو ان کا سفر اور شہرہ درخت چننا ڈاکٹر افسانہ گیارہوں میں جگہ تمام بچے ہیں۔ بارہوی، نفسیاتی واقعات و حالات کا مرقع ہے۔ محبوب کو صبر و کار و باطن کیا ہے تو بجا ہوگا۔ میری ہی آہ و بکا محبت ہے۔ مراد کو کا کاڑی والا اپنی بارہوی کو کیونکر بھلا سکتا ہے؟ جناب محترم امام، ہر دور میں سو فکات کے ساتھ نکل کر ہوئے۔ ہمدرد، دینی سائنس کے لیے تجھے سے کہہ کر نہیں۔ خدا ہی تو ہے کہ ہر کام کی تحریریں سائنس کے اوراق کی کوکشت و طراز بن چکے ہوتی ہیں۔ کو ان کی کہانی مختصر ہوتی ہے لیکن ان جیسی کہانی پر کوئی گہ نہیں نکلتا۔ سائنس کو ان جیسے نگار کی کامیرا کی عوازاں سے کہیں۔ یہ سائنس نگار کی کی جگہ پر رضوان ساجد کا نام پر آکر اچھا ہوا۔ مگر تحریر یہ بھی ناگوار بہت ہی ناگوار ہے۔ خیر حضرت ابوالقاسم علیہ السلام کے حلق پر ہر کاریمان ناز ہوا۔ ساجد ایمان افروز تحریر ہے۔ خدا صفت کا جوہر ہے۔ آخری صفحات پر ہر اہم کے عنوان پر انشور ادبی کی تحریر شامل ہے۔ فی الحال پرچی تو کھیں لیکن توقع ہے کہ کو بھائے گی۔ طاہر جاوید محفل کو جن کے سچا ہمارا دلی ہے عاشق ہیں۔ ہمیں ہے ختم شہر بار میں بکھر کے رکھتے ہیں۔ راتیں صاحب ہمارے شہر کے ہیں۔ وہ محفل ہی کے بڑے مستند ہیں جو ہم ان کے۔ محفل کی دینی و اجتماعی زبان میں تحریر میں حادق و طاق ہیں۔ ہر کھٹی میں انہیں واقعی ملک حاصل ہے۔ راقم بھی محفل ہی کی تحریروں کا عاشق ہے۔ مجھ میں اور راتیں صاحب میں فرق صرف ہے کہ میں محفل کی نگار کا زبانوں اور خود محفل کے دے جاتے ہیں۔ چہ سے ناہاب الیاس جتا پوری، وہاں وہاں ہی کر دیا۔ یہ کوکب خیر۔ سخاوت ہی واقعی ہے۔ شرم نہیں کی تیز تر، مشقی سے بھر پور اور مفرح تحریر ہے۔ جون الیاس مرحوم، کیا ہوا ہمارے اور ایمان نہیں ہیں۔ وہ اپنی پر محفل تحریروں میں تو حیات ہیں۔ محفل یا راس میں قدرت اللہ نیازی کی خدمت حال کر ہی صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ مگر لگتا ہے کہ کسی ایک ماہ سے زیادہ وقت نہ لگائے گی۔ محمد خواجہ کا مہر آمیز حیرت زور نظر ہے۔ میاں، محفل کا دنا کا بے کور ہے۔ وہ بے مقصد ہے پوری تو کا۔ خدا تبار نہیں۔ مسافر جیسی بھی نہ لگے وہی دانی کہانی کے حقیق کا نہ صرف کو کو یا یہ کا پانچ ہو گئے ہیں۔ ادارے سے عرض ہے کہ ان سے کوئی سلسلہ اور کہانی کی ضرورت ہے۔"

شوکت شہر یار، گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ سے پہلے آ رہے ہیں "اگرچہ صبر و وفا نہ دے گی ہے تماشا ہیں لیکن اپنی پند ہے محفل

سے غیر حاضر رہا تو انہیں ہے۔ سو مت باہمی ہاتھ سے تم اٹھا یا اور لکھتے ہو مجھے سائنس میں ایک خط۔ اس مرحلہ پر سائنس کا ہمارا شمار کمال کا ہے۔ سرور کی حیرت زور دنیائی انہوں نے کھل دیکھ رہی ہے اور پیچھے ایک آدمی اپنی شیطانی سرکارت سے سو جود بیٹھا ہوا ہے۔ محفل یا راس میں حاضر ہوئے تو اپنے بھائی قدرت اللہ نیازی کو کرسی صدارت پر براعتان پایا۔ نیازی بھائی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اعجاز احمد راتیل یا رہے آپ (بھائی مائی) کب سے ہو گئے ہو؟ محفل صاحب یہ تین اور تیرہ سو گستاخی ہیں آپ؟ محفل میں اپنی بیٹاری بہن سعدی بگاری اور زیبا اعجاز کی بیبت زیادہ محسوس ہوئی۔ سید شکیل کا بھی صاحب جیڑا بھی غصہ ٹوٹ دیا اور محفل میں حاضر ہوں ورنہ۔ "کہانیوں میں سب سے پہلے یہ کوکب خیر پرچی۔ اس کا انجام کچھ اور اس کا لگے۔ تیرہ بیٹوں نے بڑی کامیابی سے شہرہ شہرہ کے گز گز اڑا لیا۔ کاشف زبیری کی قلمی محبت ایک بہترین کہانی تھی۔ راجا کو بانی زہرا کشمیں اور مارش قاضی ہیں۔ ہر حال اینڈ رن کی صحت کی رادہ دینی پڑے گی جس نے راجا کو کھلی موت سے بچایا۔ ستاروں پر کنہری یہ قسط پرچی اور بے اختیار طاہر جاوید محفل کے ہاتھ اپنے تصور میں لائے اور چرم لیا ان کے ہاتھوں کو۔ آخر میں عادل ایک سازش کا خطرہ ہوا اور آپ بے گئی سے آگے قسط کا انکار ہے گا۔ چاند من میں مراد خان جیسے بار بار کے بارے میں بڑے فکر افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ وہ جیل کی محفل پر ماتم کیا، ہر حال مراد صاحب اس بار بھی اپنے صوفی کو صاف بچا کے لگے۔ انکار میں راجا کی ایک غلطی اس کا گھر برباد کر گئی اور فحش بے چاری کو ایک ناز و نہاد کی سزا ملی۔ محفل شعر و سخن میں صوبہ اقبال، میر تقی میر، ناز، اعلیٰ اور مولانا علی کے اشعار بھی تھے۔ تیز تر میں لوئی دانی تیز لگا اور سرور کھنڈی میں بھی بات دے دی۔ ہمدرد میں زبانی کی کوٹ مار دیکھ کہ بہت حیرت زور ہوئی کہ کیسے کیسے فراڈ لوگ ہیں اس دنیا میں۔ دہر اہم آخری صفحات پر ایک اچھی کہانی پڑنے کو ملی۔ راقم اور سرور کا امن اور سلطان کا کروار بہت پند آیا۔"

ادریس احمد خان و ناہم آباد کر گیا سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں "سائنس کی برکت دیدہ ہوئی۔ سرور بھی ڈاکر صاحب جیسے آرٹس کا منہ بول ثابت تھا۔ اندر اللہ میں سخت دواشی کے موتی تھے۔ ادارے نے سوچ کے دوا کیے کول اپنی محفل میں وارد ہوئے جہاں فرسٹ نظر آ رہے تھے قدرت اللہ نیازی، ہوسمارک یا تو بول کر میں۔ اپنی حاضرہ نظر میں آئی جو بیٹے عظمیٰ ڈاک کی کو بانی کے سبب ممکن نہ ہو سکی۔ سب سے پرانے دوستوں کی بھر پور شرکت نظر آ رہی تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس جتا پوری کی یہ کوکب خیر پرچی جو بیٹوں آدمی کے حالات و واقعات سے مزین تھی۔ بلاشبہ بیٹوں آدمی بہار اور ادارے کا کا تھا جو کئی بھی انسان کو کام عروج پر پہنچانے کا بیٹاری عنصر ہے۔ دوسری کہانی طاہر جاوید محفل کی ستاروں پر کنہری جی اپنی تحریر کی بچکان کے سبب طاہر جاوید محفل صاحب کا نام اجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ جس میں اینڈ پیر اور دوکان کی گرم جوشی بھی ہے۔ بی الدین نواب کی تحریر بارہوی میں بھی اسے ہونے کا احساس دلا رہی ہے مگر مضرت کے ساتھ کہ کھلی کو کھیں جیسے چھوڑ دیا ہے۔ ہر حال تحریر بی الدین نواب کی ہے تو پڑھنا تو ہے۔ اس لیے آگے چل کر سلسلہ دلچسپ محبت ہوگا۔ قاضی دوست میں راجا کی زندگی کی جو وہ سلاک قاضی سے فتح کئی اور اینڈ رن کا بے لوث جذبہ محبت جس کے باعث اسے آزادی جیسی نعمت کی پس کا کوئی مول نہیں۔ اگر وہ دونوں اپنی جان بچانے کی بہت جیسی کرتے تو تین۔ ان دونوں کو بیکار سے جاتے۔ فشن کیانی کو تیرہویں کی اثر انگیز رہی۔ چاند من بھی بس گزرا ہو گا۔ انکار ڈاکٹر ساجد امجد کی ایک محبت انگیز کہانی تھی جہاں راجا اور فحش کی زندگی میں ملک نے اپنا جگہ بویا بیٹیاں زندگیوں پر باد ہو گئیں۔ ملک کا ہر انسانوں کی زندگیوں کو پر باد کر دیتا ہے۔ اللہ ہر انسان کو ملک کے زہر مٹے تاک سے بچائے۔ شعر و سخن میں ایچے اور معیاری اشعار تھے۔ اشعار نے کافی کھنکھایا۔ سچ محفل میں کھنوں نے بھی لطف دیا ہوا کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب محفل کی مقابلہ بھی اچھی گئی جس میں یہ احساس ہوا کہ زندگی وہ اچھی نہیں جو اپنے کی محفل سے دوسرے لوگوں کے لیے تعریف وہ ہوجائے بلکہ اچھا انسان وہ ہے جو شہر محل سے دوسرے انسانوں کے لیے راحت کا سبب بن جائے۔ تیز تر بھی اچھی کہانی تھی۔ محترم امام کی ہمدردی اچھی کی کہ لہذا محفل کے ملک کر لاکھوں روپے خورد لیے اور تین چار گنا پیسے بنائے۔ اللہ کے گزرتے ہی حضرت ابوالقاسم علیہ السلام کے حالات و واقعات سے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کیا۔ مضافات پر میں ثابت ہوا کہ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ محبت انسان سے وہ کروا دیتی ہے جو عام حالت میں ناممکن ہے۔ آخری صفحات کی کہانی بھی بہتر تھی۔"

ایم اے وارث و سند علیا لوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس ماہ نائل سرور پر دو تبصرہ کا اعزاز جانے کیوں ایسا لگتا جیسے جاسوسی کا سرور کی ہو۔ یاد رکھو! اس سے گزر گیا میں جم اور ہم میں۔ محفل خطوط میں قدرت اللہ بھائی کا خط پہلے سیر پر تھا۔ کرسی صدارت کی مبارک باد بھائی قدرت آپ کا اور سیر اسٹیل بالکل شہر کے ہے۔ ہم پر بھی شریک حیات کی طرف سے باندھی ہے کہ سائنس میں خیرے ناگین ہم بھلا کہلا رہے تھے۔ علی رحمان فرام سے ملنا لوالی۔ مبارک ہو! خط خوش شاخ ہو گیا۔ میں آپ کا یمن اور رسالے کے توسط سے اپنے شاگردوں کی کتب خط کی مبارک باد اور نویں کلاس میں بھی پڑھتے ہیں ہر مبارک باد جو ہوں ملے گا بہت مبارک ہو۔ اپنا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ طاہر آئی اور رضوان جی کا خط نظر آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ستاروں پر کنہری پرچی۔ کہانی تھی یا سائنسی خیر علم حیرت مزہ آیا پڑا ہے۔ طاہر صاحب ایسا کر دیا؟ عادل کا اختصار طے کرنے کے بعد خالی ہاتھ وہاں ہی عادل کے ساتھ بہت پر ہوا۔ آخر میں بے چارہ خود بخود گیا۔ محترم امام کی ہمدردی بہت پند آتی۔ ہمدردی کی آؤ میں سب کو زبانی محفل نے کیا اور اچھی حیرت پر ہمدردی کرنے کے لیے بھی گیا۔ بارہوی اچھی تھک دلی دلی ہے۔ ہاں ایک جگہ میری برکت اعتراف پند آتی۔ سب سے مراد کوئے تھی۔ آخری صفحات پر بھی شہر ہادی کی تحریر حاشیہ



اور آپ پر
ملا۔ سرور
تان لگا
سید اکبر شاہ
پڑھا۔ یہ
لہجہ کی
بڑی اچھی
بجھی کی کہ
اچھا کہ۔

ہوا۔ اور
میں اپنے
دوہرونی
کے
میں پہلے
ڈالنے
لاکھوں
پاک کر
کہا۔
ولیس
آستین
اس
روغنیہ
میں کچھ
مختصر
تھا کہ
انھا
خوشیوں
کہا

کی وجہ سے
کو ایک
نے
سدا
رحمان
کے
ہے

10

اکتوبر 2014ء

[illegible]

کہاں سے کہاں سے کی ہے، نہایت آسان کو لیا ہے کیا دیکھ کر ہے کہاں لکھا کا لڑی چلائے والا اور کہاں بڑے بڑے سے سورہاؤں کی لکھیں گرانے والا اور اب ہر ستاروں پر کندہ چرمی، پتھر سے مرصعہ ایک بیٹی کی سلامت و اچانک چینی ادواب مادل کی کیفیت میں بھی گیا۔ یہاں سے کسی طرح لگا ہے، کیا قضا کا انکار کرتے ہیں۔ کاشف زہر کی قاضی محبت چرمی و بہت غی زبردست کہاں کی ہے کہ سبکی کی دوسرے پرتا کی دوسرے آغرا کا رچنے آپ کو بے نقاب کیا۔ جاننے میں میں ایک صاحب نے پھر ایک مرتبہ اپنے مولیٰ کو باجرت بری کر کیا اور اصل مجرم کو کھیل بھڑکانے کے لئے اپنے ساتھ بھی بری کیا اور دینی تباہی کے ساتھ بھی، ایک برادر کو جو میری اس وفد میں شامل شہر کی جہت تھی۔ قضا کی تیار سے لائن تھی۔ منظر امام کی تہذیب و تہذیب پر منکرابست بکھر گئی۔ زہاد علی نے کسی طرح بے وقوف بنایا۔ حضرت ابراہیم کا واقعہ یہاں تازہ ہو گیا۔ شہناز چرمی کی بھی، قصور ہادی کی دوبرہم سلطان کی بے لوث محبت اور انار نے حق کیا اور سورہ کے غلط فیصلوں نے اسے اور دینی کو کھیل بھڑکانا۔

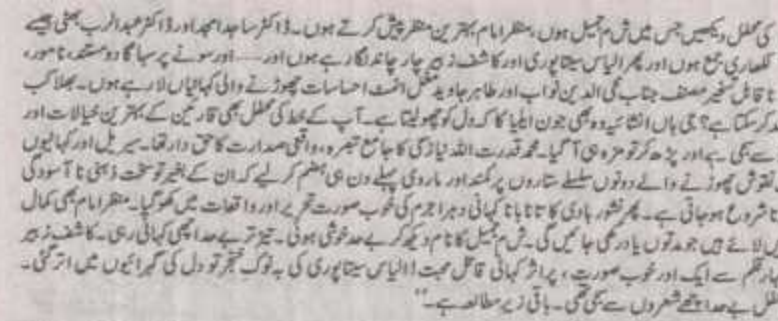
۱۰ محمد یوسف سائول، نور پور قلعہ، ضلع خوشاب سے محفل میں شریک تھا۔ "1998ء سے سسٹن کا خاموش قادی ہوں لیکن خط لکھنے کی جرات ملنی بارگزر ہوں کیونکہ میرا گاؤں شہر سے بہت دور ہے اور جب تک سسٹن مجھے بتائے تو خط لکھنے کی تار بن کر گر جاتی ہے، آج کل میں راولپنڈی میں چاہ کر ہوں اس لیے سوچا کہ کیا ایک کوشش کر کے دیکھ لی جائے، ہو سکتا ہے کہ میں بھی سسٹن میں جا کر مل جائے۔ (خوش آہنہ)" سسٹن کا معیار بہت ہی اچھا ہوا ہے، سب سے پہلے ظاہر ہوا یہ محفل صاحب کی ستاروں پر کندہ پڑھی۔ لیکن کریں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس ان کرداروں کے ساتھ ساتھ ہوں، کرشمی کی کہے ہاں، اعلیٰ کی امت اور جرات، ہر سر کے بھانے کا اعزاز لیکن کریں کی قبول فوج ہوا تھا ہے۔ اس کے بعد محمد الدین انوار صاحب کی باروی پڑھی، اور ان کی کہے ہاں اور ان کے لکھنے کا اعزاز ہی مسعود ہا ہے۔ ڈاکٹر عبد اللہ اعظمی اس قدم میں ہوتی چاہیے۔ اس کے بعد مرزا احمد کھنجر صاحب کی چائے گاہ میں بہت ہی اچھی تھی۔ مرزا، مرزا احمد جیسے کردار ہمارے معاشرے میں ازل سے ہیں اور اب تک وہ ہیں، اور ان کی سرگرمی کے لیے مرزا صاحب جیسے کوئی پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب احمد صاحب کی انتھار پڑھی اور دل اس ہو گیا کہ مرشد میں جیسے بندے کو والدہ دنیا میں چاہیے تھا۔ حاجی صاحب کا حال بہت پند آیا۔ آخر شہر ہادی کی دہرا جرم پڑھ کر یہ کہہ سوجھا کہ یہ دہرا ہے روپ انسان کیسے کیے۔ محفل خلوتو میں محمد قدرت اللہ ہادی کو کرکسی صدارت پر ہمارا دل تمام دوستوں کے شہر سے اچھے لگے۔ تہذیب کے دائرے میں رہے ہوئے لوگ جو کہ اس سطح بحال کیا جاتے۔ رضوان خونی کی راجہ ماسری انتم نہیں ہو رہی۔ محفل شروع میں محمد اشفاق سیال کا شعر بہت پند آیا۔"

اشوک کمار، میر پور خاص سے چلے آ رہے ہیں "ہر بار وہ نئے رنگ و روپ میں پہلے سے گھر گزرتا ہے۔ ہم رستہ اگر بھولتے ہیں تو صبح راہ دکھاتا ہے۔ جگہ کے ذہن پر جبر سے ملاتا ہے، وہ خطہ خیروں کے ہمیں دکھانے کی عہد دلاتا ہے۔ گھر بیٹھے دنیا کی سر کرنا ہے یہ ہے راجپاراسٹھن (جسٹ) (جسٹ گھر یہ صاحب) ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر حاضریں۔ دراصل میں وہ اپنی اپنی بہنوں کا گھر گیا یا نہ گئے رسم کے لیے گیا ہوا تھا۔ گوکہ وہاں کی عوام بہت پر غلطی سے یقین اپنے وطن پاکستان کی بات ہی آگے ہے۔ ستمبر 16 آگست کو مل گیا۔ روری اور اوارا سے سے مستفید ہونے کے بعد اپنی۔ لی مانی مکمل میں انگریزوں کے صدارت پر نیا ذی بھائی کا قبضہ اچھا لگا۔ مبارک باد۔ یہی میں نے شرف دے دیا کریں، اوارا سے والواس محلہ میں جہاں آخر کی رائے آئے گی ویسے ہی ہوگا اور اوارا سے کافی مستعان گئے ہیں۔ ملل تہذیب کے دائرے میں اپنے طرف پر آئے گی۔ ملل ماسٹر ملل ہوساگر و مبارک۔ بشری الملل بی، ایلکی صاحبہ کو اب اپنا ملل نام جاری رکھا ہے۔ جہاں تاریقی میں آپ کے فیصلے کی قدر کرتا ہوں، ہر بار تجربہ پسند آتا ہے۔ اسٹوری بڑی اچھا اپنے دل پر پندرہ انگریز صاحب طاہر ابوہ مکمل کی ستاروں پر کندہ ہے۔ اس کہانی میں دل کو دھونے والے منظر ہے۔ اچھے گئے ہیں۔ آخر عادل اچھا کو جہاں تک کرلوں گیا۔ اب چرچہری ناصر کے چکل میں چھٹی گیا۔ اچھے کا کاشت سے انکار ہے۔ لی الدین خواب کی ماروی تر پتے دلوں کی کک اور حسرت والہات کا مجموعہ ہے۔ مراد علی، مشکلات کا بھار دے سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس کا اڈا جانا اسٹوری میں ایک نیا ٹولف آگیا۔ جہاں گان میں زائد بیک سے سودا وں اور نماز دوست مراد خان کا دل کھل دیا۔ مراد خان جیسے بے نیو لوگ اس دور میں بہت ہیں۔ سودی ایک اعلیٰ ہے۔ ٹیٹا دہر شہر خور ریاض صاحب ایک اچھوتی محبت کے ساتھ آئے۔ اسکو نیک سے اپنی وقاداری دکھائی۔ اسٹوری پسند آئی۔ ذاکر دھارب بھٹی صاحب نے بھی خوب مقابلہ کیا۔ برائی کے خلاف مزید بیک سے جہز کرنا دوسروں کے لیے کھودا اس میں خود ہی مرگا۔ برے کا انجام۔ آخر میں شہر بادی کے دہرا جرم سے انصاف کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بھوت کو چھپانے کے لیے موجود ہوئے پڑے ہیں تو باطل فرما کر ایک مللی کو چھپانے کے لیے مہر کو کھڑے لگا کر کام کا سہارا لینا اور اس کا جرم یقین ہوتا گیا۔

۱۸ ابن مقبول چاویہ احمد صدیقی وراولپنڈی سے شریک محفل ہیں۔ ”مجھے خوب صورت فہرست تولد و وصال پر چھاپی گئی۔ اسے جس عمر کا رائے کیے گئے ہیں آپ لوگوں نے کہ پھر میگزین پسند نہ کیا جائے۔ اس سے بڑا جلد حق اور نیک ہوگا۔ اس میں قرآن و احکام کا رستاروں

محفوظ

گلدستہ ہمارے علی ایک نامور شاعر و شاعر کا بیٹا جس کے لیے دوبارہ تولد سے صفحہ ترقی ہے۔



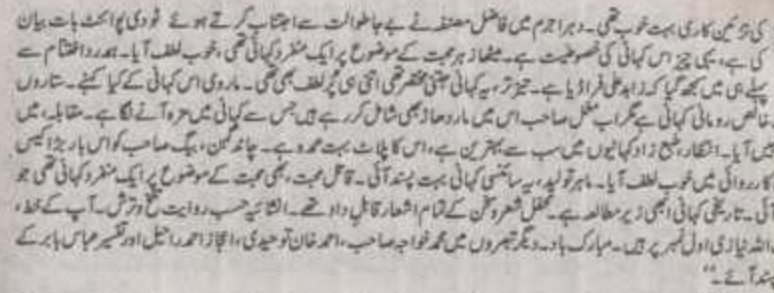
حضرت اظہار الدین بیگ، میر جو خاص سے تہذیب و تربیت کے حامل تھے۔ "میر کا سہیلیں" آپ اس کے بعد ۱۷ اور دو گئے پھر ان سال اور سے
میں سہیلیں کا سالنامہ زیر دست ہوتا چاہے جا کہ پیش یا در لکھا جائے اور کوشش کر کے انسان تو کیا کام ہے مشکل۔ حضرت ابراہیم علیہ
برہت ہو کر ملے سے لکھا گیا ہے دوسری قسط کا اظہار ہے۔ بیگ صاحب کی کہانی کی کمی کی زبانی اس وقت قدرے مختلف رہی۔ میرا وہاں وہاں
حریف وجود کو کر فرب اور جھٹلائی آخر میں قاضی قانون کے شہرے میں۔ میرا ان کی خوش صحبت بیگ صاحب کے یہ کہیں آپ کے پاس
اور ہماری خوش صحبتی ہے کہ سہیلیں پر سب شائع کر رہے ہیں اور ہم پر اسے شوق ہے پڑھ رہے ہیں۔ میرا تربیت و تربیت کا کہانی بھی
اور دو گئی ہے یہی حکم صاحب کی زبانی ماہر نوید معاشرتی کہانی کی تحریر کا بھی کیا۔ میرے ساتھ اس پر لکھا بھی صرف میں ہی قسطا آتی
کہانی زیر دست ہے۔ ساتھ اس پر لکھا آگے کہ ہوتا ہے پڑی ہی ہے میری سے اظہار ہے کیونکہ میرا صاحب نے غم تھا کچھ اس طرح کی
پے لکھا پڑھ رہی ہے۔"

سبب ڈائجسٹ 12 اکتوبر 2014ء

دشت خیال، خوابِ کسبِ عقل میں پلے آ رہے ہیں۔ "تجربہ کاسکس اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہونے کے باعث اپنی خوش بختی پر براؤں ہے۔" فاضل پر غور فرمیں۔ انشاء پر راکھ یا حواں، سید عادل میں انگریز۔ پھر جھانک غلطو میں، جہاں قدرت اللہ کریم صدارت پر براہمن خوشی سے ہلنے نہ رہا ہے۔ ہارت ٹوٹ تجرہ نگار ہائیں سعید کچھ عرصے سے گمشدہ ہو گئے ہیں۔ "اوتھنے اوتھنے" سب سے پہلے ہم نے شہنشاہِ عالمگیر علیٰ الرحمہ کے عہدِ ستاروں پر کندھائی۔ اس کے بارے میں سیدنا جانی کہ "لوگ نادان ہیں کہ سورج کو دکھاتے ہیں چاند۔" مقرر نگاری و کردار نگاری، اسکا کہ نگاری فرضِ عقل کے کردار میں جیسے سائنس میں عیسوی ہوتے ہیں اور ہم کو سب اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ پھر ہم اپنی کارکردگی کی اصل قیمت کی طرف آئے۔ دیکھا کہ کردار اور چہرہ ہر آخری صفحات پر نشور اوی کی دیرا جہم ابھی تر رہی۔ روحی کی عشق کی ابتداءں کو چھوٹی محبت نے ابھیں غم کر ڈائیں۔ سلطان کا قلعی عرف کردار بھی خوب رہا۔ صاف صاف کہے۔ اللہ آپ کو تندرستی اور ایمان تک عطا فرمائے۔"

انتقالِ نبو صلال
ادارے سے طویل و ابھری کے بعد تقریباً گواہی پیش کی کہ دعویٰ گزارنے والے عقیدل القم کا نام بطیم الحق مفتی 26 اگست کو طویل ملاقات کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ مکین باغ عکاکان کے دو کمروں میں برابر کا شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

سینس ڈائجسٹ 13 اکتوبر 2014ء



محمد اکبر تاج کو پھر اس سے تعریف لائے ہیں ”جبر 2014ء کا سلسلہ 18 تاریخ کو ختم کیا۔ غرض یہی شاندار لگا۔ میرے لیے نہ صرف یہ قطعی مسکن کا کلیدی صاحب، بلکہ ایک انجمن اور عمل، یہاں میری تازہ روزانہ انکارا سلسلہ اور ان کا اندازِ تحریر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں سب دوستوں سے تعریف اٹھے ہیں۔ ابتدائی مصالحت پر ایسا ہی بیجا پڑی کی۔ دو کسوختی میں خوب صورت تحریر پڑھنے کوئی۔ ہم و فرات کا قلمی سلسلہ ہے۔ دنیا کا کردار پسند آیا۔ حاکم جابر کا عمل صاحب کی ستاروں پر گھنٹے کے دل خوش کر دیا۔ یہ لکھنے کی پختی کے لیے بھی ملاحظہ کیے۔ فاروقی اس وفدِ قدس کے بہترین ممبر استوری میں وہ جان نہیں جو اب صاحب کے قلم کا خاصہ ہے۔ حسام بیٹ کا چاند من میں مرزا احمد بیگ سے مراد وہاں جیسے شاعر انسان کو قانون کی گرفت میں دے دی دیا۔ لشکر باوی کا دہرا جرم ایک مفرد ہے۔ سوچوں کے دور و گزشتہ، انسان سے قطعی ہو جائے تو اس کا اندازِ سردی ہوتا ہے اگر ہم اس کو چھپا دیں گے تو یہ قطعی ہوئی۔ قاضی محبت، انصاف جی محمد اکبر لکھنا میں پسند آئیں۔ محبت کے موضوع پر لکھنے کی کئی مثالیں ملتا ہر بہت اچھی لگی۔ وہ اسی محبت مٹھا ہر جو انسان اپنی خوشی سے لے جاتا ہے۔ حضرت امیر اہم کی سوانح حیات ایمان تازہ کر گئی۔ آخر میں ادارے والوں سے گزارش ہے کہ صاحب کو سسٹم میں لایا جائے۔“

۱۳ اکرم علی گور چاقی، داخل سے پلے آرہے تھے، "وید و زب سرورق دل کو بہت داس آیا۔ جون ایللیا کا انسانیہ حکمت کے موافق تھیں

۱۰ محمد قدس سرہ اللہ فیاضی و حکیم ہذا کی غائبی ال سے خبر دے کر دے ہیں۔ "ستمبر 2014ء کا شمار وقت معمول ہو گیا۔ سرورق گزارے
اگر بھی تھا۔ ادارہ مستقبل کی خوش گمانیوں سے حیران نظر آیا، وہ جاری بھی دلی کتاب ہے کہ پاکستان امن و استحکام حاصل کرے اور ترقی کی منازل
لے کر کے ایک اچھی مثال ہے۔ گری صدارت پر خود کو بیٹھ دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ حسب معمول ستاروں پر کندھب سے پہلے پرچی۔ آغوش
سرور صاحب کی تربیت اور چٹائی سے عادل نے "آگہی" چھپ کر رکھی لی۔ تاہم انسانوں کی سازشوں سے متاثرہ کرنے کے لیے ابھی
تک کامیاب نہ ہو سکا۔ چھ مہرے ناصر نے عادل کو بہت مشکل صورت حال میں پھنسا دیا ہے جس کا منتقلی اور سیاسی بنیادیں صرف موت سے تاہم یہاں
کہانی میں مطلق انکشاف کا قلم بیٹھا ہے اور کواں مشکل سے نکالے گا۔ آخری صفحات پر لشکر ہادی دہرا جرم سے لے کر آئے۔ کہانی کا حقیقہ اچھا تھا تاہم
غیر معمولی طوالت اور غیر ضروری وضاحتیں مکالمے کی عیبت ہے۔ پڑھ کر اسے کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم یہاں بھی جرموں سے سرسبز ہوا دکھایا جا رہا
ہے۔ عالمی طاقتوں کی تحریر میں شمولیت کی شاید یہ کہانی کو دلچسپ بنا دے۔ ابھیذا اقبال کی ماہر تالیف میں چھفت کے گوش کا ذکر نہ ہوا۔ جب قصور
کہا تو واقعی حیرت ہو گئی۔ تحریر کو تنگ اور اس پر ہونے والے اعتراضات کی یاد تازہ کرتی، دلچسپ رہی۔ انکشاف سچا اچھا کی انتہا کی اور امانی
جوڑی حال تحریر تھی۔ کتاب کے ناگوار اندیشوں کی زندگی کو جنم دیتے تھے۔ عالمی صاحب سے ملاقات اور اس کے بعد کے واقعات بھی اعجاز لے
ہوئے تھے۔ کاشف زندگی کی ناقص محبت حقیقت میں ناقص ثابت ہوئی۔ تاہم چند ماہ سے کاشف لکھ رہا جس قسم کی تقریریں مسلسل لکھتے نظر آ رہے ہیں۔
محفل شعر و سخن میں مہمان اشرف، کوٹ مکتب جیل کا انتخاب بہترین رہا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
 راجہ قادر علی اہی، چچا آبدین شاہ، امجد اقبال بکھی، شمس سابعہ الی۔ محمد رشید سیال، روہڑی، محمد مصطفیٰ، خالص الی۔ اعجاز حسینی،
 لیہ مور۔ اور میں احمد ناصر، گوگڑی کراپن، محمد جاوید، فیصل علی پور۔ سہو احمد خان، ادوہ، خیر و خیر و۔ اختر حسین، املوان، مظفر آباد، آزاد اور
 شہر۔ انکام کامران قانہ، صاحب اک۔

آل پاکستان نیوز پیپر رسوائی کے سبب رسواں اور صدر جناب محمد یونس کی والدہ 10 ستمبر کو طاق حلقی سے جا ملیں انابلہ وانا البیہ راجعون
 انصار و جس مانعگان کے غم و اندوہ میں میرا کراشریک ہے اور دعا گو ہے کہ رعب العزت مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

تاریخ نے ثابت کیا ہے، اگر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ انسان جیسے جیسے عروج کی جانب قدم بڑھاتا ہے درحقیقت اپنی ذات کی کمزوریوں... زندگی کے نازک لمحات اور ضعف سے قریب تر ہوتا جاتا ہے... حتیٰ کہ وہ عروج کی مطلوبہ منزل کو چھو لینا ہے اور جب وہ پلٹ کر چاروں جانب دیکھتا ہے تو سب کو پیچھے چھوڑ کر خوش ہوتا ہے لیکن درحقیقت خود کو تنہا پاتا ہے... اسے اپنی آواز بھی دور سے آتی سنائی دیتی ہے... تب جا کر اسے اپنے عروج میں چھپے زوال کا احساس ہوتا ہے... وہ منظر بھی بام عروج کو چھونے والے ایک عہد کے زوال کی تصویر بن کر رہ گیا تھا جب سلطنت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان سلیمان کے خوشحال اور مضبوط دور حکومت نے کتنی آنکھوں کو سنہری سپہوں کا عادی بنا دیا تھا۔ دلوں کی تالوں پر بھر پور کتے قصے عجب کیف و مستی کو دعوت دیتے تھے کہ اچانک وزیرا کی تبدیلی نے تاج و تخت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا پھر حالات و واقعات کی بگڑتی تریب نے تمام درکیوں کو بے اثر کر ڈالا... ماضی کے اوراق جب پلٹتے ہیں، ایک الگ ہی سبق آموز ماحول میں لے جاتے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار ادرے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

شہزادی مہر ماہ سلطان نے اپنی خواب گاہ میں بستر پر کروٹ لی۔ کچھ دیر سے وہ اسی طرح کروٹیں بدل رہی تھی جیسے کسی کروٹ یمن نہ آ رہا ہو۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ دماغ میں مسلسل یہ سوال گردش کر رہا تھا کہ اسے شقیہ خطے کی کسے جسارت کس نے کی تھی۔ اس خطہ کی وجہ سے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ خطہ اس کے بڑے بھائی شہزادہ بایزید کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ مہر ماہ نے اسے یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ نہ تو کسی سے محبت یا عشق کرتی ہے اور نہ اسے اندازہ ہے کہ اسے وہ خطہ کس نے لکھا تھا مگر شہزادہ بایزید کو یقین نہیں آیا تھا۔ خطہ وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور بڑی تنجید کی سے کہہ گیا تھا کہ یہ مسئلہ وہ سلطان سلیمان خان کے علم میں ضرور لائے گا۔ مہر ماہ سلطان اسی بات سے پریشان تھی کہ جب وہ اپنے بھائی کو اپنی بات کا یقین نہیں دلا سکی تھی تو اپنے باپ کو کس طرح یقین دلانے لگی۔

سلطان سلیمان خان ترکی کی عثمانی سلطنت کا دواں عظیم فرماں روا تھا جس کی سپاہ یورپ کی متعدد سلطنتوں کو روند چکی تھی اور جہاں ابھی اس کے قدم نہیں پہنچے تھے، وہاں کے بادشاہ اس کے نام سے بھی شہیدِ نفرت کرتے تھے۔

شہزادی مہر ماہ سلطان اس کی بہت چٹکتی مٹی تھی جو ملکہ خرم سلطان کے بطن سے تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی شہزادہ جہانگیر پیدائشی طور پر بڈیوں کا مریض تھا۔ خصوصاً ریزہ کی بڈی بھر بھر اس کی طرف مائل تھی۔ خرم سلطان کے دو اور بیٹے بھی تھے جن میں شہزادہ سلیم بڑا تھا مگر ملکہ خرم سلطان اس سے چھوٹے شہزادہ بایزید کو زیادہ پسند کرتی تھی۔

مہر ماہ سلطان کو باپ کی بہت اہمیت والہ والدہ کا زیادہ خوف تھا کیونکہ وہ شہزادہ بایزید کی بات پر جلدی یقین کر لیتی۔ بایزید نے کہا تو یہی تھا کہ یہ مسئلہ سلطان سلیمان خان کے علم میں لایا جائے گا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ سلطان اس بارے میں ملکہ خرم سلطان کو بھی بتاتا۔

مہر ماہ سلطان کو اس اعتبار سے نوحہ کیا جاسکتا تھا کہ ابھی اسے سن بلوغ میں قدم رکھنے چند مہینے ہی گزرے تھے لیکن اس کی اٹھان بہت اچھی تھی۔ اس کا جسم بھرا بھرا ہونے کے باوجود نہایت متناسب تھا۔ نقش و نگار بھی غیر معمولی تھے۔ سلطان سلیمان خان کی مریہ کہ چکا تھا کہ وہ اپنی خوب صورت ماں پر جی گی۔

اس سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کہ قصر شادی میں خرم سلطان سے زیادہ خوب صورت کوئی دوسری عورت نہ



تھی۔ جہاں اولادوں کی ماں بن جانے کے بعد بھی اس کے جسمانی تناسب اور نقش و نگار میں کچھ نمایاں تبدیلیاں آئی تھیں۔ فرق آیا تھا تو صرف اتنا کہ اب وہ نہایت باوقار اور پرکھنت نظر آنے لگی تھی جبکہ قصر شاہی میں قدم رکھتے وقت وہ ایک شوخ اور ابلڑو شیرہ بھی۔

سلطان سلیمان خان نے جب اس کی ایک ریاست فتح کی تھی تو وہاں سے قیدی بنا کر لائے جانے والوں میں وہ بھی شامل تھی۔ اس کی خوب صورتی ہی کو دیکھ کر والدہ سلطان نے اسے محل سرا کی کنیزوں میں شامل کر لیا تھا۔

بھائی ترکوں میں یہ خاصا پرانا روایت تھا کہ فرماں روا نے وقت کی ماں کو والدہ سلطان "یا" والدہ ماجدہ کہا جاتا تھا۔ لہذا اس پر اعتراض کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ اس لڑاکا لڑکی کو کنیزوں میں کیوں شامل کیا گیا۔ اسے "لڑاکا" اس لیے کہا جانے لگا تھا کہ وہ خود سے حسد کرنے والی ان کنیزوں کے بال بول ڈالتی تھی جو اس پر کبھی کوئی ختمہ کس دیا کرتی تھیں۔ عموماً وہ جھگڑا کنیزوں کی سربراہ قیدہ تکی کی وجہ سے رفع دفع ہو جاتا تھا۔

غیرہ کئے والی کنیزیں ملکہ محل بہار کی شہ پر ایسا کیا کرتی تھیں۔ دراصل محل بہار کو یہ ضد شد لاحق ہو گیا تھا کہ محل سرا میں آنے والی وہ قیامت کی خوب صورت کنیز کنیز سلطان سلیمان خان کے دل کو نہ بھاجائے۔ محل بہار چاہتی تھی کہ کسی بہانے سے اس کی کنیز کو محل سرا سے نکال دے۔ وہ خود بھی ایک خوبصورت کنیز تھی جو سلطان سلیمان خان کو اتنی بھائی تھی کہ اس کے بیٹے شہزادہ مصطفیٰ کی ماں بن چکی تھی۔

بھائی ترک فرمان رواؤں کے قانون اور اصول کے مطابق شہزادہ مصطفیٰ ہی بڑا چننا ہونے کی وجہ سے سلطنت کا ولی عہد ہوتا۔ اس کے باوجود محل بہار اس روی کنیز کی وجہ سے اندیشوں کا شکار ہوئی تھی۔ مشہور تھا کہ اس روی اور صیامی کنیز کا نام "روکے لانا" تھا۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب سے اعزاز میں رخص بھی کیا کرتی تھی۔

جب کسی خوشی کے موقع پر کنیزیں جشن منانا کرتی تھیں، وہ موسیقی کے قریب اپنے ہاتھ اس طرح بچھاتی کہ وہ باجر پر روا ہتی دیو کا سایہ رقص کرتا نظر آتا۔ ابتدا میں اسے بہت کم جب خرچ ہوتا تھا اس لیے وہ اپنے جوتے میں قیتہ باندھ لیتی تھی اور نیلے رنگ کی ٹوپی پہنتی تھی کیونکہ دوسری کنیزوں کی طرح اس کے پاس بال باندھنے کے لیے ملکہ محل، ساری عطا کردہ موتیوں کی مالائی، نذرین طلسم کی ٹوپی لیکن اس حالت میں بھی وہ نہایت خوب رو ہونے کے باعث تمام

کنیزوں میں نمایاں نظر آتی۔ پھر ایک دن وہی ہواجس کا ملکہ محل بہار کو خدشہ تھا۔ وہ روی کنیز سلطان سلیمان خان کی نظر میں آئی اور اس نے رقمیر تکی کو ہدایت کی کہ اس رات اس کی غلوٹ میں اسی کنیز کو بھیجا جائے۔

غلوٹ کی وہ رات اس روی کنیز کی زندگی میں انقلاب لے آئی۔ سلطان سلیمان خان نے اس کے لیے "مخوم" کا نام تجویز کیا۔ دوسرے دن رقمیر تکی کو مخوم سلطان ملکہ خرم کو اب تمام کنیزوں کے ساتھ رکھنے کے بجائے اس کے لیے ایک آرامتہ عیراستہ پر اساتش کمران مخصوص کیا جائے۔ ملکہ محل بہار کے پیچھے میں آگ لگی کی لیکن وہ دل مسوں کر رہ جانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کسی میں بھی اتنی مجال نہیں تھی کہ سلطان کے سامنے اف بھی کر سکے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خرم کی اہمیت بڑھتی ہی چلی گئی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ملکہ محل بہار کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی کنیز، سلطان کی غلوٹ میں جاتی رہتی تھی لیکن پھر یہ ہوا کہ جب بھی سلطان امور سلطنت سے تھک جاتا تو صرف خرم ہی کو اپنی غلوٹ میں طلب کرتا۔

اب ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد خرم نہ صرف کئی شہزادوں اور ایک شہزادی کی ماں بن چکی تھی بلکہ مسلمان ہونے کے بعد سلطان کی منگودہ بھی تھی جبکہ محل بہار اب بھی غیر منگودہ ہی تھی۔ قصر شاہی میں اس کی اہمیت کا سبب صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ ولی عہد سلطنت شہزادہ مصطفیٰ کی ماں تھی۔

اس سارے عرصے میں ملکہ محل بہار اور ملکہ خرم سلطان کے تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے تھے۔ سلطنت کے وزیر اعظم ابراہیم پاشا کو بھی ملکہ خرم سلطان تخت نہایت کرتی تھی جبکہ سلطان سلیمان خان کے بعد وہ سلطنت کا سب سے مقتدر شخص تھا۔ سلطان سلیمان خان کی شہزادی کے وقت وہ اس کا مصاحب خاص بھی تھا اور سلطان سلیمان کی ایک ہمشیرہ سے اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔

شہزادی میرا کو یہ اعزاز ہوتا تھا کہ ملکہ محل بہار اور اس کی والدہ کے تعلقات میں کشیدگی کیوں تھی لیکن یہ اس کے علم میں نہیں تھا کہ ابراہیم پاشا سے اس کی والدہ کے شدید اختلافات کیوں تھے۔ لیکن اس وقت میرا بہتر پرکردہ نہیں لیتی ہوئی ان سب باتوں کے بجائے صرف اس خد کی وجہ سے پریشان تھی جو شہزادہ بائزید اس لیے لے گیا تھا کہ سلطان سلیمان کو دکھائے۔ اپنی اس اہمیت سے وہ اس وقت فکری جب اس نے کمرے کے باہر دوڑتے بھاگتے ہوئے

قدموں کی آوازیں سنیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے اپنی کنیز خاص فروزاں کو پکارا جو محصل کمرے میں موجود تھی۔ وہ دوڑی ہوئی آئی۔ "یہ بھاگ دوڑ، یہ شور کیسا ہے معلوم کرو۔" شہزادی میرا نے حکماً شانہ ادا نہیں کیا۔

فروزاں نے موہ پانا انداز میں سرخم کیا اور تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میرا اب بستر سے اتر چکی تھی۔ وہ ٹھٹھے لگی۔ فروزاں جلدی واپس لوٹی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"غضب ہو گیا شہزادی حضور!" وہ بولی۔ "کسی نے شہزادہ بائزید کو خنجر مارا ہے۔"

"کیا!" میرا مہلک پیڑی۔

شہزادہ بائزید اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات تھے۔ بائیں بازو پر کپڑے کی ایک دھکی بھی نہیں تھی۔ اس کا لباس اس طرح پھاڑا گیا تھا کہ بازو، شانے تک برہن ہو گیا تھا۔ بازو پر موٹے سے قریب تانت اتنی کس کر باغی تھی کہ شاید ذرا اور زور سے بانٹھی جاتی تو کھال پھاڑ کر گوشت میں پوست ہو سکتی تھی۔

ایک خون آلود خنجر قریب ہی ایک ملشت میں پڑا تھا جو جینے شہزادے کے بازو سے نکالا گیا تھا۔ اس زخم پر کسی دوا کا لپ لگانے کے بعد غلیب بازو پر پٹی باندھ رہا تھا۔ چند شاہی غلیب جو باپ ہمالیوں کے بہت قریب رہتے تھے، یہ غلیب انہی میں سے ایک تھا۔

کمرے میں اس وقت سلطان سلیمان خان کے علاوہ ملکہ خرم سلطان، شہزادہ سلیم اور میرا سلطان بھی موجود تھے۔ "قہارے چہرے پر اب تکلیف کے تاثرات کیوں لکھائے میرے بہادر بیٹے!" سلطان سلیمان خان نے کہا۔ "قہارے زخم پر دوا کا لپ کیا چا چکا ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں آرام ملنا چاہیے۔"

شہزادہ بائزید سے پہلے غلیب بول پڑا۔ "میرے آقا! اس لپ ہی کی وجہ سے کچھ دیر تکلیف رہے گی، پھر آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔"

"تم نے رخصت الاطبا کو کیوں بلوایا ہے؟" ملکہ خرم سلطان اس وقت بستر پر شہزادہ بائزید کے سرہانے جا بیٹھی تھی اور میرا سے شہزادے کے بھرے

ہوئے بالوں میں اٹھیاں بھیر رہی تھی۔ "تم نے بازو پر تانت کیوں باندھی ہے؟ اور پھر اتنی زور سے؟"

اس سے پہلے کہ سلطان سلیمان کو اپنے سوال کا جواب ملے، رخصت الاطبا تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ شاہی خاندان کے سامنے وہ احتراماً ہرماں غریب کی طرف متوجہ ہوا۔ غلیب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے رخصت الاطبا کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ دونوں کشادہ کمرے کے ایک کمرے پر پہلے گئے جہاں سے ان کی آواز وہاں موجود کسی شخص کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

غلیب کے اس رازدارانہ انداز کے باعث خانوادہ شاہی کے تمام افراد کے چہروں پر تشویش کے تاثرات میں اضافہ ہوا۔ غلیب دھیرے دھیرے کچھ بتا رہا تھا اور رخصت الاطبا اثبات میں سر ہلاتا تھا پھر وہ واپس سب کے قریب آئے۔

"شاہ معظم!" رخصت الاطبا نے سلطان سلیمان سے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ آپ کے علاوہ باقی سب لوگ باہر چلے جائیں، کچھ دیر کے لیے۔"

"میں اس وقت اپنے بیٹے کے پاس سے ملی بھر کے لیے بھی نہیں ہوں گی۔" خرم سلطان بول پڑی۔ اس کا لہجہ بڑا حکم تھا۔

سلطان سلیمان کے چہرے سے غرور مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے شہزادہ سلیم اور میرا سلطان سے کہا۔ "تم دونوں باہر جاؤ۔"

وہ دونوں موہ پانا نہ تھکے اور پھر کمرے سے نکل آئے۔ وہاں ان دونوں کے علاوہ ان کے دو دو محافظین کے ساتھ سلطان سلیمان اور خرم سلطان کے محافظ بھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ میرا کی خصوصی کنیز اور وہ دونوں کنیزیں بھی موجود تھیں جو میرا وقت ان کے ساتھ رہتی تھیں۔

میرا سلطان، شہزادہ سلیم کو ان لوگوں سے کچھ دور ہٹا لے گئی اور پریشان لہجے میں بولی۔ "میں بعد میں آئی تھی یہاں۔ آپ خائیاں یہاں پہلے پہنچے ہوں گے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ کیسے ہوا؟"

"ہاں۔" شہزادہ سلیم نے جواب دیا۔ "بائزید اس وقت اپنے محافظوں کے ساتھ پہلے اور دوسرے دو محافظان خانے کے درمیان سے گزر کر حرم سلطانی کی طرف بڑھ رہا تھا جب اوپر ہی منزل کی راہداری سے اس پر خنجر پھینکا گیا۔ بائزید نے اپنی طرف آتے ہوئے بھڑکی چک و بھکی تو میرا نے خود کو بچانے کے لیے ایک طرف بھاگ بھاگ خنجر سامنے کی

سرگزشت

ماہنامہ

گل فارسی

حاشا حق میں ملکوں ملکوں پھرنے والے
کاسواغ 'نور کی بجلی بھری سرگزشت'

باکمال بسینیں

ادب کی دنیا میں تامل کر چاہئے والی تین بہنوں کی روداد

کمن فتنہ

معصوم سے بچنے امریکا کے کنگز خفیہ کوا کر رکھ دیا تھا

آئینہ

ایک ایسی جگہ بیانی جو آپ کی آنکھ بھروسے کی

ادب کی جھلکیاں

”قلمی الف لیلہ“ جو اپنے آپ میں ایک تاریخی
دستاویز ہے ”سراب“ لہو کو گرم کر دینے والی طویل
کہانی جس کی فسون گری آپ کو اپنا اسیر بنالے
گی ”الوداع“ منظر و انداز کی سفر کہانی

ادب

ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات
انوکے قصے، آپ بیتیوں، جنگ بیتیوں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ بخش کر لیں

میں نہ پھیل سکے۔“

”آپ کی ذہانت سے انکار ممکن ہی نہیں شاہ معظم“
ریس الاطمانے کہا۔ ”بے شک آپ کا خیال درست تھا۔
غالباً آپ کو یہ علم بھی ہوگا کہ تانت ایک خاص انداز سے
ایک خاص جگہ پر باندھنے سے ہی دوران خون رک سکتا ہے
اور یہ طریقہ اعلیٰ ہی جانتے ہیں۔ ہر شخص تانت اس طرح
نہیں باندھ سکتا کہ دوران خون رک جائے۔“

”میرے بچے کو اس طرح ہلاک کرنے کی کوشش
کون کر سکتا ہے؟“ خرم سلطان کی آواز میں لرزش تھی۔

”تحقیق کرنا پڑے گی۔“ سلطان سلیمان نے کہا۔

اسی دوران میں طبیب نے کسی مظلوم سے دُغم صاف
کرنے کے بعد اس پر زردی مائل لیب کیا اور لیب کرنے
کے بعد پٹی باندھنے لگا۔ دیکھ الاطمان عور سے وہ سب کچھ
دیکھتا رہا۔

”شہزادے بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جائیں گے
لگتا“ ریس الاطمان نے خرم سلطان کی عزت غیر دیکھتے
ہوئے اسی سے کہا۔ ”اب یہ خطرے سے بالکل باہر تھا۔“

اب خرم سلطان کے ہونٹوں پر دُغم سی مسکراہٹ نظر آئی۔

ریس الاطمان نے سلطان سلیمان کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”آپ تو مضبوط اعصاب کے مالک ہیں شاہ معظم! میں
نے باقی لوگوں سے باہر جانے کے لیے یوں کہا تھا کہ اگر پہلا
لیب کارگر ہوتا نظر نہ آتا تو مجھے جلت کے ساتھ کوئی دوسرا قدم
اٹھانا پڑتا۔ پٹی مائل کر دے لیب بھی بٹانا ہوتا۔ دُغم دیکھ شہزادہ
والا تار اور شہزادہ کی صاحب پر نہ جانے کیا کرتی۔“

”باہر وہ دونوں بہت بے چہن ہوں گے۔“

”اب وہ اندر آجائیں تو کوئی حرج نہیں، تاہم وہ

زیادہ نہ رکھیں۔ انہیں آرام سے سوتے دیا جائے۔“ ریس

الاطمان کا اشارہ شہزادہ بایزید کی طرف تھا پھر اس نے طبیب
کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ تو اس وقت تک رکھیں گے جب
تک شہزادے جاگ نہ جائیں۔ اس وقت پٹی ایک بار پھر
تبدیل کی جائے گی۔ اس کے بعد دُغم منسل ہو جائے تک
حریدہ کھڑکے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔“

سلطان سلیمان نے سر ہلایا اور پھر تیزی سے

دروازے کی طرف مڑ گیا۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے

ساتھ فیسے کے تاثرات بھی تھے۔ وہ مکرے سے لگا تو اس کا

سامنا ان سب لوگوں سے ہو گیا جو وہاں موجود تھے۔

ابراہیم پاشا، شہزادہ سلیم اور شہزادہ مبراہ سلطان اسے دیکھ

کر اتر آئے تھے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ سلطان سلیمان کی نظر
شہزادہ بایزید کے بازو پر بندھی پٹی پر تھی۔ ”اگر اس میں
دُغم کا خون جذب ہو رہا ہے تو یہ بڑی مائل سیاہ کیوں ہے؟“
”میں ہات میرے لیے اطمینان بخش سے شاہ
معظم!“ ریس الاطمانے کہا۔ ”اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے پٹی کھلوا
کر دوسرا لپکوانا پڑتا۔“

سلطان سلیمان کا منہ کھلا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کوئی
خیال اس کے ذہن میں آیا تھا لیکن وہ خرم سلطان کی طرف
دیکھ کر چپ رہ گیا۔ خرم سلطان اس وقت آبدیدہ تھی۔

سلطان سلیمان آہستہ آہستہ چلتا ہوا خرم سلطان کے قریب

پہنچا اور پشت سے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر

نہایت نرم لہجے میں بولا۔ ”خرم! جب ریس الاطمان خود یہاں

موجود ہیں تو فکر مند ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ ہمارا بیٹا بالکل

ٹھیک ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ ریس الاطمان اور طبیب کے منہ سے

ایک وقت لگا پھر ریس الاطمان نے طبیب سے کہا۔ ”اب

پٹی کھلو۔“

طبیب پٹی کھولنے لگا۔ ریس الاطمان کی نظر اس پر بھی

رہی۔ وہ ترک مملکت کا سب سے اچھا طبیب سمجھا جاتا تھا

اور اسی لیے سلطان سلیمان خان نے اسے ریس الاطمان کے

عہدے پر فائز کیا تھا۔ وہ نہ صرف طبیبوں کا سربراہ تھا بلکہ

تمام شفاخانے اور دوا گاہیں بنانے والے ادارے اسی کی

نگرانی میں کام کرتے تھے۔ وہ شاہی خانوادے کے علاوہ

کسی بھی مریض کو دیکھتے نہیں جاتا تھا۔

پٹی اتارنے کے بعد جب طبیب نے دُغم صاف کیا تو

ریس الاطمان اس پر جھک کر فور سے دیکھنے لگا پھر اس کے

ہونٹوں پر نہایت اطمینان بخش مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے

طبیب سے کہا کہ اب وہ شہزادے کے شانے پر بندھی ہوئی

تانت کھول دے پھر وہ سلطان سلیمان خان سے بولا۔

”شاہ معظم! اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ دُغم کے گرد بھگی سی

سرخ تو ہے لیکن سیاہی مائل بڑی نہیں ہے۔ اس کا مطلب

ہے کہ لیب نے سارا زہر کھینچ لیا ہے۔“

”زہر!“ خرم سلطان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”میں سمجھ گیا تھا ریس!“ سلطان سلیمان نے کہا۔

”پٹی کا رنگ سیاہی مائل سبز ہو رہا تھا جس سے مجھے اس کا شبہ

ہوا۔ تم نے بھی اس رنگت کو اپنے لیے اطمینان بخش کہا تھا۔

میرے شیخے کو تنہا اس سے فنی کہ شہزادے کے شانے پر

تانت بڑی مضبوطی سے باندھی گئی تھی تاکہ زہر باخون جسم

جانب سے پھینک گیا تھا۔ یقیناً شہزادہ بایزید کے سینے ہی کا لیا
گیا ہوگا لیکن اس کے ایک طرف جھک جانے کی وجہ سے وہ
خبر اس کے بازو میں لگا۔ خبر سمجھنے والا کل ہی کا ایک جوشی
خواجہ سرا تھا۔ بایزید کے محافظ فوراً چلے تاکہ اوپر کی
راہداری میں موجود خبر سمجھنے والے کو پکڑیں لیکن اسی وقت
کسی جانب سے آنے والا تیرا اس جوشی خواجہ سرا کی گردن
میں پھوست ہو گیا۔ وہ تڑپ کر اسی وقت مڑ گیا۔

”یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے سلیم بھائی!“ مبراہ

نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”نکس میں یہ اس قسم کی ہلکی

واردات ہے۔“

اسی وقت ان دونوں نے وزیر سلطنت ابراہیم پاشا کو

تیزی سے قریب آتے دیکھا۔ اس کے چہرے سے بھی

پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ قریب آتے ہی ادب سے جھکے کے

بعد بولا۔ ”میں اس حادثے کی اطلاع ملنے ہی آ رہا ہوں۔“

وہ شام کا وقت تھا جب وزیر سلطنت ابراہیم پاشا کو

قصر سلطان میں کوئی کام نہیں ہوتا تھا وہ اپنے محل میں چلا

جاتا تھا جو کچھ ہی قائلے پر تھا۔

☆☆☆

شہزادہ بایزید کی خواب گاہ میں ریس الاطمان کے

اشارے پر طبیب نے کسی عرق کے دو بچے شہزادے کو

چلائے۔ اس عرق کے گلے سے اترتے ہی شہزادے کی

آنکھیں بند ہونے لگیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے میرے بچے کو؟“ خرم سلطان جلدی

سے بولی۔

”گھبراہٹ نہیں ملکہ!“ ریس الاطمانے کہا۔ ”یہ عرق

انتہائی سریع الاثر ہے۔ یوں سمجھئے کہ شہزادہ والا تار نصف

شب کے بعد خود ہی جاگ جائیں گے۔ اس طرح انہیں اتنی

دیر تک تلف کا احساس نہیں ہوگا۔“

”لیکن خبر کا دُغم اتنا تلخ ہے وہ تو نہیں ہو سکتا ریس!“

سلطان سلیمان خان نے کہا۔ ”میرا بہادر بیٹا اتنی تلخ

آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔“

”تلخ دُغم کی نہیں ہے شاہ معظم!“ ریس الاطمانے

جواب دیا۔ ”بس ذرا سا توقف فرمائیں۔ پھر میں آپ کو

ایک اہم بات بتاؤں گا۔“

”اہم؟“ سلطان سلیمان خان چونکا۔ سبکی کیفیت خرم

سلطان کی بھی ہوئی تھی۔

”گستاخی معاف! میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ

ذرا سا توقف فرمائیں۔“

”اب تم دونوں اندر جا سکتے ہو۔“ سلطان نے شہزادہ سلیم اور میرزاہ سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ایک طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے ساتھ آؤ اور ابراہیم!“

”جیسے حکم آقا!“ ابراہیم پاشا پھر غم ہوا۔

☆☆☆☆

قصر شاہی کے زیادہ تر افراد سلطان سلیمان کو آقا ہی کہتے تھے کیونکہ اکثریت کنیزوں اور غلاموں ہی کی تھی۔ ابراہیم پاشا وزیر سلطنت کے عہدے تک پہنچ گیا تھا اور سلطان کی ہمیشہ سے اس کی شادی بھی ہو چکی تھی لیکن غلام ہونے کے باعث سلطان سلیمان کو آقا ہی کہنے پر مجبور تھا۔ سلطان سلیمان کے پیچھے جاتے ہوئے اس کے چہرے سے تہمت پریشانی ظاہر ہوتی تھی کیونکہ قصر شاہی میں گزشتہ رات سے اب تک وہ نہایت غیر معمولی واقعات ہو چکے تھے۔

جہاں سے حرم سرا کی حدود شروع ہوتی تھیں، وہاں جیٹی خواجہ سرا پہرے پر پہنچے تھے۔ انہیں نہ صرف آختہ کیا گیا تھا بلکہ ان کی زبانیں بھی کاٹ دی گئی تھیں تاکہ اگر وہ حرم سرا میں کچھ دیکھ لیں تو اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتا سکیں۔

انہی میں سے ایک غلام نے کچھ دن قبل ایک کنیز سے بدتمیزی کی تھی جس کی پادشاہ میں اس کو پچاس دن کے لیے زندان میں ڈال دیا گیا تھا۔ گزشتہ رات وہ زندان سے اس طرح ناکب ہوا تھا کہ وہاں پہرا اپنے والے دو سیاہی مردہ پائے گئے تھے۔ حرم سرا سے ان دونوں کی گردیں اڑا دی گئی تھیں۔

فوری طور پر اس معاملے کی تحقیقات کے لیے باب سرعسری کے آغا کیہان کو طلب کیا گیا تھا۔ طلب کرنے والا ابراہیم پاشا تھا۔

باب سرعسری، ترک سیاہ کا صدر دفتر تھا مگر آغا کیہان، سیاہ میں شامل نہیں تھا۔ اسے اور اس کے ماتحتوں کو صرف دفتری ذمے دار یا رابطہ سونپ دی گئی تھی یا اگر کسی قسم کی تحقیقات کروانا ہوتی تھیں تو وہ معاملہ اس کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اسے غیر معمولی معاملات کی تحقیقات کا خاص تجربہ تھا۔ اسے جس ملک سے لایا گیا تھا وہاں اسے اس کی تربیت دی گئی تھی۔

آغا کیہان نے نصف رات کے قریب ابراہیم پاشا کو اپنی تحقیقات سے آگاہ کر دیا تھا اور ابراہیم پاشا نے وہ سب باتیں سلطان سلیمان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ آغا کیہان کی تحقیق اور تجزیے کے مطابق جیٹی خواجہ سرا کو آزاد کرانے والا کوئی ایسا شخص ہو سکتا تھا جو قصر شاہی ہی میں مقیم ہوتی ہو۔ اس خیال کا سبب یہ تھا کہ زندان کے محافظوں کی

لاشیں اس طرح پائی گئی تھیں کہ انہوں نے نہ تو اپنے منہ پر کھانے کچے اور نہ تو انہیں بے غلام کی تھیں۔ اگر وہ کسی ایسی یا قصر کے کسی غلام آدمی کو زندان کے قریب آتے دیکھتے تو چوکنہ ہو جاتے۔ حرم سرا میں بے غلام نہ کرتے تو کم از کم منہ پر کھانے لیتے اور کسی کو زندان کے قریب نہ آنے دیتے لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔ لہذا اس شخص نے ان کے قریب پہنچ کر بڑی تیزی سے ان کی گردنیں اڑا دی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک کے پاس سے زندان کے قفل کی چابی نکالی اور جیٹی خواجہ سرا کو آزاد کرانے گیا تھا۔

یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ قفل کی وہ مقدار کتنی کون ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہی ممکن تھا کہ اس کا تعلق شاہی خانوادے سے ہوگا یا وہ قصر شاہی کے ہی ایک حصے میں قائم چند محکمے کے وزرا یا ان کے خاص ماتحت ہو سکتے تھے۔

کیونکہ خصوصی طور پر اس معاملے کی تحقیقات کے لیے آغا کیہان کو اختیارات بھی مکمل دیے گئے تھے اس لیے اس نے قفل میں قائم محکموں کے وزرا اور ان کے مستند افراد سے بھی پوچھ بچھ کی لیکن ان میں سے کسی کو بھی مشتبہ قرار نہیں دیا تھا۔ آغا کیہان کا خیال تھا کہ اگر وہ انہی میں سے کوئی ہے تو نہایت عیار ہے جس نے پوچھ بچھ کے دوران میں کوئی ایسی بات اپنی زبان پر نہیں آئے دی تھی کہ اس پر شبہ کیا جاسکے۔ آغا کیہان نے کہا تھا کہ وہ باب سرعسری میں کام کرنے والے اپنے کچھ مستند اور ہوشیار افراد سے ان لوگوں کی گہرائی کرانے کا بھی حقیقت سامنے آئے کا امکان ہے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ جیٹی خواجہ سرا آزاد ہونے کے بعد قفل سے بھی فرار ہوا ہوگا یا نہیں؟ لیکن اب یہ بات ہو چکا تھا کہ وہ جیٹی خواجہ سرا قفل ہی میں رہا تھا۔ اسی نے شہزادہ باغیہ کو زہر پہنچنے سے بچا کر اسے قفل کرنے کی کوشش کی تھی۔

پھر قفل ہی میں موجود کسی شخص نے اسے حج راز کر ہلاک کر دیا تھا۔ اسے ہلاک کرنے والا یقیناً وہی شخص ہوگا جس نے اسے آزاد کر دیا تھا اور آزاد آدمی اسے لے کر آیا تھا کہ اس سے شہزادہ باغیہ کو قتل کر دیا سکے۔ اسی نے رات سے اب تک اس غلام کو چھپا کر رکھا تھا۔ غلام کو یہ بھی یقین دلا یا ہوگا کہ یہ سنگین واردات کرنے کے باوجود اس کی گرفتاری نہیں ہو سکے گی جس کے بعد اسے قفل سے فرار کر دیا جائے گا۔

”وہ غلام۔“ سلطان سلیمان اپنے کمرائے خاص میں بیٹھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یقیناً کسی اہم شخصیت کا آلہ کار بنا ہے۔ کسی معمولی آدمی کی بات پر وہ ہرگز یقین نہیں کرتا کہ

اسے اتنی سنگین ترین واردات کے بعد قفل سے فرار کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس سے اکرام و انعام کے وعدے بھی کیے گئے ہوں گے۔“

”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں آقا!“ آغا کیہان بولا۔

اس وقت ابراہیم پاشا تو وہاں موجود تھا ہی مگر آغا کیہان کے علاوہ قفل کے داروغہ آغا نے اول طور پر کو بھی طلب کیا گیا تھا۔ قفل کے تمام امور آغا نے اول طور پر اور اس کے ماتحت آغاؤں پر عائد ہوتی تھی۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا کیونکہ اسے متوہب ہونے کا خدشہ یقیناً ہوگا۔ واقعہ بہت سنگین تھا۔ شہزادہ باغیہ کو قفل کرنے کی کوشش کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

آغا کیہان نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ ”غلام کو قفل سے فرار کرانے اور انعامات سے نوازنے کے وعدے کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسے ہر صورت میں قسم کیے جانے کی تیاری بھی مکمل ہوگی۔ وہ گرفتار ہو جاتا تو کوٹہ ہونے کے باوجود اس شخصیت کی نشاندہی کر سکتا تھا جس نے اسے اپنا آلہ کار بنایا تھا۔“

”اور اسے ہلاک کرنے والا اس وقت بھی قصر شاہی میں آزاد ہے۔“ سلطان سلیمان نے تشویش کا اظہار کیا پھر بولا۔ ”آغا طور!“

”آقا!“ آغا طور نے سر خم کیا۔

”جیٹیں اور قہرمانے ساتھ کام کرنے والوں کو اب بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔“

”جی میرے آقا!“ آغا طور نے مزید سر جھکا یا۔

اس نے اطمینان کی سانس یقیناً ہی ہو کی لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ اس کے غیاب میں کیا بات ہو چکی تھی۔ آغا کیہان نے سلطان سلیمان سے کہا تھا کہ وہ جن لوگوں کی گرفتاری کروانا چاہتا ہے، ان میں آغا طور کا نام بھی شامل ہے۔

”جیٹیں مکمل اختیارات دیے جا چکے ہیں۔“ سلطان سلیمان نے اسے سمجھوتے ہوئے کہا۔ ”اب تم دونوں جا سکتے ہو۔ تم ابھی روکو گے ابراہیم!“

ابراہیم پاشا مولود باغیہ انداز میں جھکا۔

آغا کیہان اور آغا طور کے جانے کے بعد سلطان سلیمان نے ابراہیم پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ اس غلام نے کسی کنیز سے بدتمیزی کی تھی اور تم ہی نے اسے زندان میں ڈال دیا تھا۔“

”معمولی سی بات تھی آقا!“ ابراہیم پاشا نے کہا۔

”اس قسم کے چھوٹے موٹے واقعات سے باخبر کر کے میں آپ کا دماغ بوجھل نہیں کرتا ہوں۔ امور سلطنت کا بہت بوجھ ہے آپ پر۔“

”لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک آختہ خواجہ سرا کسی کنیز سے بدتمیزی کرے۔“

”جی۔“ ابراہیم پاشا نے جلد بزدل لہجے میں کہا۔ ”مجھے بھی اس پر تعجب ہوا تھا۔ میں نے زندان میں غلام کو رہنے نہ کرایا تھا۔ وہ میرا مطلب ہے اسے آختہ نہیں کیا گیا تھا۔“

”کیا!“ سلطان سلیمان چونکا۔

”جی آقا!“ ابراہیم پاشا کا سر جھکا رہا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں آقا! مجھے یہ خیال وارد ہرے آیا۔ میں آپ کے حکم کے مطابق فرانس کے سفیروں کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ میں آج شام ہی اس کے آختہ نہ ہونے کی تصدیق کر سکا۔“

”اس کا ذمہ دار کون ہے؟“ سلطان سلیمان نے بگڑ کر پوچھا۔

”شاہی جراح سفیان۔“ ابراہیم پاشا نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے فوراً طلب کیا تھا لیکن وہ اس وقت اپنے کھڑے نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے کسی عزیز سے ملنے کندر چلا گیا ہے جہاں سے جلد ہی لوٹ آئے گا۔“ ابراہیم پاشا گھبرایا ہوا سا لڑائی چلا گیا۔ ”مجھے شبہ ہوا کہ شاید اسے غلام اور کنیز کے معاملے کا علم ہو گیا ہے اس لیے وہ ذکر فرما رہا ہوگا ہے۔ میں نے اسے گرفتار کرنے کے لیے سیاہ بھیج دیے ہیں۔ اگر وہ کندر میں نہ لاتا تو بھی اس کی تلاش جاری رہے گی۔ ہمارے سیاہ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”ہوں۔“ سلطان سلیمان جھٹکا ہوا ایک طرف گیا پھر پلٹ کر بولا۔ ”کیا ان حالات میں تمہیں دوسرے غلاموں کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا؟“

”اگر میں آپ کی بات کو صحیح طور پر سمجھا ہوں تو میرا جواب یہ ہے کہ قفل کے تمام خواجہ سراؤں کا معائنہ کروایا جا چکا ہے۔ وہ سب آختہ کیے جا چکے ہیں۔“

اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ان سیاہیوں میں سے ایک اندر آیا جو سلطان سلیمان کے محافظ تھے۔

”آقا!“ وہ بولا۔ ”ملکہ خرم سلطان باریابی کی اجازت چاہتی ہیں۔“

”کہہ دو کہ میرے کمرائے خاص میں انتظار کیا جائے۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

محافظ کے جانے کے بعد سلطان سلیمان، امیر انجم پاشا کو کچھ ہدایات دینے لگا۔

☆ ☆ ☆

خرم سلطان، شہزادہ یازید کے کمرے سے جا چکی تھی جب ملکہ گل بہار اور ولی محمد سلطنت شہزادہ مصطفیٰ کمرے میں پہنچے۔ انہیں سامنے کی اطلاع خاصی تاخیر سے اس لیے ملی تھی کہ شہزادہ مصطفیٰ ایک کتب خانے کا افتتاح کرنے گیا ہوا تھا اور افتتاح کرنے کے بعد خاصی دیر تک کتابوں کا جائزہ لیتا رہا تھا اور ملکہ گل بہار امرائے سلطنت کی نیکیات کی کسی تقریب میں ملنے ہوئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ دونوں ایک وقت ہی محل لوٹے تھے اور انہیں اس سامنے کی اطلاع ملی تھی۔

اب وہ نہایت پریشان رویہ میں شہزادہ سلیم سے اس سامنے کی تفصیلات معلوم کرنے کے بعد اس پر تھمرے کر رہے تھے۔ مہر ماہ سلطان اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اس کا دماغ بدستور اس خط میں الجھا ہوا تھا شہزادہ یازید کے ہاتھ لگا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کس نے لٹکا تھا۔ یازید کے ہوش میں آنے کے ذرا دیر بعد ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی کیونکہ ملکہ گل بہار، شہزادہ شہزادہ شہزادہ مصطفیٰ سے باتیں کرنے کے دوران میں یازید نے اس سے بے اعتنائی برتی تھی جس کا اسے دکھ ہوا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ ہایزیدی کو چاہتی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بستر پر لیٹی تو اس کی تیز خاص فروزاں نے پوچھا۔ ”کیا آپ کے لیے کھانا چاہتا ہے؟“

”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تھک رہی ہو؟“ مہر ماہ سلطان نے بجز کر کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔“

فروزاں مودباں انداز میں جھکی اور چلی گئی۔ بھوک ہی نہیں، مہر ماہ کی آنکھوں سے نیند بھی اڑی ہوئی تھی۔ رورہ کر اس کے دماغ میں یہ پریشان کن سوال اٹھ رہا تھا کہ اس کے والدین پر اس خط کا کیا رد عمل ہوگا۔ ہوگا کچھ، اس نے سمجھا کر سوچا اور اس مسئلے سے دھیان ہٹانے کے لیے مہر ماہ خاتون کی شاعری پڑھنے لگی جو اسے بہت پسند تھی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ مہر ماہ خاتون کا اصل نام بھی مہر ماہ تھا۔ اس کی وفات مہر ماہ سلطان کی پیدائش سے چھ بجھیں سال پہلے، مولویں مہدی کے دوسرے عشرے میں ہوئی تھی۔ چند عرصے مہدی میں اس کی شاعری نے بڑی دھوم مچائی تھی۔

مشہور وہ مانی تھی اس سے منسوب کیے جاتے تھے اور اس کی شاعری بھی مشہور تھی۔ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی تھی جس کا سبب شاید کوئی ناکام عشق ہو۔ اس نے اپنی شاعری میں اپنی تسوایت کو دہانے کی کوشش نہیں کی تھی اور اپنے جذبات کا بلا جھجک اظہار کیا تھا۔ اس نے اپنے عہد کے صنف اول کے شعرا میں جگہ بنائی تھی۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ سلطان سلیمان کے دادا کی سکرانی کے زمانے میں شہزادہ احمد کے ادبی حلقے میں شامل تھی جو امانیہ کا دانی تھا۔

مہر ماہ سلطان کا خیال تھا کہ اس کی شخصیت پر مہر ماہ خاتون کے کام کا خاص اثر پڑا تھا۔ وہ بے باک اور خود سر ہوئی تھی۔ سلطان سلیمان کیونکہ اپنی اس بیٹی کو بہت چاہتا تھا اس لیے عموماً اس کی خود مری کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ مہر ماہ سلطان کو صرف شاعری ہی نہیں، فنون لطیفہ کے ہر شعبے سے گہرا یازید و دلچسپی بہر حال تھی۔ سلطنت کے امور سے اس نے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھا تھا۔ اس نے بے یاد رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ اس کے باپ نے یورپ پر انگلشی کا آغاز کب کیا تھا، یا ہنگری، یوڈا، وینا اور دیگر مغربی ممالک کب فتح کیے تھے۔

امور مملکت سے اس کی عدم دلچسپی کا سبب یہ احساس بھی ہو سکتا تھا کہ اسے زمانہ حکومت بھی نہیں سنبھالنا تھا۔ وہ شہزادہ نہیں، ایک شہزادی تھی جسے کسی شہ و دیار کی کسی ایسے شخص کی رفیقہ زندگی بننا تھا جس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون کسی شاہی خاندان کا نہیں ہوتا۔

یہ اس کے خاندان کا رواج یا قانون تھا کہ شہزادوں کی شادی امرائے دربار یا امرائے دربار کے کسی بیٹے سے ہوتی تھی تاکہ ان کے خاندان میں کسی دوسرے شاہی خاندان کا خون شامل نہ ہو۔

مہر ماہ سلطان نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی شادی کب ہوگی اور کس سے ہوگی۔ اس کی خواہش صرف اتنی تھی کہ جس سے بھی اس کی شادی ہو، وہ فنون لطیفہ کے گہریت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت دلچسپی ضرور رکھتا ہو۔

اسی جسم کے احساسات کے باعث ایک مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ کسی سے اپنی تصویر بنوائے۔ اس کے علم میں تھا کہ کئی مصور قسطنطنیہ ہی میں تھے مگر وہ یہودی یا مسیحی تھے۔ مثالی ترکوں میں تصویر کشی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے عہد میں شاید ہی کسی مسلمان نے مصور بننا چاہا ہو۔

مہر ماہ سلطان نے چھان بین کروائی تو اسے معلوم ہوا کہ ان دنوں وہاں کارل نام کے ایک مصور کی بہت دھوم مچ رہی تھی۔ وہ اتنی حسین تصویریں بناتا تھا کہ لوگ اس کی کھلیں اٹھتے تھے۔ یہ معلوم ہوجانے کے بعد مہر ماہ سلطان کے لیے مشکل یہ تھی کہ اپنی تصویر بنوانے کے لیے کارل کو کہاں بلائے۔ محل میں بلوانا تو اسے کی طرح بھی ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ یہ کام اسے چھپ کر ہی کرنا پڑے گا لیکن یہ بھی ایک مسئلہ تھا کہ اس کام کے لیے چھپنے کی جگہ کہاں ہو۔

کوئی دیر ان جگہ امیر ماہ سلطان کے دماغ میں خیال آیا تھا اور پھر اس نے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی تھی۔ وہ بحیرہ قارس کے کنارے چٹانوں کے ایک درخت کا چھتہ تھا جس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ وہاں تصویر بنوانا خاصا ممکن تو تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ مہر ماہ سلطان کے لیے وہاں آنا جانا کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ وہ بخشی رانی اور گھڑ سواری خوب جانتی تھی۔ امور سلطنت سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود اس نے بچپن میں جب شہزادہ مصطفیٰ کو فنون حرب سیکھتے دیکھا تھا تو اسے بھی وہ سب سیکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ باپ کی لاڈلی بیٹی ہونے کے باعث یہ ممکن بھی ہو گیا۔ اس نے گھڑ سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی سیکھی تھی۔ گھڑ سواری میں وہ کم عمری ہی میں حلق ہوئی تھی لیکن شمشیر زنی اور تیر اندازی میں اسے ابھی زیادہ ملکہ حاصل نہیں ہوا تھا۔

ایک مرتبہ وہ فروزاں کے ساتھ بحیرہ قارس کے ساحل پر اس دیرانے میں تھی۔ دو محافظ بھی ان کے ساتھ رہے تھے لیکن مہر ماہ نے ان کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے تو کسی خاص مقام کی تلاش تھی۔ محافظ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔

جگہ کا انتخاب کر لینے کے بعد اس نے فروزاں ہی کو کارل کے پاس بھیجا تھا۔ فروزاں نے کارل سے ملنے وقت اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ اصل کون تھی۔ صرف یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ امرائے خاندان کی ایک لڑکی کی کینز ہے اور اس کی مالک چونکہ مسلمان ہے اس لیے چھپ کر تصویر بنوانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے کارل کو ”قلاں جگہ“ آنا ہوگا۔ کارل ایک دیرانے میں جانے کے خیال سے پریشان تو ہوا تھا لیکن جب فروزاں نے اسے اشرافیوں کی ایک بھاری جھلی دی تھی تو وہ اس کام کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

مہر ماہ سلطان کو گھڑ سواری کا شوق جنوں کی حد تک تھا اور چونکہ وہ عمری ہی میں اس کی مشاق بھی ہوئی تھی اس لیے سلطان سلیمان اس پر اعتراض بھی نہیں کرتا تھا کہ وہ دونوں

کا ایک پہر محل سے باہر گھڑ سواری میں گزاردے۔ مصوری کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ جگہ فروزاں ہی نے کارل کو دکھائی تھی چنانچہ وہ اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ مقررہ دن اور مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا۔ مہر ماہ سلطان نے جب پہلی مرتبہ کارل کو دیکھا تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق کارل کو پختہ عمر کا شخص ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس عمر میں اس کا سارے قسطنطنیہ میں شہرت پا جانا حیرت انگیز تھا۔

مہر ماہ سلطان اس وقت اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپائے ہوئے تھی۔ اگرچہ نقاب حریری تھا اور اس کی آنکھوں کے نیچے کے نقوش بس جھلکا رہے تھے لیکن وہ اسے اس عالم میں دیکھ کر بھی مہیبت رہ گیا تھا۔ تصویر کشی کا انتظام کارل نے پہلے ہی عمل کر لیا تھا چنانچہ جب مہر ماہ سلطان نے تصویر بنوانے کے لیے چہرے سے نقاب ہٹائی تو کارل بالکل ہی دم پر خود رہ گیا۔

”کام شروع کرو مصور!“ مہر ماہ سلطان نے کہا تھا۔ اس وقت کارل بے پروا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”آپ کی کینز نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنی تصویر میں اپنے آپ کو خود سے زیادہ حسین دیکھنا چاہتی ہیں۔“ ”بے شک۔“ مہر ماہ سلطان نے کہا تھا۔ ”سبکی خواہش ہے میری!“

”شاید یہ مجھے سے ممکن نہ ہو۔“

”کیوں؟“

اس سوال کا جواب دینا کارل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مہر ماہ سلطان مسکرا دی۔ اسے اندازہ تھا کہ کارل جواب دینے سے قاصر کیوں ہے۔ ”میری خواہش کی پروا نہ کرو۔“ مہر ماہ سلطان نے کہا۔ ”تصویر جیسی بھی ہو، تم اپنا کام شروع کرو۔“

امرا کے باعث کارل کو اپنا کام شروع کرنا پڑا۔ اگر کارل پختہ عمر کا آدمی ہوتا تو بھی مہر ماہ سلطان اس دیرانہ مقام پر اس سے تصویر بنوانے کے خوف زدہ نہ ہوتی۔ پھر اس کی کمر سے ہر وقت بندھا رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کے باوجود خطرہ ہوتا تو وہ اپنے آنکھوں کو پکار سکتی تھی جو اس سے بہت زیادہ دور نہیں تھے۔ محافظ اسے بس دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ مقام چٹانوں کے چھتہ کے پار قدرے نشیب میں تھا۔

”میں وہاں بیٹھ کر شاعری کرتی ہوں شاہ بابا۔“ مہر ماہ سلطان نے ایک مرتبہ اپنے باپ سے کہا تھا۔ ”سنائے

میں شہر کہنا آسان ہوتا ہے۔"

دراصل سلطان سلیمان نے ایک مرتبہ اس کے محافظوں سے پوچھا تھا کہ وہ آخر کہاں جایا کرتی ہے کہ دوسرے پہر سے زیادہ وقت گزر جاتا ہے محافظوں کو جواب دینا پڑتا تھا۔

سلطان سلیمان نے دو ایک مرتبہ اس کی شاعری دیکھی تھی بھی اور نوٹے چھوٹے اشعار پڑھ کے مسکرا کر رہ گیا تھا۔ وہ خود ایک اچھا شاعر تھا اور اس کا قصہ "بکلی" تھا۔ مہر ماہ سلطان کی تصویر چند روز قبل مکمل ہو چکی تھی۔ کارل اسے مہر ماہ سے زیادہ خوب صورت تو نہیں بناسکا تھا لیکن پس منظر میں چاندنی رات دکھا کر اس نے تصویر ابھار ضرور دی تھی۔

مہر ماہ نے وہ تصویر چھپا کر رکھ دی تھی۔ کارل سے اس نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کارل خود بھی ایک خوب صورت نوجوان تھا لیکن ایسا بہر حال نہ ہو سکا کہ مہر ماہ کے دل میں اس کے لیے کوئی مخصوص جگہ بن جائے۔ عشق محبت جیسے جذبوں کے بارے میں اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اس کی نگاہ میں تو یہ بات بھی نہیں آ سکتی تھی کہ اس کا باپ سلطان سلیمان اس کی والدہ خرم سلطان کا ایسا کیوں گرویدہ ہو گیا تھا کہ اب اس کی نظر میں کوئی دوسری عورت چلتی ہی نہیں تھی۔

لیکن اب وہ سوچتے پر مجبور ہوئی تھی کہ ایسا کوئی جذبہ اس کے لیے کسی کے دل میں پیدا ہو چکا تھا اور اسی نے وہ سستہ خط لکھ مارا تھا۔ اس خط کی عمارت میں ایک بات عجیب تھی۔ نہ تو اس میں کسی کو مخاطب کیا گیا تھا اور نہ یہ بات ظاہر ہونے دینی گئی تھی کہ خط کھینے والا کون تھا۔ اس معاملے میں مہر ماہ کا خیال کارل کی طرف بالکل نہیں گیا تھا۔ اس طرف دھیان جانے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ کارل پر یہ بات ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے جس کی تصویر بنائی تھی، اس کا باپ سلطنت ترکیہ کا فرماں رواں تھا اور وہ اس سلطنت کی شہزادی تھی۔

خط کسی گھڑسوار نے محل کے صدر دروازے پر ایک محافظ کے حوالے کرتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ شہزادی مہر ماہ سلطان کے لیے ہے۔ محافظ نے وہ خط آغا طوبور کے حوالے کر دیا تھا تا کہ وہ اس کے ذریعے سے شہزادی تک پہنچ جائے۔ صدر دروازے کے محافظ یا آغا طوبور یہ ہمت نہ کر ہی نہیں سکتے تھے کہ خط کھول کر دیکھ لیتے۔ خط آغا طوبور کے ذریعے شہزادی تک پہنچ جاتا لیکن شہزادہ

بازید نے محافظ کو وہ خط آغا طوبور کے حوالے کرتے ہوئے دیکھا تو اسے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ اس نے وہ خط آغا طوبور سے لے لیا۔ آغا سے اس نے کہا تھا کہ وہ خود یہ خط اپنی بہن کو پہنچا دے گا۔

خط مہر ماہ سلطان تک پہنچا بھی لیکن اس سے پہلے وہ شہزادہ بازید نے پڑھ لیا تھا اور اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔

سلطان سلیمان نے دوسرے دن دوپہر کو اپنے کمرائے خاص میں خرم سلطان کو ایک خط دیا۔

"کیا ہے سلیمان؟" خرم سلطان نے پوچھا۔

"خرم سلطان اگرچہ روی نژاد تھی لیکن قصر شاہی میں ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باعث وہ فارسی اور ترک زبان اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اس نے خط اس کے خول سے نکالے اور سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اس وقت بھی پریشان نظر آ رہے ہیں، بازید تو اس کا سبب نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی اس کے کمرے سے آ رہی ہوں۔ وہ اب قہقہے سے اس نے بتایا تھا کہ تھوڑی دیر قبل آپ بھی اسے دیکھنے گئے تھے۔"

"ہاں۔" سلطان سلیمان نے کہا۔ "یہ خط مجھے اسی خرم سلطان اس مختصر دورانیے میں خط کھول چکی تھی۔ تحریر کا بیلا جملہ پڑھتے ہی اس کی پیشانی پر مٹی کی شکن پڑ گئی۔ لکھا تھا۔ "میرے دل کی سکراں۔! میرا دل آپ کے جلوہ حشر سامان کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ چشم مضطر، ہمت وید ہے۔ دن و رات میں پریشان ہیں۔ وادرات قلب کی خونریزی، قہم کی نوک سے لوں بہر لکھا چاہتی ہے کہ غلام درود تا حد کنارتجیل جائے لیکن محبت مستحاضی ہے کہ یوں آپ کو نہ تر پاؤں۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ چشم حسرت، آشنائے دید ہو جائے۔"

خط کے آخر میں کسی کا نام نہیں تھا، جیسے لکھنے والا جانتا ہو کہ اسے اپنا نام لکھنے کی ضرورت نہیں، پڑھنے والا جان لے گا کہ وہ کون ہے۔

"بازید کے پاس؟" خرم سلطان حیرت سے بولی۔ "تو کسی لڑکی کو لکھا گیا ہے۔"

"مگر وہ لڑکی کتنی ہے کہ وہ خط لکھنے والے کو نہیں جانتی۔"

"لڑکی کون ہے؟"

"مہر ماہ۔"

"دیکھا؟" خرم سلطان حیرت زدہ رہ گئی۔

پھر اس سے پوچھنے کے وہ کوئی استفسار کرتی، سلطان سلیمان نے خود ہی وہ تفصیل دہرا دی جس کا علم اسے بازید سے ہوا تھا۔

خرم سلطان نے حیرت سے سب کچھ سنا۔ سلطان سلیمان کے خاموش ہونے پر وہ کچھ سوچتی ہوئی شکر لہجے میں بولی۔ "کیا آپ کو مہر ماہ کے بیان پر یقین نہیں؟ کیا آپ بھی وہی سمجھ رہے ہیں جو بازید نے سمجھا ہے؟"

"یقیناً یا عدم یقین، حقیقت کے بعد ہی ممکن ہے۔"

"آپ نے مہر ماہ سے تو ابھی بات نہیں کی ہوگی؟"

"درست اندازہ نہ تھا۔ بہتر ہوگا کہ اس معاملے میں تم ہی اس سے بات کرو۔"

"ابھی جا کے کرتی ہوں۔ میں یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ بازید پر ہونے والے حملے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بس یہ اندازہ تو ہم بھی لگا سکتے ہو کہ اس کی منصوبہ بندی، اس کو گئے خواجہ سرا کو زنداں سے چھڑانے سے پہلے کی گئی ہوگی۔ اس کا آئندہ نہ ہونا تعجب خیز ہے۔ جراح سفیان کے ہاتھ لگنے تک یہ معاہدہ بھی مل نہیں ہو سکتا اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگا تو شاید مردہ ہی ہاتھ لگے۔ جس نے بھی بازید کو قہم کرنا چاہا تھا، وہ سفیان کو بھی زندہ تو نہیں رہنے دے گا۔"

"آپ کو کسی پر شبہ ہے؟"

"سوچ سوچ کر میرا دماغ بھڑانے لگا ہے۔ محل میں تو کوئی ایسا نہیں جو بازید کی جان کا دشمن ہو سکے۔ محل سے باہر ہی کا کوئی شخص ہو سکتا ہے۔"

"بابر کا کوئی فرد کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ زنداں کے محافظ آسانی سے اس کے ہاتھوں میں ہو جائیں اور وہ جی خواجہ سرا کو زنداں سے نکال لے جائے؟"

"اس سوال پر بھی دماغ بھڑانے لگتا ہے اور اس سوال پر بھی کہ اس خواجہ سرا کو تیر کا لٹا نہ بنانے والا محل ہی تھا ہے، آخر وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"وہی مقتدر مہر ماہ بازید کی زندگی قہم کرنا چاہتی ہے۔"

"مگر کون۔۔۔ کون؟" سلطان سلیمان مضطرب ہوا۔

"آل عثمان کا قدیم قانون۔" خرم سلطان نے نظر ہٹا کر آہستہ سے کہا۔

سلطان سلیمان نے چونک کر خرم سلطان کی طرف دیکھا۔ آل عثمان میں یہی دستور رہا تھا کہ بادشاہ اپنے

بھائیوں کو قتل کروا دیا کرتا تھا تا کہ بغاوت کے خدشات ختم ہو جائیں۔

"نہیں خرم!" سلطان سلیمان نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "برادر کشی کی یہ پرانی بربری رسم اب نہیں رہی اور اگر تم مجھے ہو کہ اس رسم کا خیال اب بھی کسی کے دماغ میں آ سکتا ہے تو میں کبھوں کا کہ تمہارا اشارہ مصطفیٰ ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ میرا بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میں نے اسی کو اپنا ولی عہد نامزد کیا ہے۔ اگر تمہارا اشارہ اسی کی طرف ہے تو مجھے حیرت ہوگی۔ تم جانتی ہو کہ مصطفیٰ بہت خطرے میں عزائم کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بھائیوں سے بہت محبت کرتا ہے۔"

مصطفیٰ خرم سلطان، مصطفیٰ ہی کی طرف اشارہ کرنا چاہتی تھی لیکن سلطان کے لہجے کی سختی کے باعث اس نے بات بنائی۔ "میرا اشارہ بازید کے سب بھائیوں کی طرف ہے سلیمان!۔۔۔ کون، کب تک زندہ رہے گا، یہ فیصلہ صرف قدرت کا ہوتا ہے۔ خدا خواستہ اگر مصطفیٰ کو کچھ ہو گیا تو اس کے بعد آپ اپنا ولی عہد سلیم ہی کو بنائیں گے۔ مصطفیٰ کے بعد سلیم ہی آپ کا بڑا بیٹا ہے۔"

"یعنی بازید کے معاملے میں سلیم کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے؟" سلطان سلیمان نے حیرت سے کہا۔

"حقیقتاً تو میں کسی کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہنا چاہتی۔" خرم سلطان جذباتی انداز میں سلطان کے سینے سے لگ گئی۔ "یہ سب کچھ سوچتے ہوئے، آپ کی طرح میرا دماغ بھی بھڑانے لگا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔"

"آپتی پریشان نہ ہو تم!" سلطان سلیمان نے محبت سے اس کا شانہ تھپکا۔ "ابھی تم صرف میرے لیے جھوڑا کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ معلوم کرو کہ اس معاملے کی کیا حقیقت ہے۔ تم جا کر اس خط کے بارے میں مہر ماہ سے بات کرو۔ شاید بھائی کے سامنے اس کی زبان نہ کھل سکی ہو لیکن تم سے وہ حقیقت نہیں چھپائے گی۔"

خرم سلطان، سلطان سلیمان کے سینے سے الگ ہوئی تو آہ دیدہ تھی لیکن جیسے ہی اس کے دوا آؤ سٹیک سلطان سلیمان نے انہیں اپنے دونوں ہاتھوں کی دوا لگیوں پر لے لیا۔

"یہ بہت جلدی موتی ہیں خرم!" سلطان سلیمان نے کہا۔ "جذباتی نہ ہو۔ جا کے مہر ماہ سے بات کرو۔ تم جانتی ہو کہ میں محبت کا پجاری ہوں۔ وہ مہر ماہ کے شایان شان ہوا تو ان دونوں کی شادی کرنے میں مجھے ذرا بھی ہچکچاہٹ

نہیں ہوگی۔"

خرم سلطان موڈ باندھ چکی، پھر اگلے قدموں چلتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ سلطان سلیمان کے چہرے سے پھر فکر مندگی ظاہر ہونے لگی۔ وہ خرم سلطان کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا۔

☆ ☆ ☆

مہرماہ سلطان نے جو کچھ شہزادہ بایزید سے کہا تھا، وہی جواب اس نے خرم سلطان کو بھی دیا۔

"میں قسم کھاتی ہوں والدہ!" اس نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم، کھد کس نے لکھا اور میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتی ہوں کہ مجھے کسی سے محبت نہیں۔"

"تو پھر اس گستاخی کرنے والے کو سخت سزا دی جائے گی۔" خرم سلطان نے کہا۔ "تمہارے شاہ بابا سے بچاؤ نہیں سکے گا وہ اچلے ہی اس کا پتا لگا لیا جائے گا۔"

"میری کچھ نہیں آ رہا ہے کہ یہ حرکت کیوں کی گئی ہے؟ کون اس سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟"

"مجھے کچھ بہار پر شبہ ہے۔"

"ان پر؟" مہرماہ چونکی۔ "کیوں والدہ؟ وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"دکھاؤ کرتی ہے وہ! منافق مہرت ہے۔ تمہارے شاہ بابا اپنی اولادوں میں جنہیں زیادہ چاہتے ہیں جبکہ اس کی خواہش ہے کہ سب سے زیادہ اس کے بیٹے کو چاہا جائے۔ وہ جنہیں اپنے شاہ بابا کی نظروں سے گرانے کی کوشش کر سکتی ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو بہت غلط ہے۔ انہیں تو اپنی اس خوشی پر قانع کرنا چاہیے کہ ان کا بیٹا ترک سلطنت کا ولی مہد ہے۔"

"مجھے تو یہ شبہ بھی ہے کہ بایزید کو ختم کرنے کے لیے بھی اسی نے مصطفیٰ کو بہکا یا ہوگا۔ گل میں مصطفیٰ ایسی ہی اہم شخصیت ہے کہ زنداں کے محافظ اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کر سکتے۔ اسی لیے وہ انہیں گل کر کے اس جھٹی خواجہ سرا کو آزاد کر سکتا ہے۔ اسی سے بایزید پر حملہ کروا سکتا ہے اور وہی اس خواجہ سرا کی گروں میں تیرے جوتے کر سکتا ہے۔"

"تیرا انداز ہی میں اسے بلا کی مہارت ہے۔"

"آپ نے مجھے بہت حیران کروا دیا والدہ! مصطفیٰ بھائی تو ہم سب بھائی بہن سے محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں وہ دل کا اتنا برا نہیں ہے۔" خرم سلطان نے اپنے موقف میں قدرے نرمی لاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ماں

کے دباؤ یا بہکاوے میں تو آ سکتا ہے۔ گل بہار اس کے دل میں یہ اندیشے پیدا کر سکتی ہے کہ اس کے بھائی تخت حاصل کرنے کے لیے بغاوت کر سکتے ہیں۔ اس سلطنت میں یہ ہوتا ہی رہا ہے کہ سربراہ بننے والوں نے اپنے بھائیوں کو اسی غم کے تحت ہلاک کیا۔"

"شاہ بابا نے تو یہ دم ختم کر دی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں کسی سے کہتے سنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے کہ اب ان کے خاندان میں یہ بربریت جاری رہے۔"

"اس کے باوجود مصطفیٰ کے دماغ میں یہ خیال بٹھایا جاسکتا ہے۔"

"پھر تو سلیم بھائی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"اندیشہ تو ہے اس کا۔ اسے میں نے سمجھا دیا ہے کہ وہ کل تک خود کو اپنے کمرے تک محدود رکھے اور بایزید تو دشمن ہونے کے باعث ابھی دو ایک دن تو اپنے کمرے میں رہے گا۔"

"کل تک کیا فرق پڑ جائے گا والدہ؟"

"مصطفیٰ کو گل مینیشیا بھیجا جا رہا ہے۔ تمہارے شاہ بابا نے اسے وہاں کا ولی مقرر کیا ہے۔ دستور کے مطابق گل بہار کو بھی اس کے ساتھ جانا ہوگا۔"

مہرماہ مسکرائی۔ "پھر تو اب گل پر آپ ہی کی حکومت ہوگی۔"

"والدہ سلطان کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں۔"

مہرماہ فوراً بولی۔ "رات کو وہ نہیں آئیں بایزید بھائی کو کیجئے؟"

"کسی نے جنہیں بتایا نہیں؟ کل صبح سے ان کی طبیعت نامناسب ہے۔ طبیعت نے انہیں دو دن تک حمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ بایزید کی خبر ان تک بہر حال پہنچی گئی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ جنہیں ان کی حراست پر ہی کو جانا چاہیے تھا۔"

"اب آپ سے معلوم ہوا ہے تو جاؤں گی۔ مجھے یہ خیال بھی ابھی آیا ہے کہ خرم سلطان چھوٹی بھی بایزید بھائی کو دیکھنے نہیں آئیں۔"

مہرماہ اور اس کے بھائی، ابراہیم پاشا کی بیوی کو بھی خرم سلطان چھوٹی کہا کرتے تھے۔

خرم سلطان نے مہرماہ کو بتایا۔ "وہ کل دوپہر سے یہاں نہیں ہے۔ اپنی بی بی بہن سے ملنے گئی ہوگی۔"

"خاتم سلطان چھوٹی تو یہاں سے ایسی نہیں کہ پھر نہیں آئیں۔"

"خاتم سلطان؟" اور "خرم سلطان؟" سلیمان کے عطا

کردہ خطبات تھے جو اس نے اپنی بہنوں کو دیے تھے۔

"اپنے شوہر کے گل ہونے کی وجہ سے وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی تھی۔" خرم سلطان نے جواب دیا۔

مہرماہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میں اس وقت چھوٹی تھی لیکن وہ لرزہ خیز واقعہ مجھے یاد ہے۔ شاہ بابا نے نہ جانے کس دل سے ان کے گل کا حکم صادر کیا ہوگا۔"

"ایک مرتبہ تو انہوں نے فرہاد پاشا کو معاف بھی کیا تھا لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ اچھا جواب میں چلتی ہوں۔ تم اپنی دادی کی حراست پر ہی کے لیے چلی جانا۔"

☆ ☆ ☆

لیکن خرم سلطان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک مہرماہ کے تصور میں فرہاد پاشا اور خاتم سلطان کے چہرے سے متحرک رہے۔ وہ ان کے بارے میں سوچتی رہی۔

فرہاد پاشا ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کا وطن "ڈاہیشیا" کے کسی ساحلی علاقے کی بستی تھی۔ وہ سلاف نژاد سلطان سلیمان کے وزیر میں سے ایک تھا۔ اس نے شام کی بغاوت کا کام بنائی تھی اور باغیوں کے سربراہ کا سر کاٹ کر سلطان کو بھیج دیا تھا۔ بغیر اور دیکھ کر کبھی جنگوں میں وہ بڑی بے جگری سے لڑا تھا۔ اس کی انہی خدمات سے خوش ہو کر سلطان نے اپنی بہن خاتم سلطان سے اس کی شادی کر دی تھی اور اسے ایک ریاست کا ولی بنا کر دربار سے بھیج دیا گیا تھا۔

جنگوں میں اس کی بہادری کا سبب اس کی فطری وحشت تھی جو ریاست کا ولی بن کر بڑی شدت سے عود کر آئی۔ اسے خون بہا کر بڑی لذت حاصل ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ذاتی دشمنوں کو مختلف جگہوں پر انہوں سے قتل کروانا شروع کر دیا۔ والی ریاست ہونے کی وجہ سے وہ اس پر قادر تھا۔ اس کی بد قسمتی سے اس کے ان اقدامات کی خبر سلطان سلیمان تک پہنچی گئی۔ اس نے فرہاد پاشا کو فوراً پایہ تخت واپس بلوایا۔ اس کے خلاف کاغذی تردید بہت موجود تھی۔

سلطان سلیمان، عثمانی سلطنت کا تہایت منصف فرمان روا تھا۔ وہ اپنی سلطنت کے طول و عرض میں ہر قیمت پر قانون کا انصاف چاہتا تھا۔ خواہ اس کی زد پر اس کی کوئی قریب ترین بستی ہی کیوں نہ آجائے۔ وہ اسی وقت فرہاد پاشا کو سخت ترین سزا کا حق قرار دے دیتا لیکن حرم سرا کی طاقت اس کے آڑ سے آگئی۔ والدہ سلطان اور ابراہیم پاشا کی بی بی خرم سلطان فرہاد پاشا کی حمایت میں ڈٹ گئی تھیں لیکن سلطان سلیمان پر اس سے زیادہ اثر شاید اپنی بہن خاتم

سلطان کے آنسوؤں کا پڑا ہو۔ چلتی مرتبہ اور قابلاً آخری مرتبہ اس کے قدم ڈگمگائے۔ اس نے فرہاد پاشا کو سمجھ کر کے پایہ تخت سے رخصت کر دیا۔ اس مرتبہ اسے دریائے ڈینیوب کے کنارے ایک سرحدی شہر کا حاکم بنایا گیا تھا۔

فرہاد پاشا اس کے بعد بھی اپنی فطری وحشت کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی طاقت کا غلط استعمال پھر شروع کر دیا۔ اس نے بس بے کوشش کی تھی کہ اس مرتبہ اس کی بیوی خاتم سلطان کو اس کے ان وحشیانہ اقدامات کا علم نہ ہونے پائے لیکن وہ شاید بھول گیا تھا کہ سلطان سلیمان سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ اسے ایک مرتبہ پھر پایہ تخت طلب کیا گیا اور اس مرتبہ سلطان نے بڑی جلدی کی۔ اس سے پہلے کہ حرم سرا کی طاقت حرکت میں آتی یا اسے خاتم سلطان کی اٹک بار آکھیں دیکھنا پڑتیں، اس کے غم سے جلاؤں نے کمان کی تانت سے فرہاد پاشا کا گھاگھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔

خاتم سلطان روٹی دھوئی، اپنے بچوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئی۔ والدہ سلطان اور خرم سلطان کے علاوہ خود سلطان سلیمان نے اسے کھانے کے لیے اپنے سینے سے لگا لیا تھا لیکن وہ نہیں مانی۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی نہیں آئی تھی اور اپنے جیم بچوں کے ساتھ ڈینیوب کے ساحل پر رہتے ہوئے اسی گل میں دوری تھی جو فرہاد پاشا نے بنوایا تھا۔ اس کے اقراہات کے لیے اس گلیمر کی آمدنی کافی تھی جو اسے بیچہ میں والدہ سلطان سے ملتی تھی۔ جو کچھ اسے سلطان سلیمان کی طرف سے ملتا تھا، وہ اس نے واپس کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن شہزادہ مصطفیٰ اور ملکہ گل بہار مینیشیا پہلے گئے۔

اس وقت تک نہ تو یہ بات معلوم ہو سکی تھی کہ مہرماہ کو خط بھیجے والا کون تھا اور نہ بایزید کے قتل کی ناکام سازش بے نقاب ہوئی تھی۔ گل اور گل سرا کی زندگی کے معمولات میں بھی یہ ظاہر کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسی شام خرم سلطان نے خفیہ طور پر ختم پاشا سے ملاقات کا بندوبست کیا۔

خرم پاشا سلطنت کی کوئی بہت اہم شخصیت تو نہیں تھا لیکن اسے میرا ہم بھی نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ دربار تک اس کی رسائی بھی تھی۔ اس کے بعض اہم کاموں سے خوش ہو کر سلطان سلیمان نے اسے پاشا کے خطاب سے نوازا تھا۔

امور سلطنت سے متعلق کچھ کام بھی اسے سونپ دیے گئے تھے لیکن وہ کچھ زیادہ اہم نہیں تھے۔ ”پاشا“ کا خطاب ملنے کے سلسلے میں وہ خرم سلطان کا احسان مند بھی تھا اور بھی سے اس کا بندہ ہے دام بھی بن گیا تھا۔

”میں ابھی مطمئن نہیں ہو سکتی رستم پاشا! خرم سلطان نے خفیہ ملاقات میں اس سے کہا۔“ میری حریف اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں سے جا چکی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ کل میں اس کے دو ایک خاص افراد ضرور ہوں گے اور ابراہیم پاشا تو ہے ہی اس کا طرف دار۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو۔ کل کی ایک کیزر خسارہ پر تو مجھے زیادہ ہی شبہ ہے۔ وہ کل بہار کی بہت مختصر رہی ہے اور اسی لیے مجھے اس پر شبہ ہے۔ کل بہار اپنی چوٹی کیزر کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئی۔ کل بہار جی نہیں بلکہ مصطفیٰ بھی اس پر غریب تھے۔ ہمیں ان حالات پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔“

”میں ایک کام تو آپ سے پوچھنے بغیر کر چکا ہوں ملکہ! رستم پاشا نے کہا۔“ میں نے شہزادہ مصطفیٰ کے حملے میں ایک ایسا آدمی بھی شامل کر دیا ہے جس پر میں مل اعتماد کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے وہاں کی ایک ایک بات سے باخبر کرتا رہے گا۔“

”غوب۔۔۔ بہت خوب رستم پاشا! خرم سلطان نے خوش ہو کر کہا۔“ میں بھی چاہتی تھی کہ کل بہار اور مصطفیٰ کی وہاں کی سرگرمیاں بھی میرے علم میں آتی رہیں۔“

”میں ابراہیم پاشا پر بھی کڑی نظر رکھوں گا ملکہ لیکن آپ نے جس کیزر کا ذکر کیا ہے، اس پر تو وہی نظر رکھ سکتا ہے جس کی عمل میں آزادانہ آمد و رفت ہو۔ میں تو کل میں اسی وقت جاتا ہوں جب سلطان کی وجہ سے مجھے طلب فرماتے ہیں۔“

”میں ایک ایسی تدبیر پر عمل کرنے والی ہوں کہ تم ہر وقت کل میں رہو سکوار مجھے تم سے خفیہ ملاقاتیں نہ کرنا پڑیں۔“

”میں کل میں کیسے رہ سکتا ہوں ملکہ؟“

”جیسے کرتی رہنے لگے۔“

”وہ فراہمی کسی سے ابراہیم پاشا نے کل کا مایہ مقرر کیا ہے؟“

”ہاں۔“

”لیکن میں اس کی طرح کیسے رہ سکتا ہوں ملکہ؟“

”مگر تم کو اس منصب سے بنا دیا جائے گا۔ اس کی جگہ میں جس مقرر کروانا چاہتی ہوں۔“

”رستم پاشا خوش ہوا۔“ یہ تو بہت اچھا ہو گا ملکہ۔ آپ سلطان عالی سے یہ تبدیلی کروا بھی سکتی ہیں۔“

”میں تمہیں اس سے بھی بڑے منصب پر دیکھتا چاہتی ہوں رستم پاشا!“

خرم سلطان نے کہا۔ ”میں کسی طرح ابراہیم پاشا کا کنارہ سے گل جائے۔“

رستم پاشا ہلکا۔

”اب تم جانتے ہو۔“ خرم سلطان پھر بولی۔

رستم پاشا رخصتی کا سہم ہونے کے بعد کچھ اور کینے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں کچھ سہانے خواب ضرور اٹھنے لگے۔

ذرا دیر بعد خرم سلطان اپنے کمرے میں تھی۔ اس پر اب گہری تنقید کی طاری تھی۔ مگر رے ہوئے وقت نے اسے بہت بدل دیا تھا۔ جب وہ پہلے پہل کل میں لائی گئی تھی تو اسے شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تنقید کیسے کہتے ہیں لیکن اب اس میں جو بلاؤں آیا تھا، اس کا سبب صرف وقت ہی نہیں بلکہ حالات بھی تھے۔

سلطان سلیمان کی محور نظر بننے کے بعد اس نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ کل کل بہار ہر وقت اس کی شدید ترین مخالفت پر آمادہ رہتی تھی لیکن اس کی وہ کوششیں بار آور نہیں ہو سکی تھیں کہ سلطان سلیمان کو اس سے بدجن کر سکیں۔

پھر اس کا دوسرا احساس یہ تھا کہ وزیر سلطنت ابراہیم پاشا کی ہمدردیاں بھی کل بہار کو حاصل نہیں جس کا سبب خرم سلطان کی دلالت میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کل بہار سلطنت کے ولی محمد یعنی شہزادہ مصطفیٰ کی ماں تھی۔ وہ مصطفیٰ کے فرماں روا کی ماں سے اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار رکھنا چاہتا تھا۔

سلطان کو اس پر اعتماد بھی بہت ہے، خرم نے بہت پہلے اس وقت سوچا تھا جب ضعیف وزیر پر عظیم جبری پاشا کے بعد اس کی جگہ ابراہیم پاشا کو دی گئی تھی جبکہ دوسرے کی اہم منصب دار اور وزیر اچھے رہے تھے کہ جبری پاشا کے بعد یہ منصب انہی کو ملے گا۔ انہی لوگوں میں ایک شمس سکندر چلیپی بھی تھا جس کی ابراہیم پاشا سے نفرت خرم سلطان نے بھی تازہ کی تھی اور سوچا تھا کہ مناسب وقت آنے پر سوچے گی کہ سکندر چلیپی کو ابراہیم پاشا کے خلاف کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سکندر چلیپی خزانہ شہزادہ کی منتظر تھا۔

شہزادہ خاندان میں اپنی حیثیت مشکوک کرنے کے لیے خرم سلطان نے سلطان سلیمان کو اس پر بھی آمادہ کر لیا تھا کہ دواسے اپنی نمای سے آزاد کرے اسے اپنے نکاح میں لے لے اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

اس کے بعد تو کل بہار کل خرم سلطان کے سامنے آگئی تھی۔

”تم اس طرح بھی میری اہمیت ختم نہیں کر سکتیں خرم! کل بہار نے اس سے کہا تھا۔“ میں بہر حال سلطنت کے ولی مہدی ماں ہوں۔“

خرم سلطان جواب میں مسکرائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”میرنگی حالات کا مطلب جاتی ہو تم۔۔۔؟ کوئی نہیں جانتا کل بہار کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں کیا سمیٹ کر لائے گا۔ وہی میری آج کی اہمیت۔۔۔ تو اس بارے میں تم خوب جانتی ہوگی۔ ترک سلطنت میں چھ بچوں سے ایسا نہیں ہوا کہ کسی فرماں روا نے وقت سے کسی کیزر سے شادی کی ہو اور تم بھی آج تک کیزر ہی ہو۔ سلطان نے تمہیں آزاد نہیں کیا ہے۔“

”ہاں۔“ کل بہار کے لہجے میں تھی تھی۔ ”اس کے باوجود۔۔۔ میری خواہش ہے، تم اس وقت تک زندہ رہو جب میں والدہ سلطان بنوں گی۔“

”مگر تم نے ابھی سے یہ خواب دیکھنا شروع کر دیا ہے تو پھر تم سلطان کو کل کروانے کی سازش بھی کر سکتی ہو لیکن یہ دماغ میں اچھی طرح بٹھا لو کہ میں انہیں جی جان سے چاہتی ہوں۔ میری زندگی میں ان پر کوئی آج نہیں آسکتی۔“

خرم کا یہ جواب قطعی غلط نہیں تھا۔ وہ سلطان سے اتنی ہی شدید عجب کر رہی تھی کہ اپنے علاوہ کسی کو سلطان کی غلطی میں دیکھنا اس کے لیے ذرا بھی قابل برداشت نہیں رہا تھا۔ کل بہار کو تو وہ اپنے حسن کی بدولت سلطان کی غلطی سے دور کرنے میں کامیاب ہوئی چکی تھی لیکن اگر بھی سلطان کسی خوب صورت کیزر کو نظر بھر کر دیکھ لیتا تھا تو خرم بڑی ہوشیاری سے اس کیزر کو اپنی کیزروں میں شامل کر لیتی تھی تاکہ سلطان اس کی موجودگی ہی میں اس کیزر سے مل سکے۔

سلطان بھی اس کے عشق میں ایسا گرفتار ہوا تھا کہ خرم سرا میں ہونے والی اس رقابت سے بے خبر ہی رہا۔ اسے جب امور سلطنت سے فرصت ملتی تھی تو وہ اپنا بیٹا شہزادہ خرم سلطان ہی کے ساتھ گزارتا تھا اور اس سے امور سلطنت کے بارے میں بھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا جیسے وہ اس کی مشیر خاص بھی ہو۔

اسی لیے کیزروں میں یہ کانٹا پھوسی ہوتی رہتی تھی کہ خرم نے سلطان پر جادو کر دیا ہے۔

اسکی ہی ملاقاتوں میں خرم اشاروں کنایوں میں ایسی باتیں کیا کرتی تھی کہ کل بہار اور شہزادہ مصطفیٰ کو سلطان کی

نظروں سے گرا سکے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اپنے حصول مقصد میں اسے آسانی صرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ پہلے ابراہیم پاشا کو اپنے راستے سے ہٹائے چنانچہ اس سلسلے میں بھی اس کا دماغ کام کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ یہ اس کے لیے ایک ممکن مہم ثابت ہوگی۔ سلطان کو ابراہیم پاشا پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ اسی اعتماد کے باعث اس نے ابراہیم پاشا کو وزارت عظمیٰ کا منصب سونپنے کے کچھ ہی عرصے بعد ترک سیاہ کا سالار اعلیٰ بھی مقرر کر دیا تھا۔

☆☆☆

شہزادی مہرماہ سلطان کو اعزازہ ہو چکا تھا کہ اس کی ماں کے دماغ میں کیا کچھ لپک رہی تھی لیکن وہ خود کو ان باتوں میں ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا بیشتر وقت اپنے شوق پورے کرنے میں صرف ہوتا تھا جس میں شاعری کو اولیت حاصل تھی۔

وہ ہنسنے پر لیتی مہری خاتون کا کلام پڑھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بلند آواز سنائی دی۔

”سلطان سلیمان خان شریف لارہ ہیں۔“

مہرماہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اسے فوراً خیال آیا تھا کہ کوئی خاص بات کہہ رہی تھی۔ سلطان سلیمان اس سے ملنا چاہتا تھا تو اسے ہی اپنے کمرے میں بلایا کرتا تھا۔

”فرود! اس نے اپنی کیزر خاص کو پکارا۔ وہ اپنے باپ کی ہدایات کے لیے اس سے پوچھنے کا شریعت منگوائی جو سلطان سلیمان کو بہت پسند تھا۔

براہر کا کمرہ فروداں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں سے اس کو کوئی جواب ملا، وہ خود آئی۔

مہرماہ اسے دوبارہ پکاری تو ہنسنے سے انکاری لیکن اس سے پہلے ہی سلطان سلیمان دروازہ کھول کر اندر آیا۔

مہرماہ مود باندا انداز میں تھکی۔ ”خوش آمدید شاہ بابا!“

”سلامت رہو۔“ سلطان سلیمان نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کے قریب آیا۔ مہرماہ کو باپ کے اس اعزاز میں الجھن ہوئی۔ مہرماہ سلطان سلیمان دونوں ہاتھ پیچھا کر اسے اپنے سینے سے لگا اور اس کی پیشانی چوم کر کہتا تھا لیکن اس وقت صورت حال برعکس تھی۔

”انشاء اللہ، خبریت ہی ہو گی شاہ بابا!“ وہ بولی۔

”یہ تم نے کیوں کہا تو رچم؟ کیا خدشہ ابجرا ہے تمہارے ذہن میں؟“

”آپ اس وقت کچھ بدلے ہوئے سے نظر آ رہے ہیں۔“

”کچھ سبب ہے اس کا۔ میں ایک شخص کو لایا

ممکن نہیں تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے بعد ہی میں نے کارل کو گرفتار کر لیا۔ مجھے شہر ہوا تھا کہ خط لکھنے والا وہی ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ پوچھ گچھ کی ضرورت بھی نہیں پڑی، اس نے خود ہی اعتراف کر لیا کہ وہ خیر اسی کی ہے لیکن وہ اس بات سے انکار کرتا رہا کہ وہ خط اسی نے ہماری بیٹی کو بھیجا تھا۔ سلطان سلیمان نے کارل کا موقف بھی بتایا۔ وہ سب واقعات بھی دہرا دیے جو مہرماہ کے کمرے میں پیش آچکے تھے۔

خرم سلطان اس کے خاموش ہوتے ہی یوں۔ "تو آپ نے اسے آزاد کر دیا؟" "ہاں، تم اپنی فکر مند کیوں نظر آنے لگیں؟" "آپ کو کارل کے بیان پر یقین آ گیا ہے؟" "نہیں۔ اس کا یقین تو نہیں ہے لیکن یہ یقین ضرور ہے کہ مہرماہ کے دل میں اس کے لیے کسی قسم کے جذبات نہیں ہیں۔ کارل کے دل میں ہیں تو ہوا کریں۔ ہماری بیٹی اپنی خوب صورت ہے کہ اس پر کوئی بھی غریب نہ ہو سکتا ہے یا کم از کم یہ خواہش کر سکتا ہے کہ وہ ایک شہزادی کا شوہر بنے لیکن میں نے کارل کے معاملے میں مہرماہ سے سوچا تھا کہ اس سے ہماری بیٹی جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہونا چاہیے۔" "وہ آئندہ کسی پریشانی کا سبب بناتا تو؟" "تو وہ اپنے ہی حق میں کانٹے بونے گا۔ اگر اس نے دوبارہ کوئی حرکت کی تو میں مہرماہ سے کہوں گا کہ وہی کارل کے نکل کے حکم صادر کرے اور مجھے یقین ہے کہ مہرماہ کو یہ حکم صادر کرنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوگا۔"

ان دونوں میں کچھ دیر تک اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں، پھر خرم ہی نے بتدریج باتوں کا رخ موڑا اور گرتی کے بارے میں سوال کر بیٹھی جسے گل کا حاجب مقرر کیا گیا تھا۔

جواب میں سلطان سلیمان نے کہا۔ "میں یہ حکم صادر کر چکا ہوں کہ گرتی کو اس منصب سے ہٹا کر اس کی جگہ ختم پاشا کو دے دی جائے۔ اب تک میرے اس حکم کی تعمیل کی جا چکی ہوگی۔"

"غیب! خرم مسکرائی۔ "تمہارا مشورہ صاحب تھا خرم! سلطان سلیمان نے کہا۔ "ہماری سلطنت میں تمام مذاہب کے لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم نہیں رکھا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ گرتی ہمارا وقار دہی رہتا لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسے اہم منصب پر فائز نہ رکھا جائے۔"

"بالکل اسی طرح سوچا آپ نے جس طرح میں نے سوچا تھا۔" "تم غلط کہہ سوجتی ہو۔" سلطان نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

خرم سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ باتیں کرتے ہوئے میں ایک اور بات بھی سوچتی رہی ہوں۔ غالباً وہ بھی غلط نہیں ہوگی۔" "کیا سوچ رہی ہیں؟" "ہماری بیٹی اپنی خوب صورت ہے کہ کارل کے بعد کوئی اور قصہ بھی بھڑا ہو سکتا ہے۔" "نکلے ہوئے سروں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔" "اس سے بہتر کیا ہے نہ ہوگا کہ۔" خرم سلطان نے ایک تجویز پیش کی۔

سلطان سلیمان مسکرایا۔ "اس حد تک سوچ لایا تم نے؟" "نہیں کارل کے معاملے کو غیر اہم نہیں سمجھ رہی ہوں۔" "لیکن مہرماہ کی عمر؟" "اُمّی تو نہیں۔ اور پھر ذہنی اعتبار سے وہ اپنی عمر سے زیادہ بالغ ہے۔" "اس میں کوئی شک نہیں۔" سلطان سلیمان نے سر ہلایا۔

"اس بارے میں والدہ ماجدہ سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔" "ہاں، وہ تو بے حد ضروری ہے۔" "اور ہاں۔ ایک اہم بات جو چننا ہے آپ سے، وہ بھولی جاری تھی۔ بائزید پر حملے کے سلسلے میں آغا کیان کی تحقیق کچھ آگے بڑھی یا نہیں؟"

"اس معاملے میں وہ بہت سے ہنس نظر آیا ہے اب تک۔" "اب اس معاملے کی تحقیق بھی ختم پاشا کو سونپ دیجیے۔" "ہاں، آؤ تو وہ بہت ذہین ہے۔" خرم سلطان نے بڑی محبت سے خود کو سلطان سلیمان کے سینے پر بٹھیر دیا۔

☆☆☆

اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اس خط کے معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔" وہ بولا۔ "والدہ مجھے بتا چکی ہیں۔" "لیکن آپ نے وہ خط شاہ بابا تک پہنچا دیا تھا۔" مہرماہ نے غلطی کا انکار کیا۔ "حالا نکہ اگر اس معاملے میں حقیقت بھی ہوتی تو آپ کو میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" "جانتا ہوں۔" بائزید نے اس کی پیشانی پر دم کر کہا۔

"سلیم بھائی سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں مجھ سے۔" "والدہ بھی آپ کو ان سے زیادہ چاہتے لگی ہیں۔" بائزید نے غلطی سانس لی۔ "لیکن سلیم بھائی اپنا دتیرہ جس بدل رہے ہیں۔" یہ ایسا موضوع تھا جس پر دونوں بھائی زیادہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ شہزادہ سلیم نے گل کی کیزوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا شروع کر دی تھی۔ خرم سلطان کی تحبیر کے باوجود اس کے طور طریق میں فرق نہیں آ رہا تھا۔

مہرماہ یوں۔ "اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ زبردے نے خیر سے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کس نے کی تھی۔" بائزید کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات ابھرے تھے۔ اگر اس وقت اس کے دل میں کوئی بات تھی تو وہ اس کی زبان پر نہیں آئی۔

"آپ بہت زیادہ محتاط رہنا۔" مہرماہ پھر یوں۔ "بائزید مسکرایا۔ "آؤ اب باہر نکلیں۔" "میں آپ کو بلانے ہی تو آئی تھی۔ یہ جشن آپ ہی کی وجہ سے برپا کیا گیا ہے۔" وہ دونوں باہر نکلے۔ سائزوں کے شوخ سروں سے سارا محل گونج رہا تھا۔ شہزادہ بائزید کے قدم والدہ سلطان کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"پچھلے انجی کو سلام کرنے جاؤں گا۔" بائزید نے کہا۔ "یہ ضروری ہے۔" مہرماہ نے کہا۔

یہ کام بھیجا تھا مگر وہ نہیں آئی۔ "میرا تو بہت دل چاہ رہا ہے ان سے ملنے کو۔" مہرماہ یوں۔ "دوسرا ہو گئے جب ان سے ملنے کی تھی۔" "اس سے پہلے ہی ایک باہر گئی تھی۔" "ہی۔" مہرماہ نے کہا۔ "بہت محبت کرتی ہیں وہ مجھ سے۔" "میں نہیں کرتی تم سے محبت؟" خرم سلطان مسکرائی۔

"یہ تو میں نے کس کہا خرم سلطان پھولی! مہرماہ جلدی سے یوں۔ "بائزید میرے سے جس پڑا۔ والدہ سلطان اور شہزادی خرم سلطان بھی مسکرائیں۔ مہرماہ نے والدہ سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دن خانم سلطان پھولی کے پاس رہ آؤں؟" "ابھی نہیں۔" والدہ سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج ہی تمہاری والدہ مجھ سے تمہارے بارے میں ایک بات چھیڑ چکی ہیں۔ مجھے غور کرنا ہے اس پر۔ بعد میں بات کریں گے تمہاری اس خواہش کے بارے میں۔"

"میرے بارے میں کیا بات چھیڑی ہے انہوں نے؟" مہرماہ تقدیر سے حیرت سے یوں۔ "خرم سے ہی پوچھ لیتا۔" شہزادی خرم سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "زور سا پہلے آجائیں تو وہ تمہیں سیکھائیں۔ ابھی اٹھ کر گئی ہیں کہیں۔" "شاہ بابا کی طرف گئی ہوں گی؟" "نہیں۔" خرم سلطان نے کہا۔ "برادر معظم تو حضرت ایوب انصاری کی درگاہ پر گئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر آپ ہی بتا دیں؟ کیا بات چھیڑی ہے انہوں نے؟" والدہ سلطان بولیں۔ "ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے تو رجحان!" اسی وقت شہزادہ سلیم کمرے میں آیا۔ وہ والدہ سلطان اور شہزادی خرم سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے مڑوہ ہوا پھر سب کے قریب آ گیا۔ مہرماہ کھڑی ہو گئی۔ "میں اجازت چاہوں گی۔" وہ والدہ سلطان کی طرف دیکھتی ہوئی یوں۔

"اپنی والدہ سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہو۔" والدہ سلطان مسکرائی۔ مہرماہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

کے معاملے میں ایسی کیا بات چھری تھی کہ اسے راز بھی رکھا جا رہا تھا لیکن وہ خرم سلطان کو تلاش کرنے میں ناکام رہی۔ خرم سلطان اس وقت اس راہداری میں تھے جہاں سے صرف قید خانوں کی طرف جانا ہوتا تھا۔ وہ گل میں رہنے والوں کے لیے عام گزرگاہ نہیں تھی۔

”ملکہ! رستم پاشا اسے بتا رہا تھا۔“ کل شام ابراہیم پاشا نے فرانس کے سفیروں سے دوسری ملاقات کی تھی۔ ایک معاہدے کے تحت فرانس کو ترک سلطنت میں تجارت کی اجازت دے دی گئی ہے اور سفیروں نے ابراہیم پاشا کو بے انتہا تحائف پیش کیے ہیں۔ اتنے زیادہ تحائف تو صرف رعیت ہی کے طور پر دیے جاسکتے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ ابراہیم پاشا کا لالچ و جبر نے دھیرے بڑھتا ہی جا رہا ہے اور یہ بات ہمارے ہی حق میں جاتی ہے۔“

رستم پاشا نے فورے خرم سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی سوال کرنے کی ہمت تو نہیں کر سکا لیکن اس وقت خرم سلطان کی یہ بات ضرور اس کے دماغ میں گونگی ہوئی کہ۔ میں جہیں اس سے بھی بڑے منصب پر دیکھتا جا رہی ہوں رستم پاشا! بس کسی طرح ابراہیم پاشا کا کانٹا راہ سے نکل جائے۔

”بازید کے معاملے میں کچھ ہوا؟“ خرم سلطان بولی۔ اس کے علم میں تھا کہ اس کی خواہش کے مطابق سلطان سلیمان نے اس معاملے کی تحقیق کا معاملہ رستم پاشا کے سپرد کر دیا تھا۔

”فی الحال، میرا مطلب ہے جب تک شے کی تصدیق نہ ہو جائے وہ بات زبان پر لانا مناسب نہیں ہوگا ملکہ؟“

”خیر۔ کیا شبہ ہوا ہے تمہیں؟“

”مجھے یقین ہے کہ وہ خیال آغا کیاہان کے دماغ میں بھی آیا ہوگا لیکن وہ بھی اس کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکا ہوگا۔“

”تم یہ جرأت کرو رستم پاشا! خرم سلطان نے سخت لہجے میں کہا۔

”ابھی کچھ مہلت دیجیے ملکہ!“

”نہیں۔“ خرم سلطان کے لہجے کی سختی برقرار رہی۔

”اپنے شے کا اظہار نہیں ابھی کرنا ہوگا۔“

رستم پاشا حذب بظ نظر آ رہا تھا لیکن آخر کار اس نے زبان کھولی۔

”ملکہ! شہزادہ بازید کے معاملوں نے بتایا ہے کہ جس وقت چھٹی کی گردن میں تیرنگہ اس وقت چھٹی کا رخ

کس طرف تھا اور اس کی گردن میں وہ تیرس طرف سے لگا تھا اور تیرس ٹوکس کس طرف سے گردن کے باہر نکلی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تیرس جگہ سے چلا گیا تھا۔“

”کس جگہ سے چلا گیا تھا؟“

”ایک دوسرے سے جدا پری منزل پر ہی ہے۔“

”اوپری منزل کا کون سا درجہ؟“ خرم سلطان نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ رستم پاشا کی آواز اس کے صلیق میں اٹکنے لگی۔

”بتاؤ رستم پاشا! خرم سلطان نے تیز لہجے میں کہا۔

”ملکہ! رستم پاشا مردہ کی آواز میں بولا۔

اس راہداری میں ہے جہاں شہزادہ سلیم کی خواب گاہ ہے۔“

فوری طور پر خرم سلطان تنگ سی ہوئی۔ اس کے جسم میں سنہالت بھی پھیل گئی تھی۔

”تو۔۔۔ تو۔۔۔“ خرم سلطان رک رک کر بولی۔

”جہیں یہ شبہ ہے کہ وہ تیر شہزادہ سلیم نے چلا ہوا؟“

”کوئی اور بھی وہ درجہ استعمال کر سکتا ہے ملکہ!“

رستم پاشا نے جلدی سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص شہزادہ سلیم کی خواب گاہ کے دروازوں کی نظر میں نہ آئے۔“

”شاید شہزادہ سلیم اس وقت اپنی خواب گاہ میں نہ ہوں اور یہی وجہ سے دربان نہیں ادھر ادھر ہوئے ہوں۔“

”لیکن تم نے یہ سب کچھ اتنی چٹکا بہت کے ساتھ بتایا ہے جیسے تمہیں شہزادہ سلیم ہی پر شبہ ہو۔“

رستم پاشا کچھ نہیں بولا۔

”معلوم کرو۔۔۔ معلوم کرو رستم پاشا! خرم سلطان نے پھلو پل کر کہا۔

”معلوم کرو کہ اس وقت شہزادہ سلیم اپنے کمرے میں تھا یا نہیں۔“

”جی۔۔۔ رستم پاشا کی آواز میں مردنی قائم رہی۔

خرم سلطان چونکی۔ زعداں کی طرف سے کسی کے قدموں کی آہٹ قریب آتی سنائی دی تھی۔

”بس جاؤ!“ خرم سلطان نے کہا اور تیزی سے قدم بڑھا کر قریب کی دوسری راہداری میں مڑ گئی۔ فی الحال وہ احتیاط کے طور پر رستم پاشا سے اس طرح نہیں ملنا چاہتی تھی کہ کوئی بھی انہیں دیکھے۔

☆☆☆

کئی دن گزر گئے۔ مہرماہ سلطان نے معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی کہ اس کے بارے میں کیا بات چھتری

تھی تھی۔ اس نے خرم سلطان سے پوچھنا چاہا لیکن خرم سلطان بھی نال کی تھی۔ مہرماہ کو اپنے اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ شہزادہ بازید کو اچانک ”دارالنفون حرب“ کیوں بھیج دیا گیا تھا جیسے وہاں اگلے سال جانا تھا۔

پاپے تخت سے دو دن کی مسافت پر وہ مقام تھا جسے ”دارالنفون حرب“ کا نام دیا گیا تھا۔ ترک سپاہ میں بھرتی کے جانے والے افراد کو نفون حرب کیسے کے لیے وہیں بھیجا جاتا تھا۔ وہاں تربیت دینے والے وہ ماہرین تھے جو نمایاں کارنامے انجام دینے کے بعد عمر زیادہ ہوجانے کے باعث جنگوں میں شریک نہیں کیے جاتے تھے۔ یہ ادارہ خود سلطان سلیمان نے قائم کیا تھا اور یہ بات بھی ملے کی تھی کہ شہزادگان کو بھی نفون حرب کیسے کے لیے وہیں بھیجا جایا کرے گا۔

عام سپاہ کے لیے وہاں چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر کیے گئے تھے اور ایک چھوٹا سا محل اس لیے تھا کہ جب کسی شہزادے کو وہاں بھیجا جائے تو وہ اس محل میں رہے۔

مہرماہ کو یہ بات بھی عجیب لگی تھی کہ شاہی محل کے حاحب کو اچانک تبدیل کر دیا گیا تھا۔ گرجی کی جگہ رستم پاشا کو دے دی گئی تھی۔ یہ مہرماہ کے علم میں پہلے ہی سے تھا کہ گرجی کو مامور کرنے والا ابراہیم پاشا تھا اور چونکہ خرم سلطان اور ابراہیم پاشا کے تعلقات کشیدہ تھے اس لیے مہرماہ کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی خرم سلطان کی وجہ سے ہوئی ہوگی لیکن خرم سلطان نے اس بارے میں کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

مہرماہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ محض کا شکار ہوتی چلی گئی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ محل کا ہر فرد اپنے معاملات کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور سب ایک دوسرے کے خلاف کوئی نہ کوئی سازش کرتے رہتے تھے۔ محل کی راہداریوں میں سرگوشیاں ہوتی رہتی تھیں۔

شہزادہ مصطفیٰ اور ملکہ گل بہار جب تک میٹیشا نہیں گئے تھے، ملکہ گل بہار اور ملکہ خرم سلطان میں مکمل عام بھی گزر رہی ہو جاتی تھیں۔

اس قسم کے بھی معاملات مہرماہ کو پسند نہیں تھے۔ شاید اسی لیے وہ یہ خواب آنکھ دیکھا کرتی تھی کہ وہ ایک خوب صورت پرندہ بن کر اس محل سے اڑی اور دور ہو جاتی تھی۔

دوسرے وہ خاصے خاصے دنوں کے لیے اپنی بڑی پھولی خانم سلطان کے پاس بھی رہ آتی تھی اور اب پھر اس کا دل چاہتا تھا کہ خانم سلطان کے پاس چلی جائے۔ مگر اسے رکتا اس لیے پڑا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی بات چھتری تھی

تھی جس کے بارے میں اسے ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا۔ وہی پراسراریت! مہرماہ نے کھیا کر کئی مرتبہ سوچا تھا۔

پھر جب وہ بات اس کے سامنے آئی تو وہ اور زیادہ کھیاائی۔ اس کے خیال کے مطابق یہ بات اس سے چھپانا ضروری نہیں تھا کہ سلطان سلیمان نے اس کی شادی رستم پاشا سے لے کر دی تھی لیکن جلد ہی اسے سن کر مل گئی کہ فیصلہ بہت آخر میں ہوا تھا۔ تاثر کا سبب اختلافات تھے۔ کوئی اس کی شادی رستم پاشا سے کرنا چاہتا تھا اور کوئی اس کا مخالف تھا۔

مہرماہ کے علم میں یہ نہیں آ سکا کہ مخالف تھان اور جو بزرگ کونہ کون۔ لیکن وہ قیاس کر سکتی تھی کہ رستم پاشا کا مخالف ابراہیم پاشا ہی ہو سکتا تھا کیونکہ رستم پاشا نے اس کے مامور کردہ حاحب، گرجی کی جگہ لے کر اسے رک پھینچا تھا۔ مہرماہ سے شادی کے بعد رستم پاشا کی اہمیت بھی بڑھ جاتی۔

اس طرح رستم پاشا اس کا بندہ بے دامن بن جاتا۔ اگرچہ خرم سلطان، سلطان سلیمان کے اعصاب پر چھا چکی تھی لیکن ابراہیم پاشا بھی سلطان سے بہت قربت رکھتا تھا۔

یہ سبائی گھرانے میں پیدا ہوئے والا ابراہیم اول کی جوانی ہی میں اسیر کر لیا گیا تھا۔ سلطان سلیمان کے باپ سلطان سلیم اول کے دور میں ہی اسے ”شہزادہ سلیمان“ کے خدم و حشم میں نمایاں جگہ اس لیے مل گئی تھی کہ وہ نہایت باصلاحیت اور ذہین تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد سلطان سلیمان نے اسے شاہی کمرے کا داروغہ مقرر کیا تھا۔ تین سال بعد ہی اسے وزیر اعظم کا منصب بھی مل گیا۔ سلطان سلیمان کی چھوٹی بہن شہزادی خور و سلطان سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ اس کے بعد جب اس نے امیر لشکر بن کر فتوحات حاصل کیں اور نمایاں کارنامے سر انجام دیے تو سلطان سلیمان اس کا بہت گرویدہ ہو گیا۔

مہرماہ کو خوب اندازہ تھا کہ اس کی والدہ اور ابراہیم پاشا ایک دوسرے کے نہایت طاقتور حریف تھے اس لیے رستم پاشا کے معاملے میں اپنی بات منوانے کے لیے خرم سلطان کو خاموشی و شوری ضرور ہوتی ہوگی۔ مہرماہ سے اس معاملے میں بہت رنج راسے لگی تھی۔ مہرماہ نے کسی بھی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ اگرچہ شاہی محل کے مذہبی باجوں نے اس پر بہت زیادہ اثرات نہیں چھوڑے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ان اثرات سے عمل طور پر بچی رہی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ جوڑے تو آسمانوں پر ہی بن

گلے میں ہو خراش آئے ورم یا آواز بیٹھ جائے

شربت توت سیاہ



سراپی آئے صحت ہاتھ دقت گئے کواپی بہت سی سہل سہل
گلے میں خراش، ورم آئے یا آواز بیٹھ جانے
کی شکایت عام ہوتی ہیں، جو در شربت توت سیاہ کی خوراک سے گھلے
ان شکایت کا توری مٹا کر گئی ہیں۔ اب سراپی آئے یا ہاتھ آپ
گئے گوا کیا کر۔ کیونکہ آپ کو ہے اور شربت توت سیاہ ملا۔

ہمدرد

بولو کھل کھلائے!



اگر اس کا خواب پورا ہو جاتا تو وہ گل میں خرم سلطان
کے لیے سرائے لیتا بھی وہ بھر کر سکتی تھی۔
☆ ☆ ☆
خرم سلطان کے پر پا کر دانے ہوئے جشن کی تیسری
رات مہرماہ سلطان کی شادی کی پہلی رات تھی۔
اس رات مہرماہ سلطان احمد سے بری طرح ٹوٹ
پھوٹ کر رہ گئی۔ اس نے ہمیشہ ایک نرم خور اور نفاست پسند
رہنمائی زندگی کا خواب دیکھا تھا جو عورت کو ایک نرم و نازک
پھول سمجھے لیکن رسم آغا اس معاملے میں نہایت وحشیانہ ثابت
ہوا تھا۔ لڑکیاں اپنی شادی کی پہلی رات کو اپنی زندگی کی سب
سے خوشگوار رات کی طرح یاد رکھنا چاہتی ہیں لیکن مہرماہ کے
لیے وہ ایک اذیت ناک رات تھی۔ مہرماہ نے محسوس کیا کہ
اس رات نے اس کے اور رسم پاشا کے درمیان ایک ایسی
ڈھنچک مچا دی جو کبھی بھی جو شادی بھی پانی نہ جا سکے۔ اسے
خسوس بھی ہوا کہ اس کی ماں نے صرف اپنے مفادات کی
خاطر اس کی زندگی ایک ایسے خارزار میں دھکیل دی تھی جہاں
وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک لہو لہان ہی رہتی۔ اس کے
خیال میں یہ تو نامکن ہی تھا کہ اس کی ماں اس کے اور رسم
پاشا کے ملا جوں کے تفاوت سے واقف نہ ہوتی۔
اب مہرماہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر وقت
رسم پاشا سے دور رہ کر گزر اسے لیکن مشکل صورت حال یہ
تھی کہ اسے شادی میں مل ہی نہیں رہا تھا اور گل کے حاجب کی حیثیت
سے رسم پاشا کا سارا وقت بھی گل ہی میں گزرتا۔
چند دن بعد اس نے خرم سلطان سے کہا۔ ”کیا
سلطنت میں یہ کی شہزادی کو بیخبر میں ایک گل بھی نہیں مل سکتا
تھا والدہ؟“
خرم سلطان چونکی۔ ”تم الگ رہنا چاہتی ہو؟“
مہرماہ نے نظریں جمکا لیں۔ ”شادی کے بعد کیا یہ
لڑکی کا حق نہیں ہوتا؟“
”بے شک ہوتا ہے مگر لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ
وہ شادی کے بعد بھی اپنے والدین کے ساتھ رہیں۔ رسم
پاشا کی تو مجبوری یہی ہے کہ وہ تنہا رہے۔“
مہرماہ بولی۔ ”خریب ہی ایک گل ہے جس کی تعمیر مکمل
نہیں ہوئی لیکن ہوتو سکتی ہے۔“
مہرماہ کا اشارہ اس گل کی طرف تھا جو سلطان سلیمان
کے والد سلطان سلیم خاں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے
میں بنوا کر شروع کیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی تعمیر
ادھوری رہ گئی تھی۔ سلطان سلیمان نے اسے مکمل کروانے کی

جانتے ہیں جن سے فرار ممکن نہیں۔ خرم سلطان نے بہت
زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع کروائیں۔
مہرماہ اس وقت پہلی ہی گلی جب ابراہیم پاشا اور
شہزادی خورد سلطان کی شادی ہوئی تھی۔ مہرماہ نے سنا تھا کہ
عوام الناس بھی اسے ایک یادگار شادی کہتے تھے اور اب
خرم سلطان کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی اس سے بھی
زیادہ شاندار ہو۔
مہرماہ کو ابراہیم پاشا اور شہزادی خورد سلطان کی
شادی یاد ہی نہیں تھی اس لیے وہ ان ہنگاموں اور اپنی شادی
کے ہنگاموں کا کوئی موازنہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔
جشن کا آغاز شادی سے تین دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔
جنگ و جدل کے کمالات دکھانے کے لیے شہزادوں نے کاتھ
کے قلعے بنائے تھے۔ ان پر حملے کے مناظر پیش کیے
جاریے تھے۔ نٹ برادری ان رسوں پر چلنے کا مظاہرہ پیش
کر رہی تھی جو نہایت بلندی پر پائے گئے تھے۔ موسیقی ہر
طرف گونج رہی تھی اور بڑی چڑی (نئی سپاہ) اپنے تھارے
بجھا رہی تھی۔
بڑی چڑی کی تشکیل کا آغاز چودھویں صدی میں
سلطنت میں یہ کے تیسرے فرماں روا سلطان مراد اول نے
کیا تھا۔ سلطنت اپنے مفتوحہ علاقوں کے نصرانیوں سے ان
کے بیچے، بطور خراج حاصل کرتی تھی۔ ان بچوں کو شرف بہ
اسلام کیا جاتا اور مخصوص مدرسوں میں تعلیم دلائی جاتی۔ بعد
میں انہیں فوجی حرب سکھا کر سپاہی بنایا جاتا۔ ان کا لباس
خالص ترک فوج سے مختلف ہوتا تھا۔ ٹوٹی بھی سفید مندرے
کی ہوتی تھی جس کے پیچھے کپڑے کا ایک ٹکڑا سارے نظر آتا
تھا۔ ان سپاہیوں کے سالار کو بڑی چڑی آغا کہا جاتا تھا۔
مہرماہ جانتی تھی کہ یہ سپاہ نہایت منظم ہونے کے ساتھ
ساتھ نہایت متحدہ فوج بھی۔ سلطان سلیمان کو بھی خیال رکھنا
پڑتا تھا کہ اس سپاہ میں کسی وجہ سے خفگی کی لہر نہ دوڑے۔
خفگی کی وہ لہر بھی بھی بغاوت تک پہنچ جاتی تھی۔ کبھی بھی
مہرماہ سوچا کرتی تھی کہ سلطان سلیمان کے بیٹوں کے بارے
میں اس سپاہ اور ان کے آغا کے خیالات کیا ہوں گے۔ یہ
امکان منقطع نہیں تھا کہ وہ لی عہدی کے سلسلے میں کسی وقت اس
سپاہ کا دل پلٹ جاتا اور وہ شہزادہ مصطفیٰ کے خلاف ہو جاتی۔
ان خیالات کے ساتھ مہرماہ کو اپنی والدہ اور ملکہ گل بہار کی
چینش بھی یاد آ جاتی جس کی وجہ سے خرم سلطان کے دربار
میں یہ خیال گھلبانے لگا تھا کہ وہ گل بہار کا یہ خواب چکنا چور
کر دے کہ وہ بھی ”والدہ سلطان“ بن جائے گی۔

طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

”مہر ماہ!“ خرم سلطان نے فور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم رستم پاشا سے شادی کر کے خوش نہیں ہو؟“ مہر ماہ کے لیے جواب دینا مشکل تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

خرم سلطان بولی۔ ”جہیں اندازہ نہیں ہے کہ مستقبل میں تم ایک بہت بڑے آدمی کی بیوی نکلاؤ گی۔ رستم پاشا بہت ذہین اور باصلاحیت ہے۔“

”والدہ!“ مہر ماہ نے کہا۔ ”میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ میں سلطنت عثمانیہ کی شہزادی ہوں۔“ ”لیکن.....“ خرم سلطان کچھ کہتے کہتے رکی پھر بولی۔ ”اچھا خیر! تمہاری خواہش ہے تو اس عمل کی تعمیر عمل کر کے وہ کہیں دے دیا جائے گا۔ زیادہ کام نہیں ہے۔ چند ماہ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“

”آپ سے ایک اجازت اور لینا ہے۔“ ”کوبیری جان!“

”میں بہت دن سے کہہ رہی ہوں، مجھے خانم سلطان چھوٹی بہت یاد آ رہی ہیں۔ میں کچھ دن کے لیے ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

”ابھی تمہاری شادی کو چند ہی دن ہوئے ہیں مہر ماہ! رستم پاشا کیا سوچے گا۔ اس کے علاوہ تمہیں والدہ سلطان سے بھی اجازت لینا ہوگی اور اپنے شاہ باپا سے بھی۔“

”مجھے یقین ہے کہ آپ سے اجازت ملنے کے بعد کوئی حرج ملے گی میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔“

”اچھا!“ خرم سلطان نے طویل سانس لی۔ ”تم اتنی خواہش مند ہو تو جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“ ”شکریہ والدہ!“ مہر ماہ خرم سلطان کے سینے سے لگ گئی۔

پھر اسی دن اس نے سلطان سلیمان اور والدہ سلطان سے بھی اجازت لے لی۔ اجازت دیتے وقت وہ دونوں ہی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں بھی یہی خیال آیا ہوگا کہ مہر ماہ اپنی شادی سے خوش نہیں تھی۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ رستم پاشا کو اس معاملے کی بابت علم نہ ہوتا۔ اس کے تاثرات سے قطعاً ظاہر نہیں ہوا کہ وہ رنجیدہ ہوا ہوگا۔ وہ قطعی طور پر غیر بحالی کی شخص تھا۔ اس کے لیے یہ بات تو اہم ہو سکتی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی شہزادی کا شوہر بنا تھا لیکن یہ اس کے لیے قطعی غیر اہم تھا کہ اس کی بیوی کوئی بہت خوب صورت لڑکی تھی۔

☆☆☆

سفر طویل تھا۔ اگر مہر ماہ سلطان آرام دہ نہ بھیجی۔ میں سڑک کرتی تو خاصا وقت لگ جاتا اس لیے اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر سفر کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات ایک عثمانی شہزادی کی شان کے خلاف تھی لیکن سلطان سلیمان نے اپنی لاڈلی بیٹی کی خواہش مسترد نہیں کی، بس اس کے سفر کے عملی انتظامات کا حکم بہر حال صادر کیا۔

مہر ماہ جب اس سفر پر روانہ ہوئی تو نئی چری کی ایک ”اورتا“ (چٹنی) اس کے ساتھ تھی جس کا سربراہ نئی چری آغا کا سنگ بان باشی (ماحت) تھا۔ اس سپاہ کے علاوہ کیزریں بھی تھیں جن میں مہر ماہ کی کیزری خاص فروزاں بھی تھی۔ مہر ماہ نے ان کیزروں کا انتخاب کیا تھا جنہیں گھڑسواری آتی تھی، اس لیے ان کیزروں کی تعداد چار سے زیادہ ہو نہیں سکتی تھی۔

فروزاں نے مصور کارل کے بارے میں سلطان سلیمان کو جو کچھ بتایا تھا، اس کی وجہ سے ابتدا میں وہ مہر ماہ سے خائف رہی تھی لیکن مہر ماہ نے اسے جھک دیا تھا۔

”میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔“ مہر ماہ نے اس سے کہا تھا۔ ”شاہ باپا کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ خود میرے لیے ممکن نہیں کہ ان کے سامنے غلط بیانی کروں۔“ اس طرح فروزاں کا خوف دور ہو سکا تھا۔

سفر کے دوران میں فروزاں کا گھوڑا، مہر ماہ کے گھوڑے کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ تین کیزروں کے گھوڑے اس کے پیچھے تھے، پھر نئی چری تھے لیکن سنگ بان باشی ایک دستے کے ساتھ مہر ماہ سے خاصا آگے تھا۔ مہر ماہ کی حفاظت کے پیش نظر ایک دستے کا آگے ہونا ضروری تھا۔ سنگ بان باشی کے ساتھ سیدہ پرچم بڑی مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ اس پرچم کے اوپر گھوڑے کی دم لگی ہوئی تھی۔

سفر دوپہر کے قریب شروع ہوا۔ اندھیرا پھیلنے سے قبل انہیں کسی جگہ قیام کرنا تھا۔

سنگ بان باشی نے قیام کے لیے ایک خوب صورت جگہ کا انتخاب کیا جہاں سرد اور چار کے درختوں کی بیہات تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اونچے نیچے سبز ٹیلے بھی تھے۔

خیمے گاڑ دیے گئے۔ نئی چریوں کے خیمے گول تھے جن میں سے بعض پر مخصوص امتیازی نشان لگائے ہوئے تھے۔ مہر ماہ کا خیمہ نہایت وسیع و عریض ہونے کے ساتھ

ساتھ نہایت آرام دہ بھی تھا۔ الاؤ روشن کر لیے گئے۔ آٹھ باشی (سپر مطبخ) نے کھانا تیار کروانا شروع کیا۔

تین کیزروں کا ایک خیمہ مہر ماہ کے خیمے کے قریب ہی لگایا گیا تھا لیکن فروزاں کو مہر ماہ نے اپنے خیمے میں رکھا تھا۔ رات گزری۔ صبح اٹھنے کے بعد سفر پھر شروع ہوا۔ دوپہر ہوئی تو قیام کے لیے پھر رکتا پڑا۔ اسی دن رات کو جہاں خیمے لگائے گئے، وہاں کچھ فاصلے پر ایک چشمہ بھی بہہ رہا تھا۔

”شہزادی!“ فروزاں نے مہر ماہ سے کہا۔ ”میں چشمے تک گھوم آؤں؟ مجھے چشمے بہت اچھے لگتے ہیں۔“ ”جاؤ لیکن جلدی آجانا۔“

فروزاں کے جانے کے بعد مہر ماہ لیٹ کر مہری خاتون کا کلام پڑھنے لگی۔ اسے مہری خاتون کے اشعار میں ایک جیب اور انہی ہی جیب محسوس ہوتی تھی لیکن محبت سے معمور مشقے اشعار پڑھتے ہوئے اس کی نگاہ میں یہ بھی نہیں آ سکا تھا کہ انسان میں اس قسم کے جذبات کب، کیوں اور کسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں اس نے اکثر سوچا تھا لیکن ابھی کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ کسی میں اس قسم کے جذبات کا مشاہدہ اس نے یقیناً کیا تھا لیکن وہ اس کے لیے واحد مثال تھی۔ اس کی ماں خرم سلطان کو سلطان سلیمان سے ایسی ہی محبت تھی، ایسا ہی عشق تھا جو مہری خاتون کے کلام میں نظر آتا تھا۔ دو سال پہلے سلطان سلیمان کی شہید بنیادی پر خرم سلطان کا رورور کرنا اور دو ماہ تک مائیک بکری سارا وقت گزرتا تھا۔ ایسی بری حالت تو والدہ سلطان کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ رنجیدگی کا تاثر ملکہ گل بہار کے چہرے پر بھی نظر آیا تھا لیکن وہ کچھ مصنوعی سا تھا اور اب دو سال بعد مہر ماہ سوچنے لگی تھی کہ خرم سلطان کا خیال غالباً غلط نہیں تھا۔ ملکہ گل بہار جلد از جلد والدہ سلطان بننا چاہتی تھی اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ سلطان سلیمان کا انتقال ہو جاتا اور شہزادہ مصطفیٰ تخت نشین ہوتا۔

مہر ماہ نے پہلے بالکل سوچا تھا کہ اس قسم کا جذبہ شاید زیادہ عرصے کی قربت کے باعث پیدا ہوتا ہو لیکن پھر اس نے خود ہی اپنا یہ خیال رد کر دیا تھا کیونکہ ملکہ گل بہار تو خرم سلطان سے بہت پہلے سلطان سلیمان کی قربت حاصل کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ مہری خاتون کے اشعار بھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ عشق کی بنیاد قربت نہیں ہوتی بلکہ یہ جذبہ اس طرح ہمیز ہوتا ہے کہ اس جذبے کا شکار ہونے والے کو بھی

تصویروں

اندازہ نہیں ہو سکتا کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ قدموں کی آہٹ بن کر مہر ماہ نے خیمے کے در کی طرف دیکھا۔ اندر آتی ہوئی فروزاں پر ایک ٹھنڈا لٹے کے بعد وہ پھر مہری خاتون کے اشعار کی طرف متوجہ ہو جاتی لیکن فروزاں کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات کی وجہ سے وہ مہری خاتون کے اشعار کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی۔

کچھ ایسا تاثر تھا فروزاں کے چہرے پر جو مہر ماہ کی نگاہ میں نہیں آ سکا۔ فروزاں کی سانس اتنی تیزی سے چل رہی تھی جیسے وہ کئی دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔

”کیا بات ہے فروزاں؟“ مہر ماہ پوچھ رہی تھی۔ ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ فروزاں ہانپ رہی تھی۔ مہر ماہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”وہ۔۔۔“ فروزاں پھر بولی۔ ”وہ۔۔۔“ مصور کارل۔

”کارل۔“ مہر ماہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ”وہ جہیں اس وقت کیسے یاد آ گیا؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ابھی۔۔۔ چشمے پر۔۔۔ ملا تھا مجھے۔“ مہر ماہ بیستر پر اٹھ بیٹھی تھی، بیچت کھڑی ہو گئی۔ ”چشمے پر ملا تھا وہ؟“

”جی۔۔۔“ فروزاں نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اندھیرا تھا۔ میں تو۔۔۔ ڈر رہی تھی۔ ایک درخت کی آڑ سے لٹ کر۔ اچانک سامنے آیا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکلی جاتی تو۔۔۔ نئی چری دوڑ پڑے اس طرف۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ فوراً ہی بول پڑا۔۔۔ ڈر نہیں فروزاں۔ میں کارل ہوں۔ میں نے تمہاری شہزادی کی تصویر بنائی تھی۔“

”اوہ!“ مہر ماہ کے منہ سے نکلا۔ ”اس نے مجھے یہ دیا۔“ فروزاں نے اپنا ہاتھ مہر ماہ کی طرف بڑھایا۔ ”اور کہا۔ یہ اپنی شہزادی کو دے دینا۔ خط ہے میرا۔ بس۔۔۔ میرے منہ سے تو ایک لفظ نہیں نکل سکا اور۔۔۔ وہ تیزی سے مڑ کر۔۔۔ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔“

مہر ماہ نے فروزاں کے ہاتھ سے خط لے لیا اور پڑھنے لگی۔

”میرے دل کی دنیا کی شہزادی!۔۔۔ بڑے کرب سے لکھ رہا ہوں یہ جملہ کہ آپ کو شادی مبارک ہو۔ دعا گو ہوں کہ آپ سدا خوش رہیں۔ میں تو اب تڑپ تڑپ کر رہی ہوں۔“ ”اگر یہی سنا۔ مجھے کوئی رنج نہیں ہوگا، اگر کوئی

کچا جاؤں اور اپنی اس گستاخی کی وجہ سے میری گردن مار دی جائے۔ مجھے اندازہ نہیں کہ آپ کہاں جا رہی ہیں۔ ابھی جب یہی سنی رات کو آپ نے پڑاؤ والا ہے تو میں نے خط آپ کو لکھ دیا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ آپ کے اس سفر کے دوران میں کسی طرح میرا یہ خط آپ تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ سے دور چلا جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ پھر کسی کی نظر میں آؤں اور گرفتار کیا جاؤں۔ مجھے یہ خوف ہرگز نہیں ہے کہ میری گردن ماری جاسکتی ہے، میں بس یہ چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کے بارے میں باتیں نہ بننے لگیں، لوگ غلط نہ سمجھ لیں، آپ کی رسوائی نہ ہو۔ اسی لیے میں نے اپنے پہلے خط کی عبارت ایسی رکھی تھی جس سے نہ تو یہ ظاہر ہو کہ خط کسی نے لکھا ہے اور نہ یہ ظاہر ہو کہ یہ خط آپ کو لکھا گیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ خط کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے اور آپ کی رسوائی کا سبب بنے۔ بس اتنی خواہش تھی میری کہ میرے ترچے دل کی آواز آپ تک پہنچ جائے اور آپ زندگی بھر سوچتی ہی رہیں کہ خط کیجیے والا دیوانہ کون تھا۔ میں اس طرح آپ کے خیالوں میں تو رہوں، آپ کی زندگی میں آنا تو ممکن ہی نہیں۔ کہاں سلطنت عثمانیہ کی شہزادی اور کہاں میں ایک معمولی انسان! پھر یہ کہ اب تو آپ سنی اور کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ خدا جانے میری یہ خواہش پوری ہو سکے گی یا نہیں کہ میں آپ کے خیالوں میں "زندان" نہ سکوں لیکن ایک مہم جوئی اس پر وہ خط بھی لکھا تھا اور یہ خط بھی لکھ رہا ہوں۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ یہ خط آپ تک رازداری کے ساتھ نہیں پہنچ سکتا تو پھر میں اسے اپنے پاس ہی رکھوں گا اور ہمیشہ کے لیے آپ سے دور چلا جاؤں گا۔ یہی بھی یہ خط وہی پڑھ کر اپنے ترچے دل کو بہلانے کی کوشش کیا کروں گا لیکن شدید خواہش یہی ہے کہ یہ خط آپ تک پہنچ جائے اور آپ کو یاد رہے کہ ایک نامعلوم دیوانہ آپ کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ اب اور کیا لکھوں، بس الوداع گوں گا۔ دل زدہ دیوانہ کا دل۔"

یہ خط خاصی دیر تک مہرماہ کے ہاتھ میں رہا۔ وہ اس نے کئی مرتبہ پڑھا تھا اور اس کے جسم میں ایک انتہائی سی مستانہت پھیلنا لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے مہرماہ خاتون کے اشعار بھی یاد آتے رہے تھے۔ دماغ میں یہ خیال بھی چکر اتار رہا تھا کہ غالباً یہی وہ جذبہ ہے جس کا اعتبار وہ مہرماہ خاتون کے اشعار میں پڑھتی رہی تھی۔

فروزاں کی آواز نے اسے چوٹ لگا دیا۔ "اس نے کیا

لکھا ہے شہزادی صاحبہ؟"

مہرماہ نے اسے گھور کر دیکھا پھر سخت لہجے میں بولی۔ "میرے اور تمہارے علاوہ اس خط کا علم کسی کو نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ سمجھ گئی؟"

"ہی۔۔۔ جی شہزادی! "فروزاں نے نظریں جھکا لیں۔ اسے مزید کوئی انتظار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

رات کو مہرماہ دیر تک جاگتی رہی، کاہل اور اس کے خط کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی ابھرا کہ وہ کیوں اس معاملے کو ہمیشہ راز میں رکھتا چلائی ہے؟ اگر وہ اس بارے میں سلطان سلیمان کو بتا دیتی تو سلطنت کا چھپا چھپا چھان ڈالا جاتا اور کاہل کو گرفتار کر کے اس کی گردن اڑا دی جاتی۔

تو پھر اس معاملے کو راز میں رکھنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ کاہل کو زندگی سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر کیوں؟

دماغ میں آنے والے اس سوال نے مہرماہ کو بوجھ بھرا دیا۔ کیا وہ کاہل کے جذبے سے متاثر ہو گئی تھی؟ اور کیا نہیں چاہتی تھی کہ عشق کا وہ پردہ اٹھ کر رکھ رہا ہو جائے؟

مہرماہ کے دل نے کہا۔ "ہاں۔"

"نہیں۔" مہرماہ نے سختی سے زہر برب کہا۔ "مجھے اب اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہیے۔"

لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ سفر کے دوران میں اسے کاہل کا خیال بار بار آتا رہا۔ اس نے وہ خط بھی اچھی طرح محفوظ کر لیا تھا۔ پڑاؤ کے دوران میں وہ کسی وقت مہرماہ خاتون کا کلام پڑھتی تو اسے ان اشعار میں کاہل کا چہرہ نظر آنے لگا۔

☆ ☆ ☆

آخر سفر تمام ہوا۔

خانم سلطان نے اپنے محل میں بڑی بڑی جوش بخت کے ساتھ مہرماہ سلطان کا استقبال کیا اور اسے گئے لگا کر بولی۔ "میری عزیز از جان مہرماہ!۔۔۔ بہت خوش ہوئی ہوں میں تمہیں دیکھ کر۔ تم نے اس کا برا نہیں مانا کہ میں تمہاری شادی میں شرکت کے لیے نہیں آئی۔"

"مجھے آپ کے جذبات کا اندازہ ہے خانم پھوپھی! "

مہرماہ نے کہا۔ "اس محل میں قدم رکھنا، یقیناً آپ کے لیے بہت مشکل ہے جہاں آپ کی بیوی کا حکم صادر ہوا تھا۔"

"ہاں۔" خانم سلطان نے شہنشاہی سانس لی۔ "فرہاد پاشا جیسے بھی تھے، میرے بچوں کے باپ تھے اور شاید وہ اسے بے بھی نہیں تھے جتنا مشہور کیا گیا اور بڑا دودھ منعم ان

کا سر قلم کر دینے کا حکم صادر کر بیٹھے۔"

مہرماہ نے افسردگی سے کہا۔ "آپ کے دل میں اب بھی نفرت ہوگی شادیاں کے لیے؟"

"کتنی محبت مجھے تم سے ہے، اندازہ ہے تمہیں؟"

"میری بات اور ہے۔"

"تم انجی کی بیٹی ہو مہرماہ! "خانم سلطان کی آواز تھوڑی سی بھرائی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ "ختم کسی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"والدہ بالکل ٹھیک ہیں، آپ کو یاد بھی کرتی ہیں۔"

خانم سلطان نے قصر شادی کے کئی افراد کی تحریریت پوچھی پھر اپنا کہہ۔ "آج تو مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہوئی ہے اور گزشتہ روز کی صبح بھی میرے لیے ایک خوشی لائی ہے۔ عہد آگیا ہے۔"

مہرماہ چوکی۔ "کہاں رہے وہ اسے عمر سے؟ بتایا تو ہوگا۔"

"سب باتیں۔ اور بہت سی باتیں ہوئی ہی رہیں گی۔ تمہارے لیے تمام تیار ہو گیا ہوگا۔ پہلے محل کر کے ذرا دیر آرام کرو۔ اتنی دیر میں کھانے کا وقت ہو جائے گا۔ کھانے پر باتیں کریں گے۔" خانم سلطان نے ایک بار پھر مہرماہ کی پیشانی پٹی۔

فروزاں اور خانم سلطان کی دو کیزوں کے ساتھ مہرماہ نے حمام کا رخ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ عہد کے آجائے سے خانم سلطان کتنی خوش ہوگی۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ وہ اس کے شہر فرہاد پاشا کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس وقت اس کی عمر بہت کم تھی جب سلطان سلیمان کے حکم سے فرہاد پاشا کو قتل کیا گیا تھا۔ خانم سلطان نے اس کی پرورش بھی اس طرح کی تھی جیسے اپنے بچوں کی کی تھی۔ عہد جب سولہ سترہ سال کا ہو گیا تھا تو اپنا کہہ لیں کم ہو گیا تھا یا خود کہیں چلا گیا تھا۔ خانم سلطان نے اسے تلاش کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی تھی لیکن وہ نہیں ملا تھا۔

مہرماہ حمام سے خارج ہونے کے بعد خانم سلطان کے کمرے میں پہنچی۔

"آرام نہیں کیا میں نے۔" وہ بولی۔ "کوئی خاص ٹکان نہیں ہے سفر کی۔ اب رات کو ہی آرام کروں گی۔ میرے بچوں بھائی کہاں ہیں؟"

خانم سلطان کا ایک چٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹا مہرماہ سے بڑا تھا اور بیٹی مہرماہ کی تقریباً ہم عمر تھی۔ ان کے بارے میں خانم سلطان نے بتایا کہ وہ دونوں اپنے دادا سے ملے

قریب ہی کی ایک ریاست گئے ہوئے تھے۔

"آج وہ دن میں آجائیں گے۔" خانم سلطان نے مزید کہا۔ "اسنے ان کو روکیا؟"

"میں تو کچھ زیادہ ہی دن رکنے کے ارادے سے آئی ہوں خانم پھوپھی! "

"ایک بات تو بتانا مہرماہ! "خانم سلطان خاصی سنجیدہ ہو گئی۔ "تم جب سے آئی ہو، میں اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ تم اپنی شادی سے خوش نہیں ہو کیا؟"

"یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟"

"تمہاری شادی کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے ہیں اور تم یہاں آ گئی ہو۔"

"تو کیا کرتی؟" ختم پاشا کی معروفیت حد سے زیادہ ہے۔ بہت کم وقت گزرتا ہے ان کے ساتھ۔ پھر یہ کہ آپ کی یاد تو مجھے بہت دن سے آ رہی تھی۔ اگر میری شادی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں بہت دن پہلے آپ کے پاس آ چکی ہوتی۔" مہرماہ نے خانم سلطان کو بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ اپنی شادی سے سخت ناخوش تھی۔ اس نے فوراً ہی موضوع بھی بدلا۔ "عہد تو طویل ہے وہ کہاں ہے؟"

"چلو ملتی ہوں۔" کہیں سو نہ گیا ہو۔ کل صبح سے آج صبح تک تو جاگتا ہی رہا تھا۔" خانم سلطان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "جب آیا تھا تو شہر پہ چپ میں گرفتار تھا۔ غلطی ہی طاری تھی اس پر۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ کہیں گھوڑے سے گر کر زخمی نہیں ہوا۔"

مہرماہ کو عہد کے گھر سے کی طرف لے جاتے ہوئے خانم سلطان نے مزید بتایا۔

عہد کی حالت دیکھ کر خانم سلطان نے فوراً طیب کو بلوایا تھا جو ریاست کے موجودہ صوبیدار کا خاص طیب تھا۔ خانم سلطان ایک سائیں اور محتول صوبیدار۔ کی یہ بھی لیکن صوبیدار اس کی اہمیت اس لیے سمجھتا تھا کہ وہ سلطان سلیمان کی بہن تھی۔

"آج صبح سے اس کی حالت بہتر ہوئی ہے۔" خانم سلطان بتاتی رہی۔ "طیب کل سے اب تک اس کے پاس رہا تھا۔ آج صبح یہ بیان دے کر گیا ہے کہ عہد کو دودھ چارون مکمل آرام کرنا چاہیے۔"

مہرماہ اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی بستر پر ایک نوجوان لٹا نہایت کو تک رہا تھا۔

"ابھی تک سوئے نہیں تم باڈا دیر سو کر جاگ گئے ہو؟"

خانم سلطان مہرماہ کا ہاتھ پکڑے اس کے بستر کی

طرف بڑھی۔
 قمار، مہر ماہ کو تک رہا تھا اور مہر ماہ پکلیں جھپکاتا تک بھول گئی تھی۔ اس کے سامنے عداوت چلا کر لڑا مہر ماہ کے دماغ میں اس سوال کی گونج پھیل رہی تھی۔
 "چلو خیر!" خاتم سلطان بولی۔ "اچھا ہے کہ تم جاگ رہے ہو اور تمہاری طبیعت بھی خاصی بہتر معلوم ہو رہی ہے۔ میری عزت از جان تھی تمہیں دیکھنے آئی ہے۔ مجھ سے اس کا نام تو تم نے ہی پارستا ہے۔ یہ شہزادی مہر ماہ سلطان ہے۔" "خوش آمدید شہزادی صاحبہ!" عداوت نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔
 "لیجئے رہو۔" مہر ماہ بولی۔ "خاتم پھولی مجھے بتا چکی ہیں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"
 خاتم سلطان نے بھی عداوت کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 "ہاں ہاں، لیجئے رہو۔" لہجے میں محبت بھری ہوئی تھی۔
 "میری پیاری بھئی برا نہیں مانے کی کہ تم اس کے احترام میں کھڑے نہیں ہوئے۔"
 "بس اب بیٹے خاتم پھولی!" مہر ماہ جلدی سے بولی۔ "مریض کو آرام کرنے دیا جائے تو بہتر ہے۔"
 خاتم سلطان نے فہم کر لیا۔ "تم نے ہی کہا تھا کہ تمہیں عداوت سے ملنا ڈرتا ہے۔"
 حقیقت تو یہی تھی لیکن عداوت کو دیکھ کر مہر ماہ کے حواس پر اگندہ ہو گئے تھے۔ وہ جلد از جلد اس کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی۔
 خاتم سلطان اسے اپنے کمرے میں واپس لے آئی۔
 مہر ماہ نے اس دوران میں اپنے حواس پر کافی حد تک قابو پالیا تھا۔
 "اس کمرے میں تصویریں بہت سی لگی ہوئی ہیں۔"
 وہ بولی۔
 "ہاں۔ اسی کی بنائی ہوئی ہیں۔ اسے بہت کم عمری سے شوق تھا مصوری کا۔ جب وہ غائب ہوا تھا، اسی زمانے کی ہیں وہ تصویریں۔ اس عمر میں بھی وہ اتنی اچھی تصویریں بناتے لگا تھا۔ تم شاید بھول گئیں، میں نے تمہیں بتایا تھا اس کے شوق کے بارے میں۔"
 "کئی سال پہلے آئی تھی میں آپ کے پاس پہلی مرتبہ۔"
 "شاید بھی بتایا تھا میں نے تمہیں۔ تم اس وقت چھوٹی تھیں۔ بھول گئی ہوگی۔ اس وقت عداوت غائب ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ اس کے غائب ہونے کے بعد میں نے اس کا کمرہ بند کر دیا تھا کہ بچے وہاں جا کر اس کی کوئی چیز خراب نہ کر دیں۔ میرا دل کہتا تھا مہر ماہ کہ وہ بھی زندگی ملے

کا ضرور، کبھی آئے گا ضرور۔ بچے اپنے دادا سے مل کر آئیں گے تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے اسے گھر میں پا کر۔"
 خاتم سلطان کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ عداوت کو بہت چاہتی تھی۔ آخر کچھ عرصے سے پرورش کی گئی تھی اس کی۔
 مہر ماہ نے اپنے حواس پر کافی قابو پالیا تھا لیکن دماغ میں ہلکی سی الجھناہٹ اب بھی ہو رہی تھی۔ اس پر جو رد عمل ہوا تھا وہ اسے بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔
 خاتم سلطان نے کھانا دیا وہاں کھانا کھا۔
 کھانے کے دوران میں وہ کچھ تشویش سے بولی۔
 "تمہاری شادی سے کچھ دن پہلے باپ جہانوں میں بڑا سنگین واقعہ پیش آیا تھا۔"
 "باپ جہانوں" سلطان سلیمان کے نکل کو کہا جاتا تھا۔
 مہر ماہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "آپ تو سب لوگوں کی خیریت پوچھ رہی تھیں، آپ کو اس سنگین واقعے کا علم کیسے ہو گیا؟"
 "مجھے بس خاص خاص اطلاعات ملتی رہتی ہیں۔"
 خاتم سلطان نے تنبیہ کی کہ۔ "نکل سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جانے کے بعد بھی مجھے یہ خواہش پیش رہی ہے کہ وہاں کے حالات سے باخبر رہوں۔ وہاں کوئی بے جو مجھے اطلاعات بھجواتا رہتا ہے۔ ابھی جب تم حمام گئی تھیں، اسی وقت قاصد ایک خط لے کر آیا تھا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ جس روز تم وہاں سے روانہ ہوئی ہو، اسی روز شام کو شاہی جراح سفیان کو کسی چیک مرده پایا گیا تھا۔"
 یہ بات مہر ماہ کے علم میں تھی کہ شہزادہ بائزید پر فخر بھیجے والے جیشی خواجہ سرا کو آئندہ نہیں کیا گیا تھا جس کی ذمہ داری جراح سفیان ہی پر عائد کی جا سکتی تھی اور سفیان اپنے گھر سے غائب بھی ہو گیا تھا۔
 خاتم سلطان بولی۔ "اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ بائزید کو نکل کرنے کی ہاتھ قاعدہ مادرش کی گئی تھی۔ وہ جیشی ایک ماہر فخر زان تھا۔ سفیان کو خاصی رشوت دی گئی ہوگی کہ اس جیشی کو آئندہ نہ کرے۔"
 مہر ماہ خاموشی سے خاتم سلطان کی طرف دیکھتی رہی۔
 "خرم کو تو کل بھار پر شہر ہونا چاہیے تھا لیکن وہ شہر غائب زیادہ مضبوط نہیں۔" مصطفیٰ اور گل بہار کے جانے کے بعد بھی خرم، بائزید کو کھلے میں محسوس کر رہی ہوگی۔ اس نے اچانک ہی بائزید کو دار الفنون حرب بھیج دیا ہے، نکل سے دور کر دیا ہے۔ اسے ضرور یہ شہر بھی ہوگا کہ بائزید کا دشمن شاید اب بھی نکل میں موجود ہے۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے خاتم پھولی؟"
 خاتم سلطان کے چہرے پر غور مندی کا تاثر گہرا ہو گیا۔ وہ کچھ رک کر بولی۔ "میرے ذہن میں ایک خیال ہے تو کسی لیکن میں اسے اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی۔ تم کھانا کھاؤ مہر ماہ۔ تمہارا ہاتھ درد کر رہا ہے۔"
 "کیا آپ کو یہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ سلیم بھائی کے مزاج میں آنے والی ایک تبدیلی کے باعث والدہ کی زیادہ محبت کا مرکز بائزید بھائی بن گئے ہیں؟"
 "میں نے کہا ماہر ماہ کھانا کھاؤ۔ اس انداز میں سوچنے سے بات کرنے سے دل لرز نہ لگتا ہے۔"
 "کوئی اور اطلاع بھی آئی ہے؟" مہر ماہ نے کھانے پر توجہ دیتے ہوئے موشموں کھنگول دیا۔
 "وہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔" خاتم سلطان نے کہا۔ "براؤ معطر، براؤم یا شا کو کسی بہم پر بھیج رہے ہیں۔" اس وقت موضوع کھنگول تبدیل کرنے کے بعد بھی مہر ماہ کا ذہن عداوت میں الجھا رہا۔
 ☆☆☆☆
 تین دن گزر گئے۔ خاتم سلطان اور مہر ماہ میں زیادہ تر خاندان کے موجودہ حالات یا سلطنت عثمانیہ کے ماضی کی باتیں ہوتی رہیں۔
 اسی شام جب اندھیرا آدھن پر نہیں اترتا تھا، مہر ماہ پائیس باغ میں پہل قدمی کرتے ہوئے ذہنی طور پر عداوت کے بارے میں مختلف الشوع خیالات کی گرفت میں تھی۔ اچانک اس کا سامنا عداوت سے ہو گیا۔
 عداوت چہلچہا جلدی سے موز بانہ انداز میں جھکا۔
 "معاف کیجئے گا شہزادی! مجھے علم نہیں تھا کہ آپ یہاں پہل قدمی کر رہی ہیں۔"
 وہ اپنے قدموں واپس لوٹ جاتا چاہتا تھا کہ مہر ماہ بولی پڑی۔ "غیر عداوت!"
 عداوت کھٹک کر رکھا۔ اس کی نظریں بھیجی رہیں۔
 "تم پانچ سال گھر سے کیوں غائب رہے؟" مہر ماہ بولی۔ "مقصود کیا صرف یہی تھا کہ مصور کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں شہرت حاصل کرو؟"
 "نہ جانے میں کیا چاہتا تھا۔" عداوت نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "مجھے اب کچھ یاد نہیں۔" اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔
 "میں بھی یاد نہیں؟" مہر ماہ نے بڑی تنبیہ کی سے پوچھا۔
 عداوت نے چوٹے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا

لیکن پھر دوبارہ نظریں جھکا نے میں بھی دیر نہیں لگتی۔
 "شہزادی!" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "انسان بھی کبھی پاگل ہو جاتا ہے۔ تم لازم میرے ساتھ تو یہی ہو۔ میں کسی بچے کی طرح چاند کی طرف ہلک پڑا۔ اپنی اس گستاخی کا اعتراف ہے مجھے۔ سزاوار ہوں میں۔ جی چری سیاہ نکل کے قریب ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ آپ گم دیکھیں کہ وہ میرا سرا ڈالیں۔"
 "ادھر آؤ۔" مہر ماہ ایک فوارے کی طرف بڑھی۔
 عداوت نے مذہب کے ساتھ اس کے پیچھے قدم بڑھائے۔
 مہر ماہ فوارے کے گرد گھومتی ہوئی ایک چتر کے برابر اونچا دیوار پر بیٹھ گئی جو تنگ رخام سے بنی ہوئی تھی۔
 "بیٹھو!" مہر ماہ نے کہا۔
 "میں آپ کے قریب بیٹھنے کی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں شہزادی!"
 "بیٹھو!" مہر ماہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "حکم دے رہی ہوں میں۔"
 عداوت مذہب کے ساتھ بیٹھ گیا۔
 مہر ماہ بولی۔ "میرے قریب بیٹھنے کی گستاخی تم نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے مشق یہ مل گئی تھی۔"
 "میں اس گستاخی کی مزا کے لیے تیار ہوں۔"
 "میں کچھ جانتا چاہتی ہوں۔ اپنی والدہ سے یہ پوچھنے کی جرأت تو میں نہیں کر سکتی کہ تم سے پوچھ سکتی ہوں۔ ایک شاعر و مہر خیانتوں کے کلام نے بھی مجھے بہت الجھا دیا ہے۔"
 "مجھے بھی وہ بہت پسند ہیں۔"
 "اوہ امہری خاتون کو پڑنا ہے تم نے؟"
 "جی۔"
 اس وقت مہر ماہ کو کچھ خیال آیا کہ وہ ایک ایسے ہی رفیق زندگی کی خواہش مند تھی جسے نوان لطیف سے دیکھی ہو۔
 مہر ماہ سوچتی ہوئی بولی۔ "اس کے ایشیا پسند کرنے کے باوجود میری بھوش نہیں آسکا کہ وہ جس قسم کے جذبات کی ترغیبی کرتی ہے، اوہ جذبات آخر کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ ویسے وہ جذبات میرے مشابہ سے میں آپکے ہیں۔ میری والدہ کو بھی میرے شاہ بابا سے عشق ہے۔ دوسرا مشاہدہ مجھے تمہاری وجہ سے ہوا۔"
 عداوت نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری، کچھ بولا نہیں۔
 "عشق۔" مہر ماہ پھر بولی۔ "کیا ہوتا ہے یہ؟"
 عداوت خاموش رہا۔
 مہر ماہ پھر جھنجھلائی۔ "مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میرے

سوال کے جواب میں کوئی خاموش رہے۔
 "وہ۔۔۔ میں۔۔۔" عمار چٹا گیا۔ "میں کیا عرض کروں شہزادی؟"
 مہرماہ قہقہہ پڑی۔ "یہ بتاؤ کہ عشق ہوتا کیا ہے؟"
 "عشق۔۔۔" عمار جھڑب لہجے میں بولا۔ "چاہت جب محسوس کے دائرے کو توڑ کر آگے نکل جاتی ہے تو اسے عشق کہتے ہیں۔"
 "چاہت تو میرے تجربے کے مطابق دھیرے دھیرے بڑھتی ہے۔ قربت کی وجہ سے بڑھتی ہے۔ میں تمہارے سامنے طویل عرصے تک تو نہیں رہی۔ وہ جس کچھ دنوں کی بات تھی۔"
 "یہ جذبہ قربت اور وقت سے ناپورا ہوتا ہے شہزادی!" عمار نے کہا۔ "یہ ایک نظر میں بھی ہو جاتا ہے۔" مہرماہ نے طویل سانس لی۔ "مہری خاتون کے اشعار میں بھی یہی بات ہے۔ جو۔۔۔ میری نگاہ میں نہیں آتی۔" اس کا سب تو دنیا میں کوئی بھی نہیں سمجھ سکا ہوگا شہزادی اور شاید یہی نہ سمجھ سکے۔
 "تمہارے دل میں یہ کب پیدا ہوا تھا؟"
 "جب میں نے آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"
 "پہلے ہی دن؟" مہرماہ تعجب سے بولی۔
 "جی۔"
 مہرماہ کے چہرے پر الجھن کا تاثر برقرار رہا۔ وہ سوچتی ہوئی بولی۔ "تمہارا پہلا خط مجھے گل میں ملا تھا۔ تم نے کیسے جان لیا کہ میں شہزادی ہوں۔"
 "جب آپ نے مجھ سے دربار کے توسط سے کوئی بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔" عمار نے جواب دیا۔ "لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی میں جان لیتا۔ تصویر مکمل کرنے کے بعد مجھے خیال تھا کہ اب میں آپ کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ اسی لیے میں نے بہت احتیاط سے آپ کا تعاقب کیا تھا۔ جب آپ گل میں گئی تھیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کا تعلق گل ہی سے ہوگا اور یہ میرے علم میں تھا کہ آپ سے زیادہ کم عمر اس گل میں کوئی نہیں ہے۔"
 "یہ نہیں خاتم پھولی سے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہوگا۔"
 "جی۔"
 "دوسرے خط میں تم نے لکھا تھا، جس میں اندازہ نہیں کہش دو ستر کے کہاں جاری ہوں؟"
 "جی۔" عمار نے کہا۔ "مجھے علم نہیں تھا کہ آپ پہلے

بھی یہاں آ چکی ہیں۔ پھر یہ کہ میں آپ کی حقیقت جاننے کے بعد کچھ سوچنے بھننے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ پھر اس خط کے بعد تو صدمے سے میری حالت ہی غیر ہو گئی تھی۔"
 "صدمہ کیوں؟"
 "میں نے آپ کو خط میں لکھا تھا کہ اب آپ سے دور چلا جاؤں گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب آپ کو کبھی دیکھ بھی نہیں سکوں گا۔ یہ میرے لیے صدمہ ہی تھا۔ اسی صدمے کی وجہ سے میں جب یہاں پہنچا ہوں تو شب میں چلا تھا۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میرے سوچنے بھننے کی صلاحیت ہی سلب ہو چکی تھی۔ میں بھجان کا شکار ہو گیا تھا۔ اگر مجھے شبہ بھی ہو جاتا کہ آپ یہاں نہیں گئیں تو میں ابھی ہرگز گھر نہ آتا، یا شاید کبھی نہ آتا۔ بہت دور چلا جاتا۔" مہرماہ غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ رک کر اس نے ایک اور سوال کیا۔ "تم نے عیسائیوں جیسا نام کیوں اختیار کیا تھا؟"
 "میں نہیں چاہتا تھا، کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہو کہ میں کون ہوں۔ کچھ لوگوں کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ فرہاد پاشا کے ایک بھائی کا نام عمار ہے۔"
 "گھر اس کا مقصد؟"
 "گھر سے جانے کے بعد تو میں نے دن رات ایک کر دیے تھے۔ میں ایک بہترین مصور کی حیثیت سے اپنی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ میرا نام سلطان معظم کے کانوں تک پہنچ جائے۔"
 "اس سے کیا ہوتا؟"
 "عمار نے خاتم سلطان کا نام لیا پھر کہا۔ "انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ سلطان معظم کو اچھی تصاویر بہت پسند ہیں۔" میں نے تو عمل میں بھی کوئی تصویر نہیں دیکھی۔" مہرماہ حیرت سے بولی۔
 "عمار نے پھر خاتم سلطان کے حوالے سے جواب دیا۔ "سلطان معظم کے خیال کے مطابق تصویر ایسی ہونا چاہیے کہ اسے دیکھ کر دل چاہے کہ بس دیکھتے رہاؤ۔ انہیں کوئی ایسی تصویر نہیں ملی ہوگی۔ میں چاہتا تھا کہ میری شہرت اتنی ہو جائے کہ سلطان معظم مجھے طلب کر لیں۔ میں اس طرح دربار تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔"
 "اس کا مقصد؟"
 "اب پھر عمار خاموش رہا۔ اس کے چہرے سے چٹکچٹا ہٹ صاف غائب ہو رہی تھیں اس سے پہلے کہ اس کی خاموشی پر مہرماہ پھر بگڑ جاتی، وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "میں

کچھ عمار صاحب سلطان معظم نے میرے بھائی کو قتل کر دیا۔ میں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا، مجھے اس کی تفصیل معلوم ہوتی رہی۔" اس نے خاتم سلطان کے حوالے سے بتایا۔ "انہیں یہ تھا کہ سلطان معظم کو ابراہیم پاشا نے ہی اتار دیا ہوگا کہ وہ اس کی باتوں پر اعتبار کر بیٹھے اور انہوں نے میرے بھائی کو قتل کر دیا۔"
 "خاتم پھولی نے مجھ سے بھی اس شبہ کا اظہار نہیں کیا۔" عمار اپنی بات جاری رکھی۔ "دربار تک رسائی پانے کے بعد کیا تم ابراہیم پاشا کو قتل کرنا چاہتے تھے؟"
 "میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔" عمار نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات ثابت ہو جاتی، یا کم از کم مجھے اس کا یقین ہو جاتا تو میں۔۔۔" عمار کی نظریں اٹکیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تو میں ابراہیم پاشا کو قتل کر دیتا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ میرے اس اقدام کی وجہ سے میری گردن بھی مار دی جاتی۔"
 مہرماہ نے ایک طویل سانس لی۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"
 "میں۔۔۔" عمار نے ہنسی سانس لی۔ "اگر آپ ہی یہ چاہیں کہ مجھے اپنی گستاخی کی سزا ملے تو اور بات ہے ورنہ میں اب باپ ہالوں کی طرف رخ بھی نہیں کرنا چاہتا۔"
 "کیوں؟"
 "اگر میں نے وہاں رسائی حاصل کر بھی لی تو خوف زدہ ہو رہوں گا۔"
 "خوف زدہ۔۔۔ کیوں؟"
 "میرے جذبات۔۔۔" عمار نے جواب دیا۔ "یہ انسان کو پاگل کر دیتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ میرا پاگل پن آپ کی رسوائی کا سبب بنے۔"
 "لیکن اب تو میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ تم جانتے ہو۔"
 "زندگی کے ایسے موڑ پر عشق کا جذبہ ختم نہیں ہو جاتا۔ کم از کم میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ میرے دل میں وہ شعلہ پہلے سے زیادہ تیز ہو چکا ہے۔" عمار کی آواز بھرا گئی۔ "میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکوں گا آپ کو۔"
 "اور اگر میں تمہیں سزا دے ٹھنوں؟ جس میں قتل کرادوں؟"
 "احسان ہوگا کہ آپ کا مجھ پر۔۔۔ میں سسک سسک کر زندگی گزارنے سے بچ جاؤں گا۔ ہاں، ایک خواہش ضرور ہوگی میری؟"

"وہ کیا؟" مہرماہ سانس لہجے میں بولی۔
 "میری گردن آپ کے سامنے اڑانی جائے اور آپ دیکھ سکیں کہ میرے خون کے قطرہوں کی چمک میں میری آنکھیں صرف آپ کی طرف گھراں ہیں۔" عمار کی آواز رندہ سی تھی۔
 "نہیں۔" مہرماہ بولی۔ "جس میں زندہ رہتا ہوگا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ عشق میں آدمی کس طرح سسک سسک کر زندہ رہتا ہے۔" یہ الفاظ سلا کی کے غماز تھے لیکن مہرماہ کے لہجے میں سلا کی جھنجھکی۔ "صرف تجھ ہی تھا کہ یہ عشق آخر کیا بلا ہوتا ہے۔"
 انکی دیر تک عمار کی نظریں جھکی ہی رہی تھیں۔ اب پہلی مرتبہ اس نے نظر اٹھا کر مہرماہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حسرت دکھ رہی تھی۔
 "اب مجھے جانا چاہیے۔" مہرماہ کھڑی ہو گئی۔
 "اندھیرا چھلنے والا ہے۔"
 وہ اس طرف چل پڑی جہاں اس کی کیزر فروزاں موجود تھی۔ عمار کو اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ مہرماہ کے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔ "وہ۔۔۔ شہزادی حضور۔۔۔"
 "وہ کارل نہیں ہے۔" مہرماہ نے اس کی بات کاٹی۔ "فرہاد پاشا کا چھوٹا بھائی ہے۔" پھر اس کے لہجے میں سختی آگئی۔ "لیکن اس حیرت انگیز مشابہت کا ذکر تم کسی سے نہیں کرو گی۔"
 "جی۔" فروزاں نے کہا۔ اس کا چہرہ کچھ عجیب سے تاثرات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ یقیناً اس کے دل نے تسلیم نہیں کیا ہوگا کہ وہ کارل نہیں تھا۔
 مہرماہ گم سم سی تھی جب گل میں داخل ہوئی۔ انکی دونوں میں خاتم سلطان کا چہرہ اور بھائی واپس آچکے تھے۔ مہرماہ سے مل کر تو انہیں خوشی ہوئی ہی تھی لیکن عمار سے مل کر وہ خوشی کے مارے رونے ہی لگے تھے۔
 کچھ ہی دن بعد خاتم سلطان کی بیٹی کی شادی تھی۔ اس شادی کے چند دن بعد مہرماہ نے خاتم سلطان سے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ ان چند دنوں میں عمار اس کا سامنا بہت کم ہوا تھا اور جب بھی ہوا تھا، مہرماہ نے اس سے کسی بھی قسم کی گفتگو سے گریز کیا تھا۔
 گل سے رخصت ہوتے وقت مہرماہ نے خاتم سلطان سے کہا۔ "میں اب آپ کے پاس آتی رہا کروں گی خاتم پھولی!" اسے رخصت کرتے وقت خاتم سلطان کے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ عمار بھی موجود تھا۔ مہرماہ کی بات سن کر اس کی

آنکھوں میں یہ سوال تڑپنے لگا۔
 ”کیا آپ یہ دیکھنے کے لیے آئی رہیں گی شہزادی کہ
 سبک سبک کرکس طرح جیا جاتا ہے؟“
 ☆☆☆
 مہرماہ جس روز پایہ تخت واپس پہنچی، اسی دن باب
 ہمایوں میں چل چکی تھی۔ والدہ سلطان پر قلع کا حملہ ہوا تھا۔
 فوراً شاہی اہلکار کے ساتھ رکش الاٹا کو بھی طلب کر لیا گیا تھا۔
 دو دن بعد معلوم ہوا کہ والدہ سلطان کو، کوئی اور بیماری
 بھی لاحق ہوئی تھی۔ طیب شب روز نگل میں موجود رہے
 لیکن والدہ سلطان کی گرفتاری ہوئی صحت نہیں سنبھال سکے۔
 سلطان سلیمان نے فرما دیا پاشا کے قتل کے بعد روٹھ
 جانے والی بہن خانم سلطان کو پہلی مرتبہ خفا لکھا۔
 ”عزیز ہمشیرہ! والدہ ماجدہ شدید علیل ہو گئی
 ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ سب، کیا ہو جائے۔ تم مجھ سے ناراض
 ہو لیکن کیا والدہ ماجدہ کو دیکھنے بھی نہیں آؤ گی؟“
 اس خط نے خانم سلطان کو بڑا دیا۔ وہ اب بھی مٹی لیکن
 اتنا طویل ستر جلدی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود
 والدہ کی سانس اس وقت چل رہی تھی۔ شاید اس کی روح کو
 اسے دن تک ٹائل اسی لیے رہا کہ جسو خاں کا ساتھ
 چھوڑنے سے پہلے ایک مرتبہ اپنی بڑی بیٹی کو دیکھ لے۔
 بیٹی نے اپنا سر ماں کے سینے پر رکھا اور ماں کی روح
 اپنی منزل کی طرف چلی گئی۔
 قتل سے سات گھنٹوں کی دھول والا شادی پر ہم
 انا کر سدا پرچم لگا دیا گیا۔
 قتل سرا کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا کیونکہ وہاں کا
 نظام چلانے والی ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔
 چٹلم کے بعد معاملات دھیرے دھیرے ٹھیک ہونا
 شروع ہوئے۔ شہزادہ مصطفیٰ ملکہ نگل بہار کے ساتھ بیگمیشیا
 واپس چلا گیا۔
 ”اب تم ہی قتل سرا کا انتظام سنبھالو غم!“ سلطان
 سلیمان نے غم سلطان سے کہا۔
 اور مہرماہ سو پے بغیر تندرہ کی کراپ تمام معاملات پر
 اس کی ماں کی گرفت اور مضبوط ہو جائے گی۔
 خانم سلطان کو سلطان سلیمان نے ایک بار پھر روکنا
 چاہا تھا لیکن وہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ واپس چلی گئی۔
 عماد اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔
 چند ماہ بعد مہرماہ اپنے قتل میں متعلق ہوئی جس کی تعمیر
 خاص طور پر اسی کے لیے قتل کی گئی تھی۔

رحیم پاشا کو اس قتل میں آنے کے لیے بہت کم وقت
 ملا تھا لیکن جتنا وقت بھی ملا تھا، وہ مہرماہ کے لیے ناخوشگوار
 ہی ہوتا تھا۔
 والدہ اور والدہ کو صبح کا سلام کرنے کے لیے مہرماہ کو
 باب ہمایوں میں جانا پڑتا تھا لیکن اس کی کوشش ہوئی تھی کہ
 وہاں کم سے کم وقت گزارے۔ اس کم وقت کا بھی زیادہ
 حصہ وہ اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ چاکیر کے ساتھ گزارتی
 تھی جس کا علاج تو ہسپتال ہور ہا تھا لیکن رکش الاٹا نے اب
 اشاروں کتابوں میں یہ بات کہنا شروع کر دی تھی کہ شہزادہ
 چاکیر جیسے جیسے بڑا ہوتا جائے گا، اس کی کرلیز می ہوئی
 رہے گی۔ اس کی کرلیز می بڑیاں جو یہ انکی طور پر بھر بھری
 تھیں، ان کا بس اتنا ہی علاج ہو پارہا تھا کہ انکی تیزی سے
 بھر بھرا ہونے سے روکا جا رہا تھا۔ غم اپنے اس بیٹے کے
 لیے اکثر اداس ہو جاتی تھی۔
 مزید چھ ماہ گزارنے کے بعد مہرماہ پھر خانم سلطان
 کے قتل پہنچی تھی۔ خانم سلطان نے اس بار بھی اسے بڑی محبت
 سے رکھا۔ دو تین دن گزار گئے۔ مہرماہ کو قتل نظر نہیں آیا۔
 چونکہ وہ خانم سلطان سے پوچھتی تھی۔
 ”عماد کیا پھر نہیں چلا گیا؟ جب سے آئی ہوں، دکھائی
 نہیں دیا۔“
 خانم سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ افسردہ نظر
 آنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جانے کیا ہو گیا ہے اب اسے؟“
 تقریباً سارا وقت اپنے کمرے ہی میں گزار دیتا ہے۔ کسی
 وقت باہر آتا ہے تو بس اپنے پیچھے اور پیچھے کے ساتھ رہتا
 ہے۔ میرے پاس بھی بہت کم وقت بیٹھتا ہے۔ اس نے یہ
 پابندی بھی لگا دی ہے کہ اس کے کمرے میں کوئی نہیں آئے
 گا۔ جب اس کا دل چاہے گا بخود ہی باہر آجایا کرے گا۔“
 ”غیب بات ہے۔ یہ پابندی کیوں کہ اس کے
 کمرے میں کوئی نہ آئے؟“
 ”سمجھ میں نہیں آتا۔“ خانم سلطان کی افسردگی قائم رہی۔
 مہرماہ، خانم سلطان کا منہ کچھ کر رہی تھی۔
 اگلے دن عماد سے اس کا سامنا آجائے ہوا جب وہ
 اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ عماد ٹھٹک کر دکا اور پھر اس
 کے منہ سے جیسے بے اختیار نکلا۔
 ”میں آپ ہی کے پاس آ رہا تھا۔“
 ”مجھے تو یہاں آنے کی دن گزار چکے تھی۔“ مہرماہ
 نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”معلوم ہو گیا تھا مجھے۔ میں آپ کی دادی مرحومہ

کی تعزیت کرتا چاہتا تھا آپ سے لیکن میری کچھ میں نہیں
 آ رہا تھا کہ کیا کہوں گا۔ اس وقت بس آ گیا۔ اب کچھ میں
 نہیں آ رہا ہے کہ کیا کہوں۔ تعزیت کے موقع پر میرے
 ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لنگھتیں کھو
 گئے تھیں جو مجھے کہنا چاہتیں۔“
 ”تو کچھ مت کہو۔ یہ کسی بات ہوتی ہے۔ جو کچھ
 خدا کو منظور تھا، وہ ہو گیا۔“
 ”آپ کہیں جا رہی تھی؟“
 ”خانم چھوٹی کے پاس جا رہی ہوں اور کہاں جاؤں گی۔“
 ”مجھے اجازت دیجیے۔“ عماد مودبانہ انداز میں جھکا
 اور پھر مہرماہ کی ہاتھ پکڑ لی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
 مہرماہ سوچتی ہی رہ گئی کہ یہ عماد کون سا روپ ہے؟
 یہ عشق کی کون سی منزل ہے؟
 وہ تجسس بھی ہو گئی تھی کہ عماد نے دوسروں کے لیے
 اپنے کمرے میں داخلہ بند کر دیا تھا آخر کیوں؟
 اس سوال کا جواب خانم سلطان کے پاس بھی نہیں
 تھا۔ اگرچہ وہ عماد سے عمر میں بھی خاصی بڑی تھی اور رشتے
 میں بھی۔ اسی نے عماد کی پرورش کی تھی۔ وہ سلطنت عثمانیہ
 کے فرماں روا کی بہن تھی۔ اس سوسے کا موجودہ والی بھی اس
 کے سامنے تسلیم خم کرنے پر مجبور تھا لیکن خانم سلطان نے یہ
 حکم صادر نہیں کیا تھا کہ عماد اپنے کمرے میں دوسروں کا
 داخلہ بند نہیں کر سکتا۔
 ”میں اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرتا چاہتی۔“
 چند دن بعد خانم سلطان نے افسردگی سے کہا تھا۔ ”اس کے
 دل میں جو محبت اپنے بھائی کے لیے بھی پایا ہے، اتنی ہی محبت
 اس کے دل میں میرے لیے بھی ہے۔ آخر پرورش کی ہے
 میں نے اس کی۔ میں بھی اسے اتنی ہی شدت سے چاہتی
 ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہوگا کہ میرے کسی سخت رویے کے
 باعث وہ ایک بار پھر مجھ پر چھوڑ چلا جائے۔ ابھی تک اس نے
 مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ چند سال تک کہاں غائب رہا۔“
 اس کے بعد مہرماہ نے وہاں چھ دن اور
 گزارے۔ اس عرصے میں عماد سے اس کا اتفاقی سامنا
 صرف ایک بار ہوا۔
 ”جانے کیا ہو گیا ہے اسے!“ خانم سلطان نے
 لگرمندی سے کہا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ تمہارا سامنا
 نہ کرنا چاہتا ہو۔ پہلے وہ کھانے وغیرہ کے لیے تو میرے پاس
 آ جینا تھا۔ تمہارے آنے کے بعد وہ کھانا بھی اپنے کمرے
 میں کھانے لگا ہے۔ کیز کھانے لے جاتی ہے لیکن اسے بھی وہ

کمرے میں نہیں آئے۔ وہاں سے ہی سے کھانے کی
 سینی اس سے لے لیتا ہے۔“
 مہرماہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے زبردستی کی
 بالکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”یہ آپ کے کھرا کا معاملہ ہے
 خانم چھوٹی۔! میں اپنے طور پر نہیں سمجھتی ہوں کہ مجھے آپ
 کے کھریلے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔“
 ان کی یہ گفتگو اس وقت ہوئی تھی جب مہرماہ خانم
 سلطان کے قتل سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ خانم
 سلطان کے بیٹے کی شادی میں بھی شرکت کر چکی تھی۔
 سفر کے دوران میں بھی یہ سوال اس کے دماغ میں کئی
 مرتبہ ابھرا کہ عماد کے اس روپ کو کیا مردم بیزاری
 سمجھایا جائے؟
 جب مہرماہ اپنے شہر سلطنت عثمانیہ کے پایہ تخت پہنچی تو
 شہر میں داخل ہوتے ہی احساس ہوا جیسے وہاں کوئی غیر معمولی
 واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے مسکراہٹ غائب
 تھی اور وہ سرگوشتوں میں باتیں کر رہے تھے جیسے انہیں ڈر ہو
 کہ وہ اگر زور سے بولے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔
 عام حالات میں مہرماہ سیدھی اپنے قتل کا رخ کرتی
 اور حمام سے فارغ ہونے کے بعد ہی باب ہمایوں میں چلی لیکن
 شہر کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ سیدھی باب ہمایوں پہنچی۔
 جب وہ قتل میں داخل ہوئی تو اس نے کیزوں اور خواجہ
 سراؤں کی حالت بھی ایسی دیکھی جیسے وہ سبے ہوئے ہوں۔
 ایک جگہ کیزوں کی سربراہ رقیہ بیگم اور آقا خوبر
 سرگوشتوں میں باتیں کرتے نظر آئے۔ وہ مہرماہ کو دیکھتے ہی
 چوگے اور مودبانہ انداز میں جھگے۔ مہرماہ ان سے ہی
 صورت حال کے بارے میں کوئی استفسار کرتی لیکن اسی
 وقت رحیم پاشا سے سامنا ہو گیا۔
 ”خوش آمدید شہزادی!“ رحیم پاشا کے ہونٹوں پر ہلکی
 سی مسکراہٹ ابھری۔
 ”کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے رحیم پاشا؟“ مہرماہ
 نے پوچھا۔
 ”میرے ساتھ آئیے!“ رحیم پاشا نے ایک طرف
 قدم بڑھائے۔
 ”بات کیا ہے؟“ مہرماہ نے اس کے ساتھ چلتے
 ہوئے پوچھا۔
 ”ابراہیم پاشا ایک ہم سے کل شام لوٹے تھے۔ ان
 سے بات چیت کے بعد جب آقا اپنی خواب گاہ میں جانے
 لگے تو انہوں نے ابراہیم پاشا کو حکم دیا کہ آج وہ اپنے قتل

جانتے کے بجائے دیوان خاص ہی میں ٹھہریں۔ شہزادی خورشید سلطان کو پیغام پہنچ دیا گیا تھا کہ کسی مصروفیت کی وجہ سے ابراہیم پاشا کو باپ ہمایوں میں روک لیا گیا ہے لہذا وہ ان کا انتظار نہ کریں۔ ابراہیم پاشا نے رات دیوان خاص ہی میں گزاری جہاں ان کے لیے بستر لگا دیا گیا تھا۔

مہرماہ کچھ بھی نہیں لیکن اس وقت وہ دونوں دیوان خاص میں داخل ہو رہے تھے اور وہاں کا منظر دیکھ کر مہرماہ کے ذہن کو شدید ہولکا لگا تھا۔ اسے دیواروں پر خون کے دھبے نظر آئے تھے۔ ابراہیم پاشا وہاں موجود تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ مہرماہ کے منہ سے نکلا۔
”خون کے دھبے ہیں شہزادی!“
”کس کے خون کے؟“ مہرماہ نے تیزی سے پوچھا۔

”ابراہیم پاشا کے؟“
”کیا ہوا ہے؟ کسی نے حملہ کیا اس پر؟“ شہزادی نے پوچھا۔
”جی نہیں۔“ رستم پاشا کا لہجہ پر سکون تھا۔ ”ذبحی ہوئے کی بات نہیں۔ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔“

مہرماہ چکی۔ ”کس نے قتل کیا؟“
”جلاوٹ۔“ رستم پاشا نے جواب دیا۔ ”ختم آقا کا تھا۔“
مہرماہ کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔ اس کا سارا جسم سنسانے لگا تھا۔ چند منے وہ ساکت کھڑی رہی پھر مرکز تیز چلتی ہوئی خرم سلطان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”آؤ مہرماہ!“ خلیفتی ہوئی خرم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے اطلاع بھی نہیں بجوائی اپنے آنے کی؟“
”یہ کیا ہوا ہے والدہ؟“

”مجھے ابھی ایک سچیز نے بتایا ہے کہ تم رستم پاشا کے ساتھ دیوان خاص کی طرف گئی تھیں۔ وہاں تمہیں معلوم نہیں ہوا، کیا ہوا ہے؟“

”والدہ!“ مہرماہ پلکیں جھپکائے بغیر بولی۔ ”آپ ابراہیم پاشا کے خلاف تھیں۔“

”مجھے اس سے انکار نہیں۔“ خرم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ابراہیم کو صرف اپنے لیے ہی نہیں، سلطنت کے لیے بلکہ خانوادہ عثمانیہ کے لیے خطرہ سمجھتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ اسے اس منصب سے ہٹا دیا جائے۔ سلیمان اس جیسے شخص کے قتل کا حکم میری وجہ سے صادر نہیں کر سکتے۔“

”شاہ بابا نے یہ حکم کیوں صادر کیا؟“
”سب تک چشم پوشی سے کام لیجئے۔ وہ اپنی حدود

سے تجاوز کرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس نے جو فتوحات حاصل کیں، اس کا سبب جی چڑھوں کی بہادری اور خرم سلطان کی منصوبہ بندی تھی لیکن وہ خود کو سکندر سے بھی زیادہ سمجھنے لگا تھا اور سفر و رہا جلا جا رہا تھا۔ سلیمان کے ہم میں یہ بات بھی اچھی تھی کہ فرانسیزیوں سے کیے گئے معاہدے پر ابراہیم نے سلطان کے لقب کے ساتھ دھجلا کیے تھے۔

سلیمان نے اسے یہی نظر انداز کیا تھا لیکن اس مرتبہ ابراہیم نے جو حرکت کی، اسے سلیمان برداشت نہ کر سکے۔ اس مرتبہ کی ہم میں انہوں نے سکندر جیسی کو ابراہیم کا تخت بنا کر بھیجا تھا۔ ان دونوں میں نہ جانے کیا ذاتی دشمنی تھی کہ ابراہیم پاشا نے اس پر خزانے میں چوری کا الزام لگا کر پھانسی دے دی۔ اگر سکندر جیسی نے واقعی ایسا کیا تھا تو بھی یہ معاملہ ثبوت کے ساتھ سلیمان کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے تھا۔

سلیمان ہی اس کا فیصلہ کرتے لیکن ابراہیم پاشا کی خود مری تو آسان کو چھوٹنے لگی تھی۔ کئی اس کی واپسی ہوئی لیکن اس سے پہلے خیر الدین بار بروس نے آکر سلیمان کو آگاہ کر دیا تھا کہ ابراہیم پاشا کا الزام جھوٹا تھا۔ اس ہم میں بار بروس بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا۔

سب کچھ تفصیل سے جان لینے کے باوجود مہرماہ سوال کر رہی تھی۔ ”کیا ابراہیم پاشا کو بتایا گیا تھا کہ اس کا جرم کیا ہے؟“

”مجھے اس کا علم نہیں۔ کسی وقت پوچھوں گی سلیمان سے۔ ابھی تو اسرو کی کے عالم میں ہیں۔ ان کے اس اقدام سے بہر حال ان کی ایک بہن بچہ ہوئی ہے۔“

”دوسری بہن!“ مہرماہ بول پڑی۔
”ٹھیک کہا تم نے۔“
”ابراہیم پاشا کی لاش؟“ مہرماہ نے ایک اور سوال کیا۔
”دشمن کے لیے بھجوا دی گئی ہے۔“

”خورد سلطان پھوٹی؟“
”ظاہر ہے کہ وہ شدید صدمے میں ہوگی۔ میں تعزیت کے لیے اس کے محل کی تھی لیکن اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ کچھ دیر ہی ہے کہ ابراہیم کو کھس نے قتل کر لیا ہے۔“

”کیا میں ان سے ملنے جاؤں؟“
”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ تم سے بھی نہیں ملے گی۔“

خرم سلطان کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ مہرماہ خورد سلطان کے محل کی لیکن خورد سلطان اس سے ملنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوئی۔ مہرماہ نے اسرو کی کے والدین کا رخ کیا۔ اس کے والدین میں ایک بات ہوئی کہ اس کے والدین نے اس کے والدین کے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا۔ لیکن خیر الدین بار بروس کا حوالہ ملنے کے بعد اسے اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹکنا پڑا۔

خیر الدین بار بروس سلطان سلیمان کے والد سلطان سلیم ہی کے عہد سے سلطنت عثمانیہ کا وفادار تھا۔ اسے مختلف خطابات سے نوازا گیا اور ترک بحری بیڑے کا امیر البحر بنا دیا تھا۔

تختی کے امراء میں یہ بات مشہور تھی کہ چھاس سالہ بار بروس کسی قیمت پر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس کے ”سچ کی گلی“ سلطان سلیمان کو بھی برداشت کرنا پڑتی تھی کیونکہ سلطنت عثمانیہ سے اس کی وفاداری کا واسن قطعی ہے داغ تھا۔

اس سے قطع نظر کہ ابراہیم پاشا کیسا آدمی تھا، مہرماہ پر اس کے قتل کے گہرے اثرات ہوئے تھے۔ بہت دن تک وہ اپنے محل سے باہر نکلی ہی نہیں۔ اسے بس اطلاعات ملتی رہیں کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔ اسے معلوم ہو کہ سلطان سلیمان نے وزارت عظمیٰ کے منصب پر بوڑھے یاز پاشا کو فائز کر دیا تھا۔ مہرماہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ اس معاملے میں اس کی والدہ کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو اس منصب پر رستم پاشا کو دیکھنا چاہتی تھی۔

خورد سلطان کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ نیم پاگل ہی ہو گئی تھی۔ درود یار سے لپٹ کر باتیں کیا کرتی تھی۔ کچھ دن بعد خاتم سلطان، خورد سلطان سے تعزیت کے لیے آئی۔ دس بارہ دن اس کے محل میں رہی۔ دونوں اس نے مہرماہ کے محل میں آکر بیٹھ کر اسے لیکن سلطان سلیمان سے ملنے نہیں گئی۔

تین سال بعد مہرماہ کی طبیعت کچھ خراب ہوئی تو طبیع نے اسے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ مہرماہ کسی قیمت پر رستم پاشا کی اولاد کی ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے اسقاط کر دیا اور نہایت درشت لہجے میں طبیع سے کہا۔ ”اگر والدہ یا رستم پاشا کو اس کا علم ہوا تو یا درکنہ تمہارا سر تھامے شائے پر نہیں رہے گا۔“

اسی سال یہ بھی ہوا کہ بوڑھا یاز پاشا طاعون کا شکار ہو گیا۔

ہر وقت پائیا۔ اس مرتبہ اس کی جگہ رستم پاشا کو مل گئی۔ اس موقع پر خرم سلطان یقیناً بہت خوش ہوئی ہوگی لیکن مہرماہ کے لیے یہ خوشی کی بات ہرگز نہیں تھی کہ اب اس کا شوہر سلطنت عثمانیہ کا وزیر اعظم تھا۔

دو سال بعد مہرماہ پھر ماں بننے والی تھی جب اس نے پھر اسقاط کر دیا۔

ان پانچ سالوں میں مہرماہ تین مرتبہ خاتم سلطان سے ملنے لگی تھی۔ دو مرتبہ ایک ایک ماہ وہاں رہی تھی۔ تیسری مرتبہ چند دن رہ کر واپس آئی تھی۔ اس مرتبہ اسے یہ جان کر دشت سی ہونے لگی تھی کہ قہار نے اپنے کمرے کے برابر کا ایک اور کمرہ بھی اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اس کمرے کے داخلی دروازے پر پریشانی چنوا دی تھی تاکہ کوئی ادھر سے اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس مرتبہ اس کی صحت بھی کچھ گری گری کی نظر آتی تھی۔

ایک سال اور گزر رہا تھا کہ طبیع نے ایک موقع پر مہرماہ سے کہا۔

”میں بڑی معذرت کے ساتھ عرض کروں گی شہزادی صاحبہ کہ اس مرتبہ آپ اسقاط نہیں کرنا سکتیں۔“

”کیا مطلب؟“ مہرماہ پوچھی۔
طبیع نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”آپ پھر ماں بننے والی ہیں۔ اس مرتبہ اسقاط کروانے سے آپ کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

مہرماہ اس کا منہ سختی رہ گئی۔
☆☆☆
وقت گزرتا رہا۔

سولہویں صدی ایٹانف سفر طے کر چکی تھی جب میانیشیا سے خبر آئی کہ ملکہ گل بہار کا انتقال ہو گیا تھا۔ مہرماہ پر اس کا کوئی جذباتی رد عمل نہیں ہوا۔ خرم سلطان نے بھی ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھنے پر اکتفا کیا تھا مہرماہ کو اس پر ضرور تعجب ہوا کہ سلطان سلیمان پر اس خبر کا کوئی مثبت یا منفی رد عمل نہیں ہوا تھا۔ اس کا سبب مہرماہ کو کچھ عرصے بعد اس دن معلوم ہوا جب ترک سپاہ کسی ہم پر جانے کے لیے اپنی تیاری کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ خورد سلطان سلیمان اس لشکر کی قیادت کرتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی بہت اہم بہم درپیش تھا۔

مہرماہ کو اواکس عمری سے سلطنت کے کسی بھی قسم کے امور سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے تجسس نہیں ہوا کہ اس ہم کے بارے میں جانتے کے لیے باپ ہمایوں کا رخ

کرتی لیکن اسے اطلاع ملی کہ اس کی والدہ خرم سلطان نے اسے فوراً طلب کیا تھا۔

”خیریت؟“ مہرماہ نے بے تابی سے پوچھا۔

”خیریت ہے شہزادی“ غلیبہ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ ”اور خیریت ہی رہے گی۔ اللہ!“

غلیبہ کے لہجے سے مہرماہ کی بے تابی ختم ہوئی اور اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ خرم سلطان بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

”والدہ!“ مہرماہ مؤدبانہ بیٹھی۔

”خوش آمدید نور چشم! آؤ۔۔۔ میرے قریب آؤ۔۔۔“

”آپ کی طبیعت۔۔۔“ مہرماہ نے اس کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

”صبح سے طبیعت کچھ خراب ہے۔ غلیبہ کا کہنا تو یہی ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں لیکن۔۔۔ جانے کیوں۔۔۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میری حالات میں اضافہ ہوگا۔“

”خدا نہ کرے والدہ!“ مہرماہ نے جلدی سے کہا۔

”ایسی بات زبان پر لانا اچھا نہیں ہوتا۔“

”بیٹو! مجھے تم سے کچھ اہم باتیں کرنا ہیں لیکن اس سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔“

مہرماہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”نور چشم!“ خرم سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہاری شادی کو خاصا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ تمہاری ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں ہو سکی۔“

مہرماہ دکھ سے مسکرائی۔ ”آج پوچھ رہی ہیں آپ۔ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد؟“

”خیال تو آتا رہتا تھا لیکن میں پوچھتی نہیں تھی۔“ خرم سلطان نے کچھ افسردہ سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ”لکھی ہوئی تھی مجھ سے۔ میں نے رسم پاشا کے اور تمہارے حواہجوں کے فرق کو نہیں سمجھا تھا اور تمہاری شادی کر دی تھی۔ اسے عرصے میں یہ بات پچھڑی اس لیے نہیں کہ اب مدد اوتو ممکن ہی نہیں تھا۔ بہر حال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے طلاق کے بارے میں نہیں سوچا۔“

”کیسے سوچتی والدہ!“ مہرماہ کی آواز کچھ بھرا گئی۔

”میرے علم کے مطابق، مانوادی، محتاجی کی شہزادی کو طلاق نہیں ہوئی، مگر میں نے طلاق نہیں لی۔ میں اپنے خاندان پر یہ وارث کیسے لگاتی۔ جس طرح ہن پڑا وقت گزرا رہی ہوں۔“

”مہرماہ نور چشم!“ خرم سلطان نے کہا۔ ”مجھے کبھی بھی خیال آیا تھا کہ شاید یہ قدم اٹھا کر تم مجھے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے آج میں تم سے کہنا چاہتی ہوں کہ اب بھی اس بارے میں نہ سوچنا۔ میں نہ ہوں تو بھی۔“

مہرماہ نے جلدی سے خرم سلطان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ابھی کہہ چکی ہوں کہ ایسی بات زبان پر لانا اچھا نہیں ہوتا۔“

خرم سلطان نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور مسکرائی۔ پھر سنجیدہ ہو کر ہوئی۔ ”میں نے خاص طور سے دو اہم باتیں بتانے کے لیے بلایا تھا تمہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری شادی سے بھی پہلے کا ایک معاملہ ہو گیا۔“

”کون سا معاملہ والدہ؟“

”بایزید پر جان لیوا حملے کا معاملہ۔“

”معلوم ہو گیا کچھ؟“ مہرماہ نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ خرم سلطان نے کہا۔ ”یہ تو شاید بتا چکی ہوں تمہیں کہ جیٹی خواجہ سربراہ جس درجے سے تیر چلایا گیا تھا، وہ درجہ سیم کی خواب گاہ کی راہداری کا ہے۔“

”یہ اگر آپ نے مجھے بتایا تھا تو اب مجھے یاد نہیں۔ تو کیا سلیم بھائی۔“

”نہیں۔“ خرم سلطان نے بات کا نچوڑے ہوئے کہا پھر ہوئی۔ ”میں نے اس معاملے کی تحقیق رسم پاشا کو سونپ دی تھی۔ اس نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ جس وقت اس جیٹی پر تیر چلایا گیا تھا، سلیم اپنی خواب گاہ میں تھا، نہ راہداری میں۔ اسے مصطفیٰ نے کوئی خاص بات کرنے کے لیے باغ میں بلایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی خواب گاہ کے دونوں دربان بھی ڈرا دیے گئے اور ادھر ہو گئے تھے اس لیے وہ بھی نہیں دیکھ سکے کہ راہداری کے درجے سے کس نے تیر چلایا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس معاملے میں سلیم بھائی کا ہاتھ تھا، نہ مصطفیٰ بھائی کا؟“ مہرماہ بول پڑی۔

خرم سلطان کچھ رک کر ہوئی۔ ”کچھ دن بعد رسم پاشا کو خبر ہوا کہ اس معاملے میں رقیہ بیٹی کچھ جانی گئی اور چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے بھی رقیہ بیٹی سے پوچھ لیا۔ اسے ذرا باہر کا بھی لکھا لیکن اس نے زبان نہیں کھولی۔ کچھ عرصے بعد رسم پاشا کو ہی قسم کا شبہ آغا طور پر

بھی ہوا لیکن پوچھ لیا کہ میں نے بھی کچھ نہیں بتایا۔“

مہرماہ سلطان توجہ سے سنتی رہی۔ خرم سلطان ہوئی رہی۔

”جب آقاؤں اور بیٹیوں کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو انہیں عمل سے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ والدہ سلطان کے انتقال کے چند سال بعد انہیں الگ کیا جانا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ والدہ کے بعد حرم سربراہ نے عمل اختیار حاصل ہو گیا تھا اس لیے میرے ہی فیصلے کو حریف آخر سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ان دونوں کو اس سے الگ نہیں کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی شاید انہی دونوں کی وجہ سے حقیقت سامنے آئے اور آخر۔۔۔ ابھی کوئی ہتھ بھر پہلے حقیقت سامنے آگئی۔“

”کیسے؟“ مہرماہ نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کس نے مارا تھا تیر؟“

”مصطفیٰ نے۔“

”کیا؟“ مہرماہ شدت سے پوچھی۔ ”مصطفیٰ بھائی نے؟“

”ہاں۔“

”ابھی تو آپ نے بتایا کہ مصطفیٰ بھائی نے سلیم بھائی کو باغ میں بلایا تھا؟“ مہرماہ نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”وہ دونوں تو وہاں ہوں گے اس وقت۔“

”سلیم باغ میں کچھ دیر انتظار کر کے گل میں واپس آ گیا تھا۔ مصطفیٰ باغ میں نہیں ملا تھا۔ جب وہ گل میں داخل ہوا تو اسے بایزید کے ساتھ جیٹی آنے والے واقعے کی اطلاع ملی۔ اس سے میں نے ہی بات کی تھی۔ روا روئی کے سے انداز میں میں نے مصطفیٰ سے بھی سوال کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک کتب خانے کا افتتاح کرنے گیا ہوا تھا۔ بعد میں رسم پاشا نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ بایزید کے واقعے سے پہلے کتب خانے سے واپس آ گیا تھا۔“

”سلیم بھائی کو اطلاع کس نے دی تھی کہ مصطفیٰ بھائی۔“

خرم سلطان نے اس کی بات کاٹی۔ ”مجھے بھاری کوئی کنیز تھی۔ بعد میں سلیم کو یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کون تھی۔ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ بایزید پر تیر چلانے والا مصطفیٰ تھا۔ اس پر میں شہرہ ی کیا جاسکتا تھا لیکن اب ایک ہتھ پہلے ثبوت بھی مل گیا۔“

”ہاں۔“ مہرماہ ہوئی۔ ”وہ بتاتے جاری ہیں آپ؟“

خرم نے سر ہلا دیا پھر کہا۔ ”اس شام میں نے سلیمان سے کہا تھا کہ وہ جلدی خواب گاہ میں آ جائیں اور کھانا میرے ساتھ ہی کھا لیں۔ دراصل ان دونوں ان کی معروضیت بہت بڑی ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں دیر تک

امور سلطنت سے متعلق کام کرتے رہے تھے۔ مجھے خیال تھا کہ وہ کام میں میری بات بھول جائیں گے اس لیے میں خود انہیں لینے چلی گئی تھی۔ جب میں انہیں لے کر اپنی خواب گاہ کی طرف آ رہی تھی تو ایک جگہ میں ایک کمرے سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ مصطفیٰ کا نام آنے کی وجہ سے ہم دونوں ہی خشک کر رک گئے۔ کمرے میں رقیہ بیٹی اور آقا طور پر تھے۔ ان کی گفتگو تیز تر ہو گئی تھی میں ہو رہی تھی۔ رقیہ بیٹی اس خوف کا اظہار کر رہی تھی کہ انہیں اس مرتبہ گل سے الگ نہ کرنے کی وجہ ہے کہ وہ دونوں مشتبہ ہو گئے ہیں اور انہوں نے یہ جیسا کہ لکھی کی ہے کہ انہوں نے سنجیدہ مصطفیٰ کو جیٹی خواجہ سربراہ پر تیر چلانے دیکھ لیا تھا۔ رقیہ بیٹی اسے لکھی قرار دے رہی تھی اور آقا طور پر کہہ رہا تھا کہ اگر وہ حقیقت کا اظہار کر دیں تو نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے سنجیدہ مصطفیٰ پر جہت لگانے کے الزام میں ان پر سلطان کا حجاب نازل ہوتا۔“

مہرماہ نے اپنا سر قدام کیا۔ ”پھر؟“ اس کے ذرے نکلا۔

”یہ سب کچھ سن کر سلیمان کو غصہ آتا ہی چاہیے تھا۔ آقا طور پر اور رقیہ بیٹی کو کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان دونوں کے بھنگوے کی ساری باتیں سن لی گئی ہیں تو ان کے چہرے حق پر گئے۔ وہ گڑ گڑاتے ہوئے سلطان کے قدموں پر گر پڑے۔ ان دونوں نے بڑے طویل عرصے تک یہ راز چھپائے رکھا تھا جو ایک سنگین جرم تھا۔ اس پر ان دونوں کی گردن بھی اڑائی جاسکتی تھی۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ ان دونوں کا موقف بالکل درست تھا۔ اگر وہ اس وقت اس راز سے پردہ اٹھاتے تو ان پر سزا سنائی دیتی۔ جاتا، انا وہ خود ہی مستحب ہوتے۔ میری بات سلطان کی سمجھ میں آگئی۔ وہ دونوں سزا سے بچ گئے۔ دراصل ان دونوں وہ پہلے ہی سے بہت ناراض تھے مصطفیٰ پر۔“

”کیوں والدہ؟“

”پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک کنیز کی لکھی پر تمہارے شاہ بابا نے حکم صادر کر دیا تھا کہ اسے گل سے نکال دیا جائے چنانچہ اسے نکال دیا گیا۔ وہ مصطفیٰ کی ریاست چلی گئی تھی اور گل میں جا کر مصطفیٰ کے سامنے گڑ گڑائی تھی کہ لکھی کسی اور کی تھی جو اس پر ڈال دی گئی۔ مصطفیٰ نے نہ صرف یہ بات مان لی بلکہ اس کنیز سے متعلق بھی قائم کر لیا۔ اس کنیز سے اب اس کا چار سال کا بیٹا ہے۔ اس نے یہ سب کچھ راز میں رکھا تھا۔ گل کے بہت خاص لوگ اس راز سے واقف تھے۔ مصطفیٰ یہ بات خاص طور پر

اکتوبر 2014ء کا پاکیزہ عید الاضحیٰ کی خوشیوں کے ہمراہ

پاکیزہ

ماہنامہ

کراچی

نگہت سیما کے تازہ ناول اعتبار وفا کی روانی کے ساتھ ساتھ

رفاقت جاوید کے نئے ناول رنگ خلش کا مترنم آغاز

نایاب جیلانی کی ترکب وفا میں پڑے حیران کن حکایتیں

زاہدہ پروین کا خوب صورت مثنوی ناول جنگل کا پھول

اس ماہ اسما قادری کی حاضری ہے ایک دل نشیں کہانی کی صورت



اس کے علاوہ

پڑھے ہماری دیگر ماہر قلم کاروں کی تحریریں کی جن میں صائمہ اکرم، بشری گوندل، امہ ثمامہ

امہ ایمان، شبانہ شوکت، سارہ ملک اور رضوانہ آفتاب شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ متنوع متنوع سلسلوں کا سین اور پڑھو متنوع متنوع سلسلوں کا سین اور پڑھو

تمہارے شاہ باپ سے چھپاتا تھا گردن کی دن قبل یہ بات کسی طرح سلیمان کے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ معاملہ گل بہار نے بھی چھپا دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا راز کبھی فاش کرتی؟ سلطان کو اس پر بھی شدید غصہ آیا تھا۔ پھر قہر نہ بکلی اور آغا غلو بورکا واقعہ جاتی پر تزلزل بن گیا۔ دہری کی کسر اس سے اگلے ہی دن پوری ہو گئی جب سلیمان کو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ بغاوت پر قتل کیا ہے اور باپ کو معزول کر کے تخت پر قابض ہونا چاہتا ہے۔

”نہیں والدہ!“ مہرماہ کا جسم ہی نہیں، دماغ بھی سننا گیا۔ ”مصطفیٰ بھائی اس حد تک جا سکتے ہیں۔“ ”اقتدار کا نشانہ ایسا ہی ہوتا ہے نور چشم!“ خرم سلطان نے غصے کی سانس لے کر کہا۔ ”پھر جب اس نقشہ کو ہمیز کر دیا جائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے، مصطفیٰ کو اسی کنیز نے درگاہ لایا ہوگا جو اب اس کے چار سالہ بیٹے کی ماں ہے۔ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا ہے کہ ایرانیوں نے پہاڑوں سے نکل کر ارض روم پر قبضہ کر لیا ہے۔ سلیمان نے رستم پاشا کی سرکردگی میں ایک لشکر ایرانیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔“

ان دنوں شہزادہ مصطفیٰ ریاست اماسیر کا ولی تھا۔ خرم سلطان نے بتایا کہ جب ترک لشکر اماسیر سے گزر رہا تھا تو نہ صرف اس کی رفتار سست پڑ گئی بلکہ سپاہیوں نے یہ مطالبہ بھی شروع کر دیا کہ بادشاہ اگر اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ لشکر کی قیادت نہیں کر سکتا تو اس لشکر کی سپہ سالاری شہزادہ مصطفیٰ کو سونپی جانا چاہیے تھی۔ وہ رستم پاشا کی قیادت قبول نہیں کریں گے کیونکہ وہ جتنی نسل سے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تک سننے میں آئی کہ وہ رستم پاشا کو قتل کر کے سلطان سلیمان کو معزول کر دیں گے تاکہ انہیں ایک ضعیف بادشاہ سے نجات مل جائے اور سلطنت عثمانیہ کے تخت پر شہزادہ مصطفیٰ بیٹھ سکے۔

☆☆☆

مہرماہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ”یقین نہیں آ رہا والدہ!“ ”اسی لیے سلطان نے خود وہاں جا کر معاملے کی تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ مصطفیٰ ہی نے اس معاملے میں سپاہ کو اکسایا ہے۔ آخر اماسیر ہی کی حدود میں ایسا کیوں ہوا۔“ ”والدہ!“ مہرماہ کی آواز لرزیدہ ہی رہی۔ ”بغاوت کی سزا تو موت ہے، خواہ وہ باپنی، بیٹاپنی کیوں نہ ہو۔“ ”خدا سلطنت عثمانیہ پر رحم فرمائے۔“ خرم سلطان

سلطان سلیمان نے کسی مصلحت سے یہ حکم صادر کیا کہ بائزید قونی سے امام اسرار سلیم منتخب سے کو تائبہ چلا جائے۔ شہزادہ سلیم نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن شہزادہ بائزید نے قونیہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ گویا سلطان سلیمان سے بغاوت کا اعلان تھا۔ مہرماہ نے بائزید کو کھلے کر سمجھانے کی کوشش کی، اسے شاہد بابا کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیے لیکن اس خط کا جواب تک نہیں آیا۔

سلطان سلیمان کو اس حکم عدولی پر شدید غصہ آیا۔ مصطفیٰ کے بعد وہ بائزید کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو جاتا لیکن غرض سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے باعث وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکا۔ وہ اس حالت میں اپنی محبوب بیوی سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

خود مہرماہ اپنی والدہ کی بیماری کے باعث اپنا کل چھوڑ کر مستقل طور پر باپ ہاتھوں آگئی تھی اور اگرچہ علاج حالے میں کوئی کسر نہیں لی لیکن مہرماہ اپنی ماں کے ستر کے قریب رخصتی یا جہانگیر کے کمرے کی طرف دوڑ لگاتی۔ ہر وقت کمرے میں پڑے رہنے کی وجہ سے وہ پیٹ کی کئی بیماریوں کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ بہت جلد چٹ پٹ ہو گیا۔ اس کے انتقال کا صدر غرض سلطان کی بیماری پر مزید اثر انداز ہوا۔

مہرماہ نے ماں کی خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا لیکن خدمت گزاری سے سوت کو شکست نہیں دی جاسکتی۔ طویل علالت کے بعد غرض سلطان بھی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

سلطان سلیمان اور مہرماہ پر قیامت گزرنی۔ ممکن نہیں تھا کہ غرض سلطان کی موت کی خبر شہزادہ سلیم اور شہزادہ بائزید تک نہ پہنچی ہو مگر اس موقع پر ان دونوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سلطان سلیمان سے خائف ہوں گے۔

خانم سلطان تو حرم کھا پہلی تھی کہ باپ ہاتھوں میں بھی قدم نہیں رکھے گی۔ اگرچہ والدہ سلطان کی وفات پر اس کی یہ قسم ٹوٹ چکی تھی لیکن اس موقع پر اس نے مہرماہ کے نام ایک تحریر جی خط لکھنے پر اکتفا کیا تھا۔

خود سلطان پر ابراہیم پاشا کے قتل کے بعد جو دھشت طاری ہوئی تھی وہ اب عمل دیوانگی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اسے اپنے بچوں تک کا ہوش نہیں رہتا تو غرض سلطان کی موت کی اطلاع کا اس پر کیا اثر ہوتا اور اگر اثر ہوتا بھی تو شاید وہ نہ آتی۔ اس نے ابراہیم پاشا کے قتل کا سبب ہی غرض سلطان کو سمجھا تھا۔

سلطان سلیمان کو بھی اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بہت دن تک گم حسم رہا۔ ان دنوں میں سلطنت کے معاملات درحکم پاشا اور اس کا نائب صوفی پاشا شاد بکھتے رہے۔ مہرماہ کو اب باپ ہاتھوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے محل چلی آئی۔ درحکم پاشا سے اس کے تعلقات بدستور ناخوشگوار رہے۔

ان تین برسوں میں مہرماہ کو خانم سلطان کے پاس جانے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ وہاں چلی جائے تو ایک ایسی خبر آئی کہ اس کا دماغ خلس ہو کر رہ گیا۔

قونیہ میں بائزید نے اپنی سیاہ میں اضافہ شروع کر دیا تھا۔ گویا اب دونوں بھائیوں میں جنگ چھڑنے والی تھی۔

مہرماہ نے سنا کہ اب سلطان سلیمان قونیہ روانہ ہو رہے ہیں۔ اس روایت کا مقصد دونوں بھائیوں کی چھٹکلی ختم کروانا بھی ہو سکتا تھا لیکن بائزید کی حکم عدولی کے باعث مہرماہ کے دل و دماغ میں غم و غشاہت کھیلانے لگے تھے۔

کچھ عرصے بعد خبر آئی کہ سلطان سلیمان کے وہاں پہنچنے سے فوراً ہی پہلے، دونوں بھائیوں میں جنگ ہو گئی تھی۔ اس جنگ میں بائزید کو شکست ہوئی۔ وہ امامیہ کی طرف بھاگا اور وہاں سے ایران چلا گیا۔

اب سلیم کو باپ کی حمایت حاصل ہو گئی اور بائزید کے باقی ہوجانے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

ایران کے شاہ طہماسپ صفوی نے بہت خوشی سے بائزید کو پناہ دی تھی۔ اس طرح وہ اپنے بچہ مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سلطان سلیمان کو پیغام بھیجا کہ اگر شری دوم اور وکیلہ فرات کا درمیانی ملاقات بائزید کو عطا کر دیا جائے۔

اس طرح شاہ طہماسپ ان صوبوں کو ایران کے زیر اثر لانا چاہتا تھا۔

سلطان سلیمان کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ اتنا بڑا لشکر لے کر وہاں نہیں پہنچا تھا کہ ایران کے مقابل باقاعدہ صف آرا ہو سکا اس لیے اس نے خط کتابت ہی جاری رکھی اور پھر دونوں فریق ایک معاہدہ کرنے پر تیار ہو گئے۔

مہرماہ کو یہ علم نہیں ہوا کہ وہ معاہدہ کیا تھا لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا کہ طہماسپ نے بائزید کو اس کے چاروں بیٹوں اور اس کے حرم کے ساتھ سلطان سلیمان کے حوالے کر دیا تھا۔

اس حوالگی کی خبر سے مہرماہ پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کے دل میں جو غصہ پیدا ہوا تھا وہ درست ثابت ہوا۔

بائزید کو اس کے بیٹوں سمیت لے کر دیا گیا تھا۔ سلطان سلیمان اپنے زندہ دور جانے والے ایک بیٹے شہزادہ سلیم سے بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھا اور اسی لیے وہ اس کی بے تحاشی آتے ہوئے اس کا خیال تھا کہ اپنی عزیز بیٹی مہرماہ کے ساتھ ہی باقی زندگی گزار دے گا لیکن مہرماہ کو اپنے بھائی بائزید سے اتنی محبت تھی کہ اس نے بیٹھ بیٹھ کے لیے باپ سے الگ ہوجانے کا فیصلہ کیا اور باپ کی واپسی سے پہلے ہی خانم سلطان کے گھر پہنچ گئی۔

☆☆☆

یہ پہلا موقع تھا جب مہرماہ رات ہونے پر وہاں پہنچی تھی۔ حسب معمول خانم سلطان نے اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی چومی لیکن خود اس میں جو غرق آگیا تھا، وہ مہرماہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ خانم سلطان کے ہاتھوں پر مسکراہٹ تو تھی لیکن ہنسی بھی تھی۔

”آپ کچھ اور اس میں خانم چھوئی!“

خانم سلطان نے اس کی بات کا متعہ ہوئے کہا۔

”کھانے کا وقت ہو چکا ہے لیکن آج کچھ دیر سے کھانوں گی۔ پہلے تمام۔“

”نہیں خانم چھوئی! اب کل صبح ہی مہم شیک رہے گا۔ ابھی تو کچھ ری آپ سے باتیں کر کے سونے کا ارادہ ہے۔“

”کھانا تو کھاؤ گی؟“

”ہاں کھانا تو کھاؤں گی۔ کھاتے ہوئے باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ آپ ایک بات ٹال نہیں میری۔ اور اس کیوں ہیں آپ؟“

”آؤ!“ خانم سلطان اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے کی طرف بڑھی۔ ”میری اداسی کا سبب مہماہ ہے۔“

”کیا؟ کیا ہوا ہے؟“ مہرماہ ہلکائی تھی۔

”اس صبح بہت عرصے بعد آئی ہو تم۔ کئی سال ہو گئے لیکن میں کوئی لگہ نہیں کر رہی ہوں۔ تم وہاں ایسے ہی حالات میں تھیں کہ یہاں آنا تمہارے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں خرم کی وفات پر بھی وہاں نہیں آ سکی۔“

”آپ پھر میری بات ٹال نہیں۔ مہماہ کے بارے میں کچھ کہا تھا آپ نے؟“ مہرماہ بے تابی سے بولی۔

”ہاں۔“ خانم سلطان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اس کی صحت تو پہلے ہی خراب رہنے لگی تھی، ان سالوں میں تو وہ بالکل ڈھیر ہو گیا ہے۔ تم اسے مشکل سے پہچان سکو گی۔“

مہرماہ نے ایک طویل سانس لی۔ خانم سلطان کی پہلی

بات سے وہ فوری طور پر کچھ اور ہی سمجھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ مہرماہ نے اس کے سینے اور پیٹ کے بارے میں پوچھا۔

خانم نے جواب دیا۔ ”وہ سال میں ایک آدھ بار آتی ہے۔ تم جانتی ہی ہو اس کی شادی جس ریاست میں ہوئی ہے، وہ بہت دور ہے۔ صاحب زادے اپنی تنہم کے ساتھ صوبیدار صاحب کے گھر گئے ہیں۔ وہاں کوئی تقریب ہے۔ میں اس لیے نہیں گئی کہ مہماہ بالکل اکیلا رہ جاتا۔ ویسے وہ اکیلا تو رہتا ہے۔ اپنے کمرے سے نکلتی ہی لپکتا ہے، پھر جہاں میں نہیں جاتی

تھی کہ محل میں وہ اکیلا رہ جائے۔ کنیزیں وغیرہ تو ہیں مگر۔“

”اب بھی اس کی وہی حالت ہے؟“ مہرماہ بول پڑی۔

”پہلے سے زیادہ خراب حالت ہے، ابھی بتا تو چکی ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ اس نے اپنے کمرے سے متصل ایک کمرے لے لیا تھا۔ بعد میں ایک کمرہ اور لے لیا ہے۔ جانے کیا کر رہا ہے وہ ان کمروں میں۔“

”آج میں دیکھتی ہوں جا کر۔“

”میرے دل کی بات آئی ہے تمہاری زبان پر۔“ خانم سلطان نے کہا۔ ”پہلے وہ ایک مرتبہ خیال آیا تھا مجھے لیکن نہ جانے کیا سوچ کر میں نے تم سے کہا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں اپنے کمرے میں آنے سے نہیں روک سکے گا۔ اتنی جرات نہیں کر سکتے گا۔“

”میں ابھی جاتی ہوں۔“ مہرماہ اٹھی۔

”پہلے کھانا تو کھاؤ۔“

دو کنیزیں کھانے کی سیٹیاں لیے اندر آ رہی تھیں۔ خانم سلطان نے اس کمرے میں آتے ہوئے کسی کنیز کو اشارہ کر دیا تھا۔

”نہیں خانم چھوئی!“ مہرماہ نے کہا۔ ”اب میں بے چین ہو گئی ہوں۔ پہلے دیکھ لوں جا کر۔“

”اچھا تو میں بھی جہاں میں کھانوں گی جب تم آ جاؤ گی۔“ مہرماہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ مہماہ کرا کرا کرا رہا تھا۔ کمرے کے سامنے رک کر اس نے ذرا توقف کیا جیسے کچھ سوچنے لگی ہو پھر آہستہ سے دستک دی۔

کسی قسم کا جواب نہیں ملا۔ کچھ توقف سے مہرماہ نے زیادہ زور سے دستک دی۔ اس کا فوری جواب ملا۔

”کون ہے؟“ آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

مہرماہ نے اپنا نام بتانے کے بجائے پھر دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے غصے میں بڑبڑانے کی آواز اور دروازے



قید خانہ

کاشف زبیر

ظنوں کا قریب بھی کیا کیا کرشمے دکھانا ہے... جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا... انہیں بھی یہی عارضہ لاحق تھا۔ اس دلدل میں دھنسنے دھنسنے وہ ایک ایسے قید خانے تک پہنچ گئے جسے وہ اپنے لیے سب سے مضبوط پتھرا گاہ سمجھتے تھے لیکن... رفتہ رفتہ بڑھنے والے حبس نے بتایا کہ وہ ایک قفس میں قیدی ہیں اور وقت نے بھی ثابت کر دیا کہ آزاد قضاوتوں میں اڑنے والے پنچھی تادیر قفس میں نہیں رہ سکتے۔

کے آسمانوں کی جستجو میں پھٹکنے والے حلاوتوں کی تلاش

ایک بلند اور ناقابلِ مہور فیصلہ تھی۔ جو اس فیصلے میں تھے وہ شہر کو دیکھا۔ شہر میں بلند عمارتیں تھیں اور اس کی گلیوں و سڑکوں پر چمک چمکاتی تھیں۔ خود راک اور سامان تیار کرنے والی فیکٹریوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شہر کے چاروں طرف

اس تربت میں دن کیا گیا جو اس نے پہلے ہی سے خود بخود ہی سوگ کے دن گزر جانے کے بعد شاہی جلوس شہر کی فسیل کے باہر روکے درختوں کے اس چمکند میں پہنچا جہاں حضرت ابو الیاب انصاری کی درگاہ تھی۔ وہاں ایک سفید ریش بزرگ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمکی سی غم دار تلواری تھی۔ اس تلوار کی نیام پر میرے ہاتھ ہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس درویش کو جو رزم ادا کرنا تھی، اس کا آغاز اس کے اجداد سے ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو تلوار تھی وہ خانوادہ عثمانیہ کی موروثی تلوار تھی۔ درگاہ سے کچھ دور ایک بلند سی جگہ پر دو گھڑسوار کھڑے تھے۔

”دیکھو یہ ہو؟“ ایک گھڑسوار نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ”ہاں۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”اس درویش کے ساتھ شہزادہ سلیم ہیں۔ میں نے انہیں پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب یہ شاید سولہ سترہ سال کے تھے۔ اب یہ چالیس چالیس سال کے ہوں گے۔“

”یہ کیا ہونے چاہا ہے؟“

”قابا تاج پوشی کی رسم ہے۔“

”میری خواہش ہے کہ تم اس منہر کی تصویر بناؤ۔ اس تصویر میں کچھ علامات بھی ہوں جن سے ظاہر ہو کہ یہ سلطنت عثمانیہ کے ذوال کا آغاز ہو رہا ہے۔“

”کیوں؟ کیا مطلب؟“

”یہ میری پیش گوئی ہے۔ یہ کسی جگہ کدھ ہو جائے تو اچھا ہے۔ میری زندگی تو ظاہر ہے کہ اس وقت تک نہ رہے گی لیکن مستقبل کا سو درخ جان لے گا کہ میری پیش گوئی کیا تھی۔“

اس وقت وہ درویش سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک بلند چوڑے پر لے جانے لگا تھا جہاں سے تمام سب کچھ دیکھ سکتے تھے۔ درویش نے شاہی تلوار سلیم کی کمر سے ہانسی۔ کوئی منصب دار ایک طشت میں تاج لیے کھڑا تھا۔ وہ تاج سلیم کے سر پر رکھا گیا اور ہر طرف مبارک سلامت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہو گھڑسوار اب دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک قبرستان کے قریب سے گزرے۔ ایک گھڑسوار نے اس قبرستان پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی جہاں تین سال پہلے رستم پاشا کی تدفین ہوئی تھی۔

اب بڑی بیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لوگوں میں چھٹیکوٹیاں ہونے لگی تھیں کہ ان دونوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی۔

مہرماہ کو علم تھا کہ جن فدا نام کوئل سے الگ کیا جاتا تھا۔ انہیں اتنی رقم دے دی جاتی تھی کہ وہ سکون سے اپنی باقی زندگی گزار سکیں لیکن اتنا کچھ ہرگز نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ بیش و عشرت کی زندگی گزار سکیں۔

اس اطلاع پر کچھ خیالات مہرماہ کے دماغ میں گلابانے لگے تھے جنہیں اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے دماغ سے نکال دیا۔

چند ماہ بعد اسے عالم سلطان کا خط ملا جس میں در سے خط لکھنے کی کچھ وجوہ بیان کی گئی تھیں جن سے مہرماہ کو دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے خط کے صرف پہلے اہم تھے۔ ”تم نہ جانے کیا جاؤ کر کے گئی ہو کہ عمارتیں بدلاؤ آتا ہی چلا گیا ہے۔ اس کی صحت اب بہت بہتر ہو گئی ہے۔“ انہی دنوں میں مہرماہ کی صحت گرنے لگی تھی۔

1665ء میں آسٹریلیا سے سلطنت عثمانیہ کی جنگ دوسری مرتبہ شروع ہوئی تھی۔ اس جنگ میں نئی چریوں کی کچھ تانیاں سامنے آنے پر ستر سالہ ضعیف سلطان سلیمان خود قسطنطنیہ سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی منصوبہ بندیوں کی وجہ سے پھر کامیابیاں حاصل ہونا شروع ہو گئیں۔ 2 اگست کو اس نے ”سستوار“ کا محاصرہ کیا۔ 8 ستمبر کو وہ شہر فتح کر لیا گیا۔ یہ سلطان سلیمان کی آخری فتح تھی۔ وہ اس فتح کا جشن بھی نہیں منا سکا۔ وہ 5 اور 6 ستمبر کی درمیانی رات کو اپنے خیمے ہی میں دائمی اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔

فتح کے بعد جب نئی چریوں کو اس کی موت کا علم ہوا تو انہوں نے گواروں سے اپنے خیموں کی مٹائیاں کاٹ دیں۔ اپنے سروں سے عباسے، خود اتار کر چھیک دیے اور تالہ و شینوں کرنے لگے۔ سلطنت عثمانیہ کے ہر فرماں رواں کی موت پر وہی طرح سوگ منایا کرتے تھے۔

شہزادہ سلیم اس وقت بلغراد میں تھا۔ اسے اطلاع ملی تو وہ اپنی سب سے قیمتی بیوی نور بانو اور جینیٹ چار سالہ بیٹے شہزادہ مراد کے ساتھ تیزی سے واپس لوٹا۔

کیا تین بچے ماحول

تاریخ اسلام	تاریخ عرب	تاریخ ایران	تاریخ اٹلی	تاریخ ایران اسلام	تاریخ قزاق
مفتاح معارف اسلامیہ	مفتاح معارف اسلامیہ	مفتاح معارف اسلامیہ	مفتاح معارف اسلامیہ	مفتاح معارف اسلامیہ	مفتاح معارف اسلامیہ

رہ سکتا تھا، درحقیقت ایک بہت بڑا قید خانہ تھا۔ اس میں لاکھوں انسان رہتے تھے مگر قیدیوں کی طرح۔ انہیں کھانے کو ملتا تھا، پہننے کو لباس میسر تھا۔ وہ رہائش رکھتے تھے اور محدود تفریحات بھی میسر تھیں مگر اس کے بدلے انہیں مٹی کوسل کے قوانین اور دقتوں سے نازل ہونے والے احکامات کی عمل پائنداری کرنا ہوتی تھی۔ تا فرمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تا فرمانی کی ایک ہی سزا تھی۔ محبوب کو شہر سے نکال دیا جاتا۔ جہاں اسے کھانا اور پانی کچھ نہیں ملتا تھا کیونکہ صرف اس شہر کے آس پاس ہی نہیں بلکہ اس پورے سیارے پر سحر اقبالہ کر چکا تھا۔ مٹی کی سرسبز دشتا دلی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ ہر طرف اڑتی ریت مٹی یا سنگسار غلے اور پھاڑ تھے۔ سمندر اور دریا خشک ہو چکے تھے۔ ہر قسم کی نباتات اور جاندار ختم ہو گئے تھے۔ انسانوں کی آبادی بھی محض کربس اسی شہر تک محدود ہو گئی تھی۔ نسل انسانی کی جگہ کے لیے سخت قوانین نافذ کیے گئے اور ان کے نفاذ کے لیے بڑا دھوکہ دیا گیا تھا۔ کام لیا گیا تھا۔ شروع میں یہ کام نیک نیتی سے کیا گیا تھا مگر بعد میں مٹی کوسل کے نام پر ایک اہلیت کلاس وجود میں آئی جو پیش و آراء سے زندگی بسر کرتی تھی اور عام لوگوں کو بس گناہوں سے لائق مانتا تھا۔ رہائش کے لیے کثیر العوالم تیار کیے جاتے تھے۔ مٹی کی رنگ کی یہ ایک بھی عمارتیں مضبوط اور باسکولت تھیں مگر ان میں شہریوں کو بس گناہوں سے لائق جگہ ملتی تھی۔ اسی طرح کھنڈیاں قائم کی گئیں۔ اسکاٹی اسکرپر میں فارمز بنائے گئے جن میں خوراک اگتی تھی۔ یہاں کھونٹک کی مدد سے ایسے جانور اور پرندے پالے جاتے تھے جن کا گوشت خوراک کے کام آتا تھا۔ شہر کے پیچھے پانی کا بہت بڑا ذخیرہ تھا لیکن اس سے صرف ضرورت کا پانی لیا جاتا تھا اور استعمال ہونے والے پانی کو تھوڑے فیصد تک صاف کر کے دوبارہ استعمال کیا جاتا تھا۔

قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ ساتھ متحدی بیماریوں کے شکار افراد کو بھی شہر سے نکال دیا جاتا تھا تا کہ دوسرے اس بیماری سے محفوظ رہیں۔ جن لوگوں کو شہر سے نکالا جاتا انہیں شہر سے کئی سو کلو میٹر دور کسی دیرانے میں چھوڑ دیا جاتا جہاں سے وہ کسی صورت واپس شہر تک نہیں آسکتے تھے اور وہیں بھوکے پیاسے مر جاتے۔ اگر کوئی شہر کی طرف واپس آ بھی جاتا تو اس کے لیے دروازہ نہیں کھلتا تھا اور وہ فیصلے سے سرگرداں کر رہا جاتا تھا۔ سٹیری کا پ آرٹیری ایک انجینئر تھا۔ پھر اسے کوئی جلدی

پتاری ہوئی اور اسے اس کے اہل خانہ سمیت شہر سے ایک دیرانے میں پھینک دیا گیا۔ سٹیری کے ملاوہ ان کے تین بچے اور تھے۔ دیرانے میں پھینکے جانے کے بعد وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں انہیں پانی اور خوراک مل سکے۔ وہ صحراؤں اور پہاڑوں میں گھومتے رہے اور اسی سفر کے دوران ایک ایک کر کے سٹیری کے تینوں بچوں بھائی اور ماں بھوک پیاس اور سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر موت کی آغوش میں جا سوتے۔

سٹیری اور آرٹیری بھی قریب المرگ تھے جب وہ ایک پہاڑ کے نیچے غار تک پہنچے جہاں کامیاب ہو گئے۔ اس غار میں پانی کا چشمہ تھا اور اس چشمے کے ساتھ ایسی کافی آبی ہوئی تھی جسے کھایا جاسکتا تھا۔ کو یا اس پانی اور کافی نے ان کی جان بچائی تھی۔ آرٹیری اہل علم یافتہ شخص تھا۔ انجینئرنگ سے ہٹ کر دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی اس کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس نے ایک دن دس سالہ سٹیری سے کہا۔ ”اس دنیا میں اور بھی شہر تھے لیکن پھر وہ دیران ہو گئے۔ مگر ان کی عمارتیں اور سامان اب بھی موجود ہے۔“

سٹیری حیران ہوا۔ ”ایسے شہر کہاں ہیں؟“ آرٹیری کے پاس اس کا اپنا بتایا ہوا نقشہ تھا۔ یہ نقشہ اس نے مٹی کوسل کی لائبریری میں موجود نقشوں سے نقل کیا تھا۔ عام لوگوں کو اس لائبریری میں جانے کی اجازت نہیں تھی مگر آرٹیری کو انجینئر ہونے کی وجہ سے یہ سہولت تھی کہ وہ لائبریری سے استفادہ کر سکتا تھا۔ وہ لائبریری یا صرف اہلیت کلاس کے لیے تھی۔ اس نے موقع پا کر وہاں سے اس نقشے سمیت بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جب اسے شہر سے نکالا گیا تو اب یہ معلومات اس کے کام آ سکتی تھیں۔ آرٹیری نے نقشے کی مدد سے سٹیری کو بتایا۔ ”یہاں سے شمال کی طرف دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مردہ شہر ہے۔ اگر ہم اس کی طرف سفر کریں تو ایک ہفتے میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“

”پاپا! امرہ شہر میں جانے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“ وہاں سے ہمیں سامان ملے گا، اس سامان سے ہم بہت کچھ بنا سکیں گے۔“ آرٹیری نے کہا۔ پھر ان دونوں باپ بیٹے نے راستے کے لیے پانی اور خشک کافی کی خوراک کا ذخیرہ کیا اور مردہ شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں اندازے سے بڑا زیادہ وقت لگا مردہ پالا خوروں کی پیچھے میں کامیاب رہے۔ شہر صدیوں پہلے مردہ ہو گیا تھا۔

اس کی عمارتیں بھی کھنڈر ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود انہیں وہاں استعمال کے قابل بہت سی چیزیں مل گئیں۔ آرٹیری نے انہیں استعمال کے قابل بنالیا۔ انہیں مٹی کوسل سے ملنے والی اتر بانیک ٹیٹس، ہتھیار اور ریلے کے آلات ملے۔ سب سے بڑھ کر انہیں پانی بھی مل گیا تھا مگر کھانے کے آلات کوئی چیز نہیں ملی تھی۔ آرٹیری اپنا فن اور معلومات سے کوئل کر رہا تھا۔ اتر بانیک کی مدد سے وہ دس دن کا سفر صرف چند گھنٹے میں طے کر کے واپس غار تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں سے کافی کا تازہ ذخیرہ لے کر وہ مردہ شہر کی طرف گئے۔ یہاں بہت سا سامان تھا جسے وہ غار تک منتقل کر سکتے تھے۔ اس کام میں انہیں سالوں لگے مگر انہوں نے بآخرو غار کے پاس اپنے لیے رہائش اور دوسری سہولتیں حاصل کر لیں۔ مردہ شہر سے انہیں محفوظ کیے ہوئے آلو کے بیج ملے تھے۔ سٹیری نے انہیں تجربے کے طور پر زمین میں بویا۔ غار سے پانی اکڑوہ ان کی سہولتی کرتا رہا اور پھر ایک دن زمین سے آلو کے پودوں نے سر اٹھایا۔ وہ دن سٹیری کے لیے بہت یادگار تھا۔

ایک طرف وہ زندہ رہنے کا سامان کر رہے تھے تو دوسری طرف آرٹیری کی جلدی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے پاس علاج کے لیے کچھ نہیں تھا اور پانچ سال بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے سٹیری سے کہا۔ ”سٹ! میرے بعد تم اگلے رہ جاؤ گے مگر گھبرا مت۔ خود کو مضبوط کرنا۔ ابھی تم صرف پندرہ سال کے ہو۔ جب تم پختہ عمر تک پہنچ جاؤ تب شہر کی طرف جانا اور وہاں سے ان لوگوں کو یہاں لانا جو آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تم ایک نیا شہر آباد کر سکو گے۔ یہاں تم لوگ بیج بچ آزاد ہو گے۔“

”میں ایسا ہی کروں گا پاپا۔“ سٹیری نے باپ سے وعدہ کیا۔ اس نے باپ کو مرنے کے بعد مکان کے پاس ہی دفن کیا۔ اب وہ اکیلا تھا مگر ذمے داریوں کے لحاظ سے اسے فرقی نہیں پڑا۔ وہ گزشتہ دو سال سے کام کر رہا تھا۔ آرٹیری صرف اسے ہدایات دیتا تھا۔ اس نے سٹیری کو سکھایا تھا کہ بیج و کوسل کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور پیشہ کی مرمت کس طرح کی جاتی ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد بھی سٹیری نے مردہ شہر آمدورفت جاری رکھی۔ اس نے کی طرح کے ہتھیار بھی حاصل کر لیے اگرچہ اسے کسی سے خطرہ نہیں تھا۔ بیوے مٹی کوسل کی طرف سے۔ اگر مٹی کوسل کو بچا چل جاتا کہ شہر سے باہر کوئی زندہ

فصل ہے اور اس نے زندہ رہنے کے لوازمات بھی تلاش کر لیے ہیں تو وہ یقیناً اسے مارنے کے لیے اپنے خاص دستے بھیجے۔ اس لیے سٹیری نے اپنی رہائش کو محفوظ بنالیا۔ ہوا تھا تا کہ وہ نقصان سے محفوظ رہے مگر آلوؤں کے پودے نظر آ جاتے۔ اس لیے سٹیری باپ کے مرنے کے بعد کم سے کم آلو کا کاشت کرتا تھا اور اس کے بیج بہت احتیاط سے محفوظ رکھتا تھا۔

کئی سال بعد جب وہ ایک جوان اور مضبوط شخص بن گیا تو اس نے شہر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے لیے ایک پلان کی ضرورت تھی۔ سٹیری نے خاصے خورد خوض کے بعد ایک پلان سوچ لیا۔ اس نے سب سے پہلے شہر کے پاس ایک محفوظ جگہ تلاش کی اور وہاں سامان منتقل کرنا رہا۔ وہ مردہ شہر سے کئی اتر بانیک پرزوں کی صورت میں لے آیا تھا اور انہیں یہاں جوڑ کر اس نے حزیہ اتر بانیک تیار کر لی تھیں۔ جب اس نے شہر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تو اتر بانیک بھی شہر کے پاس اپنے محفوظ کھانے پر لے گیا۔ خوراک، پانی اور ہتھیاروں کا مناسب ذخیرہ بھی اس نے وہاں چھپا دیا تھا۔ ان سب چیزوں کو اس نے ابھی طرح محفوظ کر لیا تھا کیونکہ شہر کے آس پاس مٹی کوسل کے خاص دستے گشت کرتے تھے اور وہ فضائی غرائی بھی کرتے تھے۔ صبح کا وقت تھا، سٹیری باندی سے نیچے پیچھے شہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ شہر اس کے لیے ابھی نہیں تھا۔ اس نے دس سال یہاں گزارے تھے۔ اب وہ پانچ سال کا بچہ تھا اور اس دوران میں شہر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تبدیلی ابھی نہیں سکتی تھی کیونکہ گزشتہ ڈھائی سو سال سے شہر کی آبادی کا حساب ایک ہی چلا آ رہا تھا۔ ہر سال جتنے نوجوان انسان کارکن کی حیثیت اختیار کرتے تھے اُتنے ہی عمر رسیدہ افراد کو شہر سے نکال کر دیرانوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ غیر کارکن افراد میں صرف پندرہ سال سے کم عمر افراد تھے جو پڑھتے تھے اور مختلف ہنر سیکھتے تھے۔ عمر رسیدہ افراد میں کسی کو بیکار نہیں رکھا جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆ گارڈ نے سٹیری کو دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی میں جا کر۔ ایک کھٹا پیٹے وہ تباہ حال فیصل کے دروازے تک پہنچا تھا۔ وہاں گارڈ نے اسے گرفتار کر لیا اور ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا۔ اسے مٹی کوسل کی بیج مٹی کے سامنے پیش کیا جاتا جو اس کی قسمت کا فیصلہ کرتی۔ سٹیری نے اپنا نام آئن روڈز بتایا تھا۔ اس

نے گاؤں کو تباہ کیا کہ وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ایک غار میں رہتا تھا جہاں پانی اور کافی سے ان کا گزارہ ہوتا تھا مگر پھر پانی کا چشمہ سوکھ گیا اور اس کے اہل خانہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو گئے۔ وہ اسی غار میں پیدا ہوا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کہاں سے آئے تھے۔ وہ کئی نسلوں سے اسی غار میں رہ رہے تھے۔ پھر وہ جان بچانے کے لیے صحرا میں چل پڑا اور بھٹکتا ہوا اتفاقاً اس شہر کے سامنے آگیا۔

سنت ہیری کو معلوم تھا کہ گاؤں کے مقابلے میں بیچ کھیتی اس سے زیادہ مفصل پوچھ گچھ کرے گی۔ اس نے خود کو ان پڑھ اور کم ذہن کا آدمی ظاہر کیا تھا جس کے پاس بولنے کے لیے الفاظ بھی کم تھے اور وہ بس چند ایک چیزوں کا نام ہی جانتا تھا۔ اس نے اپنے پاس سے ہر ایسی چیز چھوڑ دی تھی جس سے اس شہر سے اس کا تعلق ثابت ہو سکے۔ اس نے مردہ شہر سے ملنے والے لباسوں میں سے ایک لباس پہنا ہوا تھا۔ گاؤں کے جانے کے بعد اس نے ٹوٹھری کی کھڑکی سے چھانک کر دیکھا۔ یہ اس عمارت کی شاید 100 ویں منزل تھی۔ بہت نیچے شہر کی روشنائی دکھائی دے رہی تھی۔ پورے شہر کو ایک فیوژن ری ایکٹر بجلی فراہم کرتا تھا۔ اس ری ایکٹر میں پانی بھرا رہتا تھا۔ استعمال ہوتا تھا اور پھر پانی سو لیز بنائی سارا۔ سال بجلی پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اسی بجلی سے یہاں کا نظام زندگی چلتا تھا۔ ایلیٹ کلاس کے لیے شہر میں الگ جگہ تھی۔ وہاں کوئی عام آدمی نہیں جاسکتا تھا۔ ان کی رہائی عمارتیں بڑی اور خوب صورت تھیں۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے اور اب لوگ گھروں سے نکلنے لگے تھے۔ یہاں رہنے والے بارہ بجھے کام کرتے تھے۔ وہ صبح چھ سے شام چھ بجے تک مسلسل مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد وہ آٹھ بجے تک اپنی رہائش گاہ تک محدود رہتے تھے اور پھر انہیں آٹھ سے گیارہ بجے تک باہر نکلنے اور مخصوص تفریحات میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ گیارہ بجے تک تمام افراد کو لازمی اپنی رہائش گاہوں تک پہنچ جانا ہوتا تھا ورنہ ان کے دروازے خود کار انداز میں بند ہو جاتے اور گیارہ بجے کے بعد جو باہر پایا جاتا اسے کئی گاؤں گرفتار کر لیتے۔ ایک بار ایک شخص قید کی سزا ہوئی تھی اور تیسری بار۔۔۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو شہر بدر کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے لوگ بہت محتاط رہتے تھے۔ خوراک، لباس اور گھر لگے سامان سب کو ملتا

تھا اور تفریح کے لیے مخصوص ٹوکن دیے جاتے تھے۔ ان ٹوکن ختم ہو جاتے، ان کو آٹھ بجے کے بعد بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

یہاں کل فون نہیں تھے۔ وائرلیس رابطے کی سہولت صرف حکومت اور اس سے متعلقہ افراد کو دی گئی تھی۔ باقی سب کے پاس لائن والے فون تھے مگر کوئی کسی سے براہ راست رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔ رابطہ صرف آپریٹر کر سکتا تھا۔ بچوں کو ماں باپ سے اس وقت سے لیا جاتا تھا جب وہ نو سال کے ہوتے تھے پھر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کونسل کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کے رجحانات دیکھ کر ان کے شعبوں کا تعین کیا جاتا اور پھر انہیں ان مخصوص شعبوں کی تربیت دی جاتی تھی۔

پندرہ سال کی عمر میں انہیں فیکٹریوں یا ان کے شعبوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان والوں سے مل سکتے تھے۔ دس پہلے انہیں محدود اجازت ہوتی تھی۔ سال میں ایک دو بار ہی وہ گھر والوں سے مل سکتے تھے۔ بجلی زندگی میں آنے کے بعد وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں سے مل سکتے تھے مگر رہائش سب کی الگ الگ ہوتی تھی۔ شادی پسندی کی جانی تھی مگر میڈیکل ٹیسٹ لازمی تھا۔ شادی کی اجازت کا انحصار اس کے کثیر ہونے پر ہوتا تھا۔ جب کارکن بوڑھے ہو جاتے اور ان سے مزید کام نہیں ہوتا تو انہیں اس وقت تک کے لیے ان کے بچوں کے سپرد کر دیا جاتا جب تک بجلی کونسل انہیں اضافی قرار دے کر شہر بدر نہیں کر دیتی تھی۔ اپنے بوڑھے ماں باپ یا بزرگوں کے لیے کارکنوں کو راشن اور پانی کے معاملے میں قربانی دینی پڑتی تھی اور انہیں ہفتے میں چھٹی کے دن بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

عام لوگ زیادہ سے زیادہ پورے گاؤں کو دیکھ سکتے تھے، اس سے اوپر تمام جدید رابطہ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بچے مختلف ماحول میں پرورش اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انہیں ان کے ماں باپ اور خاندان کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ وہ پانچ بچوں سے متعلق تھے۔ ان کے بوڑھے شہر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ مگر بچے پیدا کرنے کے حوالے سے ان پر بھی پابندیاں تھیں۔ کوئی بچہ دو سے زیادہ نہیں پیدا نہیں کر سکتا تھا ورنہ تین آخری حدھی۔ اس کی اجازت بھی مخصوص حالات میں ملتی تھی جب ایلیٹ کلاس کے کسی جوڑے کے ہاں دو بچے نہیں ہوتے یا سرے سے بچے ہی پیدا نہیں ہوتے تو ان کی جگہ کسی دوسرے

جوڑے کو مزید بچے پیدا کرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ ان کا مقصد ایلیٹ کلاس کی تعداد کو برقرار رکھنا تھا۔ وہ محدود تعداد کی وجہ سے تو ایلیٹ کلاس تھے۔ صدیوں سے یہ نظام کامیابی سے چلا آ رہا تھا۔ عام انسان بھی اس کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ اس کے خلاف کچھ سوچتے ہی نہیں تھے۔

سنت ہیری روشن دان سے باہر دیکھتے ہوئے یہ سب سوچ رہا تھا۔ اسے آرٹ ہیری نے سب بتایا تھا۔ یہاں آئے ہوئے اسے چند کھٹے ہوئے تھے مگر اس کا دم ابھی سے کھٹے لگتا تھا۔ وہ آزادی کا مزہ کچھ چکا تھا شاید اسی لیے اسے کھٹن ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے غلطی تو نہیں کی ہے؟ اگر کونسل نے اسے شہر بدر کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے کسی بھی درجے میں پھینکا جاسکتا تھا جہاں وہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو جاتا۔ وہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا تھا جب اسے قبول کر لیا جاتا اور شہر میں رہنے کی اجازت دے دی جاتی۔ اس نے اپنی زندگی کا رسک لیا تھا مگر یہ ضروری تھا۔ وہ ساری عمر ایلیٹ اور رائے میں نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے انسانوں کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ اسے دشمنوں کی ضرورت تھی۔ کوئی لڑکی اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں بنتی۔ ان کی سب آگے بڑھتی اور وہ اس سارے پر ایک اور آبادی بناتے جہاں انسان آزاد ہوتا۔ وہاں پر بھی قوانین ہوتے مگر سب کے لیے ایک جیسے ہوتے۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ ایک بڑا مقصد لے کر یہاں آیا تھا۔

اگلے دن اسے بیچ کھیتی کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ پوری تاری سے آیا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کس سوال کا کیا جواب دینا ہے۔ اس نے پورے اعتماد سے جوابات دیے مگر بیچ کھیتی کے سخت شکلوں والے اراکین کو اگا کر وہ بہت سہاوا اور کٹھن ہے۔ یہ اس کی اداکاری تھی اور اسی وجہ سے فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔ کھیتی نے اسے شہر میں رہنے کا حق دے دیا مگر ساتھ ہی ایک مہینے کی آزادی مدت کی شرط لگا دی۔ اگر اس دوران میں وہ خود کو ایک کارآمد شہری ثابت نہیں کر پاتا تو اسے شہر بدر کر دیا جاتا۔ اسے جیل کے بجائے خدمات کے شعبے میں بھیج دیا گیا جہاں آرکسل نامی شخص کو اس کا پاس مقرر کیا گیا اور اس نے تین دن تک آسانی سے کیے جانے والے محنت کے مختلف کاموں میں اس کا احسان لیا اور بالآخر اسے ایک موزوں سینئرری ورکر قرار دیا۔ جوڑوں اور گھریلو صفائی اور کچرا ہانڈے کا کام کر سکتا تھا۔ چوتھے دن اسے سینئرری فورس میں بھیج دیا گیا۔

سنت ہیری نیکیا چاہتا تھا۔ اس کام میں وہ آزادی

سے محروم پھر سکتا تھا۔ اگر اسے کسی ٹیکسٹری میں بھیج دیا جاتا تو اس کی آزادی بس وہیں تک محدود ہو جاتی۔ محدود صفائی کرنے والے کے طور پر شہر کے بڑے حصے میں محروم پھر سکتا تھا اور لوگوں سے رابطہ بھی کر سکتا۔ اسے ایک رہائشی عمارت میں کمرال کیا گیا۔ یہاں بیٹے کا راشن ایک ساتھ دیا جاتا۔ اسے بھی بیٹے کا راشن مل گیا۔ اس کے شیعے کے لوگ دو ششوں میں کام کرتے تھے۔ ایک شفت دن کی ہوتی تھی اور ایک رات کی۔ ہر بار انہیں چھ کھٹے کام کرتا ہوتا تھا اور اس دوران میں وہ اپنا علاقہ مکمل صاف کرنے کے ذمے دار تھے۔ رات آٹھ بجے دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی تفریح کی آزادی ملتی تھی۔ کام کے چوتھے دن جب وہ تفریح کے لیے نکل رہا تھا تو اس نے سڑک پر مختصر سا بھاگ مہ دیکھا۔ بجلی گاؤں ایک بوڑھے کو کھینچ کر لے جا رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی رو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔

”پلیز! میرے گریٹ پاپا کو مت لے جاؤ۔“
بچہ حارور رہا تھا مگر اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جب اسے گاڑی میں دھکیلا گیا تو اس نے چلا کر کہا۔ ”اپنا خیال دیکھنا میری بیٹی۔“
لڑکی اب دھماڑیں مار کر رو رہی تھی۔ گاڑی اس کے دادا کو لے کر چلی گئی۔ لوگ لڑکی کے آس پاس سے گزر کر چاہتے تھے مگر کسی نے اسے تسلی کے دو لفظ نہیں کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی کوئی اس کے پاس رکا۔ سنت ہیری بھی اسے دور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لڑکی کے پاس جائے اسے تسلی دے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کا آزمائشی عرصہ تھا اور اگر اس دوران میں وہ کوئی ایسا کام کر جاتا جو کونسل کی نظر میں جرم ہوتا تو اسے شہر بدری کا پروانہ مل جاتا۔ اس لیے وہ دل سوس کر رہ گیا۔ لڑکی کچھ دیر کھڑی رہی پھر وہیں سڑک پر فٹ پاتھ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اگر پہلے اس کا کہیں جانے کا ارادہ تھا تو اب اس نے متوی کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سوائے دادا کے اس کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرے رشتے دار بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ سنت ہیری سڑک کے دوسری طرف تھا اور وہاں سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد لڑکی اٹھی اور ست قدموں سے ایک طرف چلی پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کچھ واضح نہ ہو کر اسے کیا کرنا ہے اور کس طرف جانا ہے۔ سنت ہیری کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے ساتھ ساتھ سڑک کے دوسری طرف چلنے لگا لیکن ساتھ ہی وہ بہت محتاط بھی تھا۔ اگر کوئی

گاؤں نظر آتا تو وہ چلنے کے دوران لڑکی کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ بالآخر لڑکی ایک تارکک جہی کی طرف مڑی تو سٹ بیڑی نے سڑک عبور کی اور اس جہی میں آگیا۔ جہی ششان اور تارکک جہی۔ لڑکی کے قدموں کی چاپ اس کی راہنمائی کر رہی تھی۔ مگر ایک جگہ پہنچ کر لڑکی کے قدموں کی آہٹ کم ہو گئی۔ سٹ بیڑی تیزی سے آگے بڑھا مگر لڑکی کہیں نہیں جھی۔ اس جگہ سے جہی دو طرف اور نکل رہی تھی اور دونوں راہیں تارکک جہیں۔ سٹ بیڑی فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ لڑکی کس طرف جہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹاکاں اچس آگیا۔

کے تمام حصوں میں مسلسل چلتی رہتی تھیں۔ کوئی بھی فرد مخصوص اسٹاپ سے ان میں سوار ہو سکتا تھا۔ یہ سروس اسٹاپس پر کرتی تھیں۔ اچانک لڑکی دوسری طرف کے اسٹاپ پر رکنے والی وین میں سوار ہو گئی۔ جب تک سٹ ہیری سڑک عبور کر کے اس طرف آتا، وین کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ آگے روانہ ہو گئی۔ سٹ ہیری نے یہ بھی سے اسٹاپ دیکھا۔ ایک منٹ بعد دوسری وین آئی تو وہ ان میں سوار ہو گیا۔ لڑکی والی وین بہت آگے جا چکی تھی۔ سٹ ہیری نے اسٹاپ پر دیکھا کہ۔

ایک چھپا سا کرا تھا۔ وہ اس کے فرش پر ایک جال میں لپٹا ہوا تھا۔ روشنی اس سے بہت گہری کیچڑی ہوئی تھی۔

"یہ روٹی ہے۔"

سب تیری پیچھے میرے دیکھا، باہر اس نے نرمی سے کہا "مجھے کھول دو، مجھ سے تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"کہو جس سے کہو۔" دوسرا آدمی بولا۔ وہ ایک کونے میں کھڑا تھا۔ "تم کو اس کے پاسوں ہو۔ اس سے تم کو بھی نہیں دیکھا۔"

"خفا ہے اور مجھے اس لیے پہلے کسی دیکھا کہ میں ابھی آیا ہوں چند دن پہلے۔"

”اسے آزاد کرو۔“ روٹی نے کہا۔
 ”لیکن یہ۔“ دوسرے آدمی نے کہنا چاہا۔
 ”اسے کھل دو۔“ اس بار روٹی کا لہجہ ٹھکانہ تھا۔ ایک
 منٹ بعد سب تیری کھڑا ہوا ایسا جسم سہارا تھا۔ بیٹھے جانے
 سے اسے جا بجا پتوں اور خراشوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
 ”تمہارا گھر یہ۔“ اس نے روٹی سے کہا اور پھر
 پوچھا۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ روٹی نے کہا اور اسے اندر ایک کمرے میں لے آئی۔ یہ تمام کمرے جحر اور اینٹوں سے بنے تھے اور ان میں دروازے نہیں تھے۔ شہر میں اس قسم کے کسی ٹھکانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، یہ یقیناً خلیہ تھا۔ یہاں روشنی تھی۔ روٹی نے اس کا ہاتھ دیکھا جو اچھا خاصا شچی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ڈبا اٹھایا اور اس سے مخلول کی شیشی اور روٹی نکال کر اس کا دھم صاف کرنے لگی۔ سنہ پیر کی نے آپس سے پوچھا۔

”وہ تمہارے دادا کو لے گئے۔“
روٹی کے جراثیم بدلے۔ اس کے چہرے پر بیک وقت غصہ اور غم نظر آیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”شاید ان کو کسک دیرانے میں پہنک دیا گیا ہو۔“
”مجھے افسوس ہے۔ کیا ان کے سوا تمہارا اور کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟“

اس نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”میرے ماں باپ کو اس وقت شہر بدر کر دیا گیا تھا جب میں صرف چار سال کی تھی۔ وہ کسی کو نہیں معلوم۔ پھر جب میں کارکن بنی تو دادا جان رہناڑ ہو گئے۔ وہ میرے پاس رہنے گئے کیونکہ ان کو دلچسپی بھالی کی ضرورت تھی۔ پھر وہ دو انجیل بھی لے گئے۔“

”اب وہ انجیل کئی ویرانے میں پھینک دیں گے یا پھینک چکے ہوں گے جہاں وہ بھوک پیاس سے ہلاک ہو جائیں گے۔ کیا ہمارا یہی مقدر ہے؟“ سن بیری نے لٹی سے کہا۔

روٹی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا: ”مجھے لگ رہا ہے تم نے جھوٹ بولا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے میں کوسل کا جاسوس ہوں؟“

”نہیں، تمہاری اس بات پر تو یقین ہے لیکن اس پر یقین نہیں آ رہا کہ تم کبھی جا یہاں آئے ہو۔ مجھے لگ رہا ہے تم اس شہر اور یہاں بسنے والوں کے بارے میں اتنا غی جانتے ہو جتنا کہ تم جانتے ہو۔“

سب جبری سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا: "میں جی
 بھائیوں کا لیکن اس سے پہلے تم سے ایک سوال کرنا چاہوں گا۔"
 "کیسا سوال؟"
 "نیکیا کہ کیا تم اور جہاد سے ساتھی اس جبری زندگی
 سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"پائلے۔" رونی نے سر ہلایا۔ "ہم کب سے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن اب تک کامیاب نہیں ہوئے۔"

"کیا تم لوگ شہر پر قبضہ کرنا چاہتے ہو یا یہاں سے نکل جانا چاہتے ہو؟"

"ہم یہاں آؤ اور رہنا چاہتے ہیں۔" رونی نے اپنا مقصد بیان کیا۔

سٹ ہیری نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ میرا ایک سوال اور ہے کیا کل تمہارے لوگوں کا کافی کارڈز سے تصادم ہوا تھا؟"

رونی چونکی۔ اس کے تاثرات بدل گئے اور اس نے اچانک ہاتھ سامنے کیا تو اس میں فائر کور تھا۔ اس نے سرو کچے میں پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"واہیں آنے کے بعد مجھے سینیٹیویٹ لگا گیا ہے اور میں بھی اس دوسرے میں شامل تھا جس نے تصادم کے مقام کی صفائی کی تھی۔"

"ہمارے چار ساتھی مارے گئے اور دو بچکے گئے۔" رونی نے فائر کور نیچے کر لیا۔ "تم نے کہا واہیں آنے کے بعد۔ اس کا مطلب؟"

سٹ ہیری نے اسے اپنی اصل کہانی سنائی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ شہر سے باہر بھی پانی کا ذخیرہ ہے اور زمین بدستور زرخیز ہے۔ سٹ ہیری نے کہا۔ "یہ سچ ہے۔ میں نے آلو اگائے اور مجھے یقین ہے کہ پانی ہو تو باقی سبزیاں اور پودے بھی اگ سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں بتایا جاتا ہے کہ زمین خیر ہوگئی ہے اور شہر سے باہر نہیں پانی نہیں ہے۔"

"یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، ہمیں غلام بنا کر رکھنے کے لیے۔" رونی نے نفی سے کہا۔ "لیکن جلد ہم اس جبر کے نظام کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔"

"رونی! یہ ممکن نہیں ہے۔ تم چند لوگ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اسی طرح تلاش کر کے تمہیں ختم کر دیں گے۔"

"تب ہم کیا کریں؟"

"یہاں سے نکل چلو۔ میں جانتا ہوں اس پاس مردہ شہر ہیں، وہاں سے ہمیں سامان مل سکتا ہے۔ خود میں نے اور میرے پاپائے وہاں سے سامان لے کر بہت ساری چیزیں بنائی ہیں۔ میرے پاس اڑا بایک بھی ہے جو یہاں سے کچھ دور ایک جگہ چھپائی ہے۔"

"ہم بازو زہر نہیں رو سکتے۔" رونی نے نفی میں سر ہلایا۔ "پانی کا ذخیرہ جس کی تم بات کر رہے ہو، وہ ناقابل

اعتماد ہے۔ کبھی بھی ختم ہو سکتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہمارے ہمیں حالات بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"میرا نہیں خیال۔۔۔ کہ تم لوگ یہاں کے حالات بدل سکتے ہو۔"

اچانک دوسرا آدمی جو اصل میں ایک نوجوان لڑکا تھا، تیزی سے اندر آیا اور اس نے سٹ ہیری کو دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ "میں نے کہا تھا یہ کونسل کا جاسوس ہے۔"

"میں جاسوس نہیں ہوں۔" سٹ ہیری نے مزاحمت کیے بغیر کہا۔ "میں آؤ تھا اور صرف اس لیے یہاں آیا ہوں کہ جو لوگ اس قید خانے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"تم نے کیا سمجھا، یہاں سے باہر جانا آسان ہے؟"

دوسرا آدمی زہریلے لہجے میں بولا۔

"پائلے آسان ہے۔" سٹ ہیری نے یقین سے کہا۔ "میں نے تمام خفیاتی انتظامات کا جائزہ لیا ہے۔ مسلسل کی برائے نام ہی نگرانی ہوتی ہے کیونکہ کونسل کو یقین ہے کہ کوئی یہاں سے باہر جا کر مرنا نہیں چاہے گا۔ ہم ذرا سی کوشش سے نکل سکتے ہیں۔"

"اور اس کے بعد بھوکے پیاسے صحرا میں مرجائیں؟" پہلا لڑکا بھی اندر آگیا۔ اس کا رویہ بھی جارحانہ تھا۔

"کیسے مرجائو گے، جب میں زندہ رہا ہوں۔"

"یہ جواس کر رہا ہے۔" دوسرا پھر بولا تھا کہ سٹ ہیری نے اس کے منہ پر گولی سے وار کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گر اور اس کے بعد دونوں پھر کرسٹ ہیری کی طرف آئے جسے کہہ روئی درمیان میں آگئی۔

"رنگ جاؤ۔" رونی نے سخت لہجے میں کہا۔ "یہ جو کہہ رہا ہے، میں اس کی تصدیق کر سکتی ہوں۔"

"جب تک یہ کونسل کو ہمارے بارے میں بتا دے گا۔"

"جب تک یہ یقین رکھے گا۔" رونی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "سچ جھوٹ سامنے آنے کے بعد اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" سٹ ہیری نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن اس کے بعد میں واہیں نہیں جاسکوں گا کیونکہ میں کیا وضاحت پیش کروں گا کہ میں ایک دن کہاں رہا اور میری وضاحت کون مانے گا۔ میں ویسے ہی آزمائشی مدت میں ہوں، وہ مجھے شہر بدر کر دیں گے۔"

"اب تم اسی جگہ رہو گے۔" رونی نے کہا اور گھڑی

دیکھی۔ "جائے کا وقت ہو گیا ہے۔"

رونی کے ساتھی لوگوں کے نام کورین اور شرناکل تھے۔ کورین اب تک اسے کین تو زخموں سے دیکھ رہا تھا۔ سٹ ہیری کی ضرب سے اس کے منہ سے خون چھلک آیا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ "جلد تم ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاؤ گے۔"

"دیکھتے ہیں۔" سٹ ہیری نے سکون سے کہا۔ وہ تینوں چلے گئے اور وہ اس جگہ کھڑا رہ گیا۔ یہاں بہت کچھ تھا جو شاید ان لوگوں نے بچگی کی حالات کے لیے جع کیا تھا مگر کوئی افسوس نہیں تھا۔ یہاں خوراک اور پانی بھی نہیں تھا۔ باہر جانے والا دروازہ دھات کا بنا ہوا تھا اور اسے کھولنے کا طریقہ سٹ ہیری کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ صحرا کے مقابلے میں شہر میں رات آگئی سر نہیں ہوتی تھی اور وہ اس بند جگہ سکون سے سوتا رہا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو روئی آگئی اور وہ جلالت میں تھی۔ وہ اس کے لیے خوراک اور پانی لائی تھی۔ اس نے سٹ ہیری کو بتایا۔ "یہ میں نے خود دینا ہے۔ اب مجھے کام پر جانا ہے۔"

"تم کہاں کام کرتی ہو؟"

"لیب میں جہاں پودوں، سبزیوں کے بیجوں کی پر دیکھتے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم پرندوں کی کھونٹک کرتے ہیں۔" رونی نے جواب دیا۔ سٹ ہیری چونک گیا، اس نے کہا۔

"تم بہت اہم جگہ کام کرتی ہو۔ کیا تم وہاں سے سبزیوں اور پھلوں کے بیج لاسکتی ہو؟"

"لا تو سکتی ہوں۔" رونی نے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے کہا جس میں وہ سٹ ہیری کے لیے ناشتا لائی تھی۔ "مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"میری بات سنو۔"

"شام کو۔" رونی نے کہا اور باہر نکل گئی۔ سٹ ہیری گہری سانس لے کر رہ گیا پھر وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔ یقیناً روئی نے اپنے راتن سے قربانی دی تھی کیونکہ یہاں سب کو بیٹے پھر کا سلا راتن ملتا تھا۔ اگر کسی کا راتن ضائع ہو جاتا تو اسے بڑی مشکل سے اضافی راتن ملتا تھا اس لیے سب اپنے راتن کے معاملے میں محتاط رہا کرتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روئی کس طرح سے تصدیق کرے گی۔ تصدیق کے تمام ذرائع مٹی کونسل اور اس کے خاص آدمیوں کے قبضے میں تھے۔ عام افراد کی کسی قسم کے ریکارڈنگ رسانی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کام کے لیے مخصوص آلات استعمال کرتا جانتے تھے۔ سٹ ہیری کا سارا دن سوچتے

بیوی۔" میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔"

شوہر۔ "کتنی عزت؟"

بیوی۔ "اتنی کہ اگر آپ بیٹے پیٹھے ہوں تو میں سونے پہ بیٹھوں گی۔"

شوہر۔ "اگر میں سونے پہ بیٹھ گیا تو؟"

بیوی۔ "تو میں مولے سے پیٹھوں گی۔"

شوہر۔ "اگر میں مولے سے پیٹھ گیا تو؟"

بیوی۔ "تو میں بیڑی سے پیٹھوں گی۔"

شوہر۔ "اگر میں بیڑی سے پیٹھ گیا تو؟"

بیوی۔ "تو میں زمین سے پیٹھوں گی۔"

شوہر۔ "اگر میں زمین سے پیٹھ گیا تو؟"

بیوی۔ "میں گڑھا کھود کے اس میں بیٹھوں گی۔"

شوہر۔ "اگر میں گڑھے میں بیٹھ گیا تو؟"

بیوی شے سے۔ "تو میں گڑھے کو مٹی سے بھر دوں گی، کبھی تیرے کو عزت رہاں نہیں آتی۔"

مرسلہ: رضوان خولی کریم زوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہوئے گزرا کہ دو کس طرح ان لوگوں کو راشی کرے۔ وہ جو خواب دیکھ رہے تھے، اس کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔

شام کو آٹھ بجے کے بعد کورین اور شرناکل دو اور افراد کے ساتھ آئے۔ وہ اس میں دلچسپی لے رہے تھے مگر ان کا رویہ معاندانہ ہی تھا۔ انہوں نے سٹ ہیری سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے رکھاٹی سے کہا۔ "اب کسی قسم کی گفتگو اسی وقت ہوگی جب میری حیثیت کا مین ہو جائے گا۔"

"جلد تمہاری اصلیت سامنے آجائے گی۔" کورین نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اسی لیے روئی اندر آئی۔ وہ جھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے پلٹ سٹ ہیری کے لیے ڈنڈا نکال کر میز پر رکھا مگر سٹ ہیری نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس سے زیادہ دوسرے یہ بات تھے۔ شرناکل نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

رونی نے سر ہلایا۔ "کلیئر ہے۔ یہ سچ ہے باہر سے

MEDICAM

FLUORIDE ANTICAVITY TOOTHPASTE

HERBAL
FRESHNESS

مضبوط چمکدار سفید دانت
میڈی کیم ہربل ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ



آیا ہے۔ یہی نہیں دیکھ کی حد تک گھرائی میں ہے۔
کورین نے مایوسی سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے، ہم
نے بلاوجہ اسے روکا۔ اب یہ ہم پر بوجھ بن جائے گا۔"
"میں بالکل یوچرٹس ہوں گا۔" سٹیری نے کہا۔ "تم
قہرمت کرو، میں نے کہا میں شہر سے باہر جا سکتا ہوں۔"
کورین نے ٹٹی میں سر ہلایا۔ "یہ آسان نہیں ہے۔"
"مشکل سے کسی کین میں باہر جا سکتا ہوں۔" سٹ
یری کھڑا ہو گیا۔ "فوس کہ تم لوگوں کی وجہ سے میں اپنی
کوشش میں ناکام رہا۔ تم لوگ نہ کسی اس شہر میں بہت سے
ایسے لوگ ہوں گے جو اس قید سے نجات حاصل کرنا چاہتے
ہوں گے۔ گلاب میں انہیں تلاش نہیں کر سکتا۔"
"اپنی خوشی سے کوئی موت قبول نہیں کرے
گا۔" شربٹس نے ٹٹی میں سر ہلایا۔
"سنو، ہمیں اس کی مدد کرنا ہوگی۔" روٹی نے کہا تو
سب نے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کر
دی ہو۔
"ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" کورین نے کہا۔
"ہمیں کرنا ہوگی ورنہ اس نے خود باہر جانے کی
کوشش کی اور پکڑا گیا تو ہمارے بارے میں بتا دے
گا۔" روٹی نے زور دے کر کہا تو وہ چونک گئے۔ یہ خیال کسی
کو نہیں آیا کہ وہ ان کا ٹھکانا دیکھ چکا تھا اور ان کے ناموں
سے بھی واقف تھا۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو ٹٹی گاڑوں کے جاؤ اس
سے سب اٹھوا لیتے۔ مختصر بحث کے بعد وہ مان گئے کہ سٹ
یری کو شہر سے باہر پہنچانے میں اس کی مدد کریں گے۔ جب
تک وہ ان کے ساتھ رہے گا۔ انہوں نے اس کی خوراک
کا ذمہ بھی لے لیا تھا۔ دون دن بعد ایک رات اسے وہاں
سے لٹکا لگایا۔ کورین اور روٹی کے ساتھ ایک آدمی اور تھا اور
اس نے ٹٹی گاڑوں کی وردی چائی ہوئی تھی۔ یہ وردی انہوں
نے کسی طرح سے حاصل کر لی تھی۔ وہ چھپتے چھپاتے اور
گھبوں سے گزرتے ہوئے شہر کی فسیل کے پاس آئے۔
اندر سے اوپر جانے کے لیے راستے تھے مگر ان پر مستقل
گاڑوں کی نگرانی کرتے تھے۔ بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح اوپر
بھی پہنچ گئے اور ایک ہی قدر تار ایک جگہ انہوں نے رسی کی
مدد سے سٹیری کی فسیل سے پیچھا تار دیا۔ فسیل پر کچھ
فاصلے کے بعد سرچ آؤس کی جس جو خود کار انداز میں گردش
کرتی تھیں۔ سٹیری نے ان کی گردش کے دورانیے کا
اندازہ لگایا اور پھر پتھروں اور ریت کے چھوٹے ٹیلوں کی
آزلیختا ہوا اور اس طرف جانے لگا جہاں اس نے اپنی اڑ

انہوں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور اس کے بعد اسے اذیت سے گزرتا پڑا۔ سٹی گاؤں کے جلاؤ اسے جسمانی اذیتیں دے کر کچ پھوڑ رہے تھے مگر سٹ ہیری نے اپنی زبان بند رکھی۔ وہ اپنی بات پڑنا ہار کا اس کی کسی نے مدد نہیں کی اور وہ خود یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ ایک رات اذیتوں کے دور سے گزر کر وہ نیمے ہوئی کی حالت میں کرسی پر چھل رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ سمجھا کہ جلاؤ آرام کر کے پھر آگئے ہیں۔ مگر آنے والا ایک ہی تھا اور اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔ "سٹ ہیری۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "روٹی اتم۔"

ان کے ساتھ؟

روٹی نے اپنا ناک کا تھمہ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ "وش۔ آہستہ بولو۔ میں بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ دو دن تو تمہارا سراغ لگانے میں لگے ہیں۔"

"روٹی! تمہاری صفوں میں کوئی خدار ہے۔ اسی نے میرے بارے میں بتایا ہے کیونکہ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں میرا سامان تھا تو سامان غائب تھا اور یہ لوگ میرے منتظر تھے۔"

"ہمارے درمیان کوئی خدار نہیں ہے۔" روٹی نے یقین سے کہا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ ایک دن اور گزرا لو پھر ہم تمہیں آزاد کرالیں گے۔"

"اگر تم مجھے آزاد کرالو گی تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ خدار سب کو چاڑھ دے گا۔"

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ اتفاق ہے۔" روٹی نے کہا۔ "اب میں جا رہی ہوں، واپس تم آزاد ہو گے۔"

روٹی جس طرح آئی تھی، اسی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ سٹ ہیری جانتا تھا کہ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ خطرہ کیوں مول لیا۔ خوش قسمتی سے اگلا دن اس کے لیے بہتر گزرا۔ اس کے دشمنوں کا علاج ہوا اور اسے کھانا اور پانی بھی دیا گیا مگر ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کے لیے کم سے کم بھی سزا موت کا فیصلہ ہوتا اور یہاں سزا موت دینے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ محبوب کو شہر بدر کر دیا جاتا۔ وہ کسی ویرانے میں جاس اور بھوک سے سسک سسک کر جان دیتا تھا۔ رات آئی اور وہ جاگنے کی کوشش میں اوجھ رہا تھا کہ باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی کراہا ہو پھر زمین پر گرا ہو۔ وہ چمک گیا۔ چند لمحے بعد

دروازہ کھلا اور روٹی اندر آئی۔ اس نے تیزی سے اسے تیری کی گرفت سے آزاد کیا۔ "جلدی چلو، ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ کسی وقت بھی خطرے کا امکان بن جائے گا۔"

مگر روٹی اور دشمنوں سے چور ہونے کے باوجود سٹ ہیری تیزی سے حرکت میں آیا۔ باہر راہداری میں گھران پڑا تھا، پتا نہیں ہے ہوش تھا یا سر گیا تھا۔ آگے بھی انہیں اسی طرح سٹی گاؤں بے حس و حرکت پڑے دکھائی دیے۔ بالآخر وہ اس قمارت سے باہر نکل آئے۔ روٹی کے ساتھ چار افراد اور تھے۔ وہ تار یک گلیوں اور سرنگوں سے ہوتے ہوئے دور شہر کے عام علاقے میں ایک خلیہ لٹکانے پہنچے۔ سٹ ہیری کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ صاف ستھری حالت میں ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے زخم بہتر تھے اور اب ان میں درد نہیں تھا۔ روٹی اس کے پاس موجود تھی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی۔ "اب کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" سٹ ہیری نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا۔"

"تمہاری خاطر نہیں اپنی خاطر۔" روٹی نے کہا۔ "تم ہمارے بارے میں جانتے تھے۔"

"میں نے تمہارے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن کیا تم نے واقعی یہ خطرہ اس لیے مول لیا تھا؟"

روٹی نے رخ پھیر لیا۔ "اب میں چلوں گی۔ وقت ہو گیا ہے۔ کل صبح ملاقات ہوگی تمہارے لیے کھانا اور پانی رکھا ہوا ہے۔"

سٹ ہیری اس سے بات کرتا چاہتا تھا۔ قید اور تمہارے دور ان اس نے جتنا سوچا اسے اتنی یقین ہوا کہ وہ کسی کی تفریق پر بکڑا گیا ہے۔ ورنہ سٹی گاؤں کو بھلا کیسے پتا چلا کہ اس نے اپنا سامان کہاں چھپا لیا تھا۔ اس ساری رات وہ آرام کرتا رہا۔ خود کا اور پانی سے اس کی حالت مزید بہتر ہو گئی۔ صبح روٹی آئی تو کسی قدر پُر جوش تھی۔ اس نے سٹ ہیری سے کہا۔ "اب کچھ دن کی بات ہے، بالآخر ہمیں جبر کے اس نظام سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔"

وہ تشویش زدہ ہو گیا۔ "تم لوگ کسی کارروائی کی تیاری کر رہے ہو؟"

جے اور جب ہم شہریوں کو آزاد کرانے کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر کے سٹی کونسل والوں کو خراجست میں لے لیں گے۔"

"روٹی! اچھے یقین نہیں ہے، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ لوگ بہت ہوشیار اور بیدار ہیں۔ انہوں نے تمہاری صفوں میں پہلے ہی نذرانہ پیش کیے ہوئے ہیں۔"

"ہمارا ایک ایک آدمی چتا ہوا اور اس کا ہوا ہے۔" روٹی نے پھر یقین کرنے سے انکار کیا۔ "دوسرے اگر بخیر ہی ہوتی ہوئی تو صرف تم نہیں پکڑے جاتے بلکہ ہم تین بھی پکڑے جاتے۔ مگر ہمیں نہیں پکڑا گیا اس لیے تم فکرت کرو۔"

سٹ ہیری کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی اس نے کہا۔ "کیا مجھے یاہر آنے جانے کی اجازت ہے؟"

"تم پر پابندی نہیں ہے لیکن تمہارا باہر جانا بالکل مناسب نہیں ہوگا۔ سٹی کونسل کی جانب سے تمہاری تصویر ہر جگہ دکھائی جا رہی ہے۔ شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جو اب تمہیں پکڑا نہ سکے۔"

روٹی کو کام پر جانا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔ سٹ ہیری ایک بار پھر اٹھ کھڑا تھا اور اس بار اس نے روٹی کے جانے کے بعد زیادہ اکیلا پن محسوس کیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے دل میں خاص مقام حاصل کر چکی ہے۔ وہ اپنے آدمیوں میں پرتر پوزیشن رکھتی تھی کیونکہ اس کی ہر بات حروف آخر ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کے لیے سب خود کر رہی تھی۔ سٹ ہیری کا پہلی بار کسی لڑکی سے واسطہ پڑا تھا مگر انسانی جذبات اور فطرت سے وہ نا آشنا نہیں تھا۔ مگر وہ جس جگہ اور جن حالات میں تھا روٹی کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرنا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دو دن مزید اسی جگہ رہا۔

اس کے زخم بہتر گئے تھے اور کمزوری بھی دور ہو گئی تھی۔ تیسرے دن خلاف توقع روٹی اور بہت سے دوسرے لوگ دن میں آگئے۔ سٹ ہیری کا ہاتھ ٹھکانا اس نے روٹی سے پوچھا۔ "کوئی خاص بات ہے؟"

روٹی نے سر ہلایا۔ "ہاں۔ آج رات جب لوگوں کو تفریق کے لیے لٹکانے کی اجازت ملے گی تب ہم بھی باہر جا سکیں گے اور ری ایکٹر پر قبضہ کریں گے۔"

"تم لوگوں نے تمام حفاظتی انتظامات دیکھ لیے ہیں؟"

"پاکل، ہمارا پلان مکمل ہے۔" روٹی نے اسے یقین دلایا۔ اس بار انہوں نے نہیں سے ہتھیاروں کے ذخیرہ بھی جمع کیے تھے۔ ان میں عام فائر کور کے ساتھ ایسی تباہ کن ہتھیار بھی تھیں جو دو فٹ موٹی ٹنگریٹ کی دیوار توڑ سکتی تھیں۔ اسنے اور افرادی قوت کے لحاظ سے ان کی تیاری

کمل تھی مگر وہ اس صورت میں کامیاب ہو سکتے تھے جب سٹی کونسل کو ان کے بارے میں علم نہ ہو۔ سٹ ہیری کا اندیشہ برقرار تھا کہ ان میں سٹی کونسل کے تجربہ کار اور اس صورت میں ان کا منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔ آٹھ بجے ہی وہ سب مسک حالت میں باہر نکل آئے۔ روٹی نے بتایا کہ ایسی ہی دو ٹولیاں اور مختلف جگہوں سے نکل کر ری ایکٹر کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ وہ سب گلیوں اور سرنگوں سے ہوتے ہوئے ری ایکٹر کے سامنے پہنچے۔

شہر اور ری ایکٹر میں فاصلہ رکھا گیا تھا کہ کسی حادثے کی صورت میں لوگ اس سے متاثر نہ ہوں۔ درمیان میں ایک بڑا میدان انہیں جورو دشمنوں سے جھگڑا رہا تھا۔ وہ میدان میں داخل ہوئے۔ ری ایکٹر تک سب صاف نظر آ رہا تھا۔ سٹ ہیری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ری ایکٹر سے پہلے اتنا بڑا میدان کیوں خالی رکھا گیا تھا اور یہاں کوئی گاڑی تک نہیں تھا۔ یہ اس وقت ان کی سمجھ میں آیا جب وہ میدان میں داخل ہوئے اور اچانک ان کے پیروں سے زمین لٹکی۔ میدان میں جگہ جگہ زمین مرک رہی تھی اور اس میں نمودار ہونے والے خلا انسان کو لگ رہے تھے۔ گرنے والوں کی بجائے کچھ باہر تک ستانی دے رہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت بلندی سے نیچے گر رہے ہوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے میدان سو سے زیادہ آدمیوں کو لگھ چکا تھا اور ان میں سے یہ مشکل ایک درجن باقی بچے تھے۔ نیچے والوں میں سٹ ہیری کے ساتھ روٹی اور شرٹنل بھی تھے۔ کورین غائب ہو گیا تھا۔ وہ بھی گرنے والوں میں شامل تھا۔ روٹی کوسٹ ہیری نے بچا لیا۔ وہ ایک خلا میں پھریا کر گئی تھی اگر سٹ ہیری بروقت اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا اور اسے اوپر نہ کھینچ لیتا۔ جیسے ہی خلا ختم ہونے اور زمین ہموار ہوئی، چاروں طرف سے سٹی گاؤں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دے رہے تھے اور ان کے پاس حکم کی نسیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کا فائدہ تھا کہ یہ سب بخیر کا نتیجہ تھا۔ وہ لوگ پہلے سے ان کے منتظر تھے اور انہوں نے ان کا انجام بھی طے کر لیا تھا۔ یقیناً سٹ ہیری کے فرار کے وقت انہوں نے باقی سب کو اس لیے نہیں پکڑا تھا کہ وہ ایک ساتھ ہی اس پورے کمرہ کا خاتمہ چاہتے تھے جو بغاوت پر آمادہ تھا۔

ان سے ہتھیار لے لیے گئے اور ان کے ہاتھ پاؤں فودادی پھنکڑیوں میں پکڑ کر انہیں مخصوص گاڑیوں میں ڈال

کر کسی نامعلوم مقام پر لے جایا گیا۔ پھر انہیں الگ الگ ٹوکریوں میں رکھا گیا۔ سٹیری کے موبع پکڑوئی سے کہا تھا کہ وہ سب راہ ہونے کا اقرار نہ کرے۔ کسی مرنے والے ساجھی کو سب راہ بتا دے مگر اس نے انکار کیا۔ "اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ ان کا جاسوس انہیں پہلے ہی میرے بارے میں بتا چکا ہوگا۔"

سٹیری نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تو ہے۔"

دو دن قید میں رکھنے کے بعد انہیں کونسل کی مرکزی کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان سب پر جرم بغاوت ثابت ہو چکا تھا۔ فرد جرم پڑھ کر سناٹی کی اور انہیں موبع دیا گیا کہ وہ اپنے دفاع میں دلائل دیں۔ سب سے پہلے روپی نے بات کی لیکن اس نے اپنے جرم سے انکار نہیں کیا البتہ اس نے تفصیل سے وجوہات بیان کیں کہ جن کی وجہ سے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے علم بغاوت بلند کیا اور اس ناانصاف نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آخر میں کہا۔ "مجھے اپنے کیے سے انکار نہیں ہے۔ مجھے صرف انہوں سے کہ میں ناکام رہی۔"

سب باری باری بات کرتے رہے۔ ان میں سے بعض جذباتی ہو گئے تھے اور انہوں نے سخت زبان استعمال کی مگر ان کی باتوں کو بھی خاموشی سے سنایا۔ کونسل کمیٹی کے اراکین سنگار چہرہ کے ساتھ خطرہ تھے کہ وہ اپنی بات مکمل کریں تو ان کی سزا سناٹی جائے۔ اپنی باری پر سٹیری نے کہا۔ "اب میں سچ بولوں گا۔" پھر اس نے اپنی مکمل کہانی سناٹی کہ کس طرح اس کے جلاوطن ماں باپ نے اپنی جائیں بچانے کی کوشش کی مگر صرف وہی بچا۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ آزادی پسند لوگوں کو یہاں سے لے جانے آیا تھا تا کہ وہ اپنی الگ بستی آباد کر سکیں۔ ان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد کونسل کمیٹی نے انہیں سزا سنائی اور سزا یہی تھی کہ انہیں شہر سے دور کسی ویرانے میں بھیج دیا جائے۔ جس وقت یہ کارروائی جاری تھی اور سٹیری نے اپنے بارے میں بتایا تو عوامی گیلری میں بیٹھا ہوا ایک شخص چونک اٹھا اور پھر وہ سارا وقت بے چینی سے جھلک رہا رہا۔ کہنے کو یہ عوامی گیلری تھی مگر یہاں اہلیت کلاس کے لوگ ہی آ سکتے تھے۔ اس شخص کا تعلق بھی اہلیت کلاس سے تھا۔ کونسل کے فیصلے کے مطابق انہیں ایک ہفتے بعد شہر بدر کیا جاتا۔ تب تک وہ قید خانے میں رہے۔ یہ فیصلہ نہ کرونی نے منسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر ذرا کونسل کمیٹی اہم اب تک ایک قید خانے میں ہی رہے آئے ہیں۔"

انہیں ان کی کوٹھری میں واپس بھیج دیا گیا۔ دوسری رات خلاف توقع سٹیری کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تو وہ چونک گیا کیونکہ اسے کھانا بھی دروازے کے پیچھے ایک دروازے سے دیا جاتا تھا۔ یہ کوٹھری اسی دن کھلتی جب سزا پر عمل درآمد کا وقت آتا۔ آنے والے نے خود کو اسی طرح چادر میں چھپایا ہوا تھا جیسے کبھی روپی اس سے ملنے آئی تھی مگر یہ شخص بل گاؤں کے ساتھ آیا تھا اور اسی نے دروازہ کھولا تھا۔ اس شخص کے اندر آتے ہی اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ سٹیری بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ "کون ہو تم؟"

جواب میں آنے والے نے چادر ہٹا دی اور سٹیری حیران رہ گیا۔ وہ آرکیل تھا۔ اس کا پاس جس نے اسے سینٹری کے شعبے میں بھیجا تھا۔ اس نے آتے ہی بلا حجبہ کہا۔ "کونسل کمیٹی کے سامنے تم نے اپنے بارے میں جرتا بتایا تھا وہ سچ ہے؟"

"اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔" سٹیری نے سنجیدگی سے کہا۔ "موت کے سامنے آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔"

پاس میں جھوٹ بول کر یہاں آیا ضرور تھا۔ "میرے خدا! تم سچ آرت سٹیری کے بیٹے ہو؟"

"ہاں، اپنے باپ کے بارے میں کوئی بے غیرت شخص ہی جھوٹ بول سکتا ہے۔"

"میں آرکیل سٹیری ہوں، آرت سٹیری کا بھائی۔" اس نے کہا۔ "دنیا میں میرا وہی ایک خون کا رشتہ ہے۔"

سٹیری نے شک سے اسے دیکھا۔ "لیکن پایا نے کبھی تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔ میں دس سال کی عمر تک شہر میں رہا لیکن تم ہم سے نہیں ملے؟"

"ہاں کیونکہ میں اپر کلاس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد لوہر کلاس سے میرا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے آخری بار آرت کو اس وقت دیکھا جب وہ ایک گیلری میں کام کرتا تھا۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تم میرے پیچھے ہو۔" اس نے بازو پھیلا دیے۔

"بھتیجا۔" سٹیری نے خطرے انداز میں کہا۔ "تم نے ابھی تو کہا تھا کہ تمہارا ہم سے رشتہ ختم ہو گیا ہے۔"

آرکیل کے ہاتھ گر گئے۔ اس نے مجھے اچھے انداز میں کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا، میں جذباتی ہو کر یہاں چلا آیا۔" وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر اس نے چادر اوڑھی اور مڑ کر دروازہ بچھایا۔ گاؤں نے دروازہ کھولا اور آرکیل باہر چلا گیا۔ سٹیری جواب تک تن کر کھڑا تھا، اس کے جاتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس دنیا میں خون کا واحد رشتہ اس کے

سامنے آیا تھا مگر وہ اس کے سینے سے تنگ نہ لگا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مگر اس نے جو کیا اس پر وہ مطمئن تھا۔ آرکیل اپر کلاس میں شامل کر لیا گیا تھا تو اس کی اپنی زندگی ہوگی، اس کے اپنے ہی بچے ہوں گے۔ ایک سزائے موت کے قیدی سے تعلق ظاہر ہونے پر اس کی پوزیشن شراب ہو سکتی تھی۔ سٹیری کے رویے کے بعد اس کا امکان کم تھا کہ وہ اس سے پھر ملے آتا۔ ایک ہفتے بعد سٹیری سمیت چندہ افراد جن میں نور داور چہ جورت میں لڑکچان بھی، یہ سب ہی جوان العمر افراد تھے، انہیں قید خانے سے نکال کر شہر کے اتر پورٹ تک لایا گیا۔ وہاں انہیں ایک بڑے عمارے میں بندھا گیا۔ یہاں انہیں کسی ویرانے میں اتارنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ اتفاق سے روپی اس کے ساتھ بھی تھی۔ اس نے سٹیری کا ہاتھ دیا۔ "مجھے انہوں سے تم ہماری خاطر آئے اور اب تم بھی سزا دے گے۔"

"مجھے کوئی انہوں سے نہیں ہے۔"

"مجھے تمہارا چال چل گیا ہے۔" روپی بولی۔ "وہ کورین ہے۔ وہ مجھ سے ملنے قید خانے میں آیا تھا۔"

"کورین۔" سٹیری نے گہری سانس لی۔ "تم نے اس سے کیا کہا؟"

"میں نے اسے مبارکباد دی کہ وہ تاہم ہی قید خانے میں رہے گا۔ میں یہاں سے آزاد ہو کر جا رہی ہوں۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔" سٹیری منسکرایا۔ "ہم آزاد ہونے جا رہے ہیں۔"

اسی لمحے عمارہ بند ہونے لگا۔ یہ ٹیلی کا پتھر کی طرح پرواز کرتا تھا۔ یہ کافی بڑا تھا اور طویل فاصلے تک جاسکتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں دور چھوڑنے کا پروگرام تھا۔ عمارہ بند ہو کر پہلے جنوب کی طرف گیا مگر شہر سے دور نکلنے کے بعد اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا اور شمال کی طرف پرواز کرنے لگا۔ سٹیری حیران ہوا۔ وہ کھڑکی سے نیچے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ روپی نے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا یا لیکن سٹیری نے اسے ہونٹوں پر اچھی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جیسے جیسے عمارہ آگے بڑھ رہا تھا، سٹیری پر جوش اور کی قدر تیراں نظر آ رہا تھا پھر عمارہ نیچے آئے گا۔ وہ یقیناً شہر سے بیکڑوں کیل دور نکل آیا تھا۔ اس کے پاسے ریت پر گئے اور اس کا جتنی حسد تھکے گا۔ گاؤں ان کے ہاتھوں کیوں کی بیڑیاں کھول رہے تھے اور پھر انہیں باہر نکلنے کا حکم دیا گیا۔ وہ باہر آئے تو عمارے کا دروازہ بند ہونے لگا۔ وہ

بکھرے کب عمارہ پرواز کر جاتا ہے اور وہ اس ویرانے میں رہ جائیں گے مگر بھانے اس کے کہ اس کے انہوں کی آواز آتی، کسی نے بیجا فون پر کہا۔

"تم لوگوں کو کوئی کونسل کے حکم پر اس ویرانے میں بھینکا گیا ہے مگر تم لوگ ہمت مت ہارو۔ زندگی کے ذرائع تلاش کرنے کی کوشش کرو، شاید تم کا سبب رہو۔"

روپی نے حیرت سے کہا۔ "اس بات کی کیا ضرورت تھی؟"

اسی لمحے عمارے کے انجن گرے اور وہ پرواز کر گیا۔ اس کے نظروں سے اوٹ ہونے کے بعد سٹیری نے کہا۔ "اس بات کی ضرورت تھی جب ہی تو کوئی گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" شرٹنل بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" سٹیری نے روپی کا ہاتھ تھاما اور ایک طرف چل پڑا۔ شرٹنل اس کے پیچھے لپکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک جگہ۔" میرے ساتھ آؤ۔" اس نے رے بغیر کہا۔ شرٹنل پیچھے آیا تو باقی سب بھی اس کے پیچھے آئے۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ پہلے ایک پتھر کی پہاڑی پر چڑھے۔ اب پیچھے آنے والے اسے برا بھلا کہہ رہے تھے مگر جب وہ ٹھپے کے اوپر پہنچے تو ان کی زبان بند ہو گئی۔

سامنے وادی میں آلو کے بڑے پودوں سے سجا ہوا مکیت اور وہ مکان نظر آ رہا تھا جو آرت سٹیری نے اپنے بچے کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ سٹیری نے روپی کی طرف دیکھا۔ "یہ تمہارا مستقبل کا گھر۔"

"ہاں، یہ تمہارا گھر ہوگا۔" روپی منسکرائی اور اس نے اپنے لباس سے ایک چھوٹی سی جھلی نکالی جس میں مختلف سبز یوں اور پھولوں کے سچ تھے۔ وہاں پانی موجود تھا اور وہ اب ایک نئی بستی بسا سکتے تھے۔

"تم نے کہا تھا کہ اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن جب میں نے چپکے سے یہ سچ لپ سے جب بھی میرا یہی خیال تھا۔"

سٹیری نے اس سے پھر نہیں پوچھا کہ اس نے سچ کیوں لپے تھے۔ نیلے سے دوسری طرف اترتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں آرکیل سٹیری کا شکر یہ ادا کیا۔ "ٹھیک بواٹھل۔"

خیارے سے بیجا فون پر آئے والی آواز آرکیل کی ہی تھی۔ وہی انہیں اس جگہ چھوڑنے آیا تھا جہاں وہ زندہ رہ سکتے تھے۔ ایک ٹکٹ کی آواز آواز زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔

ستاروں پر کمند

طاہر حباوید معمل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور رد عمل کی ایسی گہلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چاہتوں کو دروہام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کر دینے والے اپنے جوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ناہلی کے کہنے درختوں کے جھنڈ میں کٹی چگے اونچے سرکشے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سوار تھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز پوائلوں کے سرکش جھونکے بھی نہ بچھا سکے... دو سری جانب اس کی چاہت تھی جو سودو زبان کی حد کیپنچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹتے ہی نہیں تے رہی تھی لیکن وہ جو ایک ہل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنکھ میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی چل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رخت سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس جوصلوں اور عزم مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پھرتو زمین میں دھنسنے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں کم تھیں ایسے میں لگنے والی پرتھوکر اسے ایک نئے مزم... اور پرتھوکر اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جاسکتی ہے۔ لہذا دور بیت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی ڈہری ملی چالوں... پیار کی دھرتیوں اور بدلتی رتوں کا

رومان انجیز طویل سلسلہ



عادل نے اپنا سر پیچھا کر دووں بازوؤں میں چھپایا تھا تاکہ کم سے کم چوٹ لگے لیکن چونکہ جسم کے ہر حصے پر لگ رہی تھیں۔ سر سے رستے والا خون اس کے سامنے بکری زمین پر لگ رہا تھا۔ جڑ پتوں وہ نہیں کے نیچے لگا کر لایا تھا، وہ گر چکا تھا اور کارندوں نے اٹھایا تھا پھر اس نے شہزادی کے بڑے بھائی قاسم کی گرج وار آواز سنی۔ "کیا ہوا ہے؟" کیسے آیا یہاں؟

نظر حال عادل کو متحیر کارندوں نے دیوچ کر کھڑا کر دیا۔ وہ چیختیوں کی طرح اس سے چپے ہوئے تھے۔ مشتاق ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "قاسم بھائی! یہ پچھلے دروازے سے پتا نہیں کس طرح اندر آ گیا ہے۔ یہاں یہاں پینک جھول رہی تھیں۔"

عقب سے انور نکڑ کر بولا۔ "میں بتاتا ہوں ہی یہ کس طرح آیا ہے۔ اس نے زبردستی کی ہے میرے ساتھ۔ پستول سیدھا کیا ہے میری طرف۔ یہ دیکھیں گی۔ یہاں پستول کا دست مارا ہے اس نے۔" انور نے اپنے چپے گریبان میں سے اپنی چھاتی دکھائی۔

عادل ہکا بکا تھا۔ اس نے اپنے منہ میں جمع ہوجانے والا خون ایک طرف تھکا اور انور کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ جھوٹ بول رہا ہے، میں یہاں تایا بیٹے سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا تایا بیٹا یہاں احاطے میں ہیں۔"

"میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" فریہ اندام انور دھڑکی سے بولا۔ "اس نے مجھے زبردستی پچھلا دروازہ کھلوا دیا اور جھکی دی کہ گھر میں نے کسی کو بتایا تو میری اور میرے بچوں کی خیر نہیں۔"

عادل کے سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ انور اس کے منہ پر سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ "کہتے، کہتے! میں جان سے مار دوں گا تجھے۔" عادل نے کہا اور چل کر خود کو کارندوں سے چھڑانا چاہا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کے لپک دار جسم میں غیر معمولی توانائی تھی۔ قریب تھا کہ وہ خود کو کارندوں سے چھڑا لیتا اور انور پر جا پڑتا کہ کارندوں نے زور مار کر اسے اوندھے منہ گر دیا۔ گرتے گرتے بھی اس نے انور کے منہ پر ایسا زور وار چھانڈ مارا کہ وہ اچھل کر آدموں کے ایک ڈھیر پر جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہ نکلی تھی۔ کارندے ایک بار پھر عادل پر چل پڑے۔ شہزادی کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید دوسری لڑکیاں اسے کھینچ کر کہیں اندر لے گئی تھیں۔ قاسم خود بھی عادل کو مارنے والوں میں شامل ہو گیا۔ عادل کو

اس کے ہاتھوں میں سیاہ ریح انور نظر آیا۔ اس نے ریح انور سے عادل کی گردن پر ایک زور وار ضرب لگائی تو عادل کو لگا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے وسندہ چھانے لگی ہے۔ قاسم کی زہریلی پھٹکار اس کے کانوں میں پڑی۔ "مار دو کتے کو۔ جان سے مار دو۔"

یہی وقت تھا جب ایک اور گر جی ہوئی آواز عادل کی سماعت سے نکل گئی۔ "دک جاؤ۔ کیا ہوا ہے؟ دک جاؤ۔" یہ تایا فراسٹ کی آواز تھی۔

عادل زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی نئی قمیض تار تار ہو چکی تھی۔ پانچ چھ کارندوں نے اسے دیوچ رکھا تھا۔ تایا فراسٹ نے آگے بڑھ کر عادل کو دیکھا اور پھر بولے۔ "چھوڑ دو اسے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

قاسم نے کہا۔ "ابائی، یہ خبیث اپنے ہوش میں نہیں ہے، خون چڑھا ہوا ہے اس کے سر کو۔" پھر وہ مشتاق سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس کے ہاتھ پاؤں باغ و بار بار رہے۔" تایا فراسٹ نے ذرا توقف سے کہا۔ "نہیں، اس کی لوٹ نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کتنی گرمی ہے اس کے دماغ میں۔ چھوڑ دو اسے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

قاسم اور مشتاق نے ایک بار پھر اعتراض کیا۔ بہر حال فراسٹ صاحب کے حکم پر پیچھے ہٹ گئے۔ ریح انور ابھی تک قاسم کے ہاتھ میں تھا۔ باقی کارندوں نے بھی عادل کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے پچھلے ہاتھ سے ذہن کو سنہال کر کھڑا ہو گیا۔ خون مسلسل اس کے سر اور منہ سے رس رہا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "دیکھ لو تایا بیٹا! میں آپ سے ملنے آیا تھا اور میرا یہ حال کیا ہے! ان لوگوں نے۔ پیچھے سے وار کیا ہے! انہوں نے۔ مرد ہوئے تو سامنے سے آتے۔ اب بھی مرد ہیں تو سامنے سے آئیں۔"

"اوتے۔ تیری مردانگی کی ایسی تھی۔" قاسم پھر متحیر ہو کر عادل کی طرف بڑھ گیا۔ تایا فراسٹ نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

انہوں نے ساری صورت حال کو مہیاں لیا تھا۔ وہ انور کا چہرہ ہوا گریبان اور زخمی سینہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بچے قاسم کو باہر جانے کا کہا پھر عادل، انور اور مشتاق کو اپنے ساتھ لیا اور احاطے کے ایک کمرے میں آ گئے۔ دروازہ بند کر کے انہوں نے اصل صورت حال جاننے کی کوشش کی۔ انور جھوٹ بول رہا تھا اور بڑی دھمکی سے بول رہا تھا۔ مشتاق بھی حتی الامکان اس کی مدد کرنے میں مصروف تھا۔ عادل نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ساری

ہاتھ اس کے خلاف جاری تھیں۔ آٹھ دس منٹ بعد تایا فراسٹ نے انور اور مشتاق کو بھی باہر بھیج دیا۔ عادل ایک پرانے کپڑے سے بار بار سر اور ہونٹوں سے پینے والا خون پر پھیر رہا تھا۔ اس نے اپنی تار تار قمیض نوچ کر پیچھے دی تھی۔ اب اس کے جسم پر صرف جہان اور پتلون تھی۔

تایا فراسٹ کی پیشانی پر بے شمار غل غل آنے لگے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی عارے! تم نے اپنی عزت کا پاس کیا نہ میری عزت کا۔" "میں آپ کو کیسے شکن لاؤں تایا بیٹا۔ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ڈراما کر رہے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو۔"

"دیکھ، چور نالے چروالا کام نہ کرو۔ شرمندہ ہونے کے بجائے تم انار دوسروں کو اذیت دے رہے ہو۔ شرم آتی چاہے نہیں۔"

"تایا بیٹا! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوتی تو میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگ لیتا لیکن جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو شرمندہ کس بات پر ہو جاؤں؟"

"نہیں، تمہیں شرمندہ ہونے کی نہیں۔ پنڈ میں سینہ تان کر بیٹنے کی ضرورت ہے۔ بہت کچھ کر کے آئے ہو تم شرم سے بھی۔" تایا فراسٹ نے سخت طرز سے لہجے میں کہا۔ "ہاں کہاؤ اور دتہ پانچ دسے ہو اور پنڈ میں مشہور کر رہے ہو کہ لاکھوں کی کمائیاں ہیں اور وہ ماں تمہاری جاکر کیا دیں وصول کرتی پھرتی ہے لوگوں سے۔ بتاؤ مجھ کو ان چھ سات سینوں میں کون سا پہاڑ توڑا ہے تم نے؟ کون سی توپ چلائی ہے اور جے آگے جا کر ہوتا ہے، وہ بھی سب اندازہ ہے ہم کو۔"

"تایا بیٹا! میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ مجھے پتا ہے اور میرے اللہ کو۔ اور مجھے اللہ سے پوری امید ہے کہ وہ میری محنت کا صلہ مجھے ضرور دے گا۔ میں اپنی حق حلال کی کمائی لا کر آپ کے سامنے رکھوں گا۔ لیکن شاید آپ کو یقین نہیں۔ اسی لیے آپ کے گھر میں وہ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم آپ کے ہوتے تو ہرگز نہیں ہوتا چاہیے تھا۔ آپ نے زبان دی ہوئی ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟ کیا گل کر رہے ہو تم؟" تایا فراسٹ تنگ کر بولے۔

"تایا بیٹا! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے گھر میں رشتے کی بات ہو رہی ہے۔" "کس کے رشتے کی؟"

"شہزادی کے رشتے کی، چودھری عطار کے بیٹے کی طرف۔ پورے پنڈ میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ اندر خانے آپ کوکوں نے۔ ہاں کر دی ہے۔" عادل نے دل کڑا کر کہہ دیا۔

تایا فراسٹ کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ پہلے تو لگا کہ وہ بہت سمجھتی ہوئی تھیں لیکن پھر انہوں نے خود کو کچھ سنہالا اور عادل کی طرف اٹھ اٹھا کر بولے۔ "دیکھ عارے! زبان سنہال کر بات کر۔ اور میں تیرے منہ سے بار بار اپنی دلی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ کوئی حق نہیں ہے تجھے اس طرح گل کرنے کا۔"

عادل نے ڈرے بغیر کہا۔ "تایا بیٹا! یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔ کیا آپ نے واقعی رشتے کے سلسلے میں چودھریوں کو 'ہاں' کہہ دی ہے؟"

تایا فراسٹ نے اپنی پٹری کا اوجھا شملہ درست کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں اب تک ایسی کوئی گل نہیں ہوئی تھی پر اب ہو گئی۔ اب ہو گئی۔ جو زبان ہوئی تھی اس سے تو خود پھرا ہے۔ تو نے کہا تھا میں شہزادی سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔ پر آج تو چوری مجھے یہاں کھسا ہے۔ بے حیائی دکھائی ہے تو نے۔ اب میں بھی کسی دھڑے کا پابند نہیں ہوں اور ان چھ سینوں میں دیکھو یہ لپا ہے میں نے کہ آگے چل کر تو نے کون سا داریج کرتا ہے۔"

تم وضع اور بے نیکی کی شہرت سے عادل کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اس نے تایا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تایا! میں اپنی ماں کے سر کی قسم کھاتا ہوں، میں یہاں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔ ان لوگوں نے کسی کے کہنے پر نالک کیا ہے، مجھے پھنسا دیا ہے۔ اور اگر آپ کو اب بھی یقین نہیں تو پھر۔" وہ قہر وادھورا چھوڑ کر تیزی سے دیوار کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک تھری تاٹ تھری رائل جھول رہی تھی۔ اس نے تیزی سے یہ ڈبل جہل رائل اتاری۔ تایا فراسٹ اعظاری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹے۔ لیکن عادل نے رائل کو اٹا کر اس کا دست تایا کی طرف بڑھایا اور نال اپنے سینے پر رکھ لی۔ "اب بھی یقین نہیں تو پھر مجھے کوئی ماریں۔ میں اپنا خون آپ کو معاف کرتا ہوں۔ خدا کے واسطے، کوئی ماریں مجھے۔" اس نے استعجابی جذباتی لہجے میں کہا۔

تایا فراسٹ کے چہرے پر فحش کی سرخی کچھ کم تو ہوئی لیکن ماتھے کی چھریاں برقرار رہیں۔ اگلے پانچ دس منٹ میں تایا اور مجھے کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا۔ تایا فراسٹ

کا کہنا تھا کہ وہ خیالی ملاؤں کا پکڑنے والا نہیں تھا۔ ایک بے کار امید کے سہارے وہ اپنی نئی گوریٹ گھر میں نہیں بٹھا سکتے۔ انہیں ابھی سے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس انکار کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

عادل کی منت سماجت کے جواب میں تاپا نے بس اتنا کہا کہ وہ اس سال کے آخر تک دیکھیں گے۔ اگر انہیں کوئی امید نظر آئی تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کہیں نہ نہیں شہزادی کی بات طے کر دیں گے۔ ان کا لیجر بالکل خالی تھا اور وہ مزید کوئی بات سنتا نہیں چاہتے تھے۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب جلد از جلد اپنے دیے ہوئے قول سے بچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے عادل کو ہدایت کی کہ موجودہ حالات میں اس کا یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ وہ آج رات ہی ماں کو لے کر یہاں سے چلا جائے۔

☆☆☆☆

تاپا کی زمین سے عادل خود ہی زخمی ہو کر نہیں آیا تھا، اس کا دل بھی زخمی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سینے کے اندر خون ٹپک رہا ہے۔ ڈھائی سال کی بھٹی مہلت اب گھٹ کر چھ سات ماہ رہ گئی تھی۔ گاؤں میں اس کی جو بے عزتی ہوئی اور جو ذمہ اسے لگے وہ بٹھہر گئے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ چودھری کی کرکھیا کا دھرا ہے۔ چودھریوں نے اس کے لیے یہاں سازشوں کا جال بچھایا ہوا تھا۔ شاید تاپا فرست نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ فی الحال یہاں سے چلا جائے، کہیں کوئی ایسی گڑبڑ نہ ہو جائے کہ وہ خود بھی اسے سنبھال نہ سکیں۔

گاؤں میں اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ باغ میں موجود گارندوں نے عادل کو لٹکا کر کے مارا ہے اور اس نے معافیاں مانگ کر اپنی جان چھڑائی ہے۔ کچھ کہنا تھا کہ وہ شہزادی کو اغوا کرنے کی نیت سے سنے اٹھانے میں داخل ہوا اور شہزادی کے شور مچانے پر پکڑا گیا۔ غرض جتنے سنا تپا تاہم نہیں۔ گھر میں ماسوں ٹٹیل اور ممانی بھی بالکل کم مسم تھے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ وہ جیسے میں رہ کر مگر چھپوں سے بچ رہیں رکھ سکتے۔ اس لیے وہ ماں بیٹا جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں۔

کرنے کو تو عادل بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایک بار چودھری کی بیٹی کی حوصلی میں مسم جاتا تو پھر وہاں وہ چار لاشیں تو ضرور گر جاتیں لیکن ابھی اسے نکل سے کام لینا تھا۔ سرحد صاحب کے یہ الفاظ بھی بار بار اس کے کانوں میں گونجتے

تھے۔ ”تم دھن کو برداشت کرنا بھی ان عقیدوں کے زمرے میں آتا ہے جن کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اس فیروز یا افراد کو اپنے تم دھن کا نشانہ بنائیں جن کی وجہ سے ہم مشکل ہوئے ہیں۔ ہم اپنے تم دھن کا رخ کسی اور طرف موڑ کر بھی اپنا بدلہ چکا سکتے ہیں۔ جیسے کلاس میں مانیٹر کے ہاتھوں بے عزت ہونے والا لڑکا، مانیٹر سے لڑنے کے بجائے زیادہ محنت سے پڑھائی کر کے اور امتحان میں مانیٹر کو نیچا دکھا کر اپنا بدلہ چکا سکتا ہے۔“

سرحد صاحب کی ایسی ہی باتیں سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھیں اور اس کی اندرونی کیفیت کو بدل ڈالتی تھیں۔ رات کو عادل خاموشی سے پھر انہی درد خوں میں پہنچا تھا جہاں ایک جھنڈ کے درمیان خالی جگہ پر گاؤں کے لڑکوں نے اکھاڑا سا بنا رکھا تھا۔ یہاں تو ریت کا وہ پچھتا پچھتا بھی تھا جس پر لڑکے گھونسا بازی کیا کرتے تھے۔ عادل کے پیچھے میں جیسے آگ سی ہو کر رہی تھی۔ یہ آگ کسی اور طرف کا رخ کرتی تو یقیناً نہایت کچھ مسم ہو جاتا۔ اس نے اس آگ کا رخ تو ریت کے پٹے کی طرف کر دیا۔ وہ دیر تک اس پر مکا بازی کرتا رہا۔ دھماکے دھماکے کی آوازوں سے رات کی خاموشی تاریکی میں ارتعاش پیدا ہوتا رہا۔ اس کے بازو دل ہو گئے۔ ہاتھیں بے جان محسوس ہونے لگیں لیکن وہ لگا رہا۔ سانس اب پیچھے میں گھس رہی تھی۔ پینتا دھماکوں کی صورت بہہ رہا تھا۔ یہی پینتا اس کے اندر کی آگ پر گرا رہا تھا۔ وہ لگا نہیں بلکہ ٹھنک کر گر گیا۔ آج صبح جو چوٹیں اس کے جسم پر لگی تھیں، ان سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

قدموں کی دھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ شاید تھا، اس کے بچپن کے ساتھیوں میں سے ایک۔ عادل اٹھ بیٹھا۔ شاید اسے اس کا چھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور لگے سے لگایا۔ شاید آبدیدہ تھا۔ آج صبح پال پور میں باغ کے اندر عادل کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس نے عادل کے سارے بار دوستوں کو سخت فخر دے کر دیا تھا۔ شاید نے عادل کا ہاتھ تھا جسے ہونے کہا۔ ”عادل اہم سب جانتے ہیں یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ لیو ناصر اپنے باپ چودھری کی عمار کے ساتھ ہی کر شہزادی کو گتھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ وہ تجھے اتنا بے عزت کر دینا چاہتے ہیں کہ تو دوبارہ پنڈ کا رخ نہ کرے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔“

”کیا کرو گے تم؟“ عادل نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”تم کیوں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے کوڈو اور سلمان سے بھی بات کی ہے۔ ہم اس کیلئے ناصر کی ہاتھیں توڑ

کر سکتیں ہیں پچھلے دینے کے۔ یا ویسے ہی غائب کر دیتے ہیں اس لڑکھنڈ کو۔“ عادل نے گہری سانس لی۔ ”جیسا شاید ایہ تو بڑا سزاوار جواب ہوگا جسے ناصر کو جواب ضرور دوں گا پر کسی اور ڈھنگ سے۔ یہ دقتی بار ہے، آخری جیت ہماری ہی ہوگی۔“

”لیکن تو کیا کرے گا عادل؟ تو ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ بڑی اونچی ہواؤں میں ہیں۔ ان کے منہوں کے پاس بڑا پیسا آگیا ہے۔ بندے اب کیڑے کی طرح نظر آتے ہیں ان کو۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا بار۔ تم لوگ گھر نہ کرو۔“ عادل نے آبدیدہ شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس رات، دن کا اچالا پیچھے سے پہلے پہلے عادل اپنی ماں کو لے کر خاموشی سے لالی گاؤں سے نکل آیا تھا۔ جب دیہاتی تالہ ماں بیٹے کو لے کر کچی سڑک کی طرف روانہ ہو رہا تھا، عادل کو دور پال پور میں تاپا کی حوصلی کے اونچے برن نظر آتے تھے۔ ان پر جوں کے بیٹے کسی کمرے میں اس کی شہزادی سو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں شہزادی کی دو دو پھری آواز گونجنے لگی جو کل لڑائی کے دوران میں سنا دی تھی۔ ”چھوڑ دو اسے۔ نہ مارو۔“ مر جاتے گا۔ چھوڑ دو۔“

کبھی بے بسی، تڑپ تھی اس آواز میں۔ وہ جانتی تھی، وہ اسی کے لیے فخر کر رہا ہے۔ اسی کے لیے درد بردہ ہو رہا ہے۔ عادل نے حوصلی کے برجوں کے پیچھے آسمان پر وہ بھی اُبل رہی روشنی دیکھی جو سورج طلوع ہونے سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ”شہزادی۔“ رات تھی بھی کبھی ہے۔ لیکن تیرے آنسوؤں کی قسم صبح ضرور آئے گی۔“

☆☆☆☆

ماں کو گھر والوں میں چھوڑ کر عادل اپنے دوست صادق کے پاس لاہور پہنچ گیا۔ اپنی چٹوں کے بارے میں عادل نے صادق کو بس اتنا بتایا کہ راستے میں کچھ لڑکوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں رات بھر اپنے کام کے بارے میں بات کرتے رہے۔ صادق کا خیال تھا کہ کیا لڑکے کام کو ہرانی مشینری کی خرید و فروخت کے کام میں بدل دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی۔ کم از کم آٹھ لاکھ کا سرمایہ تو ضرور میں ہوتا ہی چاہیے تھا۔ اگلے روز عادل کا دل چاہا کہ سرحد صاحب کو فون

کر کے ان کی خیر خبریت دریافت کرے لیکن پھر نہ جانے کیوں ایک جھجکی آڑے آئی۔ اس کے ذہن میں آیا کہ کبھی سرحد صاحب یہ نہ سمجھیں کہ بار بار حال پوچھنے کے بجائے وہ یہ جانتا چاہتا ہے کہ سرحد صاحب اسے کیا کام سونپنے والے ہیں اور اس سے کیا مالی فائدہ حاصل ہونے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہالوں کو فون کر لیا اور ان سے سرحد صاحب کا حال چال پوچھا۔ وہ ابھی تک مکمل ہیڈ ریسٹ پر تھے۔ اکثر رات کو ٹانگ میں درد محسوس کرتے لگتے تھے۔ تاہم حسبِ عادت کچن پر وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ کرسٹل بھی میبل لاہور میں موجود تھی اور دن دی سے سرحد صاحب کی حادری کر رہی تھی۔

عادل کو صادق کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ صنعتی لڑائیں میں سمجھد کے خوں پر چڑھنے والا مکمل آج کل پھر پیش کیا جا رہا ہے لیکن لاہور میں نہیں کسی اور شہر میں۔ اس مکمل کے لیے رانا سیٹھ نے پھر چودھری کی عمار کے کاندھے جیٹی سے رابطہ کر رکھا تھا۔ اس بارے میں تفصیلی معلومات رانا سیٹھ کے کیرا مین اہلکار کے پاس تھیں۔ عادل کو معلوم ہوا کہ اہلکار انٹرکسٹیکسٹیشن ہوئی میں کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہا ہے۔ شام کے وقت عادل، اہلکار سے ملنے ہی انٹرکسٹیکسٹیشن گیا تھا لیکن وہاں اہلکار سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہاں کسی اور سے ہو گئی اور یہ بڑی سستی خیز ملاقات تھی۔ ہوٹل کے مین ڈائننگ ہال سے گزرتے ہوئے عادل کی نگاہ اچانک ایک گوشے کی میز کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں کی دھم روشنیوں میں اسے خور و کرشل بھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ جو غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا، وہ یقیناً وہی ”لیو پڈ“ نامی فریڈ تھا جس نے ایبٹ آباد کے ہوٹل میں کرسٹل سے بدھیز کی تھی۔ کرسٹل نے عادل کی طرف دیکھا۔ ذرا سا چوکی لیکن پھر انجان بن گئی۔ عادل سمجھ گیا کہ وہ جان بچان ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ یقیناً لیو پڈ نے بھی عادل کو دیکھا تھا لیکن وہ چونکہ عادل کو جانتا نہیں تھا لہذا اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر عادل بھی ایک حرقی میز پر جا بیٹھا۔ یہاں سستا ترین آرڈر تو کوئلہ ڈرنک کا ہی ہو سکتا تھا۔ عادل نے یہی آرڈر دیا اور خود اٹھ اپنے ہوا پلٹوں سے چھینر چھانڈ کر کے لگا۔

اس ہال کی میز پر جیسے غالی بڑی تھیں۔ پکا میوزک بٹے ہو رہا تھا۔ عادل کن انکھوں سے دیکھتا رہا۔ کرسٹل اور لیو پڈ ٹارٹل موڈ میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے آٹھ کریم اور جوہر وغیرہ رکھے تھے۔ بہر حال کچھ دیر بعد عادل کو یوں لگا جیسے ان کی گفتگو میں ہی آتی جا رہی ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

عادل نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اور عسکین بچے میں کہا۔ "میں چپ چاپ یہاں پڑے رہوں، اگر پیچھے آئے تو حراسہ لگا جائے گا۔" کرنل نے دو لفظ بھی کہہ دیے تو سیدھے لاکھ اپ میں پہنچ گئے۔"

لہذا تھاکہ بات شرابی لینے کی کچھ میں آئی ہے۔
کر مثل ابھی تک تھر تھر کا پ رہی تھی۔ ایک کندھے پر سے
اس کی شرٹ چٹ چٹ چٹ چٹ۔ بہر حال یہ جاگ اٹھنا نہیں
تھیں تھا۔ عادل نے کر مثل کو ساتھ لیا اور دھکیلی کی پیل کو
غیرت آگئے تھوکر مارا ہوتا تھوکر سے نکل آیا۔

قریباً ایک گھنٹہ بعد کرسٹل اور عادل ام ایم عالم روڈ کے ایک ٹائیو اسٹار بیسٹونٹ میں بیٹھے تھے۔ عادل کے سر پر ہاتھ کی دو دن پرانی چوٹیں دیکھ کر کرسٹل حیران ہوئی تھی۔ عادل نے ان چوٹوں کے بارے میں کرسٹل کو کبھی دی بتایا جو صادق کو بتایا تھا۔ یعنی راولپنڈی سے جھگڑا۔ موسم برسات اپنا آخری زور دہا رہا تھا۔ اچانک ہی کالی گھٹا گھٹا چھائی تھیں اور آسمان سے گرج جھبک کے ساتھ تیز توڑ توڑانی برسنے لگا تھا۔ وہ دونوں یہاں ٹپکسی پر پہنچے تھے۔ کرسٹل نے عادل سے درخواست کی تھی کہ وہ وہاں ہوں میں چوٹیں آنے والے سنگین واقعے کے بارے میں مدد صاحب کو کچھ بتا دے۔ عادل نے وعدہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے پوچھا۔ ”کرسٹل! میری سمجھ میں نہیں آتا جب تم اپنے اس ہم وطن کی خصلت یا حتیٰ بھی ہو پھر کیوں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی نہیں؟“

وہ ہم آنکھوں کے ساتھ یوں۔ ”اس کا ہاتھ ہے
 یہ ہام کو مجبور کرتا کہ ہام روم کے اندر جا کر اس کا
 ہاتھ ہے سلیپر میں کرے۔“

”لیکن تم کیوں مجبور ہوئی ہو؟ کیا مسئلہ ہے۔
 وہ تمہارے ساتھ؟ تم نے شاید آج تک مجھے اپنا نہیں سمجھا۔
 وہ اس طرح اندھیرے میں گونہ گونہ ہیں۔“
 ”تو کیوں غافل! ایسا بھی مت سوچنا۔“

”تو پھر مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“

”اُہم کہتا ہے تو تم کو؟“ وہ ابھن زدو سے جھپٹے ہوئی۔
 ”دیکھو، تمہاری اچھ باجھ میں سے سو باجھ کی پرستی بھی
 لے۔۔۔ وہ کسی شرط کی بات کر رہا تھا۔ اور شاید یہ بھی کہہ رہا
 تھا کہ وہ یہ شرط یاد رکھ جیتے گا۔ کہ کوئی شرط ہارنے کے بعد تم
 کی کسی مزاحمت نہیں کر سکتا ہو؟“
 ”تاہم عاڈل اُہم نے کوئی شرط نہیں لگا اور نہ

ساتھ دروازہ دھڑکے لاک کر دیا۔
لیو نے ایک دم آگ بگولا ہو گیا تھا۔ وہ بچپن میں
سال کا نہایت بڑا اور ذہنی جسم والا بہت نوجوان تھا۔ جسے
اس کے دشمن کارٹر فرم بھول کر نہیں نظر آنے لگا تھا اور اس کے
"لوکس" کو کھڑا کر کے دے رہا تھا۔ وہ سوئے ہوئے پر گرتے ہی
تھکتا جس کی طرح اس کی طرف آیا۔ اس نے ایک طوفانی
گھبراہٹ سے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ عادل پہلے
سے تیار تھا، چہرہ کانٹے کے خود کو صاف بچا گیا۔ اس کے ساتھ
اس نے جوائی گھوڑا سیدھا کھینچ کر لیو کی آنکھوں پر
پڑا۔ وہ حیران کر کرکٹ کے قدموں میں گر کر کھل چلا کر بچنے
گئی۔ دروازہ دھڑکے ہو چکا تھا اور چالی عادل کی جیب میں
ٹھکی ورنہ وہ شاید کمرے سے بھاگ ہی جاتی۔ عادل نہیں
پہتا تھا کہ پولی میں کسی طرح کا شور مچا ہو۔

چوتھانے کے باوجود یوہنہ کھڑا ہوا اور سر جھکا کر عادل سے ملت گیا۔ اس کا جسم کھلایا اور جیسا تھا۔ نشتے نے اس کے جسم میں اضافی توانائی بھردی تھی۔ اس نے کہاں کہتے ہوئے پورا زور لگا دیا اور عادل سمیت میز پر گر۔ وحشی کی پوسٹ قاتلین پر لڑھک گئی۔ گلاس پکنا چور ہوئے۔ ایک چھوٹا سا فریش کریم ٹیک، عادل کے پیچھے مسلا گیا۔ عادل نے یوہنہ کی ناتواں کے درمیان اپنی ہنڈی کی پٹی کی ضرب لگائی پھر سر کی ٹکر سے یوہنہ کو دور کر دیا۔ اس کے بعد اس نے شرابی یوہنہ کو پھینکے کا موقع نہیں دیا۔ غوری جیسا اصلی ہندو اس کے سامنے تھا۔ عادل نے اس کے پیروں سے کٹھن خراب کر دیا۔ عادل کو ایک ٹھیکل بسپ رسید کرنے کی کوشش میں یوہنہ اس کی بری طرح غیر حوازن ہوا کہ کھڑکی سے کھڑا ہوا اور الٹ کر نیچے جا کر۔ ایک لمحے کے لیے تو عادل کو ٹھیک لگا کہ شاید وہ دوسری منزل سے گر کر اپنی ٹھوکر کی ترواٹھنے کا لیکن پھر اس کی تقدیر اس کا ساتھ دے گئی۔ گرتے گرتے جی اس نے کھڑکی کی چوکت قدامی کی اور کی بازی گر کی طرح ہوا میں جھول گیا۔ اس بات کا چتا تو اول کو کافی بعد میں چلا کہ وہ واقعی ایک زبردست کوہ چا ہے۔ خالی ہاتھ چٹا تو وہ بڑھڑھڑا۔

عادل نے فوراً اسے پہنچ کر دو بارہ کمرے میں کر لیا۔
 وہ کمرے کی وجہ سے کوئی چپے سے منہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔
 عادل نے کھڑکی بند کر دی۔ لیو جب اب قاضی پر لینا لہی لہی
 آئیں لے رہا تھا۔ اس کا قصہ بڑا خون سے رنگین تھا۔ عادل
 نے اسے دو بارہ دیکھنے اور کوشش کرنے کی دعوت دی لیکن وہ
 چھڑا اپنے پرور تلواروں سے اسے دیکھتا رہا۔

لیونپ کی آواز ڈرنا قاصد سے سنائی دی۔ اس نے دوشیں
 قرعے ہوئے۔ ان قلعوں سے عادل کی بجھ میں نیکی آیا کر
 ایک تو دوشے میں ہے، دوسرے کرشل کو اپنے قریب کر کے
 خوش کر رہا ہے۔ عادل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ تو وہ کسی حق
 پرست کی جواہریت آباد کے، وہاں میں سامنے آئی تھی۔

عادل کو اب یہ اندازہ ہو گیا کہ کرشن نے عادل کو
خبر کی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے ہی موبائل
فون پر چپکے سے یہ کال کر دی ہے۔ اب موبائل فون ٹاپے
سے اس کے پاس کی جھلی یا پتھر وغیرہ پر رکھا تھا اور آوازیں
عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ دونوں میں جدوجہد کھڑ
جاری تھی۔ ان کی زیادہ تر آواز بڑی عادل کی سمجھ میں نہیں
آ رہی تھی۔ آوازیں بھی بالکل صاف نہیں تھیں۔ تاہم آتا
انداز وہ عادل کو ہو گیا کہ لپوٹہ کسی شرط کی بات کر رہا ہے۔
اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس سال بھی اسی نے
جیتنا ہے۔ اسے اپنا حریف آس پاس نہیں نظر نہیں آتا۔ اس
کی باتوں میں دو تین بار "فعلی راک" کا ذکر بھی آیا۔ پتا
نہیں کہ یہ فعلی راک کیا جاتی ہے۔

ایک بار کڑل کی کرہ سنا لی دی۔ شاید لپو پڑنے لپٹے
 کی حالت میں اسے سخت ہاتھ لگائے تھے۔ یا پھر ویسے
 ہی تھپڑ وغیرہ مارا تھا۔ اس کا ایک فقرہ عادل کو صاف سنا
 گیا۔ ”کیا میری برتھ ڈے کو تم اتنی زیادہ بخوبی سے
 سناؤ گی۔ مجھے بہت مایوس کر رہی ہو تم۔“

چند لمبے بعد کرنل کی اہلیت باز آواز سنا دی۔
 ”لو پتہ احمق سے بڑھ کر ہو۔“ اس نے کچھ اور بھی کہا
 محمد حمزہ کو اڑنے کے سبب عادل کی سمجھ میں آ گیا۔ اب عادل
 کے لیے حرکت میں آ کر ضروری ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے
 اٹھا اور پڑ رویٹ سینکڑوں فٹ پر پہنچ گیا۔ لیو پتہ کے کمرے
 کے دروازے پر پہنچ کر اس نے ڈور تیل بجائی۔ چونکہ
 پانچویں تیل پر دروازہ تھوڑا سا کھلا اور لیو پتہ کا لال ہونچکا
 چہرہ نظر آیا۔ اس نے عادل کو سراپا گھورا۔ ”کیا مسئلہ ہے
 تمہارے ساتھ؟“ اس نے بڑے حرکت نیچے میں کہا۔

یہی وقت تھا جب عادل کو مقب میں مرسل کی جھلک نظر آئی۔ اس کے منہ پر یہ پال مشتعل تھے۔ شرٹ کے پلائی
میں ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔
لیوچ نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ عادل کی نظر سے اوجھل
ہوئی۔ اس سے پہلے کہ لیوچ جھٹکے ہوئے انداز میں
رواز رو بند کروتا۔ عادل اسے دھکیلا ہوا اندر داخل
کر گیا۔ وہ لکھنؤ آکر ایک صوفے پر گر گیا۔ عادل نے پھر تپنے کے

کرشل کا رنگ بدل گیا تھا اور یو پی بھی پانچھ ہلاکا کر باتیں کر
 تھا۔ گاہے بگاہے وہ اپنے سر کو جھلاٹ آمیز انداز میں
 ہاتھی تھا۔ اس کے مقابلے میں کرشل کا لہجہ کچھ بڑا ہوا تھا۔
 راجا تک ہی بڑھ کر۔ یو پی کے بولنے کی آواز عادل کے
 نون تک پہنچنے لگی لیکن الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے
 تھے۔ چند سیکنڈ بعد یو پی بڑے فیصلے انداز میں اپنی جگہ سے
 مڑا ہوا گیا اس نے اپنی کمری کو کبھی شوکر ماری اور پاؤں
 نہ ہوا اللہ کی طرف بڑھ گیا۔ کرشل نے اسے روکنے کی
 شش کی لیکن وہ روکا نہیں۔

کرشل بکھو دیر کم مہینہ بھی رہی۔ اس سے سفید چٹت
اوپر نیکس کی ہانف سیلوشٹ پہن رہی تھی۔ شہری مائل بال
لوں پر بھول رہے تھے۔ وہ ابھی تک عادل سے لائق
مائل تھی۔ آخر اس نے میز پر رکھا ہوا اپنا سوپل فون
مائل اور سی سے رابطہ کرنے لگی۔ اس نے تین چار بار خوش
مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ لیو پٹ
سے سی رابطہ کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گہری سانس
اور بارے ہوئے سے انداز میں اٹھ کر کلف کی طرف بڑھ
گئی۔ یقیناً وہ لیو پٹ کے پیچھے سی گئی تھی۔ عادل نے لیو پٹ کو
کے ذریعے سینکڑوں طور پر جاتے دیکھا تھا۔ کرشل بھی سینکڑ
پر ہی جاری تھی۔ عادل تیزی سے بیڑیوں کی طرف لپکے
کر کرشل کے پیچھے پیچھے وہ بھی سینکڑوں طور پر پہنچی گیا۔ کرشل اس
پاؤں سے بے خبر رہی۔ بہر حال عادل نے اسے کور پٹور
مائل ہوئے اور چھاپک کرے کے دروازے پر تانک
رستے دیکھ لیا۔ وہ انہیں آکر چھ بال میں بیٹھ گیا اور کولہ کافی
آرڈر دے دیا۔ چائیں کیوں اسے انجمن سی ہو رہی تھی۔
کرشل جس طرح جڑ بڑ ہو کر لیو پٹ کے پیچھے اس کے کمرے
گئی تھی وہ جھٹکا دینے والی تھی۔ چائیں کے ان دونوں
کے درمیان کی گفتگو تھا جو اس میں آرا اور بے باک لڑکی
میں نظر آنے لگی تھی۔

اچانک عادل کے غم کی نقل ہوئی۔ وہ دھمک گیا۔ یہ رطل کا نمبر تھا۔ وہ اسے کال کیوں کر رہی تھی؟ اس نے ہنسنے والے ساتھ کال ریسیو کی۔ "ہیلو... ہیلو" اس نے دوبارہ کہا۔

دوسری طرف سے کرسل نے کوئی جواب نہیں دیا۔
اس کی آواز نہیں سنائی دیں۔ وہ غالباً لیو پے سے ہی
اطلاق تھی۔۔۔۔۔ وہ انگلش میں کہہ رہی تھی۔ ”ہیلز لیو پے ایہ
ایک نہیں، تم نے زیادہ ورک کی ہے۔ تم اپنے حواس میں
نہیں ہو۔“

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تما جلدی بیماریوں کا مشہور اور سب سے بڑا علاج

پھلپھری

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی کی سرکردگی میں کراچی کے معروف اور سب سے بڑے ہسپتال میں



اسلام آباد

مکمل نمبر 0300-8568188
فون 2281836
سہاگ 0300-8568188
فون 2281836



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

لاہور

گل ف سنٹر
14-فروری 27-فروری
14-فروری 27-فروری
14-اکتوبر 27-اکتوبر
0300-8568188

پشاور

نیم فروری 11-فروری
نیم جون 11-جون
نیم اکتوبر 11-اکتوبر
0300-8568188

ملتان

128-8-اپریل
28-اپریل 6-مئی
28-نومبر 7-دسمبر
0300-8568188

کراچی

13-اپریل 27-اپریل
13-اپریل 27-اپریل
13-نومبر 27-نومبر
0300-8568188

E-mail: Syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

ہمارا ہے۔ یہ کوئی اور جاکر (پکڑ) ہے۔ یہ شرط بہت پہلے سے لگا رہا ہے۔ سس ٹی ٹی ایئر۔
یاد رکھو! دوڑ سے گریب اور بارش کی یہ چھاڑیں
کچھ اور چیز ہو سکیں۔ ریسٹورنٹ کے ہال میں اکٹرا میزیں
خالی ہیں اور اندر کا ناول پر سکون تھا۔
”تمہارا مطلب ہے کمرشل، یہ کوئی ایسی شرط ہے جو
پرانے وقتوں سے لگتی جا رہی ہے اور لیو پڈ کے یہ شرط جیتنے
کی وجہ سے تم پر اثر پڑا ہے؟“
”ہاں۔ لیو پڈ۔“
عادل کے ذہن میں ایک اور خیال چمکا۔ اس نے
کہا۔ ”مجھے یاد آیا۔ تمہاری اور لیو پڈ کی باتوں میں کسی
نوٹیل راک کا ذکر بھی آیا ہے۔ واٹ اڈس نوٹیل راک؟“
کمرشل کے سفید چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ عادل کو
لگا کہ وہ بات ٹالنے کے لیے کوئی بات بنائے گی۔ وہ جلدی
سے بولا۔ ”نہیں۔ یہ کوئی ایسی چٹان تو نہیں جس پر چڑھنے کا
مقابلہ ہوتا ہو؟“
کمرشل ایک گہری سانس لے کر وہ گئی۔ وہ محسوس کر
رہی تھی کہ عادل اس کے گرد گھیرا نگہ کرتا جا رہا ہے اور اب
شاید اسے عادل کو کچھ نہ کچھ بتا ہی پڑے گا۔ اس نے پہلے
عادل سے وعدہ لیا کہ وہ اس بارے میں سرسریہ یا ہلکیوں کو
ابھی کچھ نہیں بتائے گا۔ ہاں اگر وہ خود کچھ بتائیں تو اور بات
ہے۔ عادل نے وعدہ کر لیا۔
گرتے جیسے موسم میں اس ریسٹورنٹ کی مدھم
روشنی میں بیٹھ کر کمرشل نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا، وہ
عادل کے لیے کافی حیران کن تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس
طرح تھا۔

”ساترا ابراہادی، انگلیٹ کے شادی خاندان کی ہی
ایک شاخ تھی۔ اس میں آگے میں ویلیو فیلپس تھے، گھرانے
تھے۔ چھ پشتوں کے بعد ان لوگوں کا بھروسہ لب انھارویں
صدی کے چارج دوم سے جاتا تھا۔ 1857ء کی جنگ
آزادی کے بعد انگریزوں کو ہندوستان پر مکمل تسلط حاصل
ہو گیا اور اگلے قریباً توڑے سال تک انہوں نے اپنے اس
تسلط کو خوب انجوائے کیا۔ لیکن اس سے پہلے بھی انگریز
یہاں موجود تھے اور ”انجوائے“ کر رہے تھے۔ یہ اسی
”شہری دور“ کی بات ہے۔ ساترا ابراہادی کی کچھ فیلپس
تقریباً کے لیے کے ٹو کے دانوں تک جاتی تھیں۔ وہاں
برف پر مختلف ٹھیل ہوتے تھے اور مروج سلا گیا جاتا تھا۔
وہاں پر ایک خوب صورت عموادی چٹان تھی۔ اس کی اونچائی

اپنے ارد گرد کی سطح سے کوئی 1800 فٹ تھی۔ یہاں پر انگریز
نوجوان خالی ہاتھ چڑھنے کے مقابلے کرتے تھے۔ وہ میرے
وجہ سے مذکورہ فیلپس نے اس چٹان پر چڑھنے کے مقابلے کو
مستقل تفریح کی شکل دے دی۔ بتدریج ان مقابلوں نے
ساترا ابراہادی میں سالانہ ایونت کی شکل اختیار کر لی۔ اس
چٹان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں تک جانے کا راستہ
اکت کے آخر میں ہونے والی دو ٹین نیو بارشوں کے بعد ہی
کھلتا تھا لہذا یہ مقابلے نسبتاً خشک موسم یعنی اگست کے آخر یا
ستمبر میں ہوتے تھے۔ ساترا ابراہادی کے لوگ مقررہ وقت
پر اس جگہ جمع ہوتے اور چٹان پر چڑھا جاتا۔ ایسے ہی
مقابلوں میں ایک موقع پر ”جو“ نامی ایک نوجوان بھادی
سے کرکر ہلاک ہو گیا۔ اس ہر دو گزیز نوجوان کے نام پر
چٹان کو جو ٹیل۔ یا ٹیل راک کہا جانے لگا۔
بہر حال یہ نام اور یہاں ہونے والے مقابلے صرف
ساترا فیلپس تک ہی محدود رہے۔ چالیس پچاس سال بعد
ان مقابلوں میں ایک اور چیز شامل ہوئی۔ ہر سال 25 سال
تک والی کیشیئر کی جس جو نوجوان یہ مقابلہ جیتتا تھا، اس کو یہ
حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ ساترا ٹیٹو ٹیٹو میں سے کسی بھی لاک
کو اپنی شریک حیات کے طور پر چن سکتا ہے۔ شرط صرف
اتنی ہوتی تھی کہ وہ لاک پہلے سے انجیج نہ ہو۔ انجیج ہونے کی
صورت میں وہ اپنی مرضی سے اپنی انجیج منٹ ختم بھی کر سکتی
تھی اور لاک یا راک یا ہوا بھی۔ ظاہر ہے کہ برادری کے جیسٹین
نوجوان سے شادی کرنا ایک انفرادی امر تھا۔ پھر اس
نوجوان کو ایک فلیپر رقم انعام میں بھی حاصل ہوتی تھی۔ یہ رقم
پرانے وقتوں میں تو نسبتاً تھوڑی تھی لیکن آہستہ آہستہ بڑھتی
رہی اور پانچ لاکھ پاؤنڈ تک پہنچ گئی۔ 1947ء میں انگریز
یہاں سے کوچ کر گئے۔ جو ٹیل راک پر ساترا ابراہادی کی
سرگرمیاں دو چار سال کے لیے تو رک گئیں لیکن ان
سرگرمیوں کو بچھلے دو دہائیوں میں چوتھ ایک مذہبی
رنگ بھی مل چکا تھا، اس لیے قویاں سے وہ حق کے بعد
ساترا ابراہادی کے لوگ ہر سال اگست یا ستمبر کے مہینے میں
پھر یہاں آنے لگے۔ یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور اب تک
جاری تھا۔ کچھ بڑے بڑوں کا خیال تھا کہ جو ٹیل راک
کی شکل کچھ کچھ گریب سے مشابہ ہے۔ اس لیے یہ لوگ
اسے ٹکرم بھی دیتے تھے۔

پچھلے برس یہاں ہونے والے مقابلے میں ساترا
براہادی کی ایک بڑی بھلی ماؤ نے کچھ نوجوان لیو پڈ ماؤ نے
جیتا تھا۔ اس نے دو پروڈکشن راک کھڑا کر کے حد بجا ہمار

مقابلہ کیا اور انہیں نچا دکھا کر سب کو حیران کر دیا۔ وہ خود بھی زبردست ایتھلیٹ تھا اور راک کا ٹائٹل کے عالمی مقابلوں میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ لیو نے لندن کے ایک باڈی بیلڈ شخص ڈیوگ ایان کا ٹائٹل جیتا تھا۔ باؤسنے ملی سٹار براہوری کی سب سے خوش حال میلی بھی جاتی تھی اور برادری میں ان لوگوں کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔ مقابلہ جیتنے کے بعد لیو نے فیہ متوجہ طور پر چرچہ جن میلی کی لڑکی کرٹل کا چھ ماہ تک لیا۔ کرٹل کی چنگ نہ کھیں اسٹیج منت نہیں گئی لہذا وہ خاندانی روایت کے مطابق لیو پڑے شادی کی پابندی نہ چاہم اس وقت برادری کے سب بڑے حیران رہ گئے جب کرٹل نے روایت شکنی کرتے ہوئے لیو پڑے کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ سے ایک عجیب مسئلہ کھڑا ہو گیا جو اب تک موجود تھا بلکہ مزید سنگین ہو چکا تھا۔

کرٹل کی پوری روداد سننے کے بعد عادل کی دلچسپی اس معاملے میں مزید بڑھ گئی۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ بادل بدستور موجود تھے۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش ہونے لگی تھی۔

عادل نے چائے کا گھونٹ لیٹے ہوئے کہا۔ "ساری بات سمجھ میں آ رہی ہے کرٹل۔ لیکن شادی سے انکار کی کوئی وجہ تو ہوگی تمہارے ذہن میں؟"

"وہ بس یہی تھی عادل۔ کہ وہ ہام کو آچھاتا کریں لگتا۔ شہزادی، ہام اس کو خوش نامیں رکھ سکتا اور وہ ہام کو۔"

"تمہارے انکار کو اس نے قبول نہیں کیا؟"

"نہیں عادل! اس نے اسے اپنا افسلہ سمجھا۔ وہ ہام سے ہر صورت شادی کرنا مانگا۔ آخر میں اس نے ہام کو بس کھڑا سار رعایت دیا۔"

"کیسی رعایت؟"

"ایک سال کا ٹیکسیشن۔ وہ کہتا کہ ہام اس سال بھی کبھی ٹیکس جیت کر دکھائے گا اور پھر ہام کے پاس میرج سے انکار کرنے کا کوئی پتہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم نے اس کی پیشکش مانی؟"

"نہیں ہام خاموش رہا تھا۔ وہ سمجھتا کہ ہام کچھ رضامند۔ آئی ایم سوچ ڈسٹرٹ عادل۔ آئی ڈونٹ نو، واٹ ٹو ڈو۔" وہ وہاں سے ہوئی اور تیزی سے انکس بولتی چلی گئی۔

اب بات کچھ کچھ عادل کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تین بدن میں عجیب سی سسٹنی پھیل گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سرمد صاحب نے اس لیو پڑے کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اس کا ٹھکانہ توڑنے کے لیے ہی اسے تیار کیا

ہو؟ چند ماہ سے جاری ساری تنگ و دوامی لیو پڑے کے سامنے نہ ٹھوکتے کے لیے ہو؟ ایک موقع پر کچھ اس طرح کا اشارہ سرمد صاحب نے دیا بھی تھا۔ پھر ایک دفعہ کرٹل نے بھی کچھ اسی مفہوم کی بات کی تھی اور کہا تھا۔ "سرمد کا خیال ہے عادل کہ تو ہم ہام کے لیے کچھ کر سکتا۔"

عادل کو یہ سب کچھ ایک سسٹنی خیر کیا ہی کی طرح لگ رہا تھا۔ سرمد نے کئی دنوں کے سفر پر واپس ہوتے وقت عادل کے دل میں ایک دینے کی امید چھائی تھی۔ اور پھر باگڑی ہوئی سر کرنے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔ "عادل۔۔۔ سمجھو کہ وہ دفعہ نہیں مل گیا ہے۔ اور اب کرٹل ایک خطیر رقم کی بات کر رہی تھی۔ دال میلی کی ریت کے مطابق جیتنے والے کو کم و بیش نصف ملین پاؤنڈ یعنی پانچ کروڑ پاکستانی روپے کے لگ بھگ انعامی رقم ملنا تھی اور پھر اس کا ایک بڑا اٹرازیہ بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ سٹار براہوری کی کسی بھی وینیز کو شریک حیات بنانے کے لیے منتخب کر سکتا تھا۔ بعد ازاں عادل کا یہ دوسرا انداز غلط ثابت ہوا کیونکہ سٹار براہوری کی وہ وینیز سے شادی والی شق صرف برادری کے نوجوانوں کے لیے تھی۔

اب اس توہن راک والے معاملے میں عادل کی دلچسپی ایک دم بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے کرٹل سے اس بارے میں مزید کی سوال کیے۔ اس نے اپنی معلومات کے مطابق تسلی بخش جوابات دیے۔

آخر میں عادل نے اس سے پوچھا۔ "کرٹل تمہارا کیا خیال ہے، کہ سرمد صاحب مجھے لیو پڑے کے مقابل تو نہیں لانا چاہ رہے؟"

وہ بولی۔ "سچی بات یہ ہے عادل، ہام کو اس بارے میں کثرت افکار مشن نامی ہے لیکن ہام کا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ شادی ان کے ذہن میں یہ آپشن ہے۔ کسی عام بندے کے لیے لیو پڑے سے دن کرنا ممکن نامی۔ ہی اڈ ایکسٹرا آڈیٹری ان دن فیملی عادل!"

پھر کرٹل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ توہن راک پر چڑھائی کی تاریخ سٹار براہوری میں کوئی دعائی سو سال پرانی ہے۔ یعنی کہ محمد شاہ کے دور حکومت سے یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ آج تک کے اندراج کے مطابق صرف دو بندے ایسے ہیں جنہوں نے راک کا ٹائٹل نام میں توہن راک پر چڑھائی مکمل کی۔ ان میں ایک وہی "جو" نامی لوجوان تھا جو بعد میں گر گر ہلاک ہوا۔ دوسرا لیو پڑے۔ لیو پڑے کا نام "جو" سے بھی تقریباً تین منٹ تھا۔ اس حوالے سے اسے غیر معمولی قرار دیا جا رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ آئندہ تین چار

سال تک وہی توہن راک کا ٹائٹل رہے گا۔

عادل نے کرٹل سے پوچھا۔ "اس سال یہ مقابلہ کب ہونے لگا؟"

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ "عادل! سمجھو وہ ٹائم آ گیا ہے۔ سٹار براہوری کی آٹھ دس فیملیاں تو اسلام آباد پہنچ چکی ہیں۔ ابھی مزید آ رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ خبر کے فرسٹ ویک میں یہ مقابلہ ہو سکتا ہے۔"

حیران کن اتفاق تھا کہ جس وقت ریسٹورنٹ کے نیم روشن گوشے میں عادل اور کرٹل کے درمیان یہ اہم گفتگو ہو رہی تھی، اس وقت عادل کے موبائل فون پر سرمد صاحب کی کال آ گئی۔ عادل نے کال ریسپونڈ کی۔ اور موڈب لچے میں سرمد صاحب کی خیر خبریت دریافت کی۔

حمیدہ کی گفتگو کے بعد وہ بولے۔ "تم کہاں ہو عادل؟"

"میں لاہور میں ہی ہوں سر۔ کل ہی آیا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل صبح تم میرے پاس آ جاؤ۔ تمہارے خرافت کے دن اب ختم ہو گئے ہیں۔ اب کام کرنا ہوگا۔" انہوں نے ہلکے پھٹکے انداز میں کہا۔

"میں بالکل تیار ہوں جناب۔"

سرمد صاحب سے بات کرنے کے بعد عادل خود کو ایک دم توان محسوس کرنے لگا۔ ترنگ اور جوش کی ایک لہری اس کے گدگدے میں دوڑی۔ کرٹل کے ساتھ ابھی ابھی جو انکشاف انہیں لگتا ہو رہا تھا، اس کی روشنی میں یہ صاف پتا چل رہا تھا کہ سرمد صاحب کس دن پر سوچ رہے ہیں۔

تھوڑی دیر کرٹل سے مزید بات کرنے کے بعد وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ عادل نے کرٹل کو دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ اب کہیں انکیا باہر نہ نکلے اور لیو پڑے سے ہر طرح کا رابطہ منقطع رکھے۔ وہ لیو پڑے کے رد عمل سے خوفزدہ تھی۔ عادل نے اسے تسلی دی کہ وہ اور دونوں اس پر کوئی آج نہیں آنے دیں گے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی عادل سرمد صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ حلو پوری اور جیتنے کے لاہوری ناشتے کے بعد اس نے صادق کو ساتھ لیا اور کھل پڑا۔ صادق نے کہا اور مشیر کی کے کام کے لیے اب ایک پک اپ لیا گاڑی بھی لے لی تھی۔ سینڈ چیڈز میکن فاسٹ تھی۔ سفید رنگ کی اس پک اپ پر عادل سرمد صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ دن کے نو بج چکے تھے، سڑکوں پر رش تھا۔ نسبت روڈ کے تنگ چوک سے گزرتے ہوئے عادل نے بھم پر لگا دوڑائی۔ ہر کوئی اپنے اپنے "کام" پر پہنچے کی

جلدی میں تھا۔ سیکڑوں افراد حرکت میں تھے۔ پیدل چلنے والوں کی اکثریت تھی۔ اپنا پک عادل کی نگاہ لوگوں کے درمیان ایک جھٹکے ہوئے سے چرے پر پڑی اور اسے لگا کہ اس کے ہم کار سارا خون اس کے سر کی طرف آ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لیے وہ سخت زوردار ہو گیا تھا۔ اس کی نظر کمزور نہیں تھی اور نہ ہی اس کی نظر نے دھوکا کھایا تھا۔ اس نے لوگوں کے درمیان جس شخص کی جھلک دیکھی، وہ اس کے لیے ابھی نہیں تھا۔ یہاں سے طویل فاصلوں پر کے ٹو کے برقنا لوں میں عادل اسے دیکھ چکا تھا۔ اسے یہاں نسبت روڈ کے چوک میں لوگوں کے درمیان "مالکانے زادہ" نظر آیا تھا۔ منڈا ہوا اشتاف سر ہوسوئی آگئیں، قہقہا پھرے۔ ہاں، یہ مالکانے زادہ تھا۔ اور مالکانے زادہ، کئی دن پہلے باگڑی کے کس کچھ میں تیار رہنے کے بعد مر چکا تھا۔ اگر وہ مر چکا تھا تو پھر یہ کون تھا؟ اس کا ہم شکل؟ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ تو پھر؟ کیا عادل نے جانتی آگئیں سے خواب دیکھا تھا؟

"گاڑی روکو۔" وہ پکار کر بولا۔

صادق ابھی اتنا ماہر ڈرائیور نہیں بنا تھا۔ اس نے بولکھا ہٹ میں بریک دیا۔ پیچھے آنے والا رش پک اپ سے ٹکراتے ٹکراتے تھا۔ صادق نے گاڑی کنارے پر روکی۔ عادل چکا چکا سا پیچھے اترا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا اس طرف بڑھا چلا اس نے مالکانے زادہ کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں اس کو اپنی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا، ایک دکان کے اوچے حقے پر چڑھ گیا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کہیں کوئی منڈا ہوا اشتاف سر دکھائی نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد وہ صادق کے پاس واپس پک اپ میں تھا۔ "کون تھا یاد؟" صادق نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"شاید مجھے دھوکا ہوا ہے۔ میں نے ایک مرے ہوئے شخص کو دیکھا ہے۔" عادل نے گہری سانس لیٹے ہوئے کہا۔

"مرا ہوا شخص؟" صادق نے مزید تفصیل پوچھی۔

عادل۔۔۔ صادق کو اپنی تقریباً تمام اسٹوری سن چکا تھا۔ اس میں مالکانے زادہ بولا دوان اور رائے خاں کا ذکر بھی تفصیل سے موجود تھا۔ عادل نے کہا۔ "مجھے ابھی یوں لگا ہے جیسے مالکانے زادہ یہاں نسبت چوک میں موجود تھا۔"

"شاید تم رات کو ٹھیک سے سوچیں گے ہو۔" صادق نے ہلکے پھٹکے انداز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ لگ تو ایسے ہی رہا ہے۔ لیکن۔۔۔ وہ

کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔
دونوں کچھ دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔
پھر عادل کا فون پر ہمایوں کی کال آگئی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ
عادل کتنی دیر میں نکلتا ہے۔

”بس دس منٹ کی ڈرائیو ہے۔“ عادل نے کہا۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد صادق اسے سرحد صاحب کی
رہائش گاہ کے پاس ڈراپ کر رہا تھا۔

اس روز عادل اور سرحد صاحب کے درمیان خصوصی
مفتحو ہوئی۔ یہ گفتگو قریباً چار گھنٹے جاری رہی۔ اس کے
درمیان ہی چٹائیوں پر بیٹھ کر ایک سادہ سا چائے بھی کیا گیا۔
سرحد صاحب کے اپنے کھیت میں اُسے ہوتے کدو کا ساگن
اور تھوڑی روٹی، کچھ ایسا سحر و قاس میں کہ قافیہ انشا ہوگیا
کا سوا بھول گیا۔ سرحد صاحب کی ساری بات چیت اس
لیے حسب توقع تھی کہ کل شب کرشن نے اس حوالے سے
کافی کچھ عادل کو بتا دیا تھا۔ سناڑا ابراہاروی کی ڈھائی سو سال
پرانی روایت تو سن راکھ اس پر چڑھائی کے واقعات اور
شرائط وغیرہ، یہ سب کچھ بڑا اداسی لگ رہا تھا۔

مفتحو کے آخر میں سرحد صاحب نے کہا۔ ”سناترا
براہاروی سے باہر کا کوئی فرد ان خاندانی مقابلوں میں حصہ نہیں
لیتا لیکن کرشن اور یو پے والا تنازعہ بالکل مختلف تھا۔ اصل
میں گرباگری کے دوران میں کرشن نے ہی یہ بات یو پے سے
کہی تھی کہ وہ دعا کرتی ہے کہ اس کا گھمٹھ ٹوٹ جائے۔ کوئی
اس کو بچاؤ دھماکے والا آجائے۔ یو پے نے کہا تھا۔۔۔ ٹھیک ہے
ڈارلنگ! اس جہاد کی خاطر چند بیٹے کسی ایسے سورما کا انتظار
کر لیتا ہوں لیکن اگر یہ نہ ہوا تو پھر ہمیں میری نیک خواہش
کے سامنے سر جھکانا پڑے گا۔ اس وقت میں نے یو پے سے کہا
تھا کہ امید ہے اگلے برس تک ہم جہاد پہنچ کر قول کرنے کے
قابل ہو جائیں گے۔ اور اس وقت ہمارے درمیان یہ
بات بھی ملے ہوئی تھی کہ یو پے کے چیلنج کو قبول کرنے والا
سناترا ابراہاروی سے باہر کا بندہ بھی ہو سکتا ہے۔“

عادل نے عجیب انھروں سے سرحد کی طرف دیکھا
اور کہا۔ ”سزا! آپ کو کیسے معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی آپ کو مل
جائے گا؟“

”میرے پاس ہمایوں موجود تھا۔ یہ پیدائشی کو ہستانی
ہے۔ چلاس اور اُٹھارو کے بلند پہاڑوں میں پرورش پائی
ہے اس نے۔ تم نے دیکھا ہے یہ کس قدر سخت جان اور کھٹی
ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں اسے یو پے کے مقابل لانے کے
قابل ہو جاؤں گا لیکن پھر اس دوران میں ہم دونوں کی نظر تم

پر پڑ گئی۔ جہاد کی خدا داد صلاحیت نے ہم دونوں کو متاثر کیا
اور ہم دونوں نے جس قدر لڑائی میں تمہیں دیکھنے کے بعد فیصلہ
کیا کہ تم سے رابطہ کیا جائے۔ آنے والے لڑکوں اور بیٹوں
میں ہمارے فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔“

ہمایوں حسب عادت ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔
اس کے بال بالیشائی پر بھول رہے تھے۔ اس کی آنکھیں
جیسے ہر وقت کی سوچ میں غرق رہتی تھیں۔ عادل نے دیکھا
تھا، شاید پریشانی یا غصے کے وقت میں اس کا چہرہ سیاہ
ہی نظر آتا تھا، تاہم اس کی پیشانی کسی اندرونی حدت کے
سبب جھٹکنے لگتی تھی۔

سرحد اور ہمایوں سے گفتگو کے دوران میں بھی
عادل کے ذہن کے ایک گوشے میں ”نسبت چوک“ میں
دیکھا ہوا منظر نقش رہا۔ مالکانے زادہ کی پر اسرار جھلک پار
بار عادل کی آنکھوں کے سامنے آتی رہی۔ بہر حال اس
حوالے سے اس نے سرحد اور ہمایوں سے کوئی بات نہیں
کی۔ کرشن نے بھی ابھی تک کل رات والا واقعہ سرحد یا
ہمایوں کے گوشہ گزار نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کے انداز سے
محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یو پے کی شدید بدگیزی اور باغی پائی
کے بارے میں جلد ہی از خود سرحد صاحب کو بتا دے گی۔

سرحد صاحب کی باتوں سے عادل کے دل و دماغ میں
ایک نیا جوش ابھرنے لگتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگ رہا
تھا کہ اگر سب کچھ دیکھ لیا جائے تو ایسے سرحد صاحب کہہ رہے ہیں
تو۔۔۔ اس بار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ
دولت کا بھوکا نہیں تھا۔ لیکن فی الوقت حالات نے دولت
کو اس کی ضرورت بنادیا تھا۔ اہل ضرورت۔ اسے کسی کی
خاطر ایک سترہ روپے حاصل کرنا چاہی اور اپنی جان داؤ پر لگا کر
بھی کرنا تھی۔ دو روز بعد اگست کی پانچ تاریخ کو اسی ہمایوں
ان لوگوں کی کے نوکی طرف روانہ کی کا دن تھا۔ سرحد صاحب
نے کرشن اور ہمایوں کو بھی تیاری کی ہدایت جاری کر دی۔ یہ
جان کر عادل کو حیرت ہوئی کہ ذہنی تانک کے باوجود سرحد
صاحب خود بھی اس سفر پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی
تانک پر گھٹنے سے اوپر تک چلا سترہ روپے اور دو سیڑھیوں کے
سہارے ہی چل سکتے تھے۔ سرحد صاحب کے انداز سے کے
مطابق آنے جانے میں تقریباً بیس روز لگ جاتے تھے۔ دس
روز وہاں قیام تھا یعنی کل قریباً ایک مہینے کا سفر تھا۔ عادل
ایک بار پھر ماں کے پاس گوجرانوالہ پہنچا۔ ان کو اپنی
خیر خیریت سے آگاہ کیا اور دعاؤں کا طالب ہوا۔ والدہ کے
لیے بھی یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ وہ ایک ماہ کے لیے

لاہور اور گوجرانوالہ سے دور جا رہا ہے۔ اس طرح وہ اس
جنگلے کے اثرات سے دور رکھ جائے گا جو وہاں پال پور
گاؤں میں ہوا تھا۔ بلکہ ماں کو چاہ رہی تھی کہ وہ ایک ماہ کے
بچانے دور چار ماہ کے لیے کہیں دایم بائیں ہو جائے۔

عادل نے ماں کو ملنے لگی دی اور غصے کے لیے رقم
وغیرہ دے کر لاہور واپس آ گیا۔ اس روز وہ رات کو دیر تک
صادق سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن رابطہ
نہیں ہوا۔ اس نے کہا ڈاک خانے کے ساتھ والے دکان دار
سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا۔ ”صادق بھائی دوپہر سے گھر
نہیں آ رہے، کیٹ کو تالا لگا ہوا ہے۔“

عادل نے پوچھا۔ ”اس کی پک اپ اندر ہی ہے؟“
”نہیں، وہ بھی نہیں ہے۔ شاید اسی پر گیا ہوگا۔ لیکن وہ
جب جاتا ہے بتا کر جاتا ہے، شاید کبھی جلدی میں چلا گیا ہے۔“
”ٹھیک ہے، وہ رات کو یا صبح جب بھی آئے اس
سے کہنا کہ مجھے فون کر لے۔ اس وقت تو اس کا فون بھی
بند جا رہا ہے۔“

اگلے روز کی کام کرنا تھے۔ عادل اور ہمایوں سڑکی
تیاری میں مصروف رہے۔ کچھ فوڈ ”ٹرن پیک“ کرایا گیا۔
ایک ٹرانسٹ خرید لیا گیا۔ کو بیٹائی کے سامان میں جو کچھ بھی، وہ
پوری کی تھی۔ ہمایوں والا لائسنس یافتہ پینٹول تو راہے خاں
اور فوڈا دجان کے ساتھ ہی برف کی قبر میں دفن ہو گیا تھا۔ اسی
لائسنس پر نیا ہتھیار ایٹھ کرانے کے لیے ہمایوں کی دن سے
کوشش کر رہا تھا۔ سرحد صاحب کے ایک کرم فرما کے تعاون
سے پینٹول دستیاب ہو گیا۔

سہ پہر کے وقت عادل کو پھر صادق کا خیال آیا۔
صادق کا فون حسب سابق خاموش تھا۔ اس نے بڑی دکان
دار کو فون کیا۔ اس نے بتایا۔ ”صادق بھائی رات کو بھی نہیں
آئے۔ کہاڑا لائے والے لڑکے بار بار اس کا پوچھ رہے ہیں۔“

عادل کو کچھ پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس طرح کا
غیر ذمے دار تو نہیں تھا۔ اپنے گاؤں کے عبدالقدیر کا لینڈ
لائسنس فون نمبر عادل کے پاس موجود تھا۔ عادل نے اسے فون
کیا اور درخواست کی کہ وہ ذرا صادق کا پتلا لگنے کی کوشش
کرے۔ خود وہ ایک بار پھر ہمایوں اور کرشن وغیرہ کے
ساتھ مل کر سڑکی تیاری میں مصروف رہا۔

رات کو بھی صادق کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں
ملی۔ صبح سویرے جب ہمایوں، کرشن اور سرحد وغیرہ
ایسٹ آدرواگلی کے لیے گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے، ایک
اور پریشان کن اطلاع عادل کو موصول ہوئی۔ یہ اطلاع اس

کے دوست عبدالقدیر نے ہی اس تک پہنچائی۔
عبدالقدیر کا فون آیا تو عادل سمجھا کہ شاید وہ صادق
کے بارے میں کچھ بتائے گا لیکن قدر نے صادق کے بچانے
لائی گاؤں کی بات کی۔ اس نے کہا۔ ”یار عاڈے۔ مجھے
ایک پریشان کرنے والی اطلاع ملی ہے۔“
”کیوں، کیا ہوا؟“ عادل نے پوچھا۔

”کل رات دس گیارہ بجے کے قریب میرے ماں
الغیل کے گھر میں ایک ڈاکو کھسا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی
ساتھی بھی ہو جو گھر سے باہر کھڑا ہو۔ تیرا ماما جی ہوا ہے اور
تحصیل اسپتال میں ہے۔“

عادل سنانے میں رہ گیا۔ اس نے عثمائی کی
خیر خیریت پوچھی اور بچوں کی بھی۔

قدر نے کہا۔ ”بچے تو ٹھیک ہیں پر تیری ماما کو بھی
چوٹیں آئی ہیں۔ وہ سر پر چوٹ کی وجہ سے ڈیرہ دو گھنٹے
بے ہوش رہی ہے لیکن اب ٹھیک ہے۔ کوئی جوتی سا بندہ
تھا۔ کسی ڈوٹی چیز سے سب کے سر پر ضربیں لگائی ہیں۔
بڑے بچے کا سر بھی زخمی ہے۔ چودہ پندرہ ٹانگے لگے ہیں
اسے۔ گھر میں نقد پیسے بھی تھے لیکن صرف سونے کی چیزیں
لے کر گیا ہے۔“

عادل کے لیے یہ شدید دھچکا تھا۔ پتا نہیں کیوں ایک
خیال اس کے ذہن میں ملنے کی طرح چمکا اور اسے اپنے
پورے جسم میں سناہت محسوس ہوئی۔ پچھلے دور کی شدید
معدومیت میں وہ نسبت روڈ والے اس خیر خیر کھڑکھڑا ہوا
تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں مالکانے زادہ کے چہرے کی جھٹکائی
ہوئی جھلک۔ اور مالکانے زادہ اس کی معلومات کے
مطابق مرچکا تھا۔ عادل کو محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے
رو گھٹنے کھڑے ہو رہے ہیں۔ صادق بھی پرسوں سے لاپتا تھا
اور اب گاؤں میں ماسوں فٹیل کے گھر پر یہ پر اسرار
حمل۔ کبھی نسبت روڈ والے منظر۔ اور ان دونوں
واقعات میں کوئی تعلق تو نہیں تھا؟ کبھی ایسا تو نہیں تھا کہ یہ
یاؤندہ عامل ہمارا ہو بھی زندہ ہو اور کسی بدلے وغیرہ کے
پھر میں یہاں آن موجود ہوا ہو۔ یہ عادل ہی تھا جس نے
مالکانے زادہ کے سر پر پیچھے سے کھپڑی کی آئی ضرب لگائی
تھی اور اسے پس کرنے میں مدد دی تھی۔

بہر حال عادل نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے
جھٹک دیا۔ اپنا یہ خیال اسے ایک دور از قیاس آرائی ہی کی
طرح لگا۔ اس نے قدر سے پوچھا۔ ”مامی اب محل ہوش
میں ہے؟“ قدر نے اثبات میں جواب دیا۔ عادل نے

پوچھا۔ "اس نے کچھ بتایا ہے اس بندے کے بارے میں؟"
 وہ کہتی ہے کہ وہ اس گاؤں یا علاقے کا تو نہیں لگتا
 تھا۔ اس نے اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا اور بڑے
 گہرے شلوار کے ساتھ کچھ پکڑ رکھی تھی۔ تمہاری مامی اس
 کی آواز نہیں سن سکی۔"
 قدرے عاقل کو بتایا کہ لاہور میں صادق کا ابھی
 کوئی پتا نہیں ہے۔ عاقل نے قدرے درخواست کی کہ وہ
 صادق کے بارے میں سب سے مل کر اس کا کھوج لگانے کی
 کوشش کرے۔ ان کے سفر کا شیڈول بڑا سخت تھا اور نہ اپنے
 حالات میں عاقل یہاں رک جاتا اور اس سارے معاملے کو
 دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال بھی
 آ رہا تھا کہ کہیں ماموں طفیل کے گھر میں بیٹن آنے والے
 واقعے کے پیچھے تا فرست کے بیٹن قائم اور عام وغیرہ کا
 ہاتھ نہ ہو۔ باغ والے واقعے کے بعد وہ بہت بھڑکے ہوئے
 تھے۔ انہیں یہ رنج بھی ہو سکتا تھا کہ ماموں طفیل نے ماں
 بیٹے (عاقل اور اس کی ماں) کو بطور مہمان اپنے گھر میں
 ٹھہرایا ہوا تھا۔

بہر طور مقررہ وقت پر وہ لوگ براستہ سڑک ایبٹ آباد
 کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ دو گاڑیوں میں تھے۔ دوسری
 اسٹیشن وین تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ دہائیوں سوار
 تھے۔ اس وین میں زیادہ تر ان کا ساز و سامان ہی تھا۔
 عاقل کچھ خاموش خاموش تھا۔ "کیا بات ہے عاقل تم کم سم
 ہو؟" سر صاحب نے پوچھا۔
 "نہیں سراسر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ زبردستی مسکرا
 کر بولا۔

وہ جانتا تھا کہ سر صاحب کی لگاؤ بندے کے اندر
 دور تک دیکھ لیتی ہیں۔ ان کے سامنے جھوٹ بولنا آسان
 نہیں ہوتا تھا۔
 انہوں نے اپنی پلاست شدہ ٹانگ کو ہولے سے اٹھا
 کر اس کی جگہ تبدیل کی اور بولے۔ "عاقل انہیں پتا ہے
 مجھے دنیا میں سب سے پیارے لوگ کون لگتے ہیں؟"
 پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ "وہ جو اپنا دکھ
 اور گہری پریشانی میرے میں چھپاتے ہیں اور مسکرانے والوں
 کے ساتھ مسکراتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے عاقل۔"
 "لیکن سر۔"

وہ بات کاٹ کر بولے۔ "تم کچھ بھی کہو لیکن مجھے لگتا
 ہے کہ تم برسوں سے کچھ غمزدہ ہو اور یہ غمزدگی گاؤں کے
 حالات والی غمزدگی سے ٹھیکہ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ

شہزادی والی غمزدگی کے علاوہ بھی کوئی پریشانی ہے۔"
 عاقل نے گہری سانس لیے ہوئے کہا۔ "میرا مجھے
 ایک بات بتائیے۔ یہ مالکانے زادہ کون تھا؟ میرا مطلب
 ہے کیا یہ واقعی کوئی عامل وغیرہ تھا یا اس نے بس ڈھونڈ
 رکھا ہوا تھا؟"

"یہ مالکانے زادہ کا خیال تمہارے دماغ میں
 اچانک کیوں آ گیا؟"

"بس یوں کبھی۔"
 "مالکانے زادہ جیسے لوگوں کے بارے میں کچھ بھی
 جین سے کہنا مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال جب بہت سے لوگ
 کسی شخص کے انوکھے پن پر یقین رکھیں اور مسلسل انہیں تو
 پھر اس کے پیچھے کوئی چھوٹی بڑی وجہ تو ضرور ہوتی ہے۔ بعض
 دفعہ وہ "وجہ" ہمارے عقیدے اور اعتقاد کا سبب بھی بن
 جاتی ہے۔ بہر حال ذاتی طور پر تو یہ شخص مجھے کچھ زیادہ اچھا
 نہیں لگتا تھا۔"

عاقل نے کہا۔ "سرا بھڑکی بیچ کو جب میں آپ سے
 ملنے آپ کی رہائش گاہ کی طرف آ رہا تھا، نسبت روڈ کے چوک
 میں، میں نے مالکانے زادہ کو دیکھا۔ یاہوں کہہ لیں کہ میں
 نے اس کی ایک جھلک دیکھی۔ بالکل واضح اور صاف۔"
 سر صاحب ایک دم خاموشی سے ہو گئے۔ گاڑی
 تیزی سے ہائی وے پر بھاگ جاتی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر
 کھینچ کر کھلیاؤں کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "تمہارے
 وہی نظریہ دعوے والی بات تو نہیں تھی؟"

عاقل نے موزب لہجے میں کہا۔ "میرا اس طرح کا
 وہم یا دھوکا تو جب ہوتا ہے جب آپ کے ذہن میں پہلے سے
 کوئی ڈر، اندیشہ یا پھر خواہش وغیرہ موجود ہے۔ میرے دماغ
 میں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور میں نے اسے قریباً
 پندرہ قدم کے فاصلے سے دیکھا۔ وہ جیسے، ایسے کسی خیال میں
 غم تھا، تیزی سے چلتا ہوا لوگوں کے پیچھے اوٹل ہو گیا۔"

سر صاحب کی کشادہ پریشانی پر نظریہ ایک گہری
 نمودار ہوئی۔ انہوں نے عاقل کی آنکھوں میں دیکھتے
 ہوئے کہا۔ "اس کے بعد تو کچھ نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے
 دوبارہ اس کی جھلک۔" یا کچھ اور؟

"اس کے بعد دو واقعے ہوئے ہیں سراسر اب مجھے پتا
 نہیں کہ یہ علیحدہ معاملہ ہے یا پھر ان کا تعلق اسی واقعے سے
 ہے۔ صادق۔ جو کپڑے کام میں میرا پارٹنر ہے، برسوں
 سے لاپتا ہے۔ کم از کم ابھی تک تو اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔
 دوسری طرف گاؤں میں میرے ماموں کے گھر ڈھنکی کی

واردات ہوئی ہے۔"
 عاقل نے واردات کی تفصیل سر صاحب کے گوش
 گزار کی اور بتایا کہ گھر میں کتنے والا اپنے عینے اور ڈیل
 اول سے پہاڑی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا۔ اور اس
 نے بیدردی سے سب کے سروں پر ضرب لگائی ہے۔ اس
 نے ماموں کے بارے میں بھی بتایا جن کے سر پر بڑا فریکچر
 ہوا تھا اور وہ اسپتال میں زیر علاج تھے۔

سر صاحب نے تائید کا اظہار کرتے ہوئے کہا
 کہ اگر ان واقعات کا پتا پہلے چل جاتا تو روایتی کے پروگرام
 میں رد و بدل کر لیا جاتا۔ یا پھر روایتی سے پہلے اس
 معاملے کو لیکچر کر لیا جاتا۔

عاقل بھی اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اب سفر ملتوی
 کرنے یا اس میں تاخیر کرنے کی مجاہد نہیں ہے۔ انہیں
 بہر صورت اب آگے ہی بڑھنا ہوگا۔ وہ جی ٹی روڈ پر سفر
 کرتے ہوئے راولپنڈی کی طرف رواں دواں رہے۔ ساتھ
 ہی اس موضوع پر بات بھی ہوتی رہی۔ سر صاحب نے
 پُرسوز لہجے میں کہا۔ "مالکانے زادہ کی موت کی خبر واک کی جاک
 پر ہی سن گئی تھی۔ بتانے والے اس کے باؤندہ مرید تھے۔
 ظاہر ہے کہ وہ اس سلسلے میں جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔"
 "تجربہ نشست سے کرمل اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔
 "میں سراسر ہام نے بھی واک کی جاک پر وہ کال سنا تھا۔ بولنے
 والے بہت سیدھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی مالکانے
 ایک پاسز ہو گیا۔"

سر صاحب نے کہا۔ "ایسا ہوتا ہے بعض دفعہ کسی کو
 مردہ سمجھ لیا جاتا ہے لیکن اس میں وائٹ سائنز موجود ہوتے
 ہیں۔ بعد میں وہ منجھل جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ مالکانے زادہ
 کے ساتھ بھی کچھ ایسی طرح کی بات ہوئی ہے۔"

"لیکن سراسر اگر وہ زندہ بھی ہے۔ تو ایسا کیوں ہے
 کہ وہ اتنی دور سے لاہور آئے اور عاقل کے فرینڈ اور کمل
 نمبرز سے بدلے لینے کا کوشش کرے؟" کرمل نے آنکھیں
 جھپک کر کہا۔

سر صاحب نے کاری کھڑکی سے باہر پوچھا کہ
 اسی نے نیپے نیلوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ان پہاڑوں
 میں رہنے والے کچھ لوگوں کے مزاج بہت مختلف ہوتے
 ہیں۔ ان میں بدلے اور انتقام کو بھی خاص اہمیت حاصل
 ہوتی ہے اور یہ باؤندہ تو ذہنی لحاظ سے بھی ہم سے بہت
 مختلف ہیں۔ کچھ چھ پرانے لکڑیوں جیسی جھلک پائی جاتی
 ہے ان میں۔ مجھے بار بار وہ بلائی یاد رہی ہے جو پچھلے سفر میں

کچھ نمبر دو پر ہمارے اور اسے خال وغیرہ کے درمیان ہوئی
 تھی۔ اس میں خرابی تھی نام کے جس بندے کو عاقل نے پہاڑ
 سے نیچے کرایا، وہ مالکانے زادہ کا ساتھی اور پرستار تھا۔ دور
 نزدیک سے اس کی مالکانے کے کوئی رشتے داری بھی تھی۔ یہی
 وجہ تھی کہ وہ راسے خاں اور فواد جان کو چوٹی پر جانے سے باز
 پار منع کرتا تھا اور وہ جھگڑا بھی اسی بات سے شروع ہوا تھا جس
 میں خرابی کی جان گئی۔ اگر۔۔۔ مالکانے زادہ واقعی لاہور میں نظر آیا
 ہے تو پھر اس کا واسطہ خرابی کی موت سے بھی ہو سکتا ہے۔ میں
 ممکن ہے کہ وہ عاقل کو ڈھونڈ رہا ہو۔"

قارئین متوجہ ہوں

پرچا

نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات پر یہ شکایت مل رہی تھی
 کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
 انٹیکسٹ کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
 ہے کہ ہر چاند ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
 کے ذریعے مطلع کرنا ضروری معلومات کے لیے۔

☆ ایک مثال کا نام وہاں پر چاندی کا ہے۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ نمبر پرچہ کا: 03012454188

☆ رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرت

63-C II تیشیش انٹرنیشنل پبلی کیشنز، لاہور

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

گھر مل بیوی۔ ”یہ تو انجیریں کچھ بیٹن ہے سر لیکن سوچتے کا بات ہے۔ مالکانے کو اس بات کا کان کیسے ہوا کہ خٹاب کو عادل نے پہاڑ سے گرایا تھا؟“

”ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ ممکن ہے کہ خٹاب پہاڑ سے گر کر فروری ہلاک نہ ہوا ہو۔ بعد میں جو واقعے ہمارے پیچھے اوپر آئے، انہوں نے اسے زندہ حالت میں دیکھا ہو۔ بہر حال۔۔۔ ابھی تو یہ سارے مفروضے ہی ہیں۔ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ یہ مالکانے زندہ ہے یا نہیں۔“

عادل کو اپنی والدہ کی طرف سے بھی غمراہی تھی۔ انہوں نے راولپنڈی کے قریب کوہ جڑیاں میں ٹھوڑی دیر کے لیے گاڑیاں روکیں تو عادل نے کوہ جڑیاں والے میں اپنے خالو عطا شاہ کے ایک واقف کار کو فون کیا۔ اس نے خالو عطا شاہ سے عادل کی بات کرا دی۔ عادل نے خالو عطا کو خطرے سے آگاہ کیا اور انہیں اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ اس کی والدہ کو لے کر ڈیرہ حدود پنجے کے لیے شکر پورہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس پہلے جائیں۔

☆ ☆ ☆

ان کا سفر جاری رہا۔ دو روز بعد وہ ایبٹ آباد سے شام اور اقرا قمر پر سڑک کرتے ہوئے اور بیٹام۔۔۔ واسو وغیرہ سے ہوتے ہوئے اسکر دور روڈ پر آئے۔ اور پھر معروف کنکڑو یا کھٹیر کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہاں Shigao نامی گاؤں سے آگے انہیں پانچواں سڑک کرنا تھا۔ حسب سابق یہاں گاڑیاں چھوڑ دی گئیں۔ پروگرام کے مطابق سرمد صاحب کے لیے سواری کے واسطے ایک کھاتہ تیار ہو چکا تھا۔ ان کا کام کیا گیا تھا۔ سامان وغیرہ کے لیے بھی دو ٹونو موجود تھے۔ کسی بنگالی صورت حال کے لیے ایک اضافی ٹیگر کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ سرمد صاحب کی بہت قابل دادی۔ وہ دفعی حالت میں اسے کھین سڑک کے لیے نہ صرف آمادہ تھے بلکہ لینڈنگ رول بھی ادا کر رہے تھے۔

عادل بہت غمگین تھا۔ اس کے دل و دماغ میں لپٹل سی بچی ہوئی تھی۔ بہر حال اپنی اندرونی کیفیت اس نے نہیں اپنے تنگ ہی رہی تھی۔ وہ ساتھیوں کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ عادل کی پریشانی کی وجہ ایک فون کال تھی۔ یہ فون کال اس نے چلاس کے نزدیک ایک ریست ہاؤس میں سنی تھی۔ کال کرنے والا اس کا گاؤں کا دوست عبدالقدیر تھا۔

قدیر نے کہا تھا کہ وہ اسے خواہو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن ضروری بات ہے اس لیے وہ بتاتے پر مجبور ہو رہا ہے۔ تمہید کے بعد اس نے کہا تھا کہ وہاں لالی اور پال پور

کے جڑواں دیہات میں زبردست لپٹل ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے تباہی فراست کی حوصلے میں کوئی بہت بڑا واقعہ ہوا ہے۔ جسے عام لوگوں سے چھپایا جا رہا ہے۔ پال پور گاؤں میں جو شدید افراتفری مچی ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعہ بہت بڑا ہے۔ اور اس واقعے کا فائدہ دار بھی عادل ہی کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ خود کو ڈسے دار ٹھہرائے جانے پر عادل جکا بکا رہ گیا تھا۔ وہ تو باغ والے امارتے میں تباہی فراست کے بیٹوں اور غلاموں سے اتنی بے مروتی کرا کے بھی مشتعل نہیں ہوا تھا اور اپنی والدہ کو لے کر خاموشی سے گاؤں سے نکل آیا تھا۔ اب پتا نہیں اس پر کیا الزام لگایا جا رہا تھا۔

عبدالقدیر نے اپنی اطلاع میں اس سفید پیک اپ کا بھی ذکر کیا جو عادل کے دوست صادق کے استعمال میں تھی۔ قدیر نے بتایا کہ وہ سفید پیک اپ پال پور سے قریب او میل دور سرکنڈوں میں ٹھہری ہوئی ہے اور شاید اسی پیک اپ کی وجہ سے حوصلے میں ہونے والے واقعے میں عادل کو ملوث سمجھا جا رہا ہے۔ قدیر نے اطلاع دی کہ تباہی فراست اور چودھری مختار کے کارندے جھٹھیالوں سے تیس ہوکر چاروں طرف وندنا رہے ہیں اور ہر اس شخص سے ہراسونگ کر رہے ہیں جس کا عادل یا اس کی والدہ اور ماموں سے کوئی تعلق واسطہ رہا ہو۔

اس کال نے عادل کو بہت فکر مند کر دیا تھا۔ تسلی کی صرف ایک بات تھی کہ وہ پہلے ہی والدہ کو خالو عطا شاہ کے ساتھ شکر پورہ کے دور دراز گاؤں کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ اب پتا نہیں، وہاں تباہی کے گاؤں میں کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے اتنی ہتھکنڈی ہوئی تھی۔ اگر حوصلے میں کچھ ہوا تھا تو پھر یہ اور بھی خطرناک بات تھی۔ عادل کے دل سے شکر ادی کے لیے بغیر وراثت کی دعا تھی۔ ایک اور چیز جو بری طرح الجھا رہی تھی وہ گاؤں کے قریب صادق کی سفید پیک اپ کی موجودگی تھی۔ وہ پیک اپ لاہور سے اتنا طویل سفر کر کے بہاولپور کے اس دور دراز گاؤں تک کیسے پہنچی؟ بات تو یہ ہے ازاں کا تھی کہ صادق نے گاؤں میں عادل کی بے مروتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے طور پر کوئی قدم اٹھایا ہوگا۔ حالانکہ اسے بہت رنج بھی تھا۔ شروع میں عادل نے اس سے اصل بات چھپائی تھی لیکن بعد میں بتا دی تھی۔

عادل کی سوچ کے کھوٹے سے ایک بار پھر نسبت روز کے چوک میں نظر آنے والے عجیب مٹھری طرف دوڑنے لگے۔ نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس بار بار کہہ رہی تھی کہ

اپنے جسے پیش آنے والے ان واقعات میں اور نسبت روز کے منظر میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے، کوئی گہرا تعلق۔

ایک بار تو اس کے کسی میں آئی کہ وہ سرمد صاحب کے کمرے کے وہ بے سفر مزید جاری نہیں رکھ سکنا اور واپس جانا چاہتا ہے لیکن پھر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ غیر معمولی عزت اور بے مروتی کا سوال تھا۔ سرمد صاحب بیٹنوں سے جس کام کے لیے جان مار رہے تھے، اس کا وقت آ گیا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔ پھر عادل کی محبت کے لیے بھی یہی فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اگلے چند روز میں اس نے شکر ادی کو بیٹھ کے لیے کھودینا تھا، یا پھر پالینا تھا۔ پارہیت تو قدرت کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اوپر والے کی بخشش ہوئی ہوتی اور توانائی کو اس کی آخری حدوں تک استعمال کرنا چاہتا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کی موت بھی واقع ہو جاتی تو وہ خود کو شکر و بھکتا۔

سرمد صاحب ٹیگر پر سوار تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وادی تان کی پر کسی سے بات بھی کر رہے تھے۔ بات ختم کرنے کے بعد انہوں نے عادل کو طلب کیا اور بولے۔ ”یہ یہاں کا ایک بہت تجربہ کار پورڈر انوار شاہ ہے۔ اس سے بات ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ ٹوبل راک تک جانے والا رات بج چکی دو بارشوں کے بعد کھل گیا ہے اور قریب پندرہ انچ برقیلیو وہاں پہنچ چکی ہیں۔ ابھی دن پندرہ مزید آئیں گی۔ پچھلے سالوں میں یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی لیکن آج کل چونکہ سیکڑ ریتی کے مسائل ہیں، اس لیے لوگ حیران ہیں۔“

عادل نے کہا۔ ”میں نے سنا تھا سر یہ غیر ملکی اپنی سیکڑ ریتی باہر سے بھی لے کر آتے ہیں؟“

”ہاں بھی اس بڑے کا کھیل ہے۔ بلکہ پاؤنڈز کا کھیل ہے اور پاؤنڈز ان کے پاس بہت ہیں۔ ایک ایک گاڑ پر دس دس لاکھ بھی خرچ کرنا پڑے تو کر سکتے ہیں۔ مقامی پورڈرو کو بھی یہ لوگ کھل کر رو پیلا دیتے ہیں۔ اسی لیے جو ہمیں پہنچا وہ پانچ سو روپے روزانہ پر ملا تھا، اب کتنی قیمت پر بھی مشکل سے حاصل ہوا ہے۔ اور ہاں، ایک اور غامض بات بھی انوار شاہ سے معلوم ہوئی ہے۔ بلکہ بہت غامض بات۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے سرمد صاحب کا لہجہ دھیمّا اور راز دارانہ ہو گیا تھا۔

عادل نے پہلے پہلے خود کو ان کے کچھ اور نزدیک کر لیا۔ وہ ٹیگر پر بیٹھ بیٹھ خود اس عادل کی طرف تھک گئے اور بولے۔ ”مالکانے زادہ کے بارے میں ہمارا قیافہ

عقل مندی

ایک شخص گاڑی کو پکڑنے کے لیے دوڑا لیکن گاڑی نکل گئی۔ پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی نے اس سے کہا۔ ”اگر تم کچھ اور تیز دوڑے تو گاڑی پکڑ سکتے تھے۔“

وہ شخص بولا۔ ”در اصل مجھے اپنی دوڑ کو چھ منٹ پہلے شروع کرنا چاہیے تھا۔“

درست ثابت ہوا ہے شاید۔
”کیا مطلب سر؟“

”مالکانے زادہ۔۔۔ مراجمیں۔۔۔ وہ قریباً بارہ گھنٹے سکے کی سی حالت میں رہا تھا، پھر اس کے ہاتھ پاؤں میں حرکت نظر آنے لگی تھی۔ قریباً 18 گھنٹے بعد وہ ہوش میں آ گیا تھا۔“ اس خبر نے عادل کو بری طرح چمکایا۔ اس کے جسم میں سنبھلت ہوئی۔

عادل نے کہا۔ ”سر! اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ وہاں ہمارے دیہات میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کسی نہ کسی طور اس مالکانے کا ہاتھ ہے۔“

سرمد صاحب نے معاملہ فہم نظروں سے عادل کو دیکھا۔ ”کیا تمہیں، وہاں کے بارے میں کوئی اور اطلاع بھی ملی ہے؟“

”ہاں جناب!“ عادل نے جواب دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تفصیل بتاتا، ٹیگر کی چڑھائی میں دشواری پیش آنے لگی۔ ایک پورڈر نے آگے بڑھ کر اس کی گام قیام لی۔ سرمد صاحب نے ہونٹوں پر اٹھی رکھ کر عادل کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

تاہم رات کو یکے میں کھانا کھانے کے بعد جب سرمد صاحب اور عادل کو کتنی ملی تو اس نے سرمد صاحب کو اس فون کال کے بارے میں بتا دیا جو اس نے چلاس کے قریب سنی تھی۔ اس فون کال کے بعد چونکہ مسئلہ آنا بند ہو گئے تھے اس لیے مزید کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

عادل نے کہا۔ ”سر! وہاں تباہی کے گاؤں پال پور میں کوئی بہت خاص واقعہ ہوا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس واقعے میں تباہی کا جھوٹا عناصر بھی ہو گیا ہے۔ حوصلے میں اور پورے علاقے میں کھنڈی مچی ہوئی ہے۔ مزید پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس واقعے کا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے۔ شاید یہ سمجھا جا رہا ہے کہ میں نے اپنے دوست صادق کے

ساتھ مل کر اس بار چیت کا بدلہ لیا ہے جو بارش والے اجالے میں میرے ساتھ ہوئی۔

عادل نے سرمد صاحب کو بھی بعد میں تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا اور اس فنون کال کے بارے میں بھی سرمد صاحب کو بتا دیا تھا۔ سرمد صاحب توجہ سے سنتے رہے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”لیکن تمہارے ساتھ ساتھ صادق کو بھی کیوں لوٹ کیا جا رہا ہے؟“

”اس کی وجہ وہ ہے کہ آپ سے جو جگہوں کے قریب مرکز فنون سے ملتی ہے۔ وہ صادق کی پک اپ ہے۔ گاؤں کے پرانے چوکیدار کے علاوہ اور کئی افراد نے بھی لاہور میں یہ پک اپ دیکھی ہوئی ہے۔“

سرمد صاحب کی کشادہ چیشانی پر سوچ کی کلیں چمکیں۔ وہ بولے۔ ”اگر ان معاملات میں مالکانے کا ہاتھ ہی ہے تو ممکن ہے کہ اس نے پہلے صادق کو غائب کیا ہو اور پھر اس پر تشدد کر کے دیگر معلومات حاصل کی ہوں۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ جسیں ڈھونڈنے کے لیے تمہارے گاؤں جا پہنچا ہو۔ تمہاری خوش قسمتی کہ اس کی آمد سے ایک دن پہلے تم اور تمہاری والدہ گاؤں سے نکل آئے۔“

”بالکل سراسیمہ ہوں میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔“ سرمد صاحب اور عادل تا دیر اس سنگین موضوع پر بات کرتے رہے اور قیافہ نگاہنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہاں پال پر گاؤں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تاپا فراست کا چھوٹا بیٹا عام صرف زخمی نہ ہوا ہو بلکہ جان سے چلا گیا ہو۔ لیکن اگر ایسی بات ہوتی تو پھر پولیس میں رپورٹ ضروری تھی۔ اور قدری فنون کال میں نہیں بھی اس طرح کا ذکر نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ہمایوں اور کرشل بھی اس گفتگو میں شریک ہو گئے۔ مالکانے زادہ کے زندہ ہونے اور لاہور میں دیکھے جانے کی اطلاع ان دونوں کے لیے بھی حیرت انگیز تھی۔ عادل کا دل بہت بگھا ہوا تھا۔ کسی وقت تو اسے خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں وہ آخری کوشش کرنے سے پہلے ہی شہزادی کو ہار نہ جائے۔ گاؤں میں جس طرح کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی، جتنی بات تھی کہ تاپا کے دل میں اس کے لیے رقی کیا ہمدردی بھی ختم ہو جاتی تھی۔ آخری ملاقات میں اس نے تاپا سے پھر تھوڑا سا وقت لے لیا تھا۔ اب اس تازہ واقعے کے بعد پانچویں وہ وقت موجود رہتا تھا یا نہیں؟

اب وہ سفر کے ایسے مرحلے میں تھے کہ یہاں سے واپسی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہیں آگے بڑھنا تھا۔ صرف آگے۔۔۔۔۔ نوش راک کی طرف۔۔۔۔۔ جہاں سناترا

برادری کے شوقین جمع ہو چکے تھے اور ایک نہایت خلوت گھر پر جوش میل شروع ہونے والا تھا۔

☆☆☆

انہوں نے چھ سات دن تک حتی الامکان تیز رفتاری سے سفر کیا۔ سردی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گاؤں کے بلکہ بڑے بلوچوں میں گودا بھاڑ دینے والی ہوائ سے بھی واسطہ ملتا تھا۔ دو راتیں ایسی بھی گزریں جب صبح تک آسمان سے چھابوں پانی برستا رہا اور بادل دھاڑتے رہے۔ رات آسانی سے جب کہ نو اور اس کی لوائی چوٹیاں روشن ہوئیں تو یوں لگتا جیسے اچانک ایک طعنی منظر آنکھوں کے سامنے آ کر اوجھل ہو گیا ہے۔ یہ بڑی بہت اور برداشت کا سہ تھا لیکن بہت اور برداشت کا اصل امتحان تو سرمد صاحب سے رہے تھے۔ ان کا حوصلہ دیکھ کر عادل کو ایک ایسا مکی سبق مل رہا تھا جو نصیحتوں کے ہزار پالفاظ پر بھاری تھا۔ خوشی۔۔۔۔۔ تکلف میں پوشیدہ ہے۔ یعنی زیادہ تکلف، اتنی زیادہ خوشی۔۔۔۔۔ یعنی سادہ مساوات تھی۔۔۔۔۔ شاید اسی مساوات کو نظر رکھتے ہوئے شاعر مشرق نے بھی کہا تھا کہ انسان خود کو اس درجے تک پہنچا سکتا ہے جہاں خدا، ہر تقدیر سے پہلے اپنے بندے سے پوچھتا ہے کہ اس کی مرضی کیا ہے۔

سرمد صاحب کا فلسفہ حیات یہی تھا کہ اپنا سید کشادہ کر کے۔ اور آنکھیں بند کر کے، اپنے راستے میں آئے والی تکلیفیں جھیلنے ملے جاؤ اور یہ ایمان رکھو کہ ان کا صلہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہتا ہے اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ یہ صلہ تمہاری من مرضی سے ملے تو پھر خود پر باقی خوشیوں اور راجتوں کے دروازے بھی بند کرتے چلے جاؤ۔ صرف وہی دروازہ کھلا رہے جو تمہارا من چاہا ہے اور خدا سے دعا کہ وہ اسی من چاہے دروازے سے تمہارے حصے کی خوشیاں تمہیں دے۔ اکثر وہ پیشہ ایسی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اسی طرح پر چلے ہوئے عادل نے بھی اپنے حصے کی خوشیوں کے لیے صرف ”شہزادی والا دروازہ“ کھلا رہنے دیا تھا۔ باقی سارے دروازے بند کر دیے تھے۔ سرمد صاحب، ہمایوں اور کھٹک وغیرہ کی طرح وہ بھی بالکل سادہ غذا کھا رہا تھا۔ خود کو دنیاوی آسائشوں سے دور کر رہا تھا۔ جان تو ڈھشت کو شہیار بن رہا تھا۔ جن آسانی پر جہد مسلسل کے کوزے برسا رہا تھا، بھوک پیاس کو اپنا مطیع کر رہا تھا۔ یہ باقی راتوں کے دروازے سے خود پر بند کرنے والی بات تھی تو تھی۔ اور ایک ایسا ہی دروازہ شاید حسین نیگلوں آنکھوں والی کرشل بھی تھی۔ کچھلے سفر میں ایک طوفانی شب میں ایک

جہان خیر جمائی کے نرے میں ہونے کے باوجود عادل نے خود پر یہ دروازہ بند رکھا تھا۔

آخر ان کے سفر کا وہ مرحلہ آیا جب انہوں نے ایک جنگ درے کو گراں کیا اور ایک کشادہ وادی میں داخل ہو گئے۔ دراصل یہی وہ جنگ درہ تھا جو جولائی اگست میں ہونے والی تیز بارشوں کے بعد کھلتا تھا اور وادی میں جانے کا راستہ بناتا تھا۔ بارش کا بہت سا پانی ٹھیک کی صورت میں جمع ہو کر لاکھوں فن برف کو درے کے اندر سے دھکیل دیتا تھا۔ وادی میں چند گھنٹے کے سفر کے بعد ہی انہیں رنگ برنگے ٹیپوں کی کئی قطاریں نظر آئیں۔ برف کی سفید چادر پر یہ ایک خوب صورت سی عمارتی جھلی تھی۔ بہت سے مرد و زن اس جھلی میں چلنے پھرتے نظر آئے۔ کافی بڑی تعداد میں بار برداری کے جانور بھی یہاں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر گچھر تھے۔ اگر بڑوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تو اگر بڑے فیلسفہ کے ہاتھ والے تھے۔ کچھ بوسیدہ لباسوں والے مقامی پوررز تھے۔ قریب پہنچنے پر کئی جگہ غیر ملکی سگ کارڈ بھی دکھائی دیے۔ اس کے علاوہ جڑ بڑی کئی ٹھوں ٹھوں بھی ساتی دی۔ یہ جنگل میں مشکل کا سال تھا۔

اور پھر عادل کی نگاہ اس عظیم الشان پہاڑ تھا چٹان پر پڑی جس پر چڑھائی کے مقابلے ہوتا تھے۔ اس صیت ناک چٹان کی اونچائی وہ جزا رفت سے کچھ ہی کم ہوگی۔ اس کا بالائی سرا آسمان کو بوسا دیتا محسوس ہوتا تھا۔ یہی نوش راک تھی۔ نہ جانے کتنے زمانوں سے یہ اسی طرح سر بلند ٹھوڑی تھی اور اپنی عجیب ساخت پر وادی کی طالب تھی۔ وہ اپنے پہلو سے دیکھا جاتا تو اس کی بناؤ کو کسی حد تک گرہے سے مشابہ بھی قرار دیا جاسکتا تھا۔

ان انگلیں ٹیپوں میں سے ایک ٹیپ کرشل کی بھی تھی۔ کرشل کے والد بھی یہاں موجود تھے۔ اس کا ساگ باپ مانگیل جو تھن اور سوٹنگی ماں مانیا تھا۔ کرشل نے عادل کو بتایا کہ یہ لوگ اس سے ناراض ہیں۔ اس ناراضی کی وجہ بقیہ کرشل کی روایت تھی ہی تھی۔ وہ بے شک انگلیٹ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہتی تھی لیکن اس کا خاندان ان قدراست پسند خاندانوں میں سے تھا جو آج بھی مولوی ستر حویں صدی سے آگے نہیں لٹکے تھے۔ یہ لوگ آج بھی رنگ و لہل کے حامل تھے اور ان تمام پرانے رسم و رواج کو سینے سے لگائے ہوئے تھے جن میں سے یوہروائی ذہنیت کی برآئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ خود کو ترقی یافتہ بھی کہتے تھے۔ ان

سکندروں پر گھمب

لوگوں کے نزدیک کرشل کا لیو پڈ سے شادی سے انکار کرنا سنگین روایت تھی ہی تھی۔

یہاں بھی کر عادل کو ٹیپ باریکی ڈیو کس اور دل وغیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اونچی ناک۔۔۔۔۔ باریک ہونٹ۔۔۔۔۔ اکڑی ہوئی گردنیں اور پیش قیمت لباس۔ وہ اپنی گھڑی چھڑی کو اپنی شان بگھنے تھے اور مقامی لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی نگاہوں میں بے سانسیت ”احساس برتری“ پھانکے مارنے لگا تھا۔ بڑی توعدوں اور سرخ و سپید چہروں والے دو انگلیں خواتین سے سرمد صاحب کی بھی بات ہوئی۔ یہ بات چیت عادل سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر ہوئی۔ سرمد صاحب نے ایک دو بار ہاتھ سے عادل کی جانب اشارہ کیا۔ جیسے اگر بڑے معززین کو بتا رہے ہوں کہ یہ وہ مقامی لڑکا ہے جو ان مقامیوں میں حصہ لے گا۔ دونوں اگر بڑے معززین نے جس احوال سے عادل کو دیکھا وہ بہت مختصر آئیز تھا۔ جیسے انہوں نے یہ زبان خاموشی کہا ہو کہ یہاں خوار کرنے کے لیے کس کو اٹھا لائے ہو۔ یہ اشاریہ کے میل تھا۔ ان میں ایسے ”مقامی“ کب اپنی عزت بچا پاتے ہیں۔

سرمد صاحب اور ان کی ٹیم کے لیے بھی تین ٹینٹ مناسب جگہ پر لگا دیے گئے۔ یہ دیکھ کر عادل کو حیرت ہوئی کہ اپنے والدین سے مختصر ملاقات کرنے کے بعد کرشل، سرمد صاحب کے ٹینٹ میں داخل آ گئی۔

سرمد صاحب نے عادل کو لیو پڈ کے حوالے سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ حریف تاپا کے طور پر انہوں نے کہا۔ ”لیو پڈ بھی بگھڑی چکا ہے، سبھی انہیں محسوس رہا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے کہ تم اگلے شے سے نہیں لٹکو گے۔ میں اس طرح کی بدھڑی نہیں چاہتا۔“

”جو آپ کا حکم سر۔“ عادل نے کہا۔ ”وہ تمہیں مشکل کرنے کی کوشش بھی کرے تو تم نے مشعل نہیں ہونا۔ ہم اس کی ہر زیادتی کا بدلہ اس سے لیں گے۔“

”میں بالکل تیار ہوں سر۔“ عادل کے سینے میں ایک جوش سا بھر لپٹنے لگا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ”اور کسی بھی مرحلے میں کسی سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری تیاری پوری ہے اور یہ تیاری اس مقابلے کے حساب سے ہی ہے۔ جب تم اس نوش راک کو قریب سے دیکھو گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ اس کی ساخت اور رخ اسی چٹان کی طرح ہے جس پر ہم نے قریباً سات ہفتے تک مسلسل مشق کی تھی۔“

”مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے جناب۔“

”اصل مقابلہ سے پہلے میں تین چار دن مشق کے لیے بھی بیٹھیں گے۔ اس مشق سے ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل سے ہی اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔“

لیکچر کے اختتام سے چودہ پندرہ ورے بجے پہنچے تھا۔ ایک خیمے میں کرٹنل اور سرحد صاحب تھے۔ دوسرے میں عادل اور ہمایوں۔ تیسرے خیمے میں ضروری ساز و سامان تھا۔ ان کے دو ملازموں اور دو تین پورہ رز کو ان مشق کریمیں میں جگہ ملی تھی جو اسی مقصد کے لیے لگائے گئے تھے۔

کرٹنل آج کل کافی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس میں سنجیدگی بڑھ گئی تھی۔ پچھلے سفر میں اس نے جو خوشیاں عادل کے ساتھ کی تھیں، انہیں بھی پر یک لگ بچے تھے۔ شاید اس نے ذہنی طور پر عادل کو شیر اداوی کے لیے اودان کھدیا تھا۔ یہ صورت حال عادل کے لیے بہت کئی خوش تھی۔

رات کو ہمایوں اور عادل خیمے میں تھا۔ ہمایوں اتنا کم عمر رہتا تھا کہ اس کے ساتھ رہ کر پوریت محسوس ہونے لگتی تھی۔ آج وہ معمول سے زیادہ ہی خاموش تھا۔

”کیا بات ہے ہمایوں بھائی۔ آج تو بالکل ہی چپ لگی ہوئی ہے۔ کیا سوچ رہے ہو؟“ عادل نے کہا۔

اس نے گہری سانس لی اور اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر یولا۔ ”سوچ رہا ہوں کہ تم کرٹنل کو اس عیاش امیر زادے (لیو پڈ) سے بچاؤ گے یا نہیں اور اگر خدا کا واسطہ ہے اس بار پھر کامیاب رہا تو وہ اس سے جاری کا کیا سحر کرے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اسے ایک شریک حیات کا درجہ دے گا۔ وہ اس کی کوئی بھی طرح ہوگی۔ بظاہر ترقی یافتہ نظر آنے والے یہ ”جاگیردار انگریز“ اندر سے اب بھی پرانی صدیوں میں ہی رہے ہیں۔ جب یورپ میں بے تحاشا آقا ہوتے تھے اور لوہی کی قلام کوڑیوں کے مول بنے تھے۔“

عادل نے کہا۔ ”مگر ایسا ہو گیا اور کرٹنل، لیو پڈ کے پاس چلی گئی تو ہمیں دکھ ہوگا؟“

”ظاہر ہے ہوگا۔ کیا تمہیں نہیں ہوگا؟“ ہمایوں نے ان کا سوال کیا۔

”مجھے بھی ہوگا ہمایوں بھائی۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کچھ زیادہ ہوگا۔ مجھے اب یقین سا ہو گیا ہے ہمایوں بھائی۔ کہ تم کرٹنل کو پسند کرتے ہو۔“

”تم نے یہ بات ایک بار پہلے بھی کہی تھی اور میں نے کہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔“

”اور اس وقت بھی انکار کرتے ہوئے تمہارے

چہرے پر ایسا ہی رنگ گزرا تھا ہمایوں بھائی۔“

”کیا رنگ؟“ اس نے خشک انداز میں کہا۔

”وہی رنگ جو کچھ چھپاتے ہوئے بندے کے چہرے پر آتا ہے۔“ عادل نے بے باکی سے کہا۔

ہمایوں چند لمبے تک جڑ بٹھرا کر آیا۔ پھر حسب عادت گھاسا صاف کر کے یولا۔ ”پارہیزوڑیہ بے باک کی باتیں لیتا۔ جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا نہیں ہے۔ لیکن اگر ہو سکی تو زمین آسمان کا کیا کسل۔ ہمارے اور اس کے امتیاز میں زمین آسمان سے بھی زیادہ کافری ہے۔“

عادل ہلکے ہلکے انداز میں یولا۔ ”لیکن ہمایوں بھائی، یہ زمین آسمان والا محاورہ اب غلط ثابت ہو چکا ہے۔ یہ زمین آسمان کے شے کا دور ہے۔ ہم زمین کے باشندے، چاند پر پہنچ رہے ہیں یا نہیں؟“

”لیکن یہ باشندے بھی تو سفید قلم ہی ہیں۔“ ہمایوں کے مختصر جواب نے عادل کو جواب کر دیا۔ وہ ایسے ہی چھوٹی سی مگر بڑی کامل بات کرتا تھا۔

اس سے پہلے کہ عادل کو کوئی جواب سوچتا، کرٹنل اندر آگئی۔ وہ اپنا ہیڈ فون ڈھونڈتے ہوئے آئی تھی۔ سخت سردی کے باوجود وہ منت شربت میں تھی اور بہت اسارت لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہمایوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ جیسے وہ اسے دیکھنے کی تاب نہ رکھتا ہو۔ یا پھر یہ کہ اپنی نظروں سے اس کی خوب صورتی کو میلا کر نہ جانتا ہو۔ وہ بھی ہمایوں سے کم کم یہ بات کرتی تھی۔

وہ ہیڈ فون لے کر وہاں چلی گئی۔ وہ دونوں بکھویر باتیں کرتے رہے پھر لیٹ لگے۔ ٹینٹ کے روزن کا Cover ہٹا کر عادل نے باہر دیکھا۔ دور بلند دھالا نوش راک ایک پوٹے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس کی بائیں طرف موجود تھی۔ بائیں طرف بھی برف دکھائی دیتی تھی لیکن باقی اطراف میں سنگلاخ پھرتے تھے۔ آج غلاب توجع آسمان صاف تھا۔ شہروں کے دھوئیں اور گرد سے پاک یہ آسمان گہرا سیاہ نظر آتا تھا اور اس پر ہزار ہا موتی جگمگ رہے تھے۔ یہ ستاروں کے جھرمٹ تھے۔ خیمے کے چھوٹے پر لٹے لیٹے عادل کو لگا جیسے توہل راک ان ستاروں کو چھو رہی ہے۔ عادل کو اس توہل راک پر کندھ والا تھی۔ اسے جوں لگا جیسے اسے توہل راک پر نہیں ان جگہ گاتے ستاروں پر کندھ والا تھی۔ پھر ان ستاروں کو تو کوڑا لانا ہے اور اپنی شیر اداوی کی باتک میں بھرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس کی جان ملی گئی تو بھی پرہیز نہیں۔ زندگی میں تو خوش نہیں ہو جاتی۔ وہ

یہاں شیر اداوی سے مل نہ سکا تو پھر اگلی دنیا میں ملاقات کا انتظار کرے گا اور جب شیر اداوی اسے ملے گی۔ تو اسے بتائے گا۔ ”شیر اداوی! میں نے اپنی ہی پوری کوشش کی۔ اپنے جسم اور روح کی ساری توانائیاں تمہیں پانے کے لیے لگا دیں۔ اب جو میرے بس میں ہی نہیں تھا، وہ کیسے کرتا۔ اب میں تمہارے سامنے ہوں، ہارا ہوا ضرور ہوں لیکن پشیمان نہیں ہوں۔“

ایسے ہی عجیب و غریب خیالوں میں غلطیاں وہ سو گیا۔ سلیپنگ بجک کی نرم ملائم گرمی نے نہ جانے کیسے تک اسے ڈھانپے رکھا۔ وہ بارہ آنکھ کھلی تو حمل خاموش تھی۔ بس دور کہیں جڑ بیڑی کے دم گھوم گھوم سناٹا دیتی تھی۔ اس نے رست واضح دیکھی۔ رات کے ڈھانچے جیسے تھے۔ خیمے میں ہم عمری روشنی تھی۔ اس نے دیکھا ہمایوں بیٹھا تھا۔ تاریکی کی روشنی میں کچھ بڑھ رہا تھا۔ وہیں لیٹے لیٹے عادل نے وراسا سر اٹھایا اور لیٹنے کی کوشش کی۔ یہ ایک انگشت کتاب تھی۔ خریر کے علاوہ اس پر کچھ بھی نہ ہوئے تھے۔ عادل نے ایک دو دفعہ پہلے بھی ہمایوں کے ہاتھ میں یہ کتاب دیکھی تھی۔ اس میں تین چار سو سال پہلے کے ہندوستان کے حالات و واقعات بیان کیے گئے تھے۔ عادل یہ دیکھ کر چونکا کہ خاموش شیخ ہمایوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ کتاب کا جو صفحہ اس کے سامنے تھا۔ اس پر ایک الاؤ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس الاؤ میں سے کئی انسانی ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ جیسے آگ میں جلنے والے دھو کے لیے پکار رہے ہوں۔ ایک اور آنکھ بھی تھا جس میں گھوڑے وغیرہ دکھائی دیتے تھے لیکن وہ ٹھیک سے عادل کو نظر نہیں آیا۔

پتا نہیں اس کتاب سے ہمایوں کو کیا دانشمندی تھی۔ وہ جس طرح خود ناقابل فہم تھا، اسی طرح اس کی ترجیحات اور دلچسپیاں بھی پراسرار تھیں۔ اس کے بارے میں عادل کو اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ کلاس اور اس کے دور وغیرہ کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کے والدین اس کے بچپن میں ہی اسے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ کچھ عرصہ وادی نے اس کی پرورش کی، پھر وہ بھی چل گئی۔ دل بارہ سال ہمایوں کو اپنے طور پر زندگی کے راستے بناتے پڑے۔ سخت محنت اور جاں فشانی اس کی گھنٹی میں تھی۔ اس نے پہاڑوں کی دشوار گزار بلندیوں پر مختلف کام کیے۔ درخت کاٹنے، شہد جمع کیا، کھانسی فروخت کرنے کے لیے جالوں کا کھنکار کیا۔ اور اس طرح کے بہت سے کام۔ وہ بلند یوں کا شکار ہو گیا۔ دشوار گزار پہاڑوں پر

چڑھنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا مکمل ہونیا پھر اس کا رابطہ سرحد صاحب سے ہوا اور وہ مستقل طور پر ان کے زیر سایہ آ گیا۔ اس کے طور پر طور عجیب تھے، بہت کم بولتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے نہیں کھو جاتا تھا۔ کبھی بھی تو عادل کو لگتا کہ وہ کوئی بھی ہوئی روح ہے۔

وہ جس طرح کتاب میں کھوپا ہوا تھا، عادل نے غل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنے گاؤں کے حالات اور واقعات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا پھر شیر اداوی کی صورت اس کی آنکھوں میں بس گئی اور وہ زیر لب شیر اداوی۔ شیر اداوی نکالتے ہوئے وہ بارہ سو گیا۔

اگلے روز توہل راک کے مین خیمے اس کی ملاقات لیو پڈ سے ہوئی۔ اس وقت سرحد صاحب اور ہمایوں بھی عادل کے ساتھ تھے۔ لیو پڈ کے ساتھ بھی دو تین انگشت لوجان تھے۔ کسرتی جسم والے لیو پڈ نے بڑی کڑواہٹ نظروں سے عادل کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک جگہ میڈل سب چمکی ہوئی تھی۔ گردن پر بھی چند پرانی چوٹ کے آثار تھے۔ یہ اس لڑائی کی نشانی تھیں جو بکوں کے آراستہ کمرے میں لیو پڈ اور عادل کے درمیان ہوئی تھی۔

لیو پڈ نے ایک جانب برف پر ٹھوکا اور سرحد صاحب سے مخاطب ہو کر انگریزی میں یولا۔ ”تو ہے وہ پاکستانی گوریلا جسے جناب، ہمارے مقابلے کے لیے چڑیا کھرے نکال کر لائے ہیں۔ اس سے تو پہلے بھی جان بچانا ہے۔“

سرحد صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیو پڈ! تمہیں اس طرح کسی کا مذاق اڑانے کا حق نہیں ہے۔ مقابلے سے پہلے تم سب برابر ہو۔ مقابلے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا کہ کون زیادہ عزت کا حق دار ہے اور کون نہیں۔“

”لیکن جناب! اس جو کر کو ہمارے مقابلے کھڑا کرنے کے لیے تو آپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔“

اب اگر یہ آپ کی توہمات پر پور نہیں اترتا تو اس سے زیادہ بے عزتی آپ کو سہتا پڑے گی۔“

”میں ہر صورت حال کے لیے تیار ہوں۔“ سرحد صاحب نے انگشت میں جواب دیا۔

”ناپا آپ کو اس سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے آپ اس کے عادی ہیں۔“

سرحد صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر مگر رہ گیا۔ عادل کو بھی اس کاٹ دار فقرے کی پوری طرح کچھ آتی تھی۔ انگشت میں لیو پڈ نے کیا تھا۔ ایسا پاکستانی جو

آریوز نو۔ عادل کے سینے میں چکاریاں ہی بجھ گئیں۔
 ”تم اپنی زبان سنبھال کر بات کرو سفید بندو۔“
 عادل اورو میں دھاڑا۔

کے قاتل ہو گیا۔ اسے دیکھنے والے غیر ملکی چوکیدار کے
انہیں اندازہ ہو گیا کہ سرحد صاحب کسی معمولی لڑکے کو قاتل
نہیں آئے۔

ایک لڑکی زور سے ہنسی اور بولی۔ "اچھی بڑی فزول
خراپٹ کے اپنے گھٹنے میں ارد ہے۔ اب ہم بے چاروں
کا ہوگا۔"

اب بھی وہ خاموشی سے کہیں کھسک گیا تھا۔ عادل اٹھا اور اس کی تلاش میں نکلا۔ وہ ٹینٹ میں بھی نہیں تھا۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے عادل کیپ سے آگے تار کی میں گھر

کیوں ہو؟ کیا کوئی واقعہ ہے اس کے پیچھے؟“ عادل نے اسے دوسری طرح سے گھرنے کی کوشش کی۔

ہالوں کے ہونٹوں پر سبے سادہ ایک غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ ”تم بڑے ضدی ہو عادل۔“

”تم جو بھی کہو، ہالوں بھائی۔“ وہ پھر سے ٹپک لگنے والے دور میں بند ہوا چوٹیوں کے بیویوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ان کے اوپر تاریک آسمان تھا اور چمکتے ستارے۔ آج اس کا موڈ کچھ عجیب سا تھا۔ عادل کے دل نے گواہی دی کہ شاید وہ کچھ بتائے گا۔ اس نے حسب عادت کھنکھار کر کچھ صاف کیا اور بولا۔ ”تم باغزی کے پیچھے بسنے والے پانچوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”نہی کہ وہ خاندان بدوش لوگ تھے جو یہاں آکر کپے کے آباد ہو گئے تھے۔“

”نہیں عادل!“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”ان میں سے کچھ خاندان خاندان بدوش ضرور ہوں گے لیکن ان میں سے اکثر وہی لوگ ہیں جنہوں نے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے راجپوت بستی پر حملہ کیا اور اسے جس جس کر دیا تھا۔“

”کیا مطلب ہالوں بھائی؟“

”یہ انہی بے رحم لوگوں کی نسل ہے عادل! جیسے سارا واقعہ معلوم ہی ہے۔ بہنو سردار و شواہتھ نے قبیلے کی ایک لڑکی سے زبردستی شادی رچانا چاہی تھی۔ راجپوت سرتا یا مزاحمت بن گئے تھے۔ کچھ ٹپک دل مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا مگر ہندو سالار کی طاقت کے سامنے ان کی پیش قدمی جلتی تھی۔ وہ سب ملیا میٹ ہو گئے تھے۔“

”ہاں، میں نے یہ سارا واقعہ سنا ہوا ہے لیکن۔“

ہالوں بھائی۔ ”تم سے اور تمہاری ادا سے اس کا کیا تعلق؟“

ہالوں کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ”میرا تعلق کیوں نہیں ہے؟ میرا تعلق ہے۔“

وہ میری ہی کچھ لگتی تھی جس نے۔ جس نے۔“ بولتے بولتے اس کا گھارہ بندھ گیا۔ وہ چپ ہو گیا۔

اس کے سارے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ پھر وہ ایک دم تنگیوں سے روئے لگا۔ اس نے اپنا سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے کھٹوں میں چھپا لیا۔ عادل ہلکا ہلکا تھا۔ وہ عجیب جذباتی انداز میں بولا۔ ”وہ میری ہی کچھ لگتی تھی جس نے۔“

اپنے دو سال کے بیٹے کو سگے سے لگا کر چوما تھا اور پھر روئی ہوئی۔ اور چلاتی ہوئی۔ اور اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ

بلائی ہوئی چلی گئی تھی۔ آگ میں کودنے کے لیے، جل

مرنے کے لیے۔ اور وہ مر گئی تھی، بہت سی دوسری لڑکیاں اور عورتوں سمیت مر گئی تھی۔ اس کی آخری آوازیں اس کے میرے کانوں میں گونجتی ہیں، میری روح میں چھید کر لی گئی۔ وہ اپنے خاندان سے کبہ رہی تھی۔ میرے بچے کا دھیان رکھنا، اس کے دودھ کا دھیان رکھنا۔ اور اس کی دوائی کا۔ اور اسے بہت پیار دینا۔ یہ میری نشانی ہے تمہارے پاس۔

”اور وہ چلی گئی تھی اور ایک دن بعد وہ بھی چلا گیا تھا جسے وہ نشانی سوچ کر گئی تھی۔ دھوا تھ کے پاس ہوں سے لڑتے لڑتے اس نے بھی جان دے دی تھی۔“

وہ کھٹوں میں سر دے سسکتا رہا۔ ستانے میں اس کی آواز پھٹکی اور درد کو بڑھاتی رہی۔ درد کپ کے اندر موصوفی کی کہیں وہ بچی اور ابھرتی رہیں۔ الاؤ کی سرخ روشنی دکھائی دیتی رہی۔ عادل تنہا بیٹھا تھا کہ ہالوں کا اشارہ کر دینے کی طرف ہے۔ وہی ساتھ جب بہادر راجپوتوں نے اپنی عزت آبرو بچانے کے لیے اپنی بیویوں عورتوں کو آگ میں ڈال دیا تھا اور خود سر ہتھیوں پر رکھ کر لڑنے کے لیے نکل پڑے تھے۔

ایک دم عادل کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ہالوں کے پاس انگریزی زبان کی جو تاریخی کتاب ہے اس میں بھی ایک بڑے الاؤ کا کچھ ہے اور کل رات بھی اس نے ہالوں کو اسی کچھ کو دیکھتے اور اٹک بارہوتے پایا تھا۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ پھر ایک اور بات عادل کو یاد آئی اور وہ مزید حیران ہوا۔ اس کی معلومات کے مطابق ہالوں بھی راجپوت تھا۔ تو کیا۔ کسی طور اس کا سب انہی راجپوتوں سے جاتا تھا جو شواہتھ سے لڑے تھے؟

عادل کے ذہن میں اٹھنے والے خیالات جیسے ہالوں نے پڑھ لیے۔ بالکل نئی قسمی سی مائل جو اکثر ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہالوں نے اپنا سر کھٹوں پر سے اٹھایا۔ ٹانگیں پھیر گئی تھیں اور ایک بار پھر پتھر سے ٹپک لگائی۔ درد علاقہ میں دیکھتے ہوئے قدرے غمیرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ایسا

مت کہو عادل کہ میرا تعلق نہیں۔ میری رگوں میں اسی راجپوت قبیلے کا خون ہے۔ جو چھ بچے اور لڑکے کسی طرح بچ رہے تھے، وہ پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ پھر ایک اور راجپوت قبیلے نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ وہ بڑے ہوئے، ان کی شادیاں ہوئیں۔ نسل آگے چلنے لگی۔ چہ نسلوں بعد کی خاندان آباد ہو گئے۔ اورنگ زیب سے بعد کے زمانے میں کچھ خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا اور

جہاں وغیرہ کی طرف نکل گئے۔ میں نے اپنی ساری خاندانی تاریخ پڑھی ہوئی ہے عادل اور میری بہن باختری سے جو کچھ ہمیشہ سے بے قرار رہتی ہے۔ میرے بڑوں کے چچا انہی پانچوں میں سے ہیں۔ میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری رگوں میں انگارے سے ملنے لگتے ہیں۔“ عادل حیران تھا۔ اس نے یہ واقعہ سنا ہوا تھا لیکن یہ تو اس نے بھی نہیں سنا تھا کہ مر مٹنے والے اسی راجپوت قبیلے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بھی اسے بھی لگے گا۔ وہ خود کو ان کی اولاد بتائے گا۔

عادل نے لمبی سانس لینے ہوئے کہا۔ ”ہالوں بھائی! بہت پرانی باتیں ہیں اور کچھ یہ ہے کہ میں اس بارے میں نہیں سمجھتا ہوں۔“

وہ یہ دستور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ انسان کے خون میں ہوتا ہے، وہ ایک کے بعد دوسری نسل کی طرف چلتا رہتا ہے۔ ایک نسل اپنی آنے والی نسل کو اپنا قصہ اپنا پیار اپنا انکسار اور اپنے اوپر کے کام۔ بہت کچھ دیتی ہے۔ اسی بہت سی مثالیں ہیں کہ کسی شخص کو کوئی الہام قسم کی چیز ہوئی اور۔۔۔ اس نے اپنے دادا یا پردادا۔ وغیرہ کو کوئی چھوڑا ہوا کام مکمل کیا۔ کیا تم انہی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟“

”نہیں معلوم ہے ہالوں بھائی! میں بہت پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اسی بار ملیاں میری کچھ نہیں آسکتیں۔“

”تم زیادہ پڑھنے کھٹوں سے نہیں زیادہ سوچ سکتے ہو اور اچھا سوچ سکتے ہو۔“ ہالوں نے اس کی تعریف کی۔ پھر دوبارہ گہری سوچ میں گم ہو کر بولا۔ ”عادل! میں نہیں اپنے دل کی باتیں بتا رہا ہوں اور پوری بیانی سے بتا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہر وقت میرے ارد گرد رہتا ہے، مجھے اپنی مظلومیت کے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے خون کو رانگاں نہ جانے دوں کیونکہ جب خون رانگاں جاتا ہے تو پھر انسانیت بھی رانگاں ہوتی ہے۔“

برخانی ہوا چلتا شروع ہو گئی تھی لیکن وہ دونوں سرد صاحب کی صحبت میں رہ کر سردی گرمی و ہلک جیاس کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ یہ چیزیں اب ان پر کچھ خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔ خاص طور سے ہالوں تو ایک بالکل مختلف سائے میں داخل چکا تھا۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اپنی ہماری بھر کم جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہی کتاب نکالی تھی جسے وہ اکثر دیکھتا تھا۔ اس نے عادل کو پھل کا راج دھان کرنے کا اشارہ کیا۔ عادل نے تاریخ روٹن کی۔ ہالوں

نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، ایک آرٹیکل نکالا۔ آرٹیکل کا عنوان کچھ اس طرح تھا۔ کہ نو کے دامنوں میں دو بڑی سردار و شواہتھ کی قلم کھائی۔ اس آرٹیکل میں کچھ نہیں پھیل سکیں۔ ان میں وہ الاؤ والا کچھ بھی تھا۔ کچھ مناظر جنگ و جدل کے تھے۔ ایک منظر میں ایک جوان سال عورت اپنے دو ڈھائی سال کے بچے کی طرف بازو پھیلا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ چہ بڑی عمر کی عورتیں جو اس سال عورت کو کچھ کر سکتے تھے سے دور بے چاری تھیں۔ ان عورتوں کے چہرے بھی اہم کی تصویر تھے۔ بچے اور بچے کا والد بھی رو رہے تھے۔

ہالوں نے کہا۔ ”دیکھو اس عورت کو۔ یہ میری کچھ تو لگتی تھی نا۔ میری رادھی کی رادھی یا پھر اس کی رادھی یا پھر رادھی لیکن یہ ہے تو میرا ہی خون۔ اس کا چہرہ دیکھو، اس کا دم اور بے بسی دیکھو۔ عادل! آخر کیوں ہوتے ہیں ایسے ظلم؟ کیوں جنگ کے نام پر بہادر سردار ہمیشہ سے عورتوں کو پامال کرتے رہے ہیں؟ میں جب بھی اس عورت کو دیکھتا ہوں عادل! مجھے لگتا ہے۔ یہ سیکم کئی میرے آس پاس موجود ہے۔ ایک درج اس کی طرح جھلک رہی ہے۔ مجھے کبہ رہی ہے۔ تو جو بھی ہے، جس مذہب سے بھی ہے، جس خاندان سے بھی ہے، تو میرا بچہ ہے۔ تیری ماں کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ انہی پانچوں نے کیا تھا۔ ہم امن سے رو رہے تھے۔ ہماری کھیتیاں بری تھیں۔ ہماری گلیوں میں ہمارے بچوں کی چپکارس گونجتی تھیں۔ ہم کسی کے دامن نہیں تھے۔ ہم پر بے وجہ زندگی کے درد اڑے بند کیے گئے۔ ہمیں بے بس کیا گیا۔ اس حد تک مجبور کیا گیا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لینا کوئی آسان ہوتا ہے میرے بچے؟ اس ظلم کو بھول نہ جانا۔ ہمیں فراموش نہ کر دینا۔۔۔ ہاں عادل! یہ تصویر کبھی ہے مجھ سے۔ یہ اپنی ہے۔“

عادل نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”لیکن۔۔۔ ہالوں بھائی۔ یہ بات تو آپ بالو کے نا۔“

کہ یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔

وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ”باتیں پرانی ہو چکی ہیں لیکن بدلا کچھ نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ ان کی رگوں میں وہی بے رحم خون لہریں لے رہا ہے۔ ان کو جب بھی موقع ملے گا پھر ایسی ہی زندگی دکھا دیں گے۔ پھر میری ماں کو اس حد تک مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنے روتے چمکتے بچے کو چھوڑ کر آگ میں کود جائے۔ اپنے بچے جیسے گھر کو الوداع کہہ دے۔ یہ پھر اسے مجبور کر دیں گے۔“ وہ جیسے غم

دیوانگی کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کی اگلیاں بے ساختہ عورت والے آنکھ پر گردش کر رہی تھیں۔

عادل نے ذرا غصے سے بولے لیکن میں کہا۔ "ہاں یوں برائی یہ عورت ہے شک تمہارے آواز اچھا دیش سے ہے لیکن تمہاری ماں تو نہیں ہے۔ تم۔۔۔"

"ماں نہیں ہے۔ ماں نہیں ہے۔" اس نے پھر تیزی سے عادل کی بات کاٹی۔ "لیکن ماں جیسی تو ہے اور ماں سب ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ ان کے سینوں میں ایک ہی طرح کے دل دھڑکتے ہیں۔ غمزدہ، میں جیسی دکھاتا ہوں۔ دکھاتا ہوں میں نہیں۔"

اس نے ایک بار پھر اپنی بیٹک کے اندرونی حصے میں ہاتھ گھمایا اور اپنا چرمی پرس نکال لیا۔ پرس کے بیرونی خانے میں ایک جواں سال عورت کی تصویر تھی۔ وہ سر پر پھول دار اور ڈھنی لیے اپنے تین بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ عادل نے چل تارقی کی روشنی میں فوراً پہچان لیا۔ ان میں سے سات آٹھ سالہ ایک بچہ لیتیا تھا۔ وہ بولا۔ "دیکھو، یہ ہے میری ماں۔ اور یہ ہے اس آنکھ میں دوسری ماں۔ کیا نہیں ان کی نظریں ملتی ہوئی نہیں لگتی؟ ان کی آنکھیں، ان کے ہونٹ۔ ان کے سینے، ہاتھ کے جذبے سے بھرے ہوئے، اپنی اولاد پر سب کچھ قربان کر دینے کے جذبے سے سرشار۔ یہ دونوں ماں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ایک اپنی طبی موت مری لیکن دوسری کی موت طبی نہیں تھی۔ وہ جہان جی، تندرست تھی۔ ابھی تو اس نے بس جینا شروع کیا تھا۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ موت کو گنگے لگے۔ ہاں دیکھو اس کو نور سے، یہ میری ماں نہیں تھی لیکن ماں جیسی تو تھی۔"

عادل واقعی حیران ہوا۔ دونوں عورتوں کے خدو خال اور ڈیل ڈول میں بہت مماثلت تھی۔ ظاہر ہے دونوں ایک ہی نسل اور لڑکی کی عورت تھیں۔

اچانک عادل کو اپنی چل تارقی بھٹا پڑی۔ اسے شک ہوا تھا کہ کوئی ان بھڑوں کی طرف آرہا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ شک درست ثابت ہو گیا۔ تدمول کی آہٹ واضح ہوئی۔ چمروہو نے نظر آئے۔ یہ ایک لڑکی لڑکا تھے۔

عادل اور ہمایوں بے حس و حرکت اس سات آٹھ فٹ اونچے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے رہے۔ لڑکی لڑکا انگریز تھے اور نشے میں مست دکھائی دیتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ لڑکی نے کسی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا، جواب میں لڑکا بھی ہنسا اور انکس میں بولا۔ "اب کتنی دور جاؤ گی؟ کوئی بھیڑیا کھا جائے گا تمہیں۔"

"بھیڑیا تو میرے ساتھ ہی ہے۔" لڑکی نے شرارت سے کہا۔

"اوپر بچ۔" لڑکے نے ہنسی آواز میں کہا اور لڑکی چڑھ دوڑا۔ دونوں ایک پتھر کی اوٹ میں گرے اور پتھر پڑنے لگے۔ لڑکی کی دم پٹی ڈوبنے لگی۔

عادل سناٹے میں تھا۔ اس نے آواز پہچان لی تھی۔ لیو پڈ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لڑکی کی آواز بھی عادل کے اپنی نہیں تھی۔ یہ لارڈ آؤس ماؤسنے کی نوجوان بیٹی اور لڑکی تھی۔ وہی اونچی ناک اور بڑی آن پان والا لارڈ آؤس۔

پتھر کے پیچھے شراب پونقی رہی اور جسم کی ہلکے پھلکی رہی۔ آنکھوں نے شایان دونوں کے بدن میں آگ برسر تھی۔ ورنہ یہ سردی اور یہ کھلا آسمان اس جسم کی مصروفیت کے لیے ہرگز سموزوں نہیں تھا۔ ایک بار تو عادل کا دل چاہا کہ وہ لیو پڈ کے سر پر پڑ جائے اور اس کو ایک زوردار نکتہ مار کر کہے۔ "بہ بدلت آؤ تو کرشل سے محبت کا وعدہ کر۔"

یہاں اس حراقہ کے ساتھ لیٹ کر اس محبت کی شان میں کون سا اضافہ فرما رہا ہے۔ "لیکن پھر اس نے شبہ کیا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ دور تک میں ابھی تک گنار اور ڈرم بچ رہے تھے۔ نہ جانے پتھر کے پیچھے جس دہوں کا مکروہ ٹھیل کب تک جاری رہتا لیکن پھر دو تین اور بدست نوجوان وہاں پہنچ گئے۔ دور سے انہوں نے لیو پڈ کا نام لے کر آواز دی۔ عادل اور ہمایوں کو لیو پڈ کی جھلکی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ان پاسنڈ ڈکوی ابھی آنا تھا۔"

چند منٹ بعد لیو پڈ اور ڈورجی کے پیوے نظر آئے۔ انہوں نے اپنے لباس درست کیے اور واپس تو دوں اور پتھروں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

اب ہوا کے چمکرتے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے بھی مکتکو کا سلسلہ منقطع کرنا مناسب سمجھا۔ ہمایوں نے ہڑک دیکھا۔ یکم میں لاؤ کی روشنی اب بالکل مائل پڑ چکی تھی۔ اس صورت حال نے اس کی بے قراری میں کمی واقع کی۔ وہ دونوں اٹھ کر جیوں کی طرف چل دیے۔

صبح بہت پھلکی اور خوشگوار تھی۔ برقانی پہاڑوں کا بے پناہ اندھیرا دھیرے دھیرے اچالے میں ڈھل رہا تھا۔ یکم میں سب سے پہلے جاگنے والے عام طور پر سرد صاحب، عادل اور ہمایوں وغیرہ ہی ہوتے تھے۔ سرد صاحب تو اپنی ناک کی وجہ سے صبح کی دھڑ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، تاہم کرشل، عادل اور ہمایوں یہ روشن حال رکھے ہوئے تھے۔ آج عادل زیادہ ہی جلدی اٹھ گیا۔ اس

سندھوں پر گھنٹا۔

نے ٹینٹ کے روزن سے cover پٹا کر باہر جھانکا۔ مختلف آسمان پر سفید بادل کا ایک کلازحیرہ تھا۔ ٹکڑے سے ٹکڑے ہی دیکھنے اپنی شکل بدل کر اسی ایسی دھیرے کی طرح دکھائی دیتے تھے، جس کے کھلے پال تیز ہوا میں لہر رہے ہوں۔ نہ جانے کیوں عادل کو یہاں تک شہزادی یاد آئی۔ شاید اسے باغ میں چٹن آئے والے واقعات عادل کے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے ٹینٹ بھونکا تھا، جب وہ اچالے میں داخل ہوا تھا اور شہزادی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے حسین بال ایسے ہی ہوا میں حرکت کر رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو بالکل بھی لگی تھا کہ وہ سب کچھ بھول بھال کر عادل کی طرف لپٹنے کی اور اس کے سینے سے لگ جائے گی اور شاید اس نے اپنی جگہ سے ذرا ہی حرکت بھی کی تھی لیکن پھر زمانہ و بار بن گیا تھا اور وہ جیسے کسی حسین سینے سے ایک دم جاگ اٹھی تھی۔

عادل کو آج کل دن رات اس کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہاں لائی اور پال پور گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور کون کر رہا ہے۔ کیا ایک وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ ٹینٹ سے باہر کرشل کی آواز سنائی دی۔ "لیو پڈ! آؤ تم ہو گیا۔ تو صبح جاؤ۔"

عادل نے ہمایوں کو جگایا اور خود بھی بیٹک پہننا ہوا ٹینٹ سے باہر آ گیا۔ جو گڑاس کے ہاتھ میں تھے۔ کرشل اب ایک دو روز سے بھڑکاس میں نظر آرہی تھی۔ چست پتلون کی جگہ بھی اب "پتلی ٹاپ" ٹراؤزرنے لے لی تھی۔ عادل بولا۔ "کرشل! میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میں نے اللہ کا نام لیا ہوتا ہے، تم فکر نہ کیا کرو۔"

وہ بولے سے مسکرائی۔ "ہام فکر کیوں نہ کرے۔ ہام کا سارا ہو پ تو ہو۔ تو میری ہو جو ہام کی لائف کو لیو پڈ دلی دلدل سے نکال سکے ہو۔"

عادل نے جو گڑ پتے ہوئے کہا۔ "ہمارا کام تو دل و جان سے کوشش کرنا ہوتا ہے کرشل۔ کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل گاؤں پر ہام کا غرست بہت بڑھ گیا ہے۔ ہام نے کل "ایونگ" میں تو م کے طریقے کے مطابق پوچھا بھی کیا۔"

"خدا کا خوف کرو۔ اسے پوچھا نہیں۔ عبادت کہتے ہیں۔ نماز کہتے ہیں۔"

"سوری۔ سوری۔ ہام نے لکھ لایا۔ ہام مانے نا تھا۔"

"اب پھر لکھ لایا رہی ہو۔ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

عادل نے کہا۔

اس دوران میں ہمایوں بھی ٹینٹ سے باہر آ گیا۔ پورا یکم سو رہا تھا۔ رات کو جو لاؤ بھڑکا یا گیا تھا، وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کونوں اور راکھ کے چاروں طرف دھنکی اور واڈا کی خالی پوٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ کتیں کتیں باری کتوں کی ہڈیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ انگریز فیلڈ کے فیصلوں سے باہر گارڈز پھر ادرے رہے تھے۔

ایک گارڈ جھٹکا ہوا ان کے پاس آیا اور اس نے کرشل سے انگلیش میں پوچھا۔ "میم، کچھ پتا چلا ان لوگوں کا؟"

"کن لوگوں کا؟" کرشل نے غیر ملکی گارڈ سے الٹا سوال کیا۔

"آپ کو پتا نہیں۔۔۔ رات کو کیا خبر پچھلی تھی؟"

غیر ملکی گارڈ موزوں انداز میں بولا۔ "کلیئر کی طرف کچھ مقامی لوگ دیکھے گئے تھے۔ ان کا رخ اوجھر ٹوٹل راک کی طرف تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ پتا ہوں۔" ہمایوں نے کہا۔

"نہیں سر۔ ان کے پاس شاید تھوڑا سا غیر ملکی تھا۔"

"تو کھاری ہو سکے ہیں۔" کچھ کلیئر کی طرف اشارہ وغیرہ مل جاتا ہے۔

گارڈ بولا۔ "رات کو ہم پریشان ہو گئے تھے کہ کتیں ٹکٹنن ہی خراب نہ ہو جائے لیکن ٹکٹنن گاؤں۔۔۔ خیریت گزری۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں یا پھر انکار مر کوئی لفظی ہوئی ہو۔"

کچھ دیر بعد عادل، ہمایوں اور کرشل جامنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے گارڈ کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ محروہہ جانتے نہیں تھے کہ یہ بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کے حوالے سے وہ عین صورت حال کا شکار ہونے والے ہیں۔ عین اور بالکل غیر متوقع۔

انہوں نے یکم کے آس پاس ایک نیم دائرے کی شکل میں جامنگ کی اور دوڑ لگائی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل مشقت نے صبح بہت ٹھنڈی تھی۔ عین سے شرابور کر دیا۔ کرشل اور ہمایوں ایک جگہ دم لینے کے لیے بیٹھ گئے۔ مگر عادل مسلسل بھاگتا رہا۔ ہر روز اپنی جان پر کچھ حیرت سم ڈھاتا اور اپنے اسیٹھا کو کچھ اور بڑھاتا اس کی ہانی بن چکا تھا۔ وہ ہمایوں اور کرشل سے قریب آؤ فر لاک دور تھا اور یہ جگہ حلوان پر تھی، اچانک وہ ٹھنک گیا۔ اسے سفید برف پر کچھ لوگ حرکت کرتے دکھائی دیے۔ وہ اس کی

طرف بڑھ رہے تھے۔ عادل کے پاس لیلی اسکوپ نہیں تھی ورنہ وہ مزید وضاحت سے انہیں دلچسپ کر سکتا۔ وہ غور ہی کر رہا تھا جب اسے بائیں جانب برقی تھوڑوں کے پیچھے سو ڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر آتشیں سائی دیں۔ اسے خطرے کا احساس ہوا اور وہ پلٹا۔ لیکن اس کے لیے شاید اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ پندرہ جیس قدم ہی دوڑا تھا کہ ایک توڑے کے عقب سے لٹاکرتی ہوئی آواز سائی دی۔ ”رک جاؤ، گولی چلاؤ گا۔“

عادل ٹھٹک کر رک گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تو وہیں اور پتھروں کے پیچھے سے چار افراد راکٹل کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے شلوار قمیض پر بھاری بھرکم جینس پہن رکھی تھیں۔ ان کے چہرے گرم تو نہیں تھے مگر ہونے تھے۔ صرف ایک بندہ شلوار کے بجائے جینوں میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی روسی راکٹل صاف نظر آرہی تھی۔ چندی سینکڑے بعد وہ لوگ عادل کے سر پر پھینک گئے۔ شلوار قمیض والے ایک شخص نے عادل کے سامنے پھینک کر اپنے سر پر سے ٹوپی ہٹائی، اس کا چہرہ دیکھ کر عادل کیسے میں رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس شخص کو یہاں دیکھے گا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی نہیں سکتی تھی۔ اس کے سامنے چھ فٹ کی دوری پر شہزادی کا بڑا بھائی قاسم کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ مختار ہوا تھا اور انگوٹھوں سے پیسے شعلے لگنے لگے تھے۔ وہ ہنسا کہ ”امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی تمہاری یہ یعنی صورت دیکھنے کو مل جائے گی۔“

عادل خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہیں۔ قاسم نے پھر ذہن نشین کیجے میں کہا۔ ”خیر ان کیوں ہو گیا ہے عاؤ؟ تو کیا سمجھتا تھا، بہت دور نکل آیا ہے۔ اب کوئی سمجھ تک پہنچ نہیں سکے گا؟“

”میں وہاں حیران ہوں۔“ عادل دھیمے لہجے میں بولا۔ قاسم تیزی سے آگے آیا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی راکٹل نظر آرہی تھی۔ اس نے راکٹل کی سرورٹل عادل کی گردن پر ٹھوڑی کے نیچے لگائی اور اسے اپنی وحشت سے دبایا کہ وہ گردن میں گھس گھس ہوئی۔ ”کہاں ہے میری بہن؟“ قاسم نے بے حد خطرناک لہجے میں سوال کیا۔

اب یہ عادل پر حیرت کا دوسرا منظر پیش ہوا تھا۔ وہ گردن پر نال کا دباؤ کم کرنے کے لیے ذرا سا پیچھے ہٹا اور بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ شہزادی سے۔“ عادل کا غصہ مہل ہونے سے پہلے ہی قاسم نے راکٹل سمجھا کر عادل کی کٹھن پر رسید کی۔ وہ لہراتا ہوا برف پر گر۔

قاسم نے راکٹل کی نال اس کے سینے پر رکھ دی اور اسی لمحے میں بولا۔ ”میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ میں اسی جگہ تھے ماروں گا کہ۔ مجھے بتا کہاں ہے میری بہن؟“ وہ چونچھاڑا۔ عادل کی آنکھوں کے سامنے ایک برقی سی لہر لگئی۔ ان لمحوں میں وہ سمجھ گیا کہ وہاں گاؤں میں وہ کون سا غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا جس کے بعد وہاں جہلمکج کیا تھا اور تاپا کے کارندوں نے ہر طرف بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ شہزادی۔ ہاں شہزادی کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا۔ اگر ہو گیا تھا تو اس نے نہیں کیا تھا۔ پھر کس نے کیا تھا؟ اس کے سینے میں آتش ہی دیکھنے لگی۔ وہ لڑزائیں آواز میں بولا۔ ”کیا ہوا ہے شہزادی کے ساتھ؟“

قاسم نے اندھا دھند اس کی پسلیوں میں ٹھونکنا شروع کر دیا اور چونچھاڑا۔ ”اوسے کتے کی اولاد! اچھے سے پوچھتا ہے کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ بتا مجھے کہاں ہے وہ؟ نہیں تو اسی تھا ان تجھے شہزادہ کروں گا۔“

گالی نے عادل کے سینے میں پھونکی آگ کو کچھ اور بلند کیا۔ لیکن اس نے خود کو سنسٹا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک بڑی فلاحی جی کا شکار ہیں۔ وہ اسی طرح اپنے لیے بولا۔ ”قاسم! شہزادی میرے پاس نہیں ہے، میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے۔“ اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ قاسم اور اس کے ساتھی وحشیوں کی طرح اس پر پل پڑے۔ راکٹلوں کے کندے، ٹھونکریں، گولے بے دریغ اس پر برسائے جانے لگے۔ ایک بار پھر یہ دنیا ہی مہر تھا جیسا تاپا کے باغ والے اچھے میں پیش آیا تھا۔

لیکن اس بار عادل مار کھانے اور ذلت سہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سینے میں دھماکے سے ہونے اور وہ پوری طاقت کے ساتھ پلٹ پڑا۔ اس کے سر کی زوردار ٹھونک نے قاسم کے ساتھی کو راکٹل سمیت نیچے ٹھپ میں لڑھکا دیا۔ قاسم نے لاشی کی طرح راکٹل کو استعمال کیا اور اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہا، عادل نے جبکہ کر یہ وار بنایا اور جواہر اندام شخص نے عادل کو عقب سے اپنے بازوؤں کے آگے کیلئے میں لے لیا۔ یہی وقت تھا جب عادل کی نگاہ قدرے بلند ہوئی اور ہاتھوں پر پڑی۔ اس نے سب دیکھ لیا تھا اور تیزی سے عادل کی مدد کو آ رہا تھا۔ وہ بھی بھانک اور بھی برف پر سلاخ کرتا ہوا آتا تھا۔ موقع پر پہنچ گیا۔ وہ ایک جی دار ساتھی تھا اور اس نے یہاں یہ جی داری ثابت کی۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں عادل اور ہاتھوں نے ڈٹ کر ان کا

افراد کا مقابلہ کیا لیکن وقت ان کے خلاف جا رہا تھا۔ قاسم کے حریف ساتھی جو قافلے پر تھے، بڑی تیزی سے ان کی طرف آ رہے تھے۔ وہ پہنچ جاتے تو پھر ان لوگوں کا پلڑا بہت بھاری ہو جاتا تھا۔ وہ خود ہی پہنچا ہی چاہتے تھے۔

قاسم کے قریب اندام ساتھی کے ہاتھ میں اب تیز دھار کا توکل آ رہا تھا۔ یہ قریب اندام شخص دراصل وہی ملازم انور تھا جس نے گاؤں میں یہ جھوٹ بولا تھا کہ عادل اسے من پابست پر باغ والے اچھے میں لایا تھا اور اچھے کا دورازہ کھلوا رہا تھا۔ اب اس شخص کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہ ان نازک لمحوں میں عادل کے سامنے آ گیا تھا، اس نے عادل پر ہاتھ کے دو اندھا دھند وار کیے۔ عادل نے دائیں بائیں ٹھٹک کر یہ وار بچائے۔ اس کی جیتے جھکی سبک کر اس کی بے پناہ پھرتی میں اس کی معاون تھی۔ قریب اندام انور کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب اس کا بازو عادل کی آگے گرفت میں چلا گیا۔ عادل نے یہ بازو اپنی وحشت سے مروا کہ اس کے ٹوٹنے کی آواز دور تک سائی دی۔ انور بھیا یک آواز میں چلایا۔ اس کا چاقو اب عادل کے ہاتھ میں تھا۔ ایک شخص نے عادل پر سیدھا قاتر کیا۔ سیون ایم ایم کا یہ قاتر عادل کے کندھے کو پھونکا ہوا نکل گیا۔ قاسم کے باقی ساتھی اب بس بچنے ہی والے تھے۔ عادل نے ہوا میں جست کی اور سیدھا قاسم پر آ جاوے تھی گری ہوئی راکٹل اٹھانے کے لیے ٹپک رہا تھا۔ عادل نے کسی جھکی پیچھے ہی کی طرح اسے عقب سے دبوچا اور چاقو کا پھل اس کی شہرگ سے لگا دیا۔

”خبردار۔ خبردار!“ وہ دہاڑا۔ ”کوئی آگے نہ آئے۔“ قاسم کے تازہ دم ساتھیوں کے حیر بہت خوفناک تھے لیکن قاسم کو عادل کے قبضے میں دیکھ کر وہ جہاں کے تھاں رک گئے۔ عادل کسی جھک کی ہی طرح قاسم سے پٹ گیا تھا اور اسے کسمانے کی گھٹائیں بھی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر دہاڑا۔ ”کوئی آگے بڑھا تو کاٹ دوں گا اسے۔ کاٹ دوں گا۔“

دو اونچی مارنے اور مر جانے کے موڈ میں تھا۔ ہاتھوں نے ایک کر قاسم کی گری ہوئی راکٹل اٹھائی اور اگلے قدموں میں کھڑا کر عادل کے شانہ پٹانہ کھڑا ہو گیا۔ قریب اندام انور۔ کا بازو اس بڑی طرح ٹوٹا تھا کہ ٹوٹی ہوئی ایک ہڈی اس کی ٹھیک کی آستین چھانڈ کر باہر نکل آئی تھی۔ لہو کے قطرے سفید برف پر گر رہے تھے۔

قاسم کے بعد میں آنے والے ساتھیوں میں دراز قدرے صاف پہچان لیا۔ اسے دیکھتے ہی عادل

کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ خود بخود قاسم کو اپنے ساتھ کھینچا ہوا چند قدم مزید پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھوں سے کہا۔ ”واکی واکی ہے نا تمہارے پاس؟“ کال کر مرد صاحب کو۔“

ہاتھوں نے ایک ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالا اور واکی واکی نکال لیا لیکن کال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ قاسم کے بعد میں آنے والے ساتھیوں سے ایک ٹھٹکی ہو چکی تھی۔ چھ منٹ پہلے انہوں نے عادل اور ہاتھوں کو ڈرانے کے لیے لگی ہوئی قاتر کر دیے تھے۔ اس قاتر کی آواز کپ کپ نکلتی ہوئی تھی۔ عادل نے مڑ کر دیکھا، اوپر بلندی پر برف کی سفید چادر تھی اور اس چادر پر حرکت کرتے ہوئے درجنوں افراد تیزی سے پیچھے آ رہے تھے۔ یہ ان کے کیپ کے لوگ تھے۔

اگلے تین چار منٹ کافی تھکاؤ والے تھے۔ قاسم، عادل کی نہایت سخت گرفت میں تھا۔ پھل دار چاقو اس کی چربی دار گردن سے لگا ہوا تھا۔ عادل اپنے ہاتھ کا دباؤ ذرا سا بڑھا تا تو شہرگ کٹنے کا مکمل شروع ہو سکتا تھا۔ وہ بار بار قاسم کے ساتھیوں کو خبردار بھی کر رہا تھا کہ ان کی کسی ہم جوئی کا انتہام کیا ہو سکتا ہے۔ دراز قدرے صاف کو دیکھنے کے بعد عادل کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا اور اس کا دباؤ آگے آئیں لہو بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ قاسم اس کا تاپا زانو تھا لیکن فی الوقت وہ صرف اور صرف ایک دشمن تھا۔ جس سے رعایت کرنے کا مطلب، خود کو موت کے منہ میں دھکیلنا تھا۔ اور پھر عادل اور ہاتھوں کے دھکا دھکیل گئے۔ یہ کیپ کے درجنوں ٹھٹکی اور غیر ٹھٹکی گاڑ رہے تھے۔ دیگر لوگ بھی تھے جن میں لارڈ اوس اور کرٹن وغیرہ بھی تھے۔

صورت حال بھاگتے کے بعد گاڑ ڈھانے تا صبر اور اس کے قریب ایک درجن ساتھیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک دو منٹ کے اندر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پاس باغیچہ دورا ٹھپیں تھیں جن میں سے ایک پہلے ہی ہاتھوں کے قبضے میں آ چکی تھی۔ باقی ہتھیاروں میں دو پستول اور دو چاقو شامل تھے۔ راکٹلوں کے کم دھنیں ڈیڑھ ہزار اور پلٹز بھی برآمد ہوئے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ بڑی تیاری سے یہاں پہنچے ہیں۔ ان کے ساتھ بشارت اور دھڑائی دو ماہر کا بڑھ بھی تھے۔

انور کا بازو اس بڑی طرح ٹوٹا تھا کہ اب وہ تلفیق کی شدت سے ہم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ایک ٹوپر بٹھا کر کیپ پہنچایا گیا۔ باقی لوگ راکٹلوں کے نرے میں پناہ دے

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے

خون آنا، ٹھنڈا گرم لگنا اور

دیگر تکالیف کے لیے

10 پر اہل
10 پر اہل

MEDICAM

Dr. Atta-ur- Rehman
Dental Surgeon

مریخس کا بہروسہ ڈاکٹر

ڈاکٹر کا بہروسہ 25 سال سے میڈی کیم ڈینٹل کلیم

پہنچے۔ ان میں سے قاسم اب بھی غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہا تھا اور عادل کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ عادل کی درخواست پر لاڑاؤ اس نے قاسم کے ہاتھ پشت پر بندھا دیے تھے۔

کمپ میں سرمد صاحب بڑی بے قراری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ باصر اور قاسم کو شکلوں سے جانتے تھے۔ انہیں یہاں اس برف زار میں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ عادل اور ہمایوں نے سرمد صاحب کو مختصر الفاظ میں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یقیناً یہ سب کچھ سرمد صاحب کے لیے بھی حیران کن تھا۔ خاص طور سے جو کچھ شہزادی کے حوالے سے کہا گیا تھا، وہ جوتا قابلِ عقید تھا۔

”شہزادی والی بات تو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ ہمایوں نے کہا۔

”لیکن میری سمجھ میں اب آنے لگی ہے۔“ عادل نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”مالک نے زادہ؟“ سرمد صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”جی سر! اسی غیبت نے پہلے لاہور سے صادق کو اٹھایا اور پھر اس کی مدد سے میرے گاؤں تک اور ماموں طفیل کے گھر تک پہنچا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ صادق کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا؟“ ”موصیٰ جناب..... اور پھر گاؤں پہنچنے کے لیے

اس نے صادق والا لاؤری استعمال کیا۔ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن میں اسے نہیں ملا۔ اس نے ماموں طفیل کو شدید زخمی کیا۔ صادق سے ہی اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ شہزادی میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے اس نے شہزادی کو اٹھالیا۔“

قاسم کا شور مچا رہا تھا کہ اس نے عادل کے منہ میں ایک کپڑا اٹھوس دیا تھا۔ اب وہ غول غول کی آوازیں نکال رہا تھا۔ سرمد صاحب کے اشارے پر ہمایوں نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ ایک بار پھر عادل کو گالیاں دینے اور چلانے لگا۔ ”مادے! اتیر! انجام چنگ نہیں ہوتا۔ سکتے کی موت ماروں گا تجھے۔ یہ مت سمجھتا ہم اکیلے تھے۔ اور لوگ بھی آرہے تھے جیسے پولیس بھی ہے۔ سرعام تجھے پھرتے لگوؤں گا دوسے تو میرا نام قاسم نہیں۔“

عادل نے اس کے سینے سامنے ہتھکڑیاں لگا کر بیان پکڑا اور جھنجھوڑ کر کہا۔ ”قاسو! مجھے تیرا کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میں اب بھی تجھ سے بڑی کہہ رہا

ہوں کہ مجھے شہزادی کا کچھ پتا نہیں۔ یہ کوئی اور ہے۔ انی نے میرے بار صادق کو بھی غائب کیا ہے اور پھر اس کے گھر (پک اپ) پر بند بھی پہنچا ہے۔ اس نے شہزادی کو ”بھواس بند کر۔“ قاسم، عادل کی بات کا تکرار چنگھاڑا۔ ”اپنی پلید زبان سے نام نہ لے میری بہن کو میں کاٹ ڈالوں گا تیری یہ زبان۔“ کاٹ ڈالوں گا۔“

طفیل کے عالم میں اس نے اٹھ کر عادل پر بھینسنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہمایوں نے اسے جھانپڑ رسید کیا۔ وہ اونچے سونے برف پر جا گرا۔ باصر اور اس کے دو تین ساتھیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر گارڈز نے دالٹھیں ان کے منہ سے لگا دیں اور انہیں جہاں کا تھاں روک دیا۔

اب تکرار پاور سے کمپ کے لوگ اس قاتل کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اگر یہ مرد و زن کے چہروں پر دلچسپی کے ساتھ ساتھ خوف آمیز بیزاری بھی موجود تھی۔ وہ یہاں انفرنگ کے لیے آئے تھے اور اس کے لیے کچھ ڈر سہارا خرچ کیا تھا۔ اپنی مصروفیات میں اس طرح کی غنیمت وکل انداز میں ان کے لیے نہایت پریشان کن تھی۔ کئی لوگ تشویش آمیز انداز میں اوٹس اور کرشل وغیرہ سے مختلف سوالات پوچھ رہے تھے۔ انگریز مہمانوں میں ایک سرجن بھی موجود تھا۔ انور کے ٹوٹے ہوئے بازو کی حالت زار دیکھ کر وہ اسے طبی امداد دینے کے لیے اپنے ٹینٹ میں لے گیا۔

قاسم تو بالکل ”پائپر“ ہو رہا تھا۔ اس سے کوئی ڈھنگ کی بات کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ عادل کے اشارے پر وہ گارڈز نے ایک بار پھر اس کے منہ میں زبردستی کپڑا اٹھوس دیا اور اوپر سے ایک منظر باندھ دیا۔

عادل دراز قد ناصر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ ہائیں کی طرح لہا اور سخت تھا۔ شہزادی کے حوالے سے وہ اس کا رقیب رو سیاہ تھا۔ وہ کئی بار عادل سے دشمنی لے چکا تھا لیکن آج عادل کا ٹیلا بھاری تھا۔ وہ چاہتا تو کوئی ایسی صورت حال بھی پیدا کر سکتا تھا کہ باصر کی جان ہی چلی جاتی لیکن وہ صاف سٹری لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ اپنی ہمت اور طاقت سے شہزادی کو جیتنے کا خواہش مند تھا۔ عادل نے باصر سے پوچھا۔ ”چھوٹے چوہری! ابھی قاسم نے کہا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی پیچھے آرہے ہیں، وہ کون ہیں؟“

ناصر خشک لہجے میں بولا۔ ”تیرے تایا صاحب ہیں۔ اور ان کے کارندے ہیں، پولیس کے لوگ بھی ہیں۔ کئی درجن لوگ ہیں۔ ان کے آنے پر تم نے سخت

مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ "ناصر کا لہو دھمکانے والا تھا۔
تایا فراسٹ کی آدھی اطلاع نے عادل کو حیران کیا۔
بہر حال وہ صاف محسوس کر رہا تھا کہ ناصر پیشگی طرح بچ
نہیں بل رہا۔ انہیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔
عادل نے تایا فراسٹ کے کاندھوں میں سے اس
مشتاق نامی شخص کو کھینچ لیا جس نے باغ والی لڑائی میں اپنے تنگ
رول ادا کیا تھا اور عادل کو برہنہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ عادل
اسے گریبان سے دیو بچ کر شیروں کے پیچھے لے گیا۔ پستول
اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سنگین لہجہ میں مشتاق کو
وارننگ دی کہ اگر اس نے سب کچھ صاف صاف نہیں بتایا تو
وہ اسے اس بری طرح زخمی کرے گا کہ وہ اس ویرانے میں
زندگی اور موت کے درمیان لنگ جائے گا۔

مشتاق جاننا تھا کہ یہاں عادل پوری طرح عادی
ہے اور اپنی باغ والی بے عزتی کا پورا پورا بدلہ لے سکتا ہے۔
اس نے عادل کی آنکھوں میں اس کے سنگین ارادے پڑھ
لیے اور بچ بولنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "تایا
فراسٹ والا گرد پ واقعی چار پانچ میل پیچھے آ رہا ہے لیکن
اس میں زیادہ بندے نہیں ہیں۔"

"نکتے بندے ہیں؟"
"چودھری صاحب کے علاوہ حویلی کے چار ملازم
ہیں۔ تین بندے چودھری بخار کے ہیں۔ اس کے علاوہ
ایک گاؤں رشید خاں ہے۔"

"پولیس کے کتنے لوگ ہیں؟" عادل نے پوچھا۔
"پولیس کے صرف دو کا سکیل ہیں اور وہ سادہ لباس
میں ہیں۔"
"بھیاہر کتنے ہیں ان لوگوں کے پاس؟"
"میرا خیال ہے کہ دو رائفلیں اور ایک پستول ہے۔"
"کوئی داکہ ٹاپی بھی ہے ان لوگوں کے پاس؟"
"آہو۔ گاؤں رشید خاں کے پاس ہے داکہ ٹاپی۔"
ابھی داکہ ٹاپی کی بات ہی ہوئی تھی کہ داکہ ٹاپی کا
سگنل آ گیا۔ یہ سگنل کا ٹنڈھڑ کے پاس موجود داکہ ٹاپی پر آیا
تھا۔ عادل نے مشتاق کی طرف سے توجہ ہٹائی اور گاؤں کے
پاس پہنچ گیا۔ پستول ہاتھوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے
گاؤں ڈھک و وارننگ دی کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو یہاں کی
صورت حال کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ ڈھرنے داکہ
ٹاپی پر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف غالباً دوسرا گاؤں رشید خاں
ہی تھا۔ وہ بولا۔ "ڈھرنہ بڑی خاص خبر ہے، کہاں ہو تم لوگ؟"
"ام چھوٹے کلیئیر سے دوڑ جانی سب آکے لکل آیا

ہے۔ تم خبریت سے ہو؟"
"ہاں ایک دم خبریت ہے، تم قائم یا ناصر صاحب سے
بات کراؤ۔ چودھری فراسٹ صاحب خود بات کریں گے۔"
ڈھرنے عادل کی طرف دیکھا۔ عادل نے ڈھک و
اشارہ کیا کہ وہ داکہ ٹاپی کی بات کرنا چاہتا ہے۔ قائم کو چاہنے
کی کوشش کر رہا تھا لیکن کچھ کی وجہ سے آواز اس کے
گھٹے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ "ہیلو کون؟" دوسری طرف
سے تایا فراسٹ کی آواز سنائی دی اور عادل کی وجہ نہیں تیز
ہو گئی۔

"مم۔ میں ناصر بول رہا ہوں تایا جی۔" ناصر نے
پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔
"پتہ جی بڑی خوشی کی خبر ہے۔ دھمی رانی مل گئی
ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہے۔ بالکل ٹھیک خاک ہے۔
قاسو کہاں ہے اسے بلاؤ۔" تایا فراسٹ کی آواز خوشی
سے کانپ رہی تھی۔

دھمی رانی سے تایا فراسٹ کی مراد یقیناً شہزادی ہی
تھی۔ ناصر اور قائم وغیرہ تو ہکا بکا تھے ہی، عادل بھی ششدر
تھا۔ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔

ناصر نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ "یہ کیسے ہوا تایا
جی۔ کہاں ہے شہزادی؟"
"میرے پاس ہی ہے۔ ابھی تو بس روندی ہی چلی
جاری ہے۔ ہمارے سارے اندازے لفظ لفظ میں ناصر
بڑے۔ یہ۔۔۔ یہ اس عاصی کا چہرہ نہیں تھا۔ یہ کوئی اور ہی
معاذ ہے۔ تم لوگ آتے ہو تو بتاتے ہیں سب کچھ۔ قاسو
کہاں ہے؟"
"نقیق۔ قائم ڈرائیو شاپ کرتے کیا ہے۔ ابھی آتا
ہے۔" ناصر نے بھانہ بتایا۔

عادل نے داکہ ٹاپی کے ٹائیک پر ہاتھ رکھا اور
کریخت لہجہ میں ناصر سے بولا۔ "تایا جی سے کہو وہ ادھر ہی
رکھیں، ہم آ رہے ہیں۔"

ناصر کچھ دیر تذبذب میں رہا لیکن جب اس نے
عادل کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ
پستول اس کی پٹیلیوں سے قریب تر ہو گیا ہے تو اس نے تایا
فراسٹ کو یہ پیغام دیا کہ وہ آ رہے ہیں۔
یہ سب کچھ بے حد رمانی تھا۔ بیٹھے بنائے عادل پر
ایک سنگین الزام لگا تھا اور اب لفظ بھی ثابت ہو رہا تھا۔
شہزادی بازیاں ہو گئی تھیں لیکن کس سے اور کیسے؟ بہت سے
سوال ذہن میں اودھم مچا جانے لگے تھے۔

عادل، ہاتھوں بندہ صاحب اور لارڈ اسٹوڈن میں ایک
بہاری میٹنگ ہوئی۔ لارڈ صاحب اس سارے معاملے میں
ملوث ہوئے نہیں چاہ رہے تھے لیکن صورت حال ایسی ہو گئی
تھی کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد
وہ مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ناصر، قائم، مشتاق اور ان کے قریب سولہ ساتھیوں کو
ایک ہی جگہ زمین پر بٹھا دیا گیا تھا۔ چار رائفل پروار گاؤں
جن میں سے دو مقامی تھے، ان کے ارد گرد چوکس کھڑے
تھے۔ چونکہ تمام افراد کی اچھی طرح تلاشی کی جا چکی تھی اس
لیے ان کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ عادل، ہاتھوں
اور ڈھرنہ وغیرہ قریب آئیں افراد کے ساتھ مطلوبہ جگہ کی طرف
روانہ ہوئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ وقت رخصت
لیوٹنے نے عادل کو تیز تو نظروں سے دیکھا۔ کئی دوسرے
برشرو کی طرح وہ بھی اس حق میں نہیں تھا کہ سرد صاحب اور
عادل وغیرہ کے ذاتی مسائل حل کرنے کے لیے خود کو کسی
تکبیرے میں ملوث کیا جائے۔ بہر حال اب تو یہ ہو چکا تھا۔
عادل کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان
میں بھی نہیں تھا کہ وہ شہزادی کو اور تایا فراسٹ کو اس
دیرانے میں بھی دیکھے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس حال میں بھی اور
کیوں بھی؟ مالکانے زادہ کا متحس چہرہ بار بار عادل کی
آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس کا دل مٹا دے رہا تھا کہ
ان تمام سنگین واقعات کا ذمہ دار وہی سرد شہزادی ہے جو
پانچ سو کے نزدیک ایک پہنچا ہوا معاملہ ہے اور کسی حد تک
لگن بھی تھا کہ اس کے پاس کسی طرح کی مادرائی توانائی
موجود ہے یا شاید یہ صرف اتفاق تھا کہ ہانگزی چوٹی کے
بارے میں بھی ہوئی اس کی کچھ باتیں بالکل درست ثابت
ہوئی تھیں۔ ابھی تین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے کے حیر رفاہ سفر کے بعد وہ لوگ ایک
بڑی چٹان کا کلاوا کاٹ کر ایک چھوٹے سے شعیب میں پہنچے
اور آٹا ٹاٹا ہاں موجود قریب آئیں افراد کو گھیر لیا۔ ان میں عادل
کے تایا فراسٹ اور گاؤں رشید خاں کے علاوہ ایک پورہ اور
اس کے تین خیر بھی تھے۔ عادل کی بے قرار نگاہوں نے سب
سے پہلے اپنی شہزادی کو ڈھونڈا۔ ہاں، وہ موجود ہی وہاں۔
ایک بڑی چادر میں لپیٹی لیٹائی۔ حیران و پریشان تایا
فراسٹ کے قریب کھڑی تھی۔ تایا فراسٹ اور رشید خاں
سمیت وہ سب لوگ اس اچانک القاد پر وحشت زدہ تھے۔
ان کی کچھ باتیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ملنی اور پھر ملنی اجنبیوں
سننے پر رائفلیں کیوں تان لی ہیں۔ یہاں پتھروں کا بنا ہوا

تینگی جیسے والا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے کے سامنے
عادل کو کھڑی کی گئی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈولی تھڑکی۔ ڈولی کو
اٹھانے کے لیے ایک لہا پاس لگا یا گیا تھا۔ عادل کو برف پر
خون کی آلائش بھی دکھائی دی۔ عادل۔۔۔ اپنے تایا فراسٹ
سے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑا تھا مگر اس کا "منہ
سر" اوٹی ٹوٹی میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں پر نگاہ تھی۔ باقی
افراد کا حلیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔

"کون ہو تم لوگ؟" تایا فراسٹ نے لرزتی آواز
میں پوچھا اور شہزادی کو حفاظتی انداز میں اپنے پیچھے کر لیا۔
عادل کو شہزادی کی پس آنکھیں ہی دکھائی دیں۔ کبھی ہرئی
کبھی گہری سیاہ آنکھیں۔ عادل نے اپنی اوٹی ٹوٹی اتاری
اور نگاہز بھی آنکھوں سے ہٹا لیے۔ تایا فراسٹ کے سر پر
جیسے ہزار پائند کا ہم پیٹ گیا۔ وہ کھانک عادل کی طرف دیکھ
رہے تھے۔ جو دیگر افراد عادل کو کہنا تھے، ان کا حال بھی
یہی تھا۔ عادل کو شہزادی کی آنکھوں میں بھی بے پناہ حیرت
دکھائی دی۔

"عادل۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں؟" تایا فراسٹ
پکلائے۔

"جی تایا جی۔" عادل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔
"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ یہ لوگ اپنے ہی ہیں۔ کوئی
انصاف نہیں پہنچا میں گے۔ ہمیں بس یہ ڈر تھا کہ آپ کے
ساتھ آنے والے نہیں گھبراہٹ میں قار وغیرہ نہ کر دیں۔"
تایا خود کو مسلسل حیرت کے شدید دھچکوں سے سنبھالنے کی
کوشش کر رہے تھے۔

"اور۔۔۔ باقی لوگ؟ میرا مطلب ہے قائم اور ناصر
وغیرہ؟" تایا نے پوچھا۔

"ان کے بارے میں بھی کوئی فکر نہ کریں۔ وہ
ہمارے پاس ہیں اور بالکل حفاظت سے ہیں۔" عادل نے
تایا کو یقین دلایا۔

انگھے دو چار منٹ میں وہ نہ صرف تایا کو قائل کرنے
میں کامیاب ہوا بلکہ تایا کے کارندوں نے اپنی دور رائفیں
اور پستول بھی گاؤں کے حوالے کر دیے۔ شہزادی پر دوسے
میں بھی لیکن اس کے جسم کی نیکیا بہت عادل کو صاف محسوس ہو
رہی تھی۔ شہزادی کی ایک کلائی پر پہلی پہلی ہی بھی بندھی
ہوئی تھی۔ ایک پولیس والے کی پیشانی اور ایک کارندے کی
کلائی پر بالکل تازہ چوٹیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں پولیس
والے سادہ پیکڑوں میں تھے۔ شہزادی کی نشتر و دووہ کے اثر
میں لگی تھی، شاید اس کا سر پھر کر رہا تھا۔ وہ کھڑے ہونے پر

جیسے کوئی جرح دے رہی تھی۔ عادل کو صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ پیدل سفر نہیں کر سکتی۔ عادل کے مشورے پر بتایا نے اسے ڈولی میں بٹھا دیا۔ تایا فرست جیسے اب خود بھی چاہ رہے تھے کہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دی جائے۔

راستے میں عادل نے تایا فرست سے پوچھا تھا چاہا کہ انہوں نے شہزادی کو کسے باز یا ب کر لیا اور اسے زبردستی یہاں لانے والا کون تھا تاہم ان کے بتا جانے صاف کہا کہ وہ جب تک قاسم اور ناصر وغیرہ سے مل نہیں لیتے، کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ کسی سوال کا جواب دیں گے۔

کیمپ میں واپس پہنچنے کے بعد ساری صورت حال بتایا کے سامنے واضح ہو گئی۔ انہوں نے جان لیا کہ یہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہوا ہے اور ناصر، قاسم سمیت تمام افراد یہاں بندوبست کی نوک پر موجود ہیں۔ تایا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خاص طور پر قاسم کو بندھی ہوئی حالت میں دیکھ کر انہیں تکلیف ہوئی تھی۔ شہزادی نے بھی باقاعدہ سسکا شروع کر دیا تھا۔ عادل نے وضاحت کی کہ قاسم کو کیوں اس حالت میں رکھنا پڑا۔ اس نے بتایا سے وعدہ کیا کہ جوں جی وہ ذرا داخل ہوتا ہے، وہ اسے کھول دیں گے۔

شہزادی کو پورے احرام سے نیچے میں کرشل کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بندھے ہوئے قاسم کو بھی ایک نیچے کی خوشگوار حرارت میسر آ گئی۔ عادل نے تایا فرست اور ناصر کو ساتھ لیا اور سرد صاحب کے پاس مینٹ میں پہنچا دیا۔ دس پندرہ منٹ تو "احساس سازی" میں لگے پھر اصل گفتگو شروع ہوئی۔ تایا کے ایک سوال کے جواب میں عادل نے کہا۔ "جیسا کہ میں نے بتایا ہے تایا جی! یہاں ایک پہاڑ پر چڑھنے کے مقابلے ہوتے ہیں ہر سال۔ ہم انہی مقابلوں کے لیے یہاں موجود تھے۔ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس طرح، پہلے قاسم اور ناصر بھائی سے اور پھر آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔"

تایا نے ایک آہ سمجھ کر کہا۔ "یہ پچھلے پندرہوی دن جو گزر رہے ہیں، میری زندگی کے سب سے بُرے دن تھے۔ جی گئی تو یہ ہے کہ وہاں پنڈ میں جو کچھ بھی ہوا، اس کے سارے اشارے تمہاری طرف ہی جاتے تھے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب وہ بندے جو جلی میں تھے۔ ایک پہرے دار کے سر پر رائل کے دستے مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔ انہوں نے دھم دھم رانی کو اٹھانے کی کوشش کی۔ جب ان کو روکنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے فائرنگ کر دی۔ قاسم سخت زخمی ہوا ہے۔ ایک گولی اس کی چھاتی پر اور

دوسری ٹانگہ میں لگی۔ ایک پہرے دار کو بھی گولی لگی۔ دوسرے شہزادی کو لے کر نکل گئے۔" تایا فرست کی آواز جھڑپائی۔ کوشش کر کے انہوں نے خود کو سنبھالا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "بہت بڑی بدنامی کی بات تھی۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی اور نہ کسی کو بتایا کہ ہم پر کیا قیمت نوٹ پڑی ہے۔ میرے بس خاص خاص کارندوں کو اس گل کا پتا تھا۔ ہم نے قاسم اور پہرے دار کو بہادپور کے ایک واقعہ کارڈ اکثر کے اسپتال میں بھیج دیا اور شہزادی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ جہاں سے ایسا صادقی سفید گڈی پنڈ کے پاس بھتوں سے مل گئی۔ اس کے بعد ہم سب کا یہ فک اور بھی بگاڑا ہوا کہ یہ سب کچھ تم نے ہی کیا ہے۔ تیسرے دن جب ہم پولیس میں رپورٹ کرانے کا سوچ رہے تھے ایک بڑی خاص اطلاع مل گئی۔ بہادپور شہر میں شہزادی کی ماں کے ایک رشتے دار صدر بنی کو ایک فون آیا۔ اس نے شہزادی کو روک دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے بھلا جانے۔ ابھی اس نے کچھ بتایا بھی نہیں تھا کہ فون بند ہو گیا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کر کے پتا کر دیا اور یہ جان کر حیران ہوئے کہ یہ فون کبھی آئے دو الے سے نہیں کیا گیا۔ یہ ایبٹ آباد اور واسو سے بھی آگے نہیں چلا س کے کیا گیا ہے۔ ہم نے فوراً انتظام کیا اور ایک کوسٹر پر بھام بھام بھاگ لبا چنڈا کر کے چلاں پہنچے۔ ہمارے پہنچنے تک ہمارے ہاتھ والوں نے فون والی جگہ کا پتا چلا دیا تھا۔ یہ چلاں کے اندر ہی بڑے ڈاک خانے کے پاس ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ پتا چلا کہ گھر کے مالک کا نام افعال خاں ہے اور وہ میر کرنے والوں کو آگے پہاڑوں پر لے جانے کے لیے جیپ چلاتا ہے۔ ہم نے افعال خاں کو پکڑا۔ اس نے بتایا کہ پرسوں رات دو بندے اس کے پاس آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو انہی علاقوں کا رہنے والا لگتا تھا۔ دوسرا شاہیہ ایبٹ آباد کا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بیمار زنا تھی۔ ایبٹ آباد سے اس کا علاج کروا کے لائے تھے اور وہاں اپنے گاؤں جا رہے تھے۔ وہ چار پانچ گھنٹے اسی کے گھر میں رہے پھر وہ ان کو جیپ پر لے کر آگے روانہ ہو گیا۔ وہ اسکرورڈ کی کسی تھاں (جگہ) کا نام لے رہا تھا۔ کہہ دے جیپ پر ان کو لے کر وہاں تک گیا۔ وہاں سے آگے انہوں نے ڈولی کا انتظام کیا اور بیمار لڑکی کو لے کر آگے چلے گئے۔"

تایا فرست کی آنکھوں میں نمی آ چکی تھی۔ انہوں نے اپنے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور غمزہ اخلاص میں بات جاری رکھتے ہوئے اس رواد کو آگے بڑھایا۔ ان کی

چلیا رواد کا لب لباب کچھ یوں تھا۔ تایا فرست کی ہدایت پر بال پور گاؤں سے کچھ اور لوگ بھی طویل سفر کر کے پشیمان کے اس دور دراز قصبے چلاں میں پہنچ چکے تھے۔ افعال خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ اسکرورڈ کے پاس سے ان لوگوں نے شہزادی کو ایک مقامی طرزی ڈولی میں بٹھایا تھا اور لے کر آگے نکل گئے تھے۔ ناصر کے ایک دوست نے ایبٹ آباد میں پولیس سے بھی آف دی رپورٹ کر دیا تھا۔ دو بڑے کاشیل سادہ لباس میں ان کے ساتھ روانہ کر دیے گئے۔ اسکرورڈ سے آگے شہزادی کو تلاش کرنے والے دو گروپس میں بٹ گئے۔ شہزادی کا بھائی قاسم، بھتیگر ناصر اور مشتاق وغیرہ آگے روانہ ہوئے۔ تایا فرست، بڑے کاشیل اور گاؤں رشید خاں دوسرے گروپ میں تھے۔ نہایت سخت موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے ان لوگوں کے پاس پورا ساز و سامان اور غنیمت وغیرہ بھی موجود تھے۔ کئی روز تک یہ لوگ نہایت دشوار راستوں پر اور بے حد محنت موسم میں سفر کرتے رہے۔ بالآخر آج صبح سویرے ایک انہولی ہو گئی۔ گاؤں رشید خاں کو برف پر ایسے نشان نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ یہاں سے ایک ڈولی گزری ہے۔

اور اسے گزرے ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔ اپنے تجربے کی بنا پر رشید خاں نے تجویزی سے ان نشانات کا تعاقب کیا اور آٹا فالتا پتھروں کے اس کوٹھے تک جا پہنچا جو برفانی توہوں کے بچوں سے بنایا گیا تھا۔ مقامی مسافروں کے لیے اس طرح کے پتھر لے کر کوٹھے نہیں نہیں بنے ہوئے تھے۔ کوٹھے کے باہر ڈولی پڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک درمیانی عمر کا غنیمت پایا ہوا تھا۔ وہ بھی سو رہا تھا۔ اس کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔ تایا فرست اور ان کے ساتھیوں نے سب سے پہلے یہ رائفل قبضے میں لی۔ رائفل کے بہت سے رائڈز اور بٹول کی گولیاں بھی انہوں نے قبضے میں لے لیں۔

اس شخص کو اٹھایا گیا۔ فحش صورت اور بول چال سے وہ ایبٹ آباد یا ناسرہ وغیرہ کا لگتا تھا۔ اس نے مزاحمت کی طرف حوجہ ہونے۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔ جب وہ لوگ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، درمیانی عمر والے اس شخص کو موقع مل گیا۔ اس نے چھوٹی دستے والی ایک کھابڑی اٹھائی۔ کاشیل مجید کے سر پر وار کیا اور ایک کانٹے کے ہاتھ پر چوٹ لگا کر اس کے ہاتھ سے رائفل چھڑائی۔ پھر اس نے تشیب میں چھلانگ لگائی اور ڈھولان ہٹک پر پھلتا ہوا دور نکل گیا۔ تایا فرست تو شہزادی کے

پاس رہے، ہاتھوں نے اس کا پیچھا کیا۔ تین چار فائر بھی اس پر کیے گئے لیکن اسے فائر لگا نہیں۔ قریب ایک فرلانگ آگے اس کا ایک ساتھی بھی موجود تھا۔ وہ شاہی علی الصلاح حاجت وغیرہ سے قاصر ہو کر وہاں آ رہا تھا۔ یہ منٹے ہوئے سر اور بھاری تین وقوش والا ایک پاؤندہ تھا۔ اس کے پاس پھول موجود تھا۔ اس نے فرست صاحب کے ساتھیوں پر جہابی فائرنگ شروع کر دی۔ یہ مقابلہ بس چار پانچ منٹ ہی جاری رہ سکا۔ اس پاؤندے کے اس پھول کی فضا پانچ چھ گولیاں ہی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ مارا جائے گا یا پکڑا جائے گا تو اپنے ایبٹ آبادی ساتھی سمیت بھاگ نکلا۔ وہ اس علاقے کے شاور تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتھروں اور برفانی توہوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ عادل کے علم میں ہی تھا۔ گاؤں رشید خاں اور گاؤں مذہر میں وائی ٹاکی پر رابطہ تھا۔ رشید خاں نے ناصر سے تایا فرست کی بات کرائی اور یوں عادل وغیرہ کو علم ہو گیا کہ شہزادی کے حوالے سے ایک اچھی خبر موجود ہے۔

تایا فرست کی مکمل رواد سننے کے بعد عادل اور اس کے ساتھیوں پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان کے اندازے اور اندیشے درست تھے۔ شہزادی، قاسم، صادق اور طفیل وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا اصل ذمے دار وہی مالکانے زادہ ہے۔ تایا فرست اس شخص کا جو حلیہ بیان کر رہے تھے، اس کے بعد فک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ اب بہت سے سوال ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ مالکانے زادہ نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ وہ شہزادی کو کہاں لے جانا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟ اور اس سے بھی اہم سوال جو عادل کا دل بار بار خون کر رہا تھا، یہ تھا کہ کیا شہزادی کی عزت آبرو محفوظ رہی ہے؟ وہ تو اسے کاٹنا چھینے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ کہاں یہ کہ وہ کئی دن تک شب و روز ایک جونی پاؤندے کے قبضے میں رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک اور روح فرسا خبر بھی عادل کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے تایا فرست سے زخمی قاسم اور ماموں طفیل کی حالت کے بارے میں پوچھا تو تایا فرست کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزرا گیا۔ انہوں نے سمجھ لیجے میں کہا۔ "قاسم بخیر تو کیا ہے لیکن اس کی ٹانگہ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

"اور ماموں طفیل؟" عادل نے پوچھا۔ "طفیل جی میں بچا عادل۔" تایا نے بوجھل آواز میں

کہا۔ "اس کے سر کی چوٹ بڑی سخت تھی، وہ دوسرے ہی دن اسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔"

عادل کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ سختی ہی دیرمدم جیسا رہا۔ انھیں تم جو نہیں۔ اب اسے صادق کے بارے میں بھی زیادہ تشویش ہونے لگی۔ تایا فراست نے بتایا تھا کہ صادق کا ابھی تک کوئی پتا نہیں۔ مالکانے کی کثرت صورت عادل کی نگاہوں میں گھومتی گئی اور اسے اپنا خون کھول ہوا محسوس ہوا۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو عادل نے تایا کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ "تایا جی! شہزادی تو خیریت سے ہے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ اس سے آپ کی بات ہوئی ہے؟"

تایا فراست کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولے۔

"میرے سوچنے سے رب کا کلمہ کلمہ شکر ہے، اس نے میری دمی رانی کی لاٹ رکھی ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے، کوئی گل بھی چھپائی نہیں ہے مجھ سے۔"

"کیا بتایا ہے اس نے؟"

"وہ بتاتی ہے کہ وہ سولے سو والا بیوٹی بندہ تھا۔ اس کی بولی عجیب تھی۔ بس کوئی کوئی گل ہی مجھ میں آتی تھی۔ پر اس کا سامی ہماری بولی میں گل کرنا تھا۔ سولے سو والا کہتا تھا کہ اس کا سچا بھائی ہوا ہے۔ اس کو پہاڑ سے گرا کر مارا گیا ہے۔ وہ جب تک اس کا بدلہ نہیں لے گا، اس کو چین نہیں آئے گا۔ مرنے والا اپنے بیک ہی ایک ہی اولاد تھا۔ وہ اس کے غم میں دن رات روتا ہے۔ سولے سو والا کہتا تھا کہ وہ شہزادی کو اپنے پنڈلے جانے کا اور اس کا ویاہر مرنے والے کے بچ یعنی اپنے بھرا سے کروائے گا۔ یہاں کی پہاڑی رسم کے مطابق اس کا بدلہ اسی طرح سے پورا ہوگا۔"

عادل کے جسم پر چڑچڑاہٹ سی رہ گئی۔ اس کے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ یہ سارا قصہ یقیناً ایک ختاب بگل سے شروع ہوا تھا جسے عادل نے لڑائی کے دوران میں بلندی سے گرا دیا تھا۔ ختاب کا سامی فواد جاں اسی وقت ختاب کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور وہ بھی سکتا تھا لیکن رائے خاں نے وقتی طور پر اسے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ معاملہ دھینے تک کھینچے کے بعد طے کریں گے۔ مگر پھر موت نے ان دونوں کو اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اب یہ کام مالکانے زادہ نے اپنے زبے کیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو عاقل؟" تایا فراست نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ کچھ نہیں جی۔ ان لوگوں کے دم و روان عجیب

تھا۔ ان کے ذہن کی طرح رواج بھی سمجھ میں نہیں آتے۔"

تایا نے کہا۔ "سب سے زیادہ تو یہ گل پریشان کرتی ہے کہ یہاں پہاڑوں میں گل ہونے والے کسی بندے کا میری دمی رانی سے کیا تعلق؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں پہاڑوں میں۔۔۔ تم سے۔۔۔ کوئی ایسا کام ہو گیا ہو۔ جس کی وجہ سے شہزادی۔"

تایا فراست نے بات اور جوری چھوڑ دی اور سولے نظروں سے عادل کو دیکھنے لگے۔ عادل خاموش تھا۔ یہ بات تو ابھی طرح اس کی سمجھ میں آئی تھی کہ شہزادی کو مالکانے وغیرہ سے سب معلوم ہو گیا ہوگا لیکن اس نے اپنے والد کو جان بوجھ کر یہ بات نہیں بتائی تھی کہ مالکانے جس گل کی بات کر رہا ہے، وہ عادل سے ہی ہوا ہے۔

عادل نے اس موقع پر گول مول بات کر دینا مناسب سمجھا۔ اس نے کہا۔ "تایا جی! یہاں کچھ پریشان کرنے والے واقعات ضرور ہوئے ہیں۔ میں اس بارے میں آپ کو بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ مجھے صلی صرف ایک بات کی ہے۔ بلکہ غوثی ہے کہ شہزادی کے حوالے سے آپ کچھ پرچہ شہر کر رہے تھے، وہ قتل لکھا ہے۔ وہاں لالی اور پال پر میں جو کچھ ہوا، اس سے میں بھی اتنی ہی بے خبر تھا جتنے آپ تھے۔"

تایا فراست نے پرجہ سوج انداز میں کہا۔ "میں عاقل یہ بات تو بے فکر کر رہا تھا کہ یہاں پہنچانے والے اور شہزادی کو ہٹا کر یہاں بچانے والے اور شہزادے کے صادق کو غائب کرنے والے ایک ہی لوگ ہیں تو پھر انہوں نے تم سے دشمنی چکانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں۔۔۔ تم سے واقعی کسی بندے کا۔۔۔ خون تو نہیں ہوا؟"

"نہیں تایا! امیر سے اندر بھی آپ ہی کا خون ہے۔ اگر آپ کسی کو ناحق قتل نہیں کر سکتے تو میں کیسے کر سکتا ہوں۔ بہر حال اس بارے میں جلد ہی آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔"

تایا فراست کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے وہی سوال پوچھا جس کی عادل توقع کر رہا تھا۔ انہوں نے جانتا تھا کہ عادل یہاں اس برف زار میں کیا کر رہا ہے۔ یہ اسے سارے آئندہ مزہب مرد و عورت یہاں کیوں موجود تھا۔ اور یہاں کس طرح کا مقابلہ ہونے والا ہے۔

عادل نے انہیں مختصر الفاظ میں بتا دینا مناسب سمجھا کہ آئندہ اڑتالیس گھنٹوں میں یہاں کیا ہونے والا ہے اور جو کچھ یہاں ہونے والا ہے، اس کی پسری سختی پرانی ہے۔ اور اس غیر معمولی ایونٹ میں حصہ لے کر اس کو کس طرح کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تایا فراست حیرت کے

میں بیٹے رہے۔ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آئیں، کچھ نہیں آئیں۔

تایا فراست زیادہ پارکیوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ شہزادی اور قاسم وغیرہ کے ساتھ جلد از جلد اس ملک کا علاقے سے نکل جائیں اور وہاں اپنے گاؤں تک پہنچ جائیں۔

عادل نے انہیں سمجھایا کہ وہی ہوگا جو وہ چاہتے ہیں لیکن طریقے سے۔ بس اب صرف اڑتالیس گھنٹے کی بات ہے۔ یہاں کیمپ میں موجود سارے لوگ ایک قافلے کی صورت میں سفر کریں گے اور وہاں کنگورو یا گلیٹر تک پہنچیں گے۔ عادل نے تایا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تایا جی! یہاں آپ کے ساتھ آنے والا ہر شخص، مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کسی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ باطل بے فکر ہیں۔ انور کے بازو کا بھی بڑا اچھا علاج کیا گیا ہے۔ شاید شہر میں بھی اس طرح سے نہ ہوتا، اسے پانچ سو روپے دیا گیا ہے۔ قاسم بھائی کی طرف سے بھی آپ تسلی دے دیں تو میں اس کے ہاتھ وغیرہ کھول دیتا ہوں۔ قاسم بھائی اتنے غصے میں تھا کہ ہمیں ہاتھ باندھنے سے سوا کوئی چارہ ہی نظر نہیں آیا۔"

تایا نے کہا۔ "ہماری طرح اس کے دماغ میں بھی یہی تھا کہ شہزادی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، تم نے کیا ہے۔ اب اس گل کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب قاسم کو بھی یہ گل سمجھ میں آجائے گی۔ میں اسے جا کر سمجھاتا ہوں۔ وہ اب کسی طرح کا قصہ نہیں دکھائے گا۔"

"تایا! آپ ناصر کو بھی سمجھا دیں۔ میری اس سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ آپ میرے بڑے ہیں، میرے لیے ہر جی کسم کریں گے، میں اسی طرح کروں گا۔ پنڈ میں جو کچھ بھی ہوا ہے، میں اسے قبول چکا ہوں اور آپ کو بھی یہی چاہیے۔ دانا ہوں تایا جی کہ وہاں بارش میں میرے ساتھ ڈراما کیا گیا تھا۔ میں وہاں صرف آپ سے ملنے گیا تھا۔" تایا سب کچھ اظہار خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔

دو رات بڑی تشویش بھری اور سستی تیر تھی۔ سرسبز، عادل اور عاقل اپنے خیمے میں تادیر سو جڑ کر بیٹھے رہے۔ حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ یہ ظاہر تو بڑا نزدیک اتفاق ہوا تھا کہ تایا فراست اور رشید خاں وغیرہ مالکانے زادہ سے شہزادی کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مالکانے زادہ اور اس کا نامعلوم ساتھی جان بچا کر ہمارے گئے تھے لیکن اسے بھاگنے کے بجائے پھانسی پھانسی

جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ مالکانے زادہ کی خصلت کا اندازہ اب اچھی طرح ہو چکا تھا۔ وہ اتنی جلدی جیسے پنڈ والا نہیں تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ اپنے باؤندہ ساتھیوں کے ہمراہ اور بارہا اس طرف آئے گا۔ وہ لوگ ہاتھ پیرا کی مغربی جانب آباد تھے۔ فاصلہ بہت زیادہ تو نہیں تھا لیکن راستہ دشوار تھا۔ سرسبز صاحب نے "غینٹ لیب" کی روشنی میں نقشہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "تیز رفتاری سے بھی سفر کیا جائے تو یہ تقریباً دو دن کا راستہ ہے۔ یعنی مالکانے اور اس کے ساتھی کو دو دن یاؤندہ ہستی تک جانے میں لگیں گے اور دو دن آئے میں۔ یعنی چاروں۔"

عاقل بولا۔ "مطلب یہ کہ یہاں کے مقابلوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارے پاس کافی وقت بچا رہے گا۔"

"بہت زیادہ وقت تو نہیں، لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ ہم اس کیمپ کو سمیٹ کر یہاں سے کنگورو یا کی طرف نکل سکیں۔ اس کے باوجود ہمیں کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مسٹر انیس کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایونٹ ختم ہوتے ہی ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

آئینہ عاقل یہاں کے کسی مقامی مسئلے میں الجھتا نہیں چاہتی تھی۔ ان میں ایک طرح کی تشویش پائی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ کل کے مقابلوں کی تیاریوں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ تو بلی راک کے گرد چار مختلف جگہوں پر کیمپ بکس نصب کیے گئے تھے۔ ان کیمپوں کے اوپر سائیکل تھے۔ کسی عاقل کی صورت میں طبی امداد کا مناسب انتظام بھی موجود تھا۔ کل صاف موسم کی پیشین گوئی تھی۔

سپر کورٹل، عادل کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "توم کے لیے آج بھی نیوڈ لائی ہوں، شہزادی توم سے ملنا چاہتا۔"

"کہاں؟"

"وہ وہاں ہام کے فینٹ میں ہے۔ اس کا غار دوسرے فینٹ میں ہے، جھک کر سو رہا ہے۔"

شہزادی سے ملنے کو عادل کا دل بھی جگمگا رہا تھا۔ اب خود بخود ہی یہ پیشین گوئی کی تھی۔ ناصر، قاسم اور مشاق وغیرہ سمیت سب لوگ ابھی تک غمرانی میں تھے۔ انہیں ایک ہی جگہ زمین پر بٹھایا گیا تھا اور چار سو گاؤں زان پر پہرا دے رہے تھے۔ اس صورت حال میں عادل اور شہزادی کی ملاقات میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط کی اور کسی کی نگاہ میں آنے وغیرہ شہزادی والے فینٹ

نوجوان آگے نکل گیا لیکن پانچ چھ سوٹ کی چڑھائی کے بعد عادل نے اسے جالیا اور اس سے "لیڈ" لے لی۔ یہ لے کر عادل نے آٹھ گیندیں برقرار رکھی اور یہ Heat جیت گیا۔ چوتھی پر کھڑے ریفریز نے اسے اسٹاپ دیا اور دیکھا۔ عادل کا نام تھا 48 منٹ۔ اور یہ کافی اچھا نام تھا۔

اب وہ ان چھ سوٹ مست کھڑیوں میں شامل ہو چکا تھا جنہیں اگلے روز دوپہر سے پہلے کلاسنگ میں حصہ لینا تھا۔ لیو نے بھی ان چھ کھڑیوں میں جگہ پا چکا تھا۔ عادل کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کا نام لیو پو کے نام سے قریباً تین منٹ کم تھا۔

سرمد صاحب کے حکم پر کرٹل نے عادل کی فوٹو گرافی کی تاکہ اس کے کندھے اور بازوؤں کی مشقت کے لیے تیار ہو جائیں۔ کرٹل اسے فینٹ میں لے گئی۔ ٹیکر کے سوا اس کے سارے کپڑے اتار دیے اور اس کے گالوں کی خوب مالش کی۔ مشقت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ دل جمعی سے لگی رہی۔ تاہم ایک بات عادل نے صاف محسوس کی۔ اب وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ عادل کے حوالے سے اس کے جذبات میں کوئی بگ روئی یا سٹپلی خرابی نظر نہیں آتی تھی۔ عادل کی گردن اور کندھوں کا

تین تین کی چوٹیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ تین کھڑیوں کی ایک کو ایک ساتھ چٹان پر چڑھائی کرنا تھی۔ ان میں سے پہلے نمبر پر آنے والا اگلے مرحلے میں جانے کا حق دار تھا۔ یوں چھ ٹوٹیوں یا ٹیوں میں سے چھ کھڑی اگلے مرحلے میں چلے جاتے۔ ان چھ کھڑیوں کو پھر دو ٹوٹیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس مقابلے میں قائل دو کھڑی منتخب ہوتا تھے جن کے درمیان آخری مقابلہ ہوتا تھا۔ عادل کو تو یہ امید تھی کہ وہ اس آخری مقابلے میں موجود ہوگا۔

عادل چوتھی ٹیم میں شامل تھا۔ اس ٹیم کی باری شام چار بجے کے قریب آئی۔ سرمد صاحب نے اس کا شانہ دکھا۔ اپنی پانچ سو شدہ ٹانگ کے باوجود وہ بہت وقت اس کی کوچنگ اور حوصلہ افزائی میں مصروف رہے تھے۔ عادل نے دور اس سرخ ٹینٹ کی طرف دیکھا جہاں شیوا دی موجود تھی۔ اسے یہی لگا جیسے آج وہ پھر شاہ فوانہ کے میلے میں ہے اور کجور کے غلوں پر چڑھائی کرنے والا ہے۔ دور ایک رنگ برنگے ٹانگے کے گرد سرخی پر دے سٹے ہیں اور اس کی شیوا دی ان پردوں کے اندر سے اس کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے جسم میں تیار ہونے کا احساس تھا۔

کلاسنگ شروع ہوئی۔ آغاز میں تمام نامی برٹش

ہم بس یہاں سے لٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ عادل بھی چپ رہا۔ اس کی انگلی کی گرفت بدستور عادل کے بازو پر قائم تھی۔ کچھ دیر بعد کھوٹی کھوٹی آواز میں بولی۔ "عادل۔۔۔ میں آج تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مجھے بہت بڑے بڑے غلوں سے آ رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمارے ساتھ کچھ ایسا نہیں ہونے والا۔ چورہری جی اور اس کا بیٹا میرے رشتے سے بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ یا تو۔۔۔ یا تو مجھے لگے کہ کچھ دنوں کا جاؤ۔۔۔ یا پھر بھول جاؤ مجھے۔۔۔ زیادہ اچھا یہی ہے کہ بھول جاؤ۔۔۔ میں اپنے ابا کی عزت کو اور مٹی میں رولوں کی تو شاید مجھے مر کے بھی نہیں آئے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان تھا۔

عادل نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں شیوا دی! میں تمہیں اس طرح لے کر نہیں جاؤں گا۔۔۔ اور نہ ہی تمہیں بھولوں گا۔ میرے اور تباہ کے درمیان ایک وعدہ ہے۔ میں وعدہ دہا پورا کروں گا۔ تم میرے تباہ کی عزت ہو۔۔۔ میں نے تمہیں عزت سے ہی حاصل کرنا ہے۔ اور کر کے رہتا ہے۔ اچھی بات ہے کہ اب تم بھی نہیں ہو۔ تم دیکھنا شیوا دی۔ تم دیکھنا۔ میں تم کی طرح اپنی جان کی بازی لگا کر تمہارا ہاتھ بچیتوں گا۔ وہ وقت اب بہت قریب آ گیا ہے۔"

عادل کے لیے میں فولادی ارادوں کی ٹھنک اور ہسپ طوفانوں کی گرج تھی۔ ان گلوں میں اس کے اندر ایسی توانائی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ وہ شیوا دی کی پیشانی چومنے کے بعد ستاروں کو بھی ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اور پھر اس نے واقعی شیوا دی کی پیشانی چومی اور اسے بولنے کا موقع دے بغیر تیزی سے باہر نکل آیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ آئندہ چھ گھنٹوں میں قسمت اس کے ساتھ کیا مکمل کیلے والی ہے۔

☆☆☆

اگلے روز موسم واقعی صاف تھا۔ ٹوٹل راک کے ارد گرد میلے کا سامنا تھا۔ برٹش مردوزن بہت بڑی جوش نظر آ رہے تھے اور اپنے اپنے کھڑیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ بہت سے تماشا بینوں کے گے میں ٹیلی اسکوپس بھول رہی تھیں۔ کچھ نے ویڈیو کیمرے قاتے ہوئے تھے۔ گاہے گاہے فٹس لائنس بھی چمک رہی تھیں۔ ایک دن پہلے قائل مقابلوں کے لیے 18 کھڑی جن لیے گئے تھے۔ عادل کا نام ان میں شامل تھا۔ کئی سال پرانی ترقیب ہی اب تک چل رہی تھی۔ کھڑیوں کو

میں داخل ہو گیا۔ عادل کو دیکھ کر وہ سسک پڑی۔ اور اس کا تواتر بازو ہتھام کر۔ بازو کے ساتھ لگ گئی۔ وہ اب ٹوٹی کی کیفیت سے نکل آئی تھی۔ اٹھارہ آواز میں بولی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے عادل! اس سے تو۔۔۔ موت آ جاتی تو اچھا تھا۔"

عادل نے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کسی بات منہ سے نہ کہو۔ سب اچھا ہو جائے گا انشا اللہ۔" انہوں نے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں، پھر وہ روتے ہوئے بولی۔ "عادل! وہاں باغ میں تمہارے ساتھ چھ کچھ ہوا، اس نے مجھے بڑا رالایا۔ میں اس کو بہت بڑا دکھ بھیجی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ اب بھی اس سے بڑے بڑے دکھ سامنے آئے ہیں۔ ابا کی عزت مٹی میں مل گئی ہے عادل! لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے؟"

"تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ اللہ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تم ویسی ہی ہو، جیسی اپنے گھر میں تھیں۔ لیکن اگر خدا بخوات۔۔۔ خدا خواست کچھ ہو بھی جاتا تو تم میرے لیے اسی طرح پاک اور صاف تھیں شیوا دی! تمہیں نہیں پتا، تم میرے لیے کیا ہو؟"

اس نے اپنی خوب صورت ٹانگیں اٹھا کر عادل کی طرف دیکھا۔ سب سے ہونے لگے میں بولی۔ "عادل۔۔۔ کیا۔۔۔ تم سے کسی کا۔۔۔ خون ہو گیا ہے؟ مجھے اسی سوئے (سرمنڈے) کے ساتھی نے بتایا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہر صورت اس گل کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ لیکن میری کچھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اس بدلے کے لیے انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیا ہو کیا؟"

"انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ۔۔۔ تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہو۔" عادل نے پوچھ لےجے میں کہا۔ "لیکن کیسے عادل؟"

"ابھی اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" عادل نے جواب دیا۔ بہر حال، عادل کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ ماکا کو شیوا دی اور ماموں ٹیلن وغیرہ کے بارے میں ساری معلومات صادق سے ہی حاصل ہوئی ہوں گی۔ وہ قسمت کا بار اپنا نہیں کس حال میں تھا۔

شیوا دی ایک بار پھر روٹی آواز میں بولی۔ "عادل! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں اب اور کچھ نہیں دیکھ سکتی۔" وہ دوبارہ سسکے لگی۔

"اب اور کچھ نہیں دیکھنا پڑے گا شیوا دی! ابھی اب

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہ جبر کی پہلی پہلی راتیں
جاسوسی کے شکار سے کات فی بندر تیں

اولین صفحات ● زمانہ حاضر کے حالات و واقعات میں ڈوبتی ابھرتی، سفاک خائن کی نکس انگیز کہانی... **کاشف زہیر کی فکر انگیزی...**

آوارہ گد ● دکھ کے شکر کا تھیں کی ایک لالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کوئی جاس کا سہارا نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شہرت

جوازی ● احمد اقبال کے شو بدلم سے ایک جوازی کے کھیل کے نئے نئے

محبوب کے بالے انداز ● مرنے والی ایک تیلے اہل کی دکھناؤبت کی پڑ ہو، اہل کرشم کہانیوں

سزوری کی کھانا بنان

بھلی کھانی ● جب جان بچنے کے تو ہر ہل چل میں جانتے... ایک بڑا بڑا کھیل

دوسری کھانی ● دولت کی چمکا ہونے کے خیر و جگہ کی کھانی کی طرح کھانے کی



اپ کے تیرے...
میں نے تجھے...
اپنی کی دلپس باتیں... کھانیں

مساج کرتے ہوئے وہ منگرائی اور یوں۔۔۔ "آج ہام نے اپنا سارا ہنر قوم کے مساج پر لگایا۔ ہام کو چین ہے تو مکل شہزادی کو مایوس بنائیں کرے گا۔ وہ بہت اچھا۔ بہت زیادہ اچھا۔"

عادل نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ "قوم بھی بہت اچھی۔ قوم نے ہام کا بہت ساتھ دیا۔ کل ہم صرف شہزادی کے لیے ہی نائیں قوم کے لیے بھی جیتے گا۔ قوم کو لیو پڈ کے شہنشاہ سے نکال کر دکھائے گا۔ شہنشاہ جیسی ہوتا تو؟"

اس نے اناہت میں سر ہلایا اور عادل کے لہجے پر فحش دی۔ عادل بھی ہنسا۔ ہنسنے ہوئے اس کی ہیلیوں کے نیچے ہلکی سی ہنسی اٹھی لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ سرد صاحب کی ہدایت کے مطابق لینے کے لیے "سلیپنگ بیگ" میں گھسا تو اسے لگا کہ مندرے کی جگہ پر ہلکا درد ہو رہا ہے۔ اس نے درد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ موجود تھا اور بڑھ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر یہ کیفیت ہو گئی کہ عادل کروش پر کروش بدلتے لگا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے کیا کیا تھا۔

ہامیوں نے اس کی کیفیت کو بھانپا اور پوچھا۔ "کیا بات ہے عادل؟ کچھ بے آرام لگ رہے ہو؟"

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔" وہ بولا۔

"تم سیدل رہے تھے۔ لیکن وغیرہ تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

"ہاں، کچھ کچھ لگ رہا ہے۔"

ہامیوں اٹھ کر بیٹھ گیا اور لیپ کی روشنی تیز کی۔ "کھانا تو ہمارے ساتھ ہی کھایا تھا؟ تم نے؟ اور اس کے بعد تو کوئی چیز نہیں کھائی؟"

"نہیں۔" عادل نے کہا پھر جیسے اسے یاد آیا۔ تین لڑکوں کی ٹولی میں اول آنے کے بعد جب وہ نیچے اتر تھا اور سب خوشی کا اظہار کر رہے تھے تو اس نے کچھ یاد کیا۔ پھر اسے یاد آیا۔ برٹش قشادہ میں سے کسی نے زور سے اس کا کندھا تھپکا تھا اور جس کا ٹخنہ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس کے جسم میں جھنجھٹیاں ہی رہ گئیں۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اس سے وہی غلطی ہو چکی ہے جس سے کروش نے اور سرد صاحب نے اسے بار بار خبردار کیا تھا۔ اس جوش کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی تھی جواب اس کے منہ سے ہاتھ نہ نکل چلائے گی تھی۔ بے شک وہ جوش "ٹن بیک" تھا اور سر ہنہر تھا لیکن کرنے والے کیا نہیں کر لیتے۔

یہ ایک عادل کا دل بے طرح متھایا۔ وہ منہ دبا کر

اٹھا۔ ہامیوں نے فوراً آگے بڑھ کر vomit bag کے سامنے کیا۔ عادل نے اس میں سے کی۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا چلا گیا۔ ایک ایک گھنٹے میں عادل کو چار بار تھوئی اور آخری بار سے میں تھوڑا سا خون بھی آیا۔

ہامیوں نے بے قرار ہو کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ کمرہ بنا دیا جائے۔"

عادل نے اٹھی کے اشارے سے اسے منع کیا۔ اسے جیسے اب بھی امید تھی کہ شاید طبیعت تسخیل جائے۔ لیکن اس دوران میں شیف سے باہر سرد صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ عادل کو پکار رہے تھے۔ شاید یہ ان کی نہایت تیز چوٹی میں ہی تھی جس نے انہیں عادل کی مصیبت سے خبردار کر دیا تھا۔ اب سرد صاحب کو باہر تو نہیں روکا جاسکتا تھا۔ وہ اندر آئے۔ اور پھر ساری صورت حال سے آگاہ ہو گئے۔

ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وہ بہت حوصلے والے تھے لیکن ان فحشوں میں عادل انہیں پریشان دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت تشویش ناک صورت حال تھی۔ صبح فاضل مقابلے سے اور عادل بری طرح فوڈ پوائزنگ کا شکار ہو چکا تھا۔

اب پچھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اسی وقت ایک برٹش ڈاکٹر کو بلا دیا گیا۔ اس نے بھی... فوڈ پوائزنگ کی تصدیق کی۔ اس سے جو کچھ بین بڑا، اس نے کیا۔ درد اور حتیٰ کے لیے دو انکشن لگائے اور فلوکوز کی ڈرب بھی چڑھا دی۔ وہ بڑی تکلیف دہ رات تھی۔ عادل کے بڑی خواہ

ساحیوں کے چہرے سر جھائے ہوئے تھے۔ کروش کا چہرہ برف کی طرح سفید دکھائی دیتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس شدید تکلیف کی حالت میں کلاہنگ جیسی مشقت کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے نفلوں میں وہ مقابلے سے پہلے ہی باہر ہو گیا تھا۔ لیکن عادل کی نگاہوں میں ایک اور ہی طرح کا مظہر بنا ہوا تھا۔ یہ مگر جیسے اس کے دل و دماغ پر فحش ہو چکا تھا۔ اس منظر کا تعلق سرد صاحب سے تھا۔ اپنے شدید ذہنی کدھرے کے ساتھ وہ ایک ابراہم کوورج بہت دو پہر کو "گمشدہ اینکر" ڈھونڈنے کے لیے کروش کے ساتھ دو پہر کا

فٹ بلند چٹان پر بڑھ گئے تھے۔ وہ واقعہ ان کے فٹلے "ٹوچین ٹو کین" کی غلطی تھی۔ ہاں۔۔۔ انہوں نے اس دو پہر میں عادل کے سامنے غیر معمولی برداشت و ہمت کا کچھ بے عمل نمونہ پیش کیا تھا۔ وہ آج پوری آپ وہاب کے ساتھ عادل کی نگاہوں میں دیکھ رہا تھا۔ اور اسے ایک

انہی کی طرف بڑھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس صبح چشم لٹک نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ ساری رات اٹلیاں کرنے اور پوائزنگ کا شکار رہنے کے بعد عادل مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اس کا رنگ ہلکی کے ساتھ تھا، ہونٹوں پر چٹائی بھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہی گنگا تھا کہ وہ فحشوں کا پیار ہے۔ مگر اس کے ارادے اس چٹان سے زیادہ مضبوط تھے جس کے سامنے وہ کھڑا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ اسی بد باطن لیو پڈ کا کیا دھڑا ہے۔ لیو پڈ کو دیکھنے کے بعد اس کے سینے میں بھڑکتے فٹلے کچھ اور فروزاں ہو گئے۔ وہ آج مرجانا چاہتا تھا یا پھر اس گورے سے جیت جانا چاہتا تھا۔

سرد صاحب، ہامیوں حتیٰ کہ کروش نے بھی اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس نے کسی کی نہیں مانی تھی۔ وہ سن ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے آج صبح سویرے ہی اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ بے گریا تھا کہ جب تک اس کے جسم میں جان ہے، وہ جیتنے کی کوشش کرے گا۔

اس نے سرد صاحب کی ایک بات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ ہی نے کہا تھا، جہاں انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے اور وہ کھتا ہے کہ اس کا جسم اور دماغ اس سے زیادہ مشقت نہیں تحمل سکتا، وہیں سے بڑی اور یادگار کامیابیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ نے کہا تھا سنا؟"

"لیکن یہاں تمہاری جان کو خطرہ ہے عادل۔"

"مجھے ایسی زندگی چاہیے بھی نہیں سر۔" اس نے باغیانہ انداز میں جواب دیا تھا۔

سرد صاحب نے اس کے لب و لہجے کو نوٹ کیا اور پھر اس کے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ صبح سویرے کی باتیں تھیں اور اب دس بج چکے تھے۔ اب وہ تھا اور ٹول راک تھی۔ تین تین کھلاڑیوں کی دو ٹولیاں فاضل مقابلوں کے لیے تیار تھیں۔ عادل پہلی ٹولی میں شامل تھا۔ تینوں کھلاڑی مخصوص جگہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہیلٹ، گلاسز اور دھاتے وغیرہ بھی ان کے لباس کا حصہ تھے۔

فائر ہوا اور اس کے ساتھ ہی تینوں کھلاڑیوں نے کلاہنگ شروع کر دی۔ اگلا قریباً ان گھنٹہ عادل کی زندگی کا سب سے تیز ترین وقت تھا۔ اسے ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ بائیں آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے سینے میں سانس ایک بڑبڑاتی طرح چل رہی تھی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے ہل رہا تھا۔ اگلیوں پر زخم آ رہے تھے مگر وہ اوپر کی

طرف جارہا تھا۔ اور جانا اس کی فطرت میں تھا۔ اس کے خون میں تھا۔ وہ بلند پاؤں ملے کرنے کے لیے پید کیا گیا تھا۔ اور پھر اس نے گڑبھا کیا۔ ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ نہایت اجر حالت میں ہوئے کے باوجود وہ آخروں کیٹھ کے فرقے سے یہ مقابلہ جیت گیا۔

جہرہ کرنے والے کچھ حیران تھے۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ عادل یہ مقابلہ پڑا سانی چھ سات منٹ کے فرقے کے ساتھ جیت جائے گا لیکن یہاں بس چند سیکنڈ کا فرق پڑا تھا۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو عادل کی اجر حالت سے بے خبر تھے۔ عادل واپس آیا تو کروش اور ہامیوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہیں احساس تھا کہ انہوں میں عادل پر کیا گزر رہی ہے۔ جس طرح کوئی پیر ساک ہلیارہ، آواز کی حد کو توڑتا ہے، اسی طرح وہ بھی اپنی برداشت کی حد کو پار کر رہا تھا۔

سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح توقع کی گئی تھی۔ دوسری نیم میں سے لیو پڈ واضح فرق کے ساتھ جیت گیا تھا۔ اس کا ٹائم شاندار رہا تھا۔ رنر اپ کھلاڑی سے قریباً پانچ منٹ کم۔

اور اب آخری مرحلہ تھا۔ وہی جس کے لیے دل و جھوک رہے تھے اور سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ ٹول راک کی قریباً 1600 فٹ خطرناک چڑھائی کے سامنے تھی اور اس ایونٹ کے دو تیز رفتار ترین کلاہنگرز، اسٹارنگ پوائنٹ پر بالکل تیار تھے۔ لیو پڈ نے شعلہ باز نظروں سے عادل کو دیکھا۔ عادل نے اس کی شعلہ باز نظروں کا جواب شعلہ باز نظروں سے ہی دیا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں کہا۔ "اے سفید چوڑی والے جانور۔۔۔ میں تیری ہر زیادتی کا جواب سیکھا پردینے کی کوشش کروں گا۔"

ہوائی فائر ہوا اور دونوں نے چڑھائی شروع کی۔ عادل کے لیے یہ زندگی اور موت کا فیصل بن چکا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مرجائے گا، یا جیت جائے گا۔ چند منٹ پہلے سرد صاحب نے اسے ایک اڑتی ڈرنک قریباً آدھ لیٹر پانی میں ملا کر زبردستی پلایا تھا۔ وہ مشکل سے دوسو فٹ ہی اوپر چڑھے ہوں گے کہ عادل کے منہ سے یہ سارا ڈرنک الٹ دیا۔ اس نے تین بھی خون کی آمیزش تھی۔ عادل نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اب وہ ان چیزوں سے آگے نکل چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بس ٹول راک کی چوٹی پر تھیں۔ جہاں سرخ جھنڈا الہا رہا تھا اور ریفریج کی سفید دریاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے کانوں میں سرد صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انسان جب اپنی برداشت کی



غیبی امداد

تویر ریاض

کہتے ہیں کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات... لیکن ایسا ہونے میں بھی اللہ کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے جو عقلمندوں کے لیے دن بدلنے کا اشارہ ہے۔ ایسا ہی ایک اشارہ ان کی زندگی کو بھی بدل گیا جب اچانک ان کی لائری کھلی اور بیوٹی قدیر کا شمعنا ستارہ عروج پر چمکنے لگا تو ہر آنکھ میں حیرت نمایاں تھی۔

رشتوں کو نہیں پہچاننے والے ایک روایت شکن کا احوال

میرے دادا پال فینک کے سب سے چھوٹے بھائی اگل مارش کی پرانی زور رنگ کی سرکاری کار ہمارے گیٹ کے سامنے آکر رکھی تو میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مجھے وہ بالکل پسند نہیں تھے کیونکہ ان میں بڑرگوں جیسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ اپنے آپ کو ابھی تک جوان ہی سمجھ رہے تھے۔ دادا کی شادی چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی جبکہ اگل مارش خاصی تاخیر سے اس دنیا میں تشریف لائے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور ڈیڑی سے چند

کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب وہ لیوڈ کی یہ لڑکھنوں کی پائے گا۔ لیوڈ بڑھری تھی، ہمیں فٹ سے زائد ہو چکی تھی۔ عادل نے آخری بار زور مارا۔ شیراوی اور کرشن کے سر جھائے ہوئے چہرے لگا ہوں میں بسا کر اس نے دماغ وار اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی۔ اب چرنی کی طرف دوڑ جانی فاصلے سے ہو چکا تھا۔ بس چند سو لمحوں کی بات اور تھی۔ تین چار منٹ اور گزر گئے۔ عادل لیوڈ کو کرنے میں تقریباً کام رہا۔ لیکن ایک دیوانی کوشش کے طور پر ہاتھ پاؤں ضرور چلاتا رہا۔ اور پھر مجھڑ ہوا۔ مجھڑے ایسے ہی وقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ جب عقل اور مصلحت کے پرچے اڑا دیے جاتے ہیں، عیشوں سے بھر توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پاؤں میں دیے جلائے کا تہیہ کیا جاتا ہے۔ کشتیاں جلا کر بے دریغ اپنی سر زمینوں پر قدم رکھ دیے جاتے ہیں۔ اور یہاں بھی ایک کرشمہ رونما ہوا۔ عادل کی دماغ وار جدوجہد دیکھ کر لیوڈ نے جو اضطراب پیدا ہوا تھا، اس نے اس کا "ٹیمو" شراب کر دیا۔ ایک دراز میں پاؤں جھانے کے بعد جب اس نے ایک اینٹرپرائس کو قاتلنا چاہا تو دراز میں سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ ایک دھچکے کے ساتھ نیچے آیا اور پھسلتا ہوا عادل سے تقریباً چند فٹ نیچے چلا گیا۔ اس کے "ہارٹس" میں جھٹکتی رستا موجو تھا۔ اس "بیک اپ" نے اسے مزید نیچے جانے سے بچا یا اور وہ مضبوطیوں کے ساتھ ہوا میں پھول گیا۔ شدید جھلاہٹ میں اس کے منہ سے بے ساختہ لگی گالیوں کی بوچھاڑ نکل گئی۔ ان میں سے زیادہ تر گالیاں یقیناً عادل کے لیے ہی تھیں۔

یہ سنہری موقع قدرت نے عادل کو دیا تھا اور یہ اس کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو نول راک کی تاریخ کا کام ترین شخص کہلاتا۔ اس نے اپنی رسی کی قوت جمع کی اور باقی ماندہ سوڈیز سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے سر دھو کی بازی لگادی۔ لیوڈ کی تیزی سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ عادل کی برتری بتدریج کم ہو رہی تھی۔ آٹھ فٹ۔ سات فٹ۔ پانچ فٹ۔ تین فٹ۔ عادل نے آخری زور مارا۔ اتنا قریب پہنچ کر وہ ہارٹس چاہتا تھا۔ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

زندگی کے دشوار گزار دستوں پر لمحہ بہ لمحہ طوفان و باد و باران سے فیر ڈاڑھا اس داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ...

عد پار کرتا ہے تو پھر اسے ناقابل یقین کامیابیاں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے کیا کیا تھا۔ شاید یہ کیا تھا کہ جس پرواشت کی عد پار کی جاتی ہے تو ہمیں ساتس کے مطابق بھی دماغ کام کرتا چھوڑ جاتا ہے اور بے ہوش طاری ہو جاتی ہے (جسم اور دماغ کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے) تو کیا اس پر بھی بے ہوش طاری ہو رہی تھی؟ اس عمووی دماغ پر چڑھتے ہوئے بے ہوش ہو جانے کا مطلب کیا تھا؟ سیدھی۔ سیدھی موت۔ لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اب رکے کا وقت گزر چکا تھا۔ اب اوپر چڑھنے کا وقت تھا یا سیکڑوں فٹ گہرائی میں گرنے کا وقت تھا۔

لیوڈ شروٹس میں ہی اس سے چار پانچ فٹ آگے نکل گیا تھا اور اب وہ یہ برتری برقرار رکھے ہوئے تھا۔ بلکہ دھیرے دھیرے اس میں اضافہ کر رہا تھا۔ سر صاحب کے قہر سے ایک جادوئی اثر کے ساتھ عادل کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ہاتس چھوٹے چھوٹے ٹپس۔ انہوں نے کہا تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں سے ایک کپ پانی تو ہر کوئی نکال سکتا ہے لیکن ایک گلاس میں سے دیر گلاس پانی نکالنے کو ہمت کا کرشمہ کہتے ہیں۔ اور وہ بھی کر رہا تھا۔ گلاس پانی میں سے دیر گلاس نکالنے کی کوشش میں معروف تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ ایسا کر لے گا۔

لیکن حقیقتیں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ اس کا اور لیوڈ کا فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اب فاصلہ چند فٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا لیکن کیا وہ ہمت چھوڑ دے؟ رک جائے؟ یا پھر آگے بڑھے؟ دوسری تے گہرائی میں چھلانگ لگا دے؟ اور پھر اسے دوسری تے آئی۔ صرف پانی نکل رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں سے جان جاتی محسوس ہوئی۔ اس کی ماں۔ خود بخود رو کر اسے کھانا دیتی تھی اور بھی وہ دونوں ہی بھوکے رہتے تھے۔ اس فاقہ کشی نے عادل کے جسم میں اضافی برداشت پیدا کر دی تھی۔ سر صاحب کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ اپنے کئی کچھ میں انہوں نے کہا تھا۔ "آخری ساتس اور آخری گولی تک لانے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بدترین حالات میں کوشش جاری رکھنا۔"

لیوڈ سے اس کا فرق اب مزید بڑھ گیا تھا۔ نیچے سات آٹھ سو فٹ کی گہرائی میں قماشائیوں کا جوش دیدنی تھا۔ یقیناً وہ لیوڈ کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ عادل

برس ہی بڑے ہوں گے۔ اس لحاظ سے ان کا اپنے آپ کو جوان سمجھنا کسی حد تک جائز تھا۔ البتہ مزاجاً وہ بہت اکھڑ، مزہبست اور سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ خاص طور پر بچوں کے ساتھ ان کا رویہ بہت ہی توہین آمیز ہوا کرتا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ بھی ہمارے گھر نہ آئیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ دادا کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بھائی تھے اور انہیں یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اور دادا باہر لان میں درخت کے نیچے رکھی لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اگل اپنی گاڑی سے برآمد ہوئے۔ ان کا بیٹ بیٹے میں بھیگ چکا تھا لیکن وہ سمجھے ہوئے کی وجہ سے اسے اتار نہیں سکتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے ہوتوں میں اپنے ہاتھ سے بنا ہوا سگریٹ دبا ہوا تھا۔ انہیں سگریٹ بنانے والی کمپنیں پر اعتبار نہیں تھا۔

”کیا مارش آیا ہے؟“ دادا نے گاڑی کا انجن بند ہونے کی آواز سنی۔ موسیٰ کی وجہ سے ان کی بیٹائی شدید متاثر ہوئی تھی اور انہیں قریب کی چیزیں بھی مشکل سے ہی نظر آتی تھیں۔

”جی۔ اگل مارش آئے ہیں۔“ میں نے انہیں مطلع کیا۔ آنکھوں میں موتیا آجانے کے بعد وہ مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگے تھے اور میں سوچتا تھا کہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ ڈیڑی سے ملنے کی ہوجانے کے بعد میں اور مادا کے پاس ملے آئے۔ دادا کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اور مادا کو بھی رہنے کے لیے ٹھکانا چاہیے تھا۔ انہوں نے ایک اسٹور میں ملازمت کر لی۔ دادا کو تھوڑی بہت چٹن ملتی تھی۔ اس طرح ہم لوگوں کا گزارہ ہونے لگا تھا۔ ڈیڑی اپنی دنیا میں گمن تھے۔ انہوں نے بھی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لی تھی۔ البتہ سال چھ مہینے میں ایک مرتبہ فون کر کے دادا کی خبریت معلوم کر لیتے تھے۔

طویل قامت اگل مارش کا رہے باہر آئے تو ان کا رنگ آلودہ پتول کوٹ کی جیب سے گر پڑا۔ اگل نے اسے جلدی سے اٹھایا اور آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھنے لگے۔ وہ ہر کام اطمینان سے کرنے کے عادی تھے۔ جب وہ قریب آئے تو دادا نے ان کے قدموں کی چاپ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”ہرمن مارش کے بیٹے کے لیے کرسی خالی کر دو۔“

میراثام کیوں رکھا گیا، اس کی بھی ایک وجہ ہے۔

اور ڈیڑی کی پہلی ملاقات ہرمن کے مقام پر ہوئی تھی۔ میرا کی گاڑی کا ٹائر میچر ہو گیا تھا اور ڈیڑی ان کی خدمت کے لیے وہاں رک گئے تھے۔ اس یادگار ملاقات کے بعد انہوں نے شادی کر لی اور میراثام اس کی مناسبت سے ہرمن رکھا گیا۔

”یہ پتول کیسا ہے؟“ میں نے اگل سے پوچھا۔ دادا اور اگل مارش میں بڑی مشابہت تھی لیکن اگل کا رویہ دادا کی طرح دوستانہ نہیں تھا۔ اس لیے مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی جب انہوں نے میرے سوال کو کھٹکا۔ نظر انداز کر دیا۔ وہ بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ لمبی بال والا پتول ابھی تک ان کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

”میں سارہ جم کوٹ کر دوں گا۔“ اگل پر ہوش بے میں بولے۔ ”ورنہ میری بقیہ زندگی عذاب میں گزرے گی۔“

میں جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں، وہی کریں گے۔ انہوں نے بھی کوئی بات مذاق میں نہیں کہی تھی۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ مذاق کیا ہوتا ہے۔ کسی دوست یا رشتے دار نے انہیں بتائے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

دادا آگے کی طرف جھکے اور اگل مارش کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”بہتر ہوگا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔“

”نہیں، سارہ جم کوٹنا ہوگا اور اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ اگل نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس جھگڑے سے تنگ آچکے تھیں۔

”تمہارے دماغ میں یہ خیال کیسے آیا؟“ دادا نے پوچھا۔

اگل مارش نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”اس لڑکے کو سننے کی ضرورت نہیں، یہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا۔“ میراثام کھول اٹھا۔ وہ جس تحقیر آمیز انداز میں میرا ذکر کر رہے تھے۔ ”میں بارہ سال کا ہو چکا ہوں۔“ میرے لہجے میں بالکلا احتجاج تھا۔ ”براہ کرم مجھے لڑکا کہنے کے بجائے نام سے پکاریں۔ مجھے ہرمن کہتے ہیں۔“ میں اس طرح کے جملے سن کر تنگ آچکا تھا۔ یہ لوگ ابھی تک مجھے بچہ ہی سمجھ رہے تھے۔

اگل مارش نے مجھے گھورا اور دادا سے باتیں کرنے لگے۔ دراصل ان کی جوان بیوی سارہ جم انہیں چھوڑ کر گئی اور انھیں کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اب وہ اسے تلاش کر کے

کرن چاہ رہے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ اگر وہ شخص بھی مل جائے تو دونوں کا ایک ساتھ ہی کام تمام کر دیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا وہ ہر کام دیر سے کرنے کے عادی تھے چنانچہ شادی کرنے میں بھی انہوں نے کافی دیر لگائی۔ اس وقت تک وہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی محنت کی اور خوب چسپا کیا۔ ان کے تین لڑک چل رہے تھے اور وہ ایک چھوٹے سے اسٹور کے مالک بھی تھے۔ اس کے علاوہ دریا کنارے شہد کی مکھیاں بھی پال رہی تھیں۔ غرض وہ ہر طرح سے پیسے بنارہے تھے۔

موسیٰ کو مطمئن نہیں تھا کہ اگل اور سارہ جم کی ملاقات کیے ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی کو اس بارے میں بتایا لیکن ایک سال پہلے انہوں نے شادی کر لی۔ یہ پہلی بار ہم لوگوں نے سارہ جم کو دیکھا۔ اس نے اپنی اگلی میں بڑی سی ڈائننگ روم کین رکھی تھی اور وہ ہر ایک سے گھرا کر مل رہی تھی۔

شادی کے فوراً بعد اگل مارش نے اس کے لیے ایک نئی سرخ رنگ کی کار خریدی۔ گھر میں نیا فرنیچر ڈالوایا اور اسٹور چلانے کی ذمہ داری سارہ کو سونپ دی۔ اگل سے ملنے سے پہلے وہ ایک کاشنل میں کام کر رہی تھی اور رات بسر کرنے کے لیے اس نے فریئر پارک میں ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ اگل سے شادی کرنے کے بعد وہ بہت خوش نظر آنے لگی تھی۔ اس کا ایک جوان بیٹا نوی میں تھا لیکن اس کے باوجود وہ اگل کے مقابلے میں بہت کم عمر نظر آتی تھی۔

وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی زندہ دل اور جس کلمہ واقع ہوئی تھی اور دوستوں میں بیٹھ کر خوب تھپتھپ لگتی اور فنی مذاق کرتی جبکہ اگل زیادہ دت۔ وقت سوچ میں غرق رہتے اور ان سے باتیں کرنا دواوار سے سرنگھانے کے برابر تھا۔ اس لیے سارہ ان سے کہیں باہر چلنے کے لیے نہیں لگتی بلکہ خود ہی اپنی نئی کار میں بیٹھ کر گھومنے چلی جاتی۔ پھر نہ جانے کب اس کی ملاقات ایک نابالغ سے ہوئی جو اسٹور پر ڈیل روٹی سپلائی کیا کرتا تھا پھر ایک دن سارہ اگل کی دلی ہوئی تھی کہ اس میں بیٹھ کر اس نابالغ کے ساتھ کہیں ملے گی جس کی ایک بیوی اور تین معصوم بچیاں بھی تھیں۔

اگل مارش لوہے کی کرسی پر بیٹھے تھا میں محسوس کر رہے تھے اور بار بار اپنے پرانے پتول کو دیکھنے لگتے۔ میں نے ایک بار مگر ان سے پوچھا۔ ”آپ اس پرانی ناکارہی چیز

کو گن کہتے ہیں؟“

اگل نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”ہاں، یہ گن ہی ہے اور میں اسی سے سارہ کو ہلاک کروں گا۔“ وہ اسٹور اینڈ کون کا اعشاریہ تین صفر کا پرانے ماڈل کار بوا لور تھا۔ دادا نے ایک نظر اس پر ڈال کر گہرا سانس لیا۔ ”اب کہنی یہ ماڈل نہیں بناتی۔ اس میں چھوٹی گولیاں استعمال ہوئی ہیں اور اعشاریہ تین آٹھ کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹا ہے۔ میرے کام کے لیے یہی کافی ہے۔“ اگل مطمئن انداز میں بولے۔

”مارش انہیں پراسکون ہونے کی ضرورت ہے۔“ دادا نے کہا۔

”مجھے ابھی اسی وقت سکون ملے گا جب سارہ جم چھ فٹ گہری قبر میں دفن ہو جائے گی۔“ اگل بولے۔

☆☆☆☆

ماما جب اپنے کام سے واپس آئیں تو اس وقت میں اپنے بستر میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ دادا کا گھر اتنا بڑا تھا کہ میں دادا اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکتا۔ وہ اگل مارش کے بارے میں ہی باتیں کر رہے تھے جو اس دات ہمارے گھر رک گئے تھے اور ہال کے آخری سرے پر واقع تھیں کمرے میں سو رہے تھے۔ اما نے کہا کہ وہ سارہ کو پہلی بار دیکھتے ہی سمجھ گئی تھیں کہ یہ عورت آگے چل کر مسئلہ پیدا کرے گی۔ وہ اس عمر میں بھی مردوں کو بے وقوف بنانے سے باز نہیں آئی اور ابھی تک نوجوان لڑکیوں جیسی گھبراہٹ کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہت کم عمری میں ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔

دادا نے کہا کہ انہیں بھی وہ پہلی نظر میں اچھی نہیں لگی تھی جبکہ موتیا کی وجہ سے وہ کسی کو بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے البتہ انہوں نے اس سے اتفاق کیا کہ سارہ نے پر نعیم کا بے دریغی استعمال کیا تھا۔ وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولے۔ ”میں اب بھی اس کی خوشبو محسوس کر سکتا ہوں۔“

”کاش میں بھی سارہ جیسی ہوتی۔“ ماما نے اپنے دل میں چھیپی ہوئی خواہش کا اظہار کیا۔ ”مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں بس سارہ جم جیسے ایک دو لباس لینا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد میں فیصلہ ہی ملازمت چھوڑ دوں گی۔“

”جو کام بھی ایمان داری سے کیا جائے وہ اچھا ہوتا ہے۔“ دادا انا سنا نہ انداز میں بولے۔

”آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے۔“ ممانے تشریح کر جواب دیا۔
”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ دادا نے پوچھا۔
”کچھ نہیں۔“

وہ دادا سے اس طرح بحث کرنا نہیں چاہتی تھیں جیسے کبھی ڈی بی سے کیا کرتی تھیں۔ ڈی بی سے تو ان کی معمولی باتوں پر جھڑپ ہو جاتی تھی جو بعض اوقات بڑے بڑے لڑائی کی شکل اختیار کر لیتی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

انگل دوسرے روز صبح سویرے ہی واپس چلے گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے ناشائستگی کیا تھا یا نہیں۔ جب وہ ایک صفحہ بعد وہ بارہ آئے تو ان کی پرانی مرکزی کار کے پیچھے ایک ٹریلر بندھا ہوا تھا اور اس میں بیٹھو سے لے کر بال تک ان کی تمام ذاتی اشیاء موجود تھیں۔ وہ بیٹھو نہیں بیٹھتے تھے اور نہ ہی انہیں باؤلنگ سے کوئی دلچسپی تھی۔ البتہ انہیں مختلف قسم کی چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا اور وہ انہیں چاہتے تھے کہ کوئی بھی ان چیزوں کو ہاتھ لگائے یا انہیں نقصان پہنچائے۔

انہوں نے ٹریلر میں رکھے سامان کے ڈھیر میں سے ایک سوٹ کیس باہر نکالا اور اس کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولے۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تم میری کسی چیز کو چھو۔ ان میں سے کچھ بھی تمہارے مطلب کی چیز نہیں۔“
”یہ کیس نے کہا کہ میں ان چیزوں کو ہاتھ لگا سکتا ہوں؟“ میں نے جمل کر کہا۔

انگل نے ہوتوں میں دبا ہوا سگریٹ اٹھی میں دبا دیا اور بولے۔ ”زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں لڑکے!“
”ہرمین۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نام ہرمین ہے۔“
کھانے کی میز پر انگل نے دادا کو بتایا کہ انہوں نے اپنا گھر اور فرنیچر فروخت کر دیا ہے۔ اب وہ اپنے ٹرک اور اسٹور بھی بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ دادا حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ”کیا تمہیں رہنے کے لیے جگہ نہیں چاہیے؟“

انگل نے کہا کہ سارہ کو قتل کر دینے کے بعد انہیں رہائش کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد انہیں جیل بھیج دیا جائے گا اور سزا ہونے کی صورت میں وہ بجلی کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے جہان چلے جائیں گے۔

جب تک وہ یہ کام نہیں کر لیتے، اسی گھر کے چھوٹے کمرے میں سوتے رہیں گے۔
انگل نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی شہد کی کمیوں کو دیکھنے دریا پر گئے تھے۔ قدامت شہد کی کھیاں مریجی تھیں۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ ان کی زندگی بھی ختم ہونے کو ہے۔
دادا بولے۔ ”اس وقت موت بنو۔ یہ شخص اتفاق ہے کہ تمہاری شہد کی کھیاں مریجی۔“
انگل نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش بیٹھے رہے۔

☆☆☆

اگلے روز انگل پھر چلے گئے اور کئی روز بعد ان کی واپسی ہوئی۔ وہ اسی درخت کے نیچے لوہے کی کرسی پر بیٹھ گئے اور جب سے سگریٹ نکال کر پینے لگے۔ کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بولے پھر کچھ دیر بعد حواس بحال ہوئے تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جارجیا کے شہر کوکس میں رہنے والے ایک پرائیویٹ سرائخ رساں گرگوری کی خدمات حاصل کر لی ہیں جو سارہ جیم اور اس ناہائی کو تلاش کرے گا۔

”جیسے ہی گرگوری نے انہیں تلاش کر کے بتایا کہ وہ کہاں ہیں تو میں دونوں کو قتل کر دوں گا۔“ انگل نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”پہلے میں اس ناہائی کو کوئی ماروں گا تاکہ سارہ اسے مرنا ہوا دیکھ سکے اور اسے معلوم ہو جائے کہ۔۔۔“
”جانی جانی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ پھر میں سارہ کی بھی دونوں آنکھوں کے درمیان کاٹنا لوں گا۔“

دادا نے موضوع بدلتے کی کوشش کی اور بولے۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ کوکس میں کوئی پرائیویٹ سرائخ رساں ہے یا نہیں۔“

انگل نے کہا۔ ”کوکس کوئی چھوٹی موٹی جگہ نہیں۔ وہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔ بشرطیکہ آپ پیسے خرچ کر سکیں اور یہ معلوم ہوتا چاہیے کہ کون کہاں لگے گا۔“ انگل نے بتایا کہ کوکس پہلے تو چین کا قصبہ تھا اور ان کی اولادیں ہر طرح کے کام کرتی ہیں۔ انگل نے انکشاف کیا کہ انہوں نے اپنی ہر چیز کو تمام رقم بینک میں رکھ دی ہے تاکہ وہ محفوظ رہے اور اس میں سے وہ سرائخ رساں اور وکیل کی فیس ادا کر سکیں۔ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کے بعد بھی کچھ پیسے بچ گئے تو وہ دادا کے حصے میں آئیں گے۔ وہ اس رقم سے موتی کا آپریشن

کر سکتے ہیں تاکہ وہ بارہ دیکھنے کے قابل ہو سکیں۔
”اگر انہوں نے مجھے بجلی کی کرسی پر نہ بٹھایا تب بھی جیل میں مجھے زیادہ قیدیوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔“
میں نے زوردار تہدید لگا دیا اور بولا۔ ”اب وہ بجلی کی کرسی پر نہیں بٹھائے بلکہ بازو میں زہر کا انجکشن لگاتے ہیں تاکہ تم آہستہ آہستہ موت کی آغوش میں چلے جاؤ۔“

انگل اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس طرح اچھلے پیچھے جھٹکے مار دیں گے۔ میں تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹا اور انگل نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے گرنے سے بچایا۔
”آئندہ میں اس طرح کی باتیں سننا نہیں چاہتا۔“
دادا بولے۔ ”بعض اوقات لگتا ہے کہ تم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو۔“

”میں واقعی اپنے ہوش و حواس میں رہتا اگر سارہ مجھے برا کر کے نہ جاتی۔ میں نے اسے وہ سب کچھ دیا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ جس چیز کی طرف اشارہ کرتی، وہ اس کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیتا اور دیکھو اس نے مجھے کیا صلہ دیا۔“

”اس کے جانے کے بعد تمہیں اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتا چاہیے؟“ دادا بولے۔ ”کیا تم نے بھی اس بارے میں سوچا؟“

”میں اسے چھ گولیوں مارنے کے بعد اپنے آپ کو بہتر محسوس کر سکوں گا۔“ انگل بولے۔

دادا اپنی کرسی سے اٹھے اور اس جانب بڑھے جہاں انگل بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ انگل کے کندھے پر رکھا اور بولے۔ ”مارش! میں تمہیں بھی سارہ کو کوئی نہیں مارنے دوں گا۔“
”تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟“
”کوئی نہ کوئی طریقہ سوچنا پڑے گا۔“ دادا عجیب سے لہجے میں بولے۔

”طریقہ۔ کیا طریقہ؟“ انگل سوچ میں پڑ گئے۔ دادا کہا کرتے تھے کہ انگل کی سمجھ میں بات دیر سے آتی ہے۔

☆☆☆

میرا اسکول شروع ہو چکا تھا اور نومبر کے شروع ہونے تک بھی انگل اسی چھوٹے کمرے میں سوتے رہے۔ میں اکثر انہیں کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا کرتا۔ وہ بستر پر بیٹھے اپنے ہاتھ سے سگریٹ بنا کر پیتے

آپ بھی پوچھئے!

سوال: دن میں تارے کب نظر آتے ہیں؟

جواب: جب کسی کا ہاتھ کھوپڑی کھار کر رکھ دے۔

سوال: گھر میں آنے والے مہمانوں پر زیادہ پیار آتا ہے یا گھر سے واپس جانے والوں پر؟

جواب: یہ تو مہمانوں پر منحصر ہے کہ وہ جمالی ہیں یا جلالی!

سوال: لڑکیوں کے لیے کونسا شعبہ ملازمت بہتر ہوتا ہے؟

جواب: بیچنگ۔ کیونکہ شادی کے بعد بھی وہ کسی کھلاتی ہیں۔

سوال: محبت قربانی یا جتنی ہے اور شادی؟

جواب: آبادی مانتی ہے۔

لا جواب

ایک نوجوان نے بزرگ سے پوچھا۔

”جب دنیا قاتی ہے تو پھر لوگ اس کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں؟“

”قانی چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے دوستوں کو دشمن کیوں سمجھتے ہیں؟“

”جسے دنیا میں رہ جائے گا تو پھر لوگ اس کے پیچھے ایمان لے کر رہے ایمان اور ملک بچ کر تھرا کیوں کھلاتے ہیں؟“

بزرگ نے مسکراتے ہوئے زمین سے کانٹا اٹھایا اور نوجوان کے تینوں سوالوں کا جواب ایک خوب صورت جملے میں دیا۔

انہوں نے کانٹا اٹھایا اور منہ کے قریب لاکے دانتوں میں پھنسی ہوئی چھالی لٹائی اور کہا۔

”چاہیے اپنا کام کر۔“

مرسلہ: قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

اور غلام میں گھومتے رہے۔ اگر کوئی کمرے کے سامنے سے گزرتا تب بھی انہیں خبر نہ ہوتی۔ کبھی کبھی جب انہیں رات میں نیند نہیں آتی تو وہ باہر نکل کر اپنی پرانی سرکاری کار میں چڑھ کر بیٹھ جاتے۔ جب میں صبح کو اسکول جانے کے لیے اٹھتا تو وہ اپنی کار کی سیٹ پر آنکھوں پر بیٹھ رکھے سو رہے ہوتے۔

جب کبھی دادا نے ان سے کہا کہ اس طرح ساری رات رہیں تو سننے کی صورت میں کار کی بیٹری ڈاؤن ہو سکتی ہے تو انہیں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ بیٹری اتنی زیادہ چلتی نہیں ہے۔ انہیں نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص انہیں کچھ کہے۔

شروع شروع میں انہیں چند روز بعد سراغ رساں سے ملنے کو کہیں جاتے یا وہ انہیں فون کر لیا کرتا۔ اس کی آواز بڑی کرخت تھی۔ وہ ہمیشہ گنگو کا آواز اس طرح کرتا۔ ”میں سراغ رساں گرگوری بول رہا ہوں۔ مجھے ایک اہم معاملے پر مسٹر مارش سے بات کرنی ہے۔“ وہ اس طرح بولتا جیسے کوئی بڑی چیز ہو۔ اس کے بعد گرگوری نے باقاعدگی سے ہمارے گھر آنا شروع کر دیا۔ وہ انہیں کو سارہ کی تلاش میں ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کرتا اور فیس کے نام پر ابھی خاصی رقم بنور کر چلا جاتا۔

میں نے ٹیلی ویژن پر جس طرح کے سراغ رساں دیکھے تھے، اس کا علیہ ان سے مختلف تھا۔ وہ چھوٹے قد کا مچھا اور موٹا شخص تھا جو ہمیشہ سر پر بیٹھ پہنے رہتا۔ اسے آدمی آسمیوں والی پھول دار قمیض پہننے کا شوق تھا۔ اس کے بازو شیڈز سے بھرے ہوتے تھے۔ جب وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا تو دادا نے اس کے بازو دیکھے اور بولے کہ کیا اس نے ان پر رنگ چڑھا رکھا ہے۔

سراغ رساں گرگوری کو معلوم نہیں تھا کہ دادا کو موتیا کی وجہ سے صاف نظر نہیں آتا۔ وہ فیس سے بولا۔ ”نہیں۔“ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ دادا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

سراغ رساں گرگوری اور انہیں اکثر باہر چلے جاتے اور دیر تک گرگوری کی جی کار میں بیٹھ باتیں کرتے رہتے۔ میں دیکھتا کہ گرگوری بار بار اپنا سر ہلا کر انہیں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوتا اور انہیں کبھی بھی مجھے میں آکر اپنے ہاتھ چلانے لگتے۔ ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب ہمارے چچا نہ بڑے ہونے والا ہے اور وہ جلد از جلد

سارہ کا چپا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

ایک دن مانا نے کام سے چھٹی کی اور خصوصی ڈنر کی تیاری کرنے لگیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں دادا کو ہتھکڑیاں تھام کر وہ اس ڈنر کا اہتمام اس لیے کر رہی تھیں کہ اس طرح گھر کے سب افراد مل جیت کر کھانا کھا سکیں۔

دادا کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری دادا کی کے انتقال کے بعد یہ پہلا ڈنر ہے جس میں ہم سب شریک ہو رہے ہیں اور یہ کہ ان سے انتظار نہیں ہو رہا ہے۔ کھانا تیار ہو گیا تو ہم سب میز کے گرد بیٹھ گئے اور کھانا لگے لگیں۔ اچانک ہی دروازے پر دروازہ دھک ہوئی۔ یہ سراغ رساں گرگوری تھا جو انہیں سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ دادا نے اس سے کہا کہ وہ بھی دروازے سے کچن کی طرف آجائے۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور گرگوری نے پڑے کی جیکٹ پہن کر بھی گئی جس کی وجہ سے اس کے شیڈز بھرے بازو چھپ گئے تھے۔ وہ کچن کے دروازے میں آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اسے انہیں سے تنہائی میں بات کرنی ہے۔ اس سے پہلے کہ انہیں اپنی جگہ سے اٹھتے، اس موٹے جاسوس نے اپنے سینے سے کیلبر اور بولا۔ ”آہ۔۔۔ بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔“

ممانے اسے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ اس کے پاس بالکل بھی فرصت نہیں ہے اور وہ انہیں کے کہیں پر بہت زیادہ محنت کر رہا ہے لیکن ممانے کہنے پر وہ ڈنر میں شریک ہو گیا۔ اس نے میز پر دھکی ہوئی چیزوں پر یوں ہاتھ صاف کیا جیسے میزوں سے کچھ نہ کھایا ہو۔ وہ کھانے کے دوران ہر چیز کی تعریف کرتا جا رہا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسا کہ وہ دیکھ کر مجھے ڈر لگا کہ کہیں اس کا پیٹ ہی نہ پھٹ جائے۔ جب اس کے مساموں اور گھبے سر سے پینا پینے لگا تو اس نے زوردار ڈکاری اور پیٹھے آؤؤں کی پلٹ اپنی طرف کیجئے لگا۔ کافی ختم کرنے کے بعد اس نے ممانے کی طرف سرخٹھی نظروں سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ان میں دھکی لے رہا ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ اس سے پہلے وہ جتنی بار ہمارے گھر آیا تو ممانے کام پر ہوتی تھیں۔ اس دن اس نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا۔ ممانے تیس سال کی ہو جانے کے بعد اب بھی بہت خوب صورت تھیں۔ وہ اگر چاہیں تو کوئی لوگوں سے دوستی کر سکتی تھیں لیکن ڈیڈی کے ساتھ وہ کر انہیں جو خلع تجربہ ہوا تھا، اس کے بعد وہ

مردوں سے نفرت کرنے لگی تھیں۔

سراغ رساں گرگوری کھانے کے بعد بھی ممانے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بیوی اب بھی باقی ہے۔ ممانے نے انہیں نظر کا مفہوم اچھی طرح بتا دیا تھا۔ لہذا انہوں نے اپنے کوزہ یا وہ لفٹ نہیں کرائی۔ کبھی اس نے ممانے کو چھوا کہ کیا ان کے شوہر نے کھانا کھا لیا ہے؟ شاید اس طرح وہ ممانے کی ازدواجی حیثیت کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ جب ممانے بتایا کہ ان کا کوئی شوہر نہیں ہے اور نہ ہی وہ دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں تو اس کا بڑا سا گول چہرہ یوں روشن ہو گیا جیسے کسی ٹرک کی بریک لائٹس مل جاتی ہیں۔

یہ جاننے کے بعد کہ ممانے کی شادی ختم ہو چکی ہے، وہ ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ممانے کا اصل نام یونی ہے لیکن سب انہیں قلوبی کے نام سے پکارتے ہیں تو وہ بھی ہر شے میں قلوبی استعمال کرنے لگا۔ مثلاً قلوبی۔۔۔ یہ ہوا اور قلوبی ایسا ہوا۔

رات مجھے رخصت ہوتے وقت اس نے انہیں کو بتایا کہ وہ سارہ جم کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے اور اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے اسے مزید خیروں کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ممانے کے ساتھ آنے والے نیچر کی رات ڈیٹ بھی ملے کرنی۔

ممانے بعد میں بتایا کہ اگلے دو دن گرگوری نے ان کے اسٹور کے گرد چکر لگاتے گزارے اور ان کے اصرار پر سوار رہا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ سارہ جہم اور اس کا بانی دوست اٹھاتا اس اسٹور کی طرف آجائیں لیکن۔۔۔ درحقیقت وہ ممانے قریب کر رہا تھا۔ لیٹے کی شام آنے تک ممانے سے بری طرح بیزار ہو چکی تھیں لیکن انہیں بھی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ کام سے واپس آتے ہی ہاتھ روم میں ممانے گئیں تاکہ گرگوری کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے تیار ہو سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس سے وعدہ کر چکی ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنا وعدہ نبھانے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ وہ یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ ان سے ایک بڑی ٹکلی مرزد ہو چکی ہے۔

ممانے ہاتھ روم سے باہر بھی نہیں آئی تھیں کہ گرگوری انہیں لینے آگیا۔ اس نے سرخ رنگ کا فنی کا ڈیڑا لے کر سٹ پکڑ کر رکھا تھا اور کسی غبارے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جب اس نے اپنا سفید کا ڈیڑا بٹے بیٹ اٹھاتا تو اس کا گھبراہٹ لائٹ کی روشنی میں چمکنے لگا۔

وہ ممانے کے انتظار میں ہمارے ساتھ ہی کچن ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میرے علاوہ دادا اور انہیں بھی وہاں موجود تھے اور اس کی پیچھوڑی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیسے ہی ممانے تیار ہو کر وہاں آئیں، وہ انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ پر اچھلا اور چلائے ہوئے بولا۔ ”ہائے، میری گزلیا۔ مجھے امید ہے کہ تم نے قلم کرنے کے لیے جوئے ضرور پیئے ہوں گے۔“ اس کے بعد وہ خود بھی کچن کے فرش پر بے تکلف طریقے سے ڈالنے لگا۔

☆☆☆☆

میں اس وقت سوچا تھا جب گرگوری ممانے کو چھوڑنے نصف شب کے قریب واپس آیا۔ وہ دونوں کچن میں کھڑے کسی بات پر بحث کر رہے تھے جس سے میری آنکھ کھل گئی اور اب میں ان کی باتیں سن سکتا تھا۔ وہ دونوں اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ جب ممانے کو طعنے آتا تو وہ اسی طرح چٹخا شروع کر دیتی تھیں۔ میں بستر سے اٹھ گیا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ دادا نے پوری کی لائٹ آن کر دی تھی جس کی زبردستی میں ممانے کو جو ان لڑکی کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

ممانے اپنی اچھی گرگوری کے چہرے کے سامنے لہرائی اور بولیں۔ ”تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم شادی شدہ ہو؟“

گرگوری نے کہا۔ ”اوہ قلوبی! یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہر شخص شادی کرتا ہے۔“ اس کے الفاظ سپاٹ اور لہجہ بوجھل تھا جیسا کہ عام طور پر شراب کے نشے میں ہوتا ہے۔

جب گرگوری نے ممانے کا پورے لینے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے دور دھکیل دیا اور اسے ان خطا بات و القابات سے نوازنے لگیں جو کبھی ڈیڈی کے لیے مخصوص تھے۔ گرگوری نے ڈھٹ بننے ہوئے کہا کہ اسے یہ زبان سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ سارہ جم پہلے ہی اسے ممانے کے بارے میں بتا چکی تھی۔

یہ سننے ہی ممانے کو جھک پڑیں اور بولیں۔ ”کیا کیا تم نے؟“

سراغ رساں گرگوری بری طرح ہولکھا گیا اور اس سے فوری طور پر کوئی جواب بن نہ پڑا۔ پہلے تو اس نے کہا کہ اس کی سارہ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی پھر اس نے قہقہہ لگایا اور تالیاں بجانے لگا۔ وہ کار کے پیچھے جھک کر

کرتے ہوئے پڑی۔ ”میں کچھ عرصے کے لیے اس سے علیحدہ ہوئی تھی لیکن ہمارے درمیان طلاق نہیں ہوئی تھی۔ میں اب بھی قانونی طور پر اس کی بیوی ہوں۔ البتہ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔“

”اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم اور وہ تانہائی کیا سوچ رہے تھے۔“ ”ممانے ایک اور تیر چلایا۔“ ”میں تاکہ اگل کی تمام دولت اور جائیداد پر کسی طرح قبضہ کیا جائے۔ اب تو مجھیں خوش ہونا چاہیے کہ سب کچھ کسی کوشش کے بغیر ہی مل رہا ہے۔“

☆☆☆

مقدمے کی سماعت کے دوران ہمیں بھی عدالت جانا پڑا۔ انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں پوچھا لیکن میں نے مقدمے کی ساری کارروائی دیکھی۔ البتہ ماما اور دادا بال جیکب کو گواہوں کے طور پر بلایا گیا۔ ممانے بتایا کہ وہ گرگوری کے ساتھ کنٹری میوزک کلب میں تھے جہاں اس نے اتنی زیادہ شراب پی لی کہ اس کے لیے پلٹنا مشکل ہو گیا۔ اس کی کار بھی وہ چلا کر لائی تھی۔ اس نے یہ بات بھی نہیں بتائی کہ پولیس میں اس کی بیوی بھی رہتی ہے۔

دادا نے اپنے بیان میں کہا کہ اگل مارش نے ایک سے زائد مرتبہ سارہ جیمز کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ اس تانہائی کو بھی قتل کرنا چاہ رہے تھے جس کے ساتھ سارہ جیمز فرار ہوئی تھی۔ انہوں نے اگل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے۔ مجبوراً انہوں نے اگل کے پستول کو تارہ بنادیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اگل، سارہ اور اس تانہائی کو قتل کریں۔ اس وقت یہ فیصلہ صحیح معلوم ہو رہا تھا لیکن اب انہیں احساس ہو رہا ہے کہ ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ اگر پستول کام کر رہا ہوتا تو اگل کی جان بچ سکتی تھی۔ ان کا نشانہ بہت اچھا تھا اور وہ ریختے ہوئے سانپ کو بھی مار دیا کرتے تھے۔

سارہ جیمز گواہی دیتے آئی تو اس نے ایک بار پھر اگل کو یاد کر کے رونے کی کوشش کی۔ اس نے سراغ رساں گرگوری کے ساتھ کسی بھی ذاتی نوعیت کے تعلق کی تردید کی حالانکہ وہ کئی مرتبہ اسے اگل کے خلاف درغلانے کی کوشش کر چکا تھا۔ اس نے یہ بھی پیشکش کی تھی کہ اگر سارہ اسے اتنی رقم دے دے جس سے وہ اپنی کار کی قسطیں ادا کر سکے تو وہ اگل کو بھی اس کا تاج نہیں بتائے گا۔

مقدمے کے اختتام پر جیوری نے فیصلہ سنایا۔ سراغ رساں گرگوری نے اپنے دفاع میں کوئی چٹائی نہیں کیونکہ اس سے پہلے اگل اس پر پستول تانے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دیکھی وہی تھی کہ اگر اس نے سارہ جیمز کو قتل کر دیا تو وہ اسے کوئی مار دینے کے۔ گرگوری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگل کا پستول تارہ ہو چکا ہے۔ اس کے وکیل نے گرگوری کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ اس نے جیوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ایسی صورت حال میں وہ بھی یہی کرتے۔ میں نے دیکھا کہ جیوری کے ممبران کی اکثریت نے تانہ میں مرہلا دیا۔ وہ وکیل کے دلائل سے متاثر نظر آ رہے تھے۔

بعد میں دادا نے مجھے اور ماما کو بتایا کہ وہ اپنے آپ اگل کی موت کا ڈرے دار سمجھتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ہوگیا تھا۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں اتنا متاثر نہیں ہوں۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگل کی موت کا اصل ڈرے دار کون تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی سوچتا۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد سب کچھ معمول پر آ گیا۔ دادا کی چٹائی مزید کمزور ہو گئی اور ماما بدستور اپنے کام پر چلے گئے۔ اگل نے اپنا مکان اور سارا سامان بیچنے کے بعد پیرا وینک میں جمع کر دیا تھا اور وہ دے کے مطابق کوئی نئی وصیت تیار نہیں کی جس کے مطابق وینک میں بیٹی ہوئی رقم دادا کو ان کے علاج کے لیے مل سکتی۔ لہذا سارہ نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں اور وصیت کے مطابق وینک میں موجود رقم اسے مل گئی۔ البتہ اس میں سے وکیل کو قس کی ادائیگی ضروری تھی جو اگل کے مقدمے کی جیوری کے لیے کیا گیا تھا۔

سارہ جیمز کے قبضے میں وہ سارا سامان بھی چلا گیا۔ ہمارے گھر کے باہر کھڑے ٹریلر میں رکھا ہوا تھا۔ سراغ رساں گرگوری اس ٹریلر کو اپنی کار میں باندھ کر لے گیا۔ سارہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس طرح اس کا بیوی ثابت ہو گیا کہ اس کے گرگوری کے ساتھ کسی قسم کے ذاتی نوعیت کے تعلقات نہیں تھے۔ وہ اپنے ہمراہ اپنی شریف بھی لائے تھے ماما ماما دادا کوئی رکاوٹ ڈالیں۔ دادا نے اس معاملے میں باطل مداخلت نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور ذہنی شریف سے جھگڑا نہیں کر سکتے البتہ تیس سال پہلے کہاں

تلف ہوتی۔

مما اس وقت کام پر گئی ہوئی تھیں جب دادا نے انہیں اس بارے میں بتایا تو انہوں نے کوئی۔۔۔ توکل ظاہر نہیں کیا اور پولیس کے دو دونوں بیٹی سارہ اور گرگوری پر مانہ ذہنیت کے حامل ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بالکل موزوں ہیں۔ دادا اور ماما میں ٹیٹھے اسی موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ دادا وینک کو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اگل مارش نے اپنی ساری رقم وینک میں کیوں رکھی۔ وہ ماما سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

”اس نے کبھی وینک پر بھروسہ نہیں کیا۔ وہ عام طور پر گھر میں ہی پیسے چھپا کر رکھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنے پیسے کئی کے برتن میں رکھتا اور اسے زمین میں دبا دیا کرتا تھا۔“

ماما چانک اپنی کرسی سے اٹھیں اور دوڑتی ہوئی اس چوہے کے سرے تک گئیں جہاں اگل سویا کرتے تھے۔ وہ کمرے کی ایک ایک چیز ہٹا کر پیسے تلاش کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ مایوس ہو کر کمرے سے باہر آنے والی تھیں کہ ان کی نظر اچانک اگل کے پرانے سوٹ کیس پر پڑی جو بیستر کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں اتنی ہزار ہزار روپے کے ہونے لگے۔

☆☆☆

ممانے اتنی زور سے جھجھکاری کہ دادا بھی اپنی جگہ پر اچھل پڑے اور پڑوسی کا تار زور زور سے بھونکنے لگا۔

بہار کا موسم آیا تو ہم تینوں بیٹی میں ماما اور دادا، جیکب ممانے ماما کی بیوی رنگ کی کیرو میں پائین ماؤنٹین گئے۔ ماما اب بھی اسٹور پر کام کرتی تھیں لیکن انہوں نے اپنے استعمال کے لیے یہ کار خرید لی تھی۔ وہاں کسی کو اس سے غرض نہیں تھی کہ کار کے لیے پیسے کہاں سے آئے۔ وہ کام کے دوران اپنی گاڑی اسٹور کے باہر کھڑی کر دیتیں اور جب کام کی زیادتی سے پریشان ہو جاتیں تو کھڑکی میں سے تھانک کر اپنی سیواری کو کھینچ لیتیں۔

دادا کا آپریشن ہو گیا تھا اور اب انہیں ہر چیز صاف نظر آنے لگی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا ایک بار پھر ان کے لیے حسین ہو گئی ہے۔ ہم تینوں پہاڑی کی اونچائی پر جیکب نکل سجائے سینڈ ویج کھائے اور گرد و نواح کا نظارہ کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک دادا نے زور زور سے

رونا شروع کر دیا۔ میرا ڈر کہ مارے دم لگے گا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دادا کی طبیعت بگڑ گئی ہے یا ان پر قاتل وغیرہ کا حملہ ہوا ہے۔

ماما بھی گھبرا گئیں اور پولیس۔ ”خوفزدی ایسا ہوا۔ میں نے پہلے بھی آپ کو اس طرح روئے ہوئے نہیں دیکھا۔“ دادا بولے۔ ”ان خوب صورت مناظر کو کچھ کرکھے احساس ہوا کہ ہماری زندگی میں کیا کچھ رونما ہوا ہے جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے تھے۔ مارش کے چھوڑے ہوئے پیسوں سے میری آنکھیں ٹپک ہو گئیں اور تم نے نئی کار خرید لی۔ اس سے پہلے کیا ہم بھی ان چیزوں کا تصور کر سکتے تھے۔ تم ساری عمر ملازمت کرتی رہیں تب بھی میرے آپریشن کے لیے پیسے جمع نہ ہو سکتے اور کار خریدنے کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ کوک مارش نے وعدے کے مطابق نئی وصیت نہیں بنوائی جس کے مطابق وینک میں رکھی ہوئی رقم میرے حصے میں آتی لیکن دیکھا جائے تو اس نے ایک طرح سے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔“

”شاید اسے ڈر تھا کہ سارہ نہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر دے۔ اسی لیے اس نے اپنے باقی پیسے سوٹ کیس میں چھپا کر رکھ دیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سارہ کو اس کا وینک نکال دیکھ کر غصا میں پڑی ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح سے میرا اندھا ہونا اچھا ہی ثابت ہوا۔ یہ سب خدا کی مہربانی ہے میں نے نہیں۔ یہی سنا ہے کہ خدا خیب سے ہماری مدد کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ان نعمتوں سے مالا مال کیا۔ واقعی مارش کی چھپائی ہوئی رقم ہمارے لیے کسی طرح بھی قیمتی ہوسکتی تھی۔“

میں ان دونوں کی سادگی پر غصہ رہا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں جان پاتے تھے کہ اگل کی پیسے چھپانے کی عادت ہمارے کام آگئی۔ پھر میں اپنی فی صلیط نہ کر سکا اور زور زور سے قہقہے لگنے لگا۔ دادا نے مجھے گھورا اور بولے۔

”تم کس بات پر غصہ رہے ہو لڑکے؟“

میں نے سینڈ ویج کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ کیا مجھے آپ کو بھی یاد دلاتا ہوگا کہ میرا نام ہم برن ہے۔“

ماما مسکراتے گئیں اور دادا زوردار قہقہہ لگا کر ایک بار پھر خوب صورت نظاروں کے حسن میں کھو گئے۔

نیکس آباد

ملک معتمد حیات

قدرت کے قانون میں ایک بات بیت نماہاں ہے۔۔۔ عمل کا رتبہ عمل۔۔۔ اور یہ عمل چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، رائگاں کبھی نہیں جاتا۔۔۔ چاہے ساری عمر رائگانی کے غلاب میں تمام ہو جائے مگر کوئی لمحہ رتبہ عمل سے محفوظ نہیں۔ انہوں نے بھی جو بویا تھا ایک دن وہی کائنات تھا لیکن خوش قسمتی سے ان کے پاس کچھ ایسے بیج بھی تھے جن سے پھوٹنے والے ہونے لگے تھے تناور درخت بنتے گئے اور ان کی گھنیری چھایا نے انہیں جلتی دھوپ سے بچالیا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ انسان نادانی میں غلطیاں ہی نہیں کرتا بلکہ بے خبری میں کچھ نیکیاں بھی کر جاتا ہے جو دعا بن کر انہیں اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔۔۔ جس کا ادراک انسان کو بیت آخر میں ہوتا ہے۔ اسی لیے جانے انجانے میں نیکیاں کرتے رہنے کا سلسلہ جاری رہتا چاہے۔ جانے کب اجر کی ضرورت پیش آجائے۔

ایک چھوٹی سی نیکی سے ملے والے اجر عظیم کا ایک اثر

انگیز واقعہ

ڈاکو اور چور میں کوئی زمین آسمان کا فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک آنکھیں دکھا کر زور زبردستی سے لوٹ مار کرتا ہے، دوسرا آنکھیں میا کر چپکے سے چرائے جاتا ہے۔ یہ بھی چند ایسے ہی کرداروں کی کہانی ہے جو چور بھی تھے، ڈاکو بھی تھے اور ہلا کو بھی تھے۔ ایک ابراہیم آدمی میں قہانے میں بیٹھا اپنے فرائض منصبی ادا کر رہا تھا کہ دودھیائی مجھ سے ملے آئے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ان میں سے ایک کا نام اللہ رکھا اور دوسرے کا فیض محمد معلوم ہوا۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی مٹ رہی تھی۔ میں نے انہیں آرام سے بٹھایا اور باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ لوگ کہاں سے آئے ہو؟“

”جناب امیر اعلیٰ فرید کوٹ سے ہے۔“ فیض محمد نای آدی نے بتایا پھر اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اللہ رکھا ریلے سے چھانک رہا ہوتا ہے۔“

فرید کوٹ میرے قہانے سے تھوڑے فاصلے پر ریلے سے لائن کے کنارے واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور

ریلے سے کچھ عرصے پہلے کوٹ سے چند قدموں کی دوری پر تھا۔ ان دونوں کی حالت بتاتی تھی کہ کسی بہت بڑی مصیبت نے انہیں میرے پاس آنے پر مجبور کیا تھا۔

”اس برقی بارش میں پولیس کے پاس آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ میں نے ایک بار پھر دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”قہانے دار صاحب! اللہ رکھا کی لڑکی کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا ہے۔“ فیض محمد نے بتایا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ”یہ کب کا واقعہ ہے؟“

”چھوٹی رات کا تھی۔“ اس مرتبہ اللہ رکھا نے براہ راست جواب دیا۔ ”کوئی آدھی رات کے وقت وہ ڈاکو ہمارے کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے وہاں موجود ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ انہیں ہمارے کوارٹر میں کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ وہ اپنا مطلوبہ چیز کو ڈھونڈنے کے دوران میں مندرل سے باہر ہونے لگا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟

”میں نے اسے روک دیا۔“ وہ اس تلاش میں ناکام رہے تو جانے

”سہلی! آخر لوگوں کے ساتھ رات جو بھی واقعہ پیش آیا اس کا مجھے بہت دکھ ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں لیکن اس کام کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہوگی۔“

”ہم ہر جسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں تمہارے دار صاحب۔“ وہ روہائی آواز میں بولی۔ ”آپ کسی بھی طرح میری مدد کو ادھیں لے آئیں۔“

”انشاء اللہ! وہ بہت جلد تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”سہلی! اتم ان ڈاکوؤں کے بارے میں کیا جانتی ہو؟“

”جی۔۔۔۔۔ وہ دو تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”آدھی رات کو گھوڑوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچے تھے۔ دونوں کے پاس بندوقس تھیں اور انہوں نے ڈھانچوں میں اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ بہت ہی ظالم اور وحشی تھے۔ بس، میں اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”یہ سب تو تمہارا خاوند اللہ رکھا مجھے بتا چکا ہے۔“ میں نے غصے سے بولے۔ ”مجھے نہیں کہہ۔“ میں ان ڈاکوؤں کی شناخت کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں تاکہ ان تک پہنچنے میں مجھے آسانی حاصل ہو۔“

”نہیں جی۔۔۔۔۔“ وہ تسلی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ایسی کوئی بات ہمیں پتا نہیں۔“

”اللہ رکھا نے مجھے جو حالات بتائے ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکو تمہاری بیٹی مندل کو ابھی طرح جانتے تھے۔“ میں نے سہلی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”انہوں نے کسی تاجا اور نیلی پٹلی کا بھی ذکر کیا تھا۔ ان کے مطابق انہیں کسی نیلی پٹلی کی تلاش تھی جو تاجا نے مندل کو دی تھی۔“

”جی۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ سہلی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جب مندل نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا اور نیلی پٹلی سے اپنی لاش کا اظہار کیا تو انہوں نے منوں پٹلی کی تلاش میں ہمارے پورا گھر الٹ کر رکھ دیا۔ آپ نے ہمارے سامان کی حالت دیکھی ہے نا۔“

”ہاں دیکھی ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”اس افراتفری سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ نیلی پٹلی ان کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ جب وہ پٹلی تلاش کرنے میں ناکام رہے تو تمہاری بیٹی کو اٹھالے گئے۔“

”جی، وہ ہمارا دیرینہ مندل کو اٹھالے گئے۔“ وہ گھوڑے آواز میں بولی۔

”وہ لوگ جانتے ہوئے آپ کو کوئی دھمکی دینے والے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی۔۔۔۔۔ میں تو کوئی دھمکی نہیں دی پر۔“

”پر کیا؟“ وہ بولتے بولتے اٹھی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

”جناب! جب وہ مندل کو گھوڑے پر لاد رہے تھے تو ان میں سے ایک نے کہا تھا۔۔۔۔۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”ہمارے پاس اتنا نام نہیں کہ یہاں بڑھ کر تم سے سوال جواب کریں۔ تاجا کے پاس کچھ کر خود ہی تمہاری زبان کل جائے گی۔“

سہلی کی زبان سے یہ ایک اہم انکشاف ہوا تھا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں استدعا کیا۔ ”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو مندل کو تاجا کے پاس لے کر گئے ہیں؟“

”سو چنا رب ہی بہتر جانتا ہے جی۔۔۔۔۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مگر تو تاجا کا نام نیلی بار ڈاکوؤں کی زبان سے سنا ہے۔ پتا نہیں، جیسے بھائے ہم کم مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“

”ایک بات تو ملے ہے سہلی بی بی! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری تنقید کی ہے کہ۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن مندل ضرور کسی تاجا کو جانتی ہے۔ کسی لفظ کی بنا پر وہ لوگ آدھی رات کو ایسی کارروائی نہیں کر سکتے اور جہاں تک اس نیلی پٹلی کا تعلق ہے تو۔۔۔۔۔“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی کوئی فرضی کہانی نہیں۔ مندل جانتی ہو یا نہیں جانتی ہو مگر نیلی پٹلی کا اپنا ایک وجود ضرور ہے جو ڈاکوؤں کے مطابق تاجا نے مندل کو دی تھی۔“

”میری تو کچھ کچھ نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب کہ یہ کیا چکر ہے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”سب چکر مجھ میں آجائے گا اگر تاجا کا سراغ مل جائے تو۔۔۔۔۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اسے ذہن پر زور دو سہلی بی بی۔ تاجا تک پہنچے بغیر تمہاری بیٹی کو ادھیں نہیں لایا جاسکتا۔“

”ذہن پر کیا زور دوں جی؟“ وہ پریشانی سے بولی۔

”یہ نام پہلے ہی سنا ہی نہیں۔“

میں نے مندل کی سسرال کے حوالے سے بھی تمہارا کھلف سوالات کیے لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہ آئی۔ سہلی کا خیال بھی اللہ رکھا کے ذہن کی حکمت کرتا

رکھا لے دیا تھا کہ گزشتہ رات والے ہسٹوناک واقعے میں مندل کے سابق شوہر تاجا کی یا اس کے گھر والوں کا کوئی پتا نہیں ہو سکتا تھا۔

”جس وقت ڈاکوؤں نے تمہارے کوارٹر پر پلٹا تو ان لوگوں نے چھپنے چلنے یا لوگوں کو مدد کے لیے بارے کی کوشش نہیں کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بات تو یہ کہ جب کہ ہم سب ڈاکوؤں کو دیکھ کر ہشت میں آ گئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور اگر ہم کچھ چاہ کر کسی کو مدد کے لیے نکلتے تھے تو کون آتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، یہاں ترعب میں کوئی آبادی دیرینہ ہی تو نہیں۔“

اس کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ آج کل کی طرح اس زمانے میں شہری آبادی میں اس قدر پھیلاؤ نہیں آیا تھا۔ میں اس وقت جس ریلے سے پھانک پر کھڑا تھا وہاں سے نزدیک ترین آبادی موضع فرید کوٹ تھی جو اللہ رکھا کے کوارٹر سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ فیض محمد کا تعلق موضع فرید کوٹ ہی سے تھا جو اللہ رکھا کے ساتھ اس ہسٹوناک واقعے کی رپورٹ درج کرانے کا پتہ پتا تھا۔

میں نے سہلی سے پوچھا۔ ”رات کو جس وقت ڈاکو یہاں کارروائی کر رہے تھے، مندل کا پتا کہاں تھا۔ کیا یہ سارا قماش اس محصور پچے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟“

”سلطان اس وقت سو رہا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ورنہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ یہ مندل کو تاجا کا خاصا اداس تو ہے لیکن ابھی تک اس نے ہنگامہ مچانے کی کوشش نہیں کی۔“

”تمہیں بڑی توجہ ہے اس کا خیال رکھنا ہوگا۔“ میں نے سمجھ دینا چاہا۔ ”یہ نکل گیا تو تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”مجھے یقین ہے، میں اسے سنبھال لوں گی۔“ وہ بڑے احماد سے بولی۔ ”یہ پچھلے ایک سال سے میری ہی گود میں لپ رہا ہے۔ مندل اس کی ماں ضرور ہے لیکن اس کا زیادہ تر وقت میرے پاس ہی گزرتا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے دور کھینچتے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ دعا کرو، میں جلد از جلد مندل کو باز یاب کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”آمین۔“ اس نے تودل سے کہا۔

تمہارے درمیان کھینک کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اللہ رکھا آگیا۔ اس نے آکر بتایا۔ ”اب دو گھنٹے تک ادھر سے

کسی گاڑی کا گزرنے نہیں ہوگا لہذا میں قاریغ ہی ہوں۔“

میں نے اللہ رکھا سے بھی مختلف سوالات تمہا پھر کر کیے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آئی جس کے سہارے میں ان دو ڈاکوؤں کے تعاقب میں روانہ ہو سکتا۔ ان لوگوں نے ڈاکوؤں کے چہرے نہیں دیکھے تھے۔ وہ انہیں آواز سے بھی نہیں پہچانتے تھے۔ نیلی پٹلی اور تاجا کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنی عمل لاشی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ان حالات کی روشنی میں اللہ رکھا سے پوچھا۔

”تم نے تو دیکھا ہوگا کہ وہ ڈاکو کس طرف گئے تھے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ لوگ اس طرف اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔“

اللہ رکھا نے جس سمت اشارہ کیا تھا وہی جگہ میزک تھی جس پر ریلے سے پھانک بنا ہوا تھا۔ مذکورہ میزک شرق سے مغرب یا مغرب سے شرق کی طرف جاتی تھی اور اللہ رکھا نے دونوں ڈاکوؤں کا مغرب کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے اور اللہ رکھا کی بیٹی مندل کو بھی اپنے ساتھ اٹھالے گئے تھے۔

سمت کا یقین تو ہو گیا لیکن علی الصباح ہونے والی بارش نے نقشہ کشی مراحل میں خاصی جھجک پیدا کر دی تھی۔ میں گھوڑوں کے گھر کے نی کی مدد سے ڈاکوؤں کی تلاش کا کام جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں تانگے میں بیٹھ کر اس جگہ میزک پر کافی آگے تک گیا لیکن کچھ مجھ میں نہ آیا کہ ڈاکو کس طرف گئے ہوں گے۔ مذکورہ میزک کی دونوں جانب سرسبز و شاداب کھیتوں کا سلسلہ تاحد نگہ پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ واردات پچھلی رات کو پیش آئی تھی۔ کم و بیش اس واقعے کو بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تک تو وہ ڈاکو پتا نہیں، کہاں سے کہاں پہنچے ہوں گے۔ فوری طور پر ان کے خلاف کوئی بھی عملی کارروائی ممکن نہیں تھی۔ وہ آج کل کا اخیر رفتار زمانہ نہیں تھا کہ میں فون کھڑا کر ارد گرد کے علاقوں کو پوچھنا کر دیتا۔ بہر حال، میری سوچ صرف دو نکات پر مرکب تھی جی۔۔۔۔۔ نمبر ایک، تاجا۔۔۔۔۔ نمبر دو، نیلی پٹلی!

اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو جائیں تو میں یہ آسانی ان ڈاکوؤں تک پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ بارش نے سارا کام خراب کر دیا تھا ورنہ میں کھوئی کی مدد سے یہ ضرور جان لیتا کہ وہ نامراد ڈاکو کھرے سے آئے تھے اور کہاں گئے تھے۔

تمام تر صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے تسلی بخش لکچر میں اللہ رکھا سے کہا۔ ”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انشاء اللہ! بہت جلد تمہاری بیٹی کو بازیاب کر لوں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جناب۔“ وہ ہنرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”لیکن اس کے ساتھ ساتھ جہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے غم سے ہوئے لکچر میں وضاحت کر دی۔

”اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو اور کسی طرح بھی یہ جاننے کی کوشش کرو کہ ”تاجا“ اور ”نیل پوتلی“ کا کیا قصہ ہے۔ اگر اس راز سے پردہ اٹھ گیا تو پھر یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ ڈاکو کون لوگ تھے اور وہ تمہاری بیٹی مندل کو کہاں لے گئے تھے۔“

”جی اچھا۔ میں پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”مندرل کے علاوہ بھی وہ ڈاکو تمہارے گھر سے کچھ اٹھا لے گئے ہیں؟“

”نہیں جی۔ کچھ بھی نہیں۔“ وہ فنی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔

”اس سے کبھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں کسی نیلی پوتلی کی تلاش میں آئے تھے۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا۔

”جران کے خیال میں کسی تاجا نے مندل کو دی گئی۔ تسلی نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ڈاکو جاتے ہوئے یہ کہہ گئے ہیں کہ وہ لوگ مندل کو تاجا کے پاس لے کر جا رہے ہیں۔“

”جی۔“ اللہ رکھا نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”انہوں نے یہ بات کی تھی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تاجا ان کے قبضے میں ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ان کی اصل دشمنی تاجا سے ہے اور یہ دشمنی کسی نیلی پوتلی کی وجہ سے ہے۔ ان کے خیال میں ہے کہ تاجا نے نیلی پوتلی مندل کو دی تھی۔ یقیناً یہ بات تاجا ہی نے انہیں بتائی ہوگی۔ وہ مندل کے دشمن نہیں ہیں۔ اگر مذکورہ نیلی پوتلی انہیں حاصل ہو جائے تو وہ مندل کو چھوڑ دیں گے۔“

”جناب آپ کی ساری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔“ اللہ رکھا نے دہمی آواز میں کہا۔ ”لیکن مسئلہ تو نیلی پوتلی اور تاجا کا ہے۔ ہم تو کسی تاجا کو جاننے میں اور نہ

جی کسی نیلی پوتلی کا ذکر کرتا ہے۔“

یوتے یوتے بولتے اللہ رکھا کی آواز جھرجھرائی تھی۔ میں نے اس کا کدھا چھپچھپایا اور تھوڑی دیر بعد سے لکچر میں کہا۔

”اللہ رکھا! مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں تم پر کبہر ہا ہوں کہ تم تاجا اور نیلی پوتلی کے بارے میں جاننے اور سراغ لگانے کی کوشش کرو۔ میں کسی ان ڈاکوؤں کا قصہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے تمہاری بیٹی جی ملی جائے گی۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے“ تھانے دار صاحب! امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کے حکم کے مطابق ضرور کوشش کروں گا۔“

میں اللہ رکھا کو تسلی دلا سادے کردار میں آ گیا۔

☆☆☆☆

اگرچہ میں اللہ رکھا اور اس کی بیوی مسکلی کو یہ یقین دلا آیا تھا کہ میں بہت جلد ان کی بیٹی مندل کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں سے لے کر آؤں گا۔ لیکن جی بات یہ ہے کہ مجھے ڈاکوؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری سوچ کی تان کھوم پھر کر ”تاجا“ اور ”نیل پوتلی“ پر ہی ٹوٹی تھی۔ میرا ذاتی تجربہ اس واردات کے بارے میں کچھ اس طرح تھا۔ وہ دو ڈاکو جو تاحال نامعلوم تھے ان کی مندل سے کسی قسم کی دشمنی نہیں تھی۔ ان کا اصل شکار تاجا یا کوئی شخص تھا جو اس وقت ان کے قبضے میں تھا۔ وہ تاجا سے کسی نیلی پوتلی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مذکورہ نیلی پوتلی میں یقیناً کوئی نہایت ہی قیمتی شے مثلاً طلائی زیورات یا کوئی عجری نقدی موجود تھی۔ اس بات کے امکانات بھی موجود تھے کہ تاجا نے جھوٹ بولا ہو۔ اپنی جان بچرانے کے لیے اس نے مندل کا نام لے دیا ہو۔ کچھ بھی تھا لیکن ایک بات کا مجھے یقین تھا کہ اللہ رکھا کی منوی بیٹی مندل کسی تاجا کو ضرور ہاتھ لگاتی تھی۔

جب میں تھانے پہنچا تو بارش کا سلسلہ ایک بار پھر چڑھ چکا تھا۔ بالکل پہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ موسم میں اگرچہ ابھی خاصی خشکی موجود تھی لیکن میری نظر میں یہ بڑا خوشامد اور درواخت موسم تھا۔

اس ڈرامائی بارش کی وجہ سے اگرچہ کھرے کھونٹ کا کوئی امکان تو باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میرے تھانے کی حدود میں سے گزرتی رات ڈاکوؤں نے ایک عورت کو اغوا کر لیا تھا۔ میں منوی کی بازیابی تک سکون کی سانس کیسے لے سکتا تھا۔

نیلکی آباد

دھوم سے نزدیک ترین تین گاؤں واقع تھے۔ نصف میل شمال میں ریلوے کی پٹری کے ساتھ موضع فرید کوٹ، شرق میں کچے راستے کے کنارے ریلوے سے چھٹک سے لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر موضع شاہ پور اور مغربی سمت تین میل کی دوری پر جمال پور۔ جمال پور دوی گاؤں تھا جہاں مندل بھی بیٹھ کر گئی تھی اور پھر ایک سال پہلے طلاق لے کر واپس آئی تھی۔

میں نے اپنے ملے کے تین ہوشیار قسم کے اہلکاروں کو سادہ لباس میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ان تینوں موضعوں کی جانب روانہ کر دیا۔ انہیں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کسی تاجا یا منوی کے بارے میں پتا چلانا تھا یا کسی ایسے بندے کا سراغ لگانا تھا جو اپنے علاقے سے پر اسرار طور پر غائب ہو گیا ہو۔ میرا ذہن اس انراویے پر بھی سوچ رہا تھا کہ میں ممکن ہے، ڈاکوؤں نے جس شخص کو ”تاجا“ کہا، وہ حقیقت اس کا نام کوئی اور ہو۔

تین اہلکاروں کو برقی بارش میں تین مختلف گاؤں کی سمت روانہ کرنے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن مسلسل اس معرکہ کوئل کرنے میں مصروف تھا۔ ڈاکوؤں نے مندل کو کھوڑے پر لادنے کے بعد جس طرف کا رخ کیا تھا وہ سمت بھی میری سوچ میں تازہ تھی۔ یہ وہ کپاراست یا جی سوک تھی جو کھیتوں کے پتوں بیچ شرق سے مغرب کی جانب چلی جا رہی تھی اور انتہائی مغرب میں جا کر پہلکی سوک چک چوں تانی ایک گاؤں کی زمین پر ختم ہو جاتی تھی تاہم پک چوں جانے وقوعہ سے ہنگامی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس بات کے زیادہ امکانات نہیں تھے کہ ڈاکو مندل کو چپک چپ لے کر گئے ہوں گے۔ میرے اندازے کے مطابق انہوں نے بیچ میں نہیں اپنا راستہ بدل لیا ہوگا کیونکہ ایک ڈاکو کا یہ کہنا کہ۔۔۔ وہ مندل سے باقی کی پوچھ گچھ تاجا کے سامنے کریں گے، اس امر کا ثبوت فراہم کرتا تھا کہ تاجا کو انہوں نے جانے وقوعہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں رکھا ہوگا۔ یہاں پر ایک بات کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چپک چوں ایک سرحدی گاؤں تھا۔ اس کی دوسری جانب دوسرے ضلع کی حدود شروع ہو جاتی تھی۔ میرا بھی چپک چوں جانا تو نہیں ہوا تھا۔ یہ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں بھی نہیں آتا تھا البتہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ چپک چوں میں چودھری حیات اللہ کی عمارت تھی۔

جہاں میں نے اپنے تھانے کی حدود کی اتنی زیادہ

تفصیلات بیان کر دی تھیں وہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس کے راستے کے متوازی، جنوب شرقی سے شمال مغرب کی سمت ایک نہر بھی رواں دواں تھی۔ یہ پہلی سوک شرق میں نہر سے ذرا ہٹ کر تھی لیکن مغرب میں آگے جا کر نہر کے اوپر سے گزر کر قدرے تر بھی ہو کر سرحدی گاؤں تک پہنچتی تھی۔ گویا اس ٹپ کے بعد نہر اور جی سوک کے درمیان فاصلہ بتدریج بڑھتا گیا تھا۔ جانے وقوعہ پر پہنچی ریلوے سے چھٹک کے مقام پر نہر اور جی سوک میں کم و بیش ایک فرلانگ کا فاصلہ حاصل تھا۔ جانے وقوعہ سے لگ بھگ تین میل آگے جا کر ایک لمبی کی مدد سے سوک، نہر کے اوپر سے گزر جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اس تفصیل کے بعد اس علاقے کا نقشہ آپ کے ذہن میں محفوظ ہو گیا ہوگا۔

دوپہر کے بعد بارش ایک مرتبہ عمارت کی گئی۔ بہت ہی پہلکی پھوار پر پڑی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر تھانے کے احاطے میں بیٹھنے لگا۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل مندل کے اغوا کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ اہلکار واپس آ گیا جسے میں نے تاجا کی ”تلاش“ میں فرید کوٹ بھیجا تھا۔ مذکورہ اہلکار نے مجھے جو رپورٹ دی اس کے مطابق فرید کوٹ میں تاجا یا کوئی شخص رہائش پذیر نہیں تھا۔ کاشمیل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ فرید کوٹ میں رہنے والے افراد میں سے کوئی کم نہیں تھا۔ وہاں سب امن و امان چل رہا تھا البتہ مندل کے اغوا والی بات سے پورا فرید کوٹ آگاہ ہو چکا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی انجانے کی بات نہیں تھی کیونکہ آج صبح اللہ رکھا کے ہمراہ جو شخص مندل کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا اس کا تعلق موضع فرید کوٹ ہی سے تھا۔

اگلی صبح بڑی پھلکی مگر خوشوار تھی۔ آج آسمان پر دور دور تک بادلوں کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ شاپور جانے والا کاشمیل لوٹ آیا وہ اپنے ساتھ وہاں کے ایک رہائشی کبیر احمد کو بھی لے کر آیا تھا۔ میں نے فوراً دونوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ کاشمیل نے مجھے جو تفصیلات بتائیں ان کے مطابق کبیر احمد کا بیٹا پچھلے دو دن سے قلعہ تھا البتہ ”تاجا“ کے بارے میں شاہ پور سے بھی کوئی سن نہیں مل سکی تھی۔

کبیر احمد کی عمر بیٹھائیس اور پچاس کے درمیان نظر آتی تھی۔ وہ پتہ قاست اور دہرے بدن کا مالک تھا جس کے کندھے معمولی سے اوپر کواٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کاشمیل کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور کبیر احمد کی جانب متوجہ

کیر احمد نے میرا ٹکڑیہ ادا کیا اور دو پارہ آنے کا کہہ کر تھانے سے رخصت ہو گیا۔ میں موجودہ صورت حال پر غور و فکر کرنے لگا۔

صنڈل کے انوار ڈاکوؤں کے حوالے سے نئی پٹی اور تاج والا معاملہ ابھی حل نہیں ہوا تھا کہ کیر احمد اچھو کی گمشدگی کا قصہ لے کر آیا تھا۔ قصوریر اچھو کے سامان میں سے نکل چکی اس عورت کا یقیناً اچھو کے ساتھ کوئی بند بانی تعلق رہا ہوگا۔ اگر میں تصویر والی عورت تک پہنچ جاتا تو اس کی مدد سے اچھو کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ بہر حال، اچھو کی گمشدگی سے کہیں زیادہ اہم معاملہ صنڈل کے انوار کا تھا جس کے حوالے سے تاج حال کوئی سرا ہتھ نہیں آیا تھا۔ اب مجھے اس پولیس اہلکار کی دادی کا انتظار تھا جسے میں نے موضع جمال پور کی طرف روانہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے فیض محمد میرے پاس آیا۔ یہ بندہ موضع فرید کوٹ کا رہنے والا تھا اور اللہ رکھا کا دوست بھی تھا میں نے اسے فوراً اپنے پاس بلا لیا اور وہی ملک ملک کے بعد پوچھا۔

”فیض محمد! اور کیا خبریں ہیں؟“

”خبریں ابھی نہیں ہیں جناب۔“ وہ اپنے لہجے میں اداسی سموتے ہوئے بولا۔ ”اللہ رکھا کی حالت بہت خراب ہے۔ میں اسی کے کہنے پر آپ سے ملنے آیا ہوں جی۔ وہ اپنی بیٹی صنڈل کے لیے بہت پریشان ہے۔“

”میں بڑی شد و حد سے صنڈل اور ان نامراد ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”انشاء اللہ! میں بہت جلد اس مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی۔ ا“ وہ غلوں سے بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”فیض محمد! تم کسی اچھو کو جانتے ہو؟“

”اچھو۔۔۔ ا“ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیا یہ بندہ فرید کوٹ کا رہنے والا ہے؟“

”فرید کوٹ کا نہیں، شاہ پور کا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو چھابڑی اٹھائے آلو لڑکھائی والے چٹا چمڑا تھا۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ وہ اچھو۔۔۔ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس اچھو کو تو میں کیا، پورا علاقہ

کر دیا۔“

پوری توجہ سے اس نے میری بات سنی اور میرے ناموش ہونے پر بولا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا جناب۔“

”ہاں واقعی۔۔۔ بہت برا ہوا۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ”تم نے ابھی تک اپنے مقصد کی وضاحت نہیں کی۔ کیا تمہارے پاس تاجا یا صنڈل کے حوالے سے کچھ معلومات ہیں؟“

”میں نہیں سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا نے دار صاحب۔“ وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کو ایک چیز دکھاتا ہوں جی۔“

تھوڑی سی دیر کے بعد کیر احمد نے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔ میں نے مذکورہ تصویر اس کے ہاتھ سے لی اور اس پر نظر بچا دی۔ وہ بچپن سے تیس سال تک کی ایک عورت کی تصویر تھی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر کیر احمد کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کون ہے یہ؟“

”میں اس عورت کو بالکل نہیں جانتا۔“ وہ سیات آواز میں بولا۔

”یہ تصویر جہیں کہاں سے ملی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اور مجھے دکھانے کا آخر مقصد کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے، آپ اس تصویر کی مدد سے اچھو کو تلاش کر سکتے ہیں۔“ وہ گہری تنبیہ کی سے بولا۔ ”یہ مجھے اچھو کے سامان سے ملی ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ میں نے ایک پوچھل سانس خارج کی۔ ”اس کا مطلب ہے، تمہارا اچھو اس عورت کے ساتھ بیار کی چٹکس چڑھا رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس عورت کو بھاگے لگیا ہو؟“

”مجھے بھی اسی چیز کا غم ہے جناب۔“ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ ”لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے، یہ عورت شاہ پور کی رہنے والی نہیں۔ آپ کو تصویر دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اسے اپنے آس پاس کے علاقوں میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ وہ سارا دن چھابڑی اٹھائے مگر گھر کو مت رہتا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں کس کے ساتھ ٹکافت ہو گیا ہو۔“

”ہاں کیر احمد، یہ تم نے ابھی راہ بھائی ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس تصویر کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ اگر یہ پتا چل گیا کہ یہ کون ہے، کہاں کی رہنے والی ہے تو اس کی مدد سے اچھو کو اخروٹ نے میں کافی آسانی ہو جائے گی۔“

آگیا۔ ہمارے درمیان ابھی خاصی ہم آہنگی ہو گئی۔ اس کے پاس ہنر کا تجربہ رہنے کا ٹھکانا نہیں تھا۔ میرے پاس پور میں ایک چھوٹا سا گھر ہے مگر کوئی مستقل آدھنی کا درجن نہیں۔ اچھو نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے اپنے گھر پر اس کی جگہ دے دوں تو وہ مجھے رزق روزگار سے بالکل بے نیاز کر دے گا۔ کہائے گا وہ کھا بھیں گے ہم دونوں۔۔۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھو کے پاس کمائی کا ایسا کون سا ہنر تھا؟“

”تھانے دار صاحب! وہ سموتے، پکڑے اور آکر لڑو کھائی والے بنانے کا ماہر ہے۔“ کیر احمد نے بتایا۔ ”وہ صبح چھابڑی لے کر گھر سے نکل جاتا تھا اور دن و صبح چ واپس آتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں دیہات میں گھوم پھر کر اپنا تیار کردہ سامان بیچتا تھا۔ وہ یہاں آپ کے علاقے تک بھی آتا ہے۔ اچھو کو پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔“

”ٹھیک ہے کیر احمد۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا۔ ”تم دو میل کا سفر ملے کر کے میرے پاس آئے ہو۔ میں اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لیتا ہوں۔ تم مطمئن ہو کر واپس جاؤ۔ میں جلد از جلد اسے ڈھونڈ لگانے کی کوشش کروں گا۔“

”آپ ضرور اچھو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کریں تھانے دار صاحب۔“ وہ میرے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ابھی میں آپ کے پاس ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔“

اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں اچھو کی گمشدگی سے بھی زیادہ اہم کوئی چیز موجود تھی۔ میں نے آنکھیں کھینچ کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”کون سا خاص مقصد کیر احمد؟“

”آپ کا جو آدمی کسی تاجا کی تلاش میں شاہ پور گیا تھا میں نے اسے بھی اپنے مقصد کے بارے میں پوچھ لیا تھا بتایا۔“ وہ نہایت ہی رازداری سے بولا۔ ”منا ہے، یہاں چھانک والے کی لڑکی کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا ہے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے کیر احمد۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اللہ رکھا کی بیٹی صنڈل کو ڈاکوؤں نے واقعی اغوا کر لیا ہے اور میرے اندازے کے مطابق تاجا جاتا ہے کہ صنڈل کو کیوں اغوا کیا گیا ہے۔“ لٹائی وقت کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے اسے صنڈل کے اغوا کی تفصیل سے آگاہ

ہو گیا۔

”تمہارے بچے کا نام کیا ہے کیر احمد؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اسلم جی۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن سب اسے ”اچھو“ کہتے ہیں جناب۔ وہ میرے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔“ بولتے بولتے اس کی آواز رنہ گئی۔

”وہ دونوں سے غائب ہے۔“ میں نے کیر احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ابھی تک اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی؟“

”ایک آدھ دن کے لیے تو وہ پہلے بھی ادھر ادھر ہو جایا کرتا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس لیے میں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی۔ اور اب تو وہ دن ہو گئے ہیں۔“

”کیر احمد! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اچھو تمہارے بڑھاپے کا سہارا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا اس کے علاوہ تمہاری کوئی اولاد نہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں ہم دونوں ہی ادھر شاہ پور میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔“

”اور تمہاری بیوی وغیرہ۔۔۔؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”جناب! میں نے تو شادی ہی نہیں کی۔“ وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جب شادی نہیں کی تو پتا کہاں سے آگیا؟“ وہ ہنسی۔ ”میرا بتایا ہوا بیٹا ہے۔“

”بتایا ہوا۔ مطلب منہ بولا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”گویا تم نے اپنے کسی رشتے دار کی اولاد کو بیٹا بتایا ہوا ہے؟“ میں نے ظہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اس کے والدین سے جا کر پوچھنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے،

چھپکے دونوں سے وہ اپنے بچے ہاں باپ کے پاس ہو۔“

”نہیں جی، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ خاصی قہر مندی سے بولا۔ ”اس کا کوئی مزید رشتے دار اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”اوہ۔۔۔ ا“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ”کیر احمد! وہ تمہارے بچے کیسے چڑھ گیا تھا؟“

”جناب! یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ پور میں ہر سال میلا لگتا ہے۔ وہ مجھے میلے میں ملا تھا۔ جلد ہی وہ میرے بہت قریب

450/-	انسان اور پوتا	475/-	معظم علی	550/-	اورنگزادہ گنجی	550/-	آخری معرکہ
300/-	پاکستان سے بڑا بڑا رنگ	550/-	خاک اور خون	500/-	مشہور قافلے	300/-	ثقافت کی تلاش
450/-	آخری چٹان	450/-	کھینسا اور آگ	300/-	واستان عابد	625/-	قید و سرکشی
225/-	سوسال بعد	599/-	قافلہ تجار	450/-	پروسی و رشت	500/-	یوسف بن تاشقین
325/-	سفید جزیرہ	425/-	نعمتین قاسم	300/-	پورس کے باقی		
475/-	شاہین						

سبق آموز زکات سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین



- 165/- اقوال حضرت علی الرضویؑ
- 165/- اقوال آنکھ کریمؑ
- 195/- حکایات گلستان سعدیؑ
- 140/- اقوال شیخ سعدیؑ
- 180/- حکایات رومیؑ
- 170/- دلچسپ و عجیب حقائق
- 199/- حکایات بوستان سعدیؑ

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879



ادولفت

(جامعہ ستوبین)

حضرت علیؑ کی زندگی کے اہم واقعات اور سیرت

جہانگیر بک ڈپو

جانب بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھی تو اچھل پڑا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
”یہ... یہ مصدل ہے... اللہ رکھا کی جینی۔“
اس کے اعتکاف نے مجھے بھی بلا کر رکھ دیا۔ میں نے جھپٹی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”فیض محمد! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ اسی مصدل کی تصویر ہے جسے ڈاکوؤں نے اللہ رکھا کے کوارٹر سے اٹھا کر لیا ہے؟“
”جناب! اس میں یقین ہونے یا نہ ہونے کی کون سی بات ہے۔“ وہ بڑے احماد سے بولا۔ ”اللہ رکھا کی ایک سی لڑکی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا نام مصدل ہے اور یہ اسی مصدل کی تصویر ہے۔ اگر آپ کو...“
475/-
300/-
625/-
اس نے اس سے تو میں بڑی ذہنی شک کا تعاقب کر دیا۔ ”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مصدل کی تصویر اچھو کے پاس پہنچی کیسے؟“
”تھانے دار صاحب! اچھو پھیری لگا کر گرگر آلودہ کھائی والے اور سوسے وغیرہ بچا کرتا تھا۔“ وہ اپنی کچھ بوجھ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اللہ رکھا کے گھر والے بھی اس سے چٹ پٹی اور مسالے دار چیزیں لے کر کھاتے تھے۔ ہوسکتا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟“
”جی ہاں! لو کہ میں انتہائی نا سمجھ تھانے دار ہوں۔“ میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف الفاظ میں مجھے بتاؤ۔“
”آپ نا سمجھ ہیں جناب۔“ وہ خوش انداز میں بولا۔ ”بہر حال، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے جی کہ... ہوسکتا ہے، اچھو اور مصدل میں کسی قسم کا رپہ مضبوط پیدا ہو گیا ہو اور مصدل نے اپنی تصویر خود اسے دی ہو۔ آپ تو جانتے ہیں، سال ڈیڑھ سال پہلے مصدل کی طلاق ہو گئی تھی۔ میں نے ایک دو بار مصدل اور اچھو کو کھڑے باہر میں کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ یقین ممکن ہے کہ ان کے بیچ راجعت کا کوئی سلسلہ چل رہا ہو۔“
فیض محمد کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ ایسا ہو جانا میں فطری بات بھی۔ مصدل نے ایک مرد کی صحبت میں شادی شدہ زندگی کے چند سال گزارے تھے۔ اگر اس کا رتخانہ

جانتا ہے۔ اس کے سوسے اور آلودہ کھائی والے بہت چٹ پٹے اور حرے کے ہوتے ہیں۔ میں نے خود کئی بار لے کر کھائے تھے۔“ وہ لمبے بھر کے لیے رک پھر ٹوٹنے والی نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولا۔
”اچھو کو کیا ہوا جناب۔ آپ نے ایسا کیوں کہا کہ وہ آلودہ کھائی والے چٹا پھرتا تھا۔ یقیناً وہ...؟“
”وہ کچھلے دو دن سے غائب ہے۔“ میں نے فیض محمد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ٹھوڑی دیر پہلے اچھو کا باپ کبیر احمد شاہ پور سے میرے پاس آیا تھا، اس کی کشتی کی رپورٹ درج کرانے۔“
میں نے کبیر احمد کا جان بوجھ کر ذکر کیا تھا تاکہ یہ جان سکوں کہ آیا فیض محمد اس حقیقت سے آگاہ ہے یا نہیں کہ اچھو، کبیر احمد کا بھائی نہیں تھا لیکن فیض محمد نے اس حوالے سے کسی خاص راز کا اظہار نہیں کیا اور سوچتے ہوئے لہجے میں بولا۔
”اچھو بھلا کہاں گم ہو سکتا ہے۔ میں نے دو تین دن پہلے بھی اس سے آلودہ کھائی والے لے کر کھائے تھے بلکہ... یہ اسی دن کی بات ہے جب مصدل کو انوکھا کیا گیا ہے یعنی جس دن میں نے اچھو سے آلودہ کھائی والے لیے تھے اس آنے والی رات میں مصدل کو انوکھا کیا گیا تھا۔“
”مجھے پتا چلا ہے۔“ میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک چال چلی۔ ”اچھو کیلایا ہی گم نہیں ہوا۔“
”کیلایا گم نہیں ہوا۔“ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھ دیکھا۔ ”اس بات کا کیا مطلب ہے جی۔؟“
”مطلب یہ کہ وہ اپنے ساتھ ایک عورت کو بھی ہونگے لے گیا ہے۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اس عورت کا تعلق تمہارے گاؤں قریہ کوٹ سے ہے۔“
”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ اچھل پڑا۔ ”آپ کس عورت کا ذکر کر رہے ہیں۔ قریہ کوٹ سے تو کوئی بھی عورت غیر حاضر نہیں۔ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو میں کیسے بے خبر رہ سکتا تھا۔؟“
”اس عورت کی تصویر ہے میرے پاس۔“ میں نے اپنی میز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، دیکھ کر تم اسے پہچان جاؤ۔“
میں نے اپنی میز کی دروازے سے دو تصویر نکال لی جو کبیر احمد نے مجھے دی تھی، پھر میں نے مذکورہ تصویر کو فیض محمد کی

اچھو کی طرف ہو گیا تھا تو اس میں اچھو نے والی کوئی بات نہیں
 کہی۔

میں نے آواز دے کر ایک کاشتیل کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب وہ میرے سامنے پہنچ کر باوبہ، پاما، اچھ، ہوشیار کھڑا ہو گیا تو میں نے حکیمانانہ انداز میں کہا۔

”وہ جو پچانک والا اللہ رکھا ہے نا۔ اسے بلاؤ۔“
”جو حکم ملک صاحب۔“ کاشمیل نے فرماں برداری سے کہا۔

”اور سنو“ دو جانے لگا تو میں نے کہا۔
وہ رک گیا اور سوالیہ نظر سے مجھے کھینٹنے لگا۔ میں نے کہا۔
”اس سے پوچھ لینا کہ گاڑیوں وغیرہ کی آمد کے کیا اوقات
ہیں۔ اگر انہی میں اس کا وہاں سے ملنا ممکن نہ ہو تو اس سے کہنا،
شام سے پہلے کسی وقت بھی تمہارے آکر مجھ سے مل لے۔“
”جی..... بہت بہتر۔“ یہ کہہ کر کاٹھیل کمرے
سے نکل گیا۔

فیض محمد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے یوں۔ ”تھانے دار صاحب اس وقت اللہ رکھا فارغ ہی ہوگا۔ اب دو بیٹے سے پہلے کوئی گاڑی ادھر سے نہیں گزرے گی۔“

میں نے رستِ واقع پر نگاہ ڈالی۔ دو پہیے میں ابھی
سوار دو گھینے باقی تھے۔ اس کا مطلب تھا، اللہ رکھا یہ آسانی
تھانے کا پیکر لگا کر وہاں اپنی ڈیوٹی پر جاسکتا تھا۔ میں نے
فیض محمدی کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”مجھے اس علاقے کے تھانے میں لے جاتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن تم تو سدا سے یہیں کے رہنے والے ہو۔ کیا یہاں پہلے بھی ڈاکوؤں نے اس قسم کی کوئی واردات کی ہے جیسی اللہ رکھا ہے کھر میں ہوئی ہے؟“

م خرید لوٹ کے سردو لوں میں پائے جاتے
والے لگاؤں دیہات میں بھی اکثر جاتے ہو گے۔ "میں نے
ایک خاص مقصد کی خاطر سوال کیا۔ "اور وہاں پر رہنے
والے لوگوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے؟"

”سارے گاؤں تو دیکھے بھالے ہیں جناب۔“ وہ
 عظمیرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”لیکن وہاں بسنے والے تمام
 لوگوں سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

”شاہ پور تو جانا ہوتا ہے نا۔۔۔۔۔“ میں نے فیض محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آلودہ و کھنکائی والے

اچھو کے گاؤں کی بات کر رہا ہوں؟
 "حق بالکل۔ وہاں تو عانا ہوتا ہے۔" اس نے
 حذب بظ بچے میں جواب دیا مگر پھر بچے سے سوال کر دیا۔ "اگر
 میں لفظی نہیں کر رہا جانتا تو۔۔۔ آپ اچھو کے بارے میں
 مجھ سے کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں۔"
 "تمہارا اندازہ بالکل درست ہے فیض محمد۔" میں
 نے اثبات میں گردن ہلاتی مگر پوچھا۔ "تم اچھو کو کب سے
 جانتے ہو؟"

”یہی۔ کوئی سال بھر ہے۔“ اس نے بتایا۔
 ”اور اس کے باپ کبیر احمد کو؟“
 ”جی، میں گھما نہیں۔“ وہ اچھٹن زدہ انداز میں مجھے
 دیکھنے لگا۔ ”آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“
 ”یہی کہ اچھو کے باپ کبیر احمد کو کب سے جانتے
 ہو؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اس نے بتایا: "اس لیے جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ دوچار بار دیکھا ہے۔"

”کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ اچھو کبیر احمد ہی کا بیٹا ہے؟“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”ابھی آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ کبیر احمد اپنے بیٹے چھوٹی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آیا تھا اور مندرلی کی تصویر بھی اسی نے دی ہے۔“

”میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا محمد۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن حقیقت اس سے خاصی مختلف ہے۔“

”کی.....“ وہ حیرت بھرے اعداد میں مجھ دیکھنے لگا۔ ”حقیقت کیا مختلف ہے جناب؟“

”اچھو، کبیر احمد کا سگا بیٹا نہیں۔“ میں نے انکشاف

یہ سچے میں کہا۔
 "یہ..... میرا آپ کیا کہہ رہے ہیں..... جناب!" اس
 کی حیرت دو چند ہوئی۔
 "میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں فیض محمد!" میں نے
 ہنس انداز میں کہا۔

جب اسے میری بات کا یقین نہ آیا تو میں نے کبیر احمد سے حاصل شدہ معلومات کا خلاصہ اسے سنایا۔ اس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

”کہانی عجیب ہے یا غریب۔۔۔ اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا۔ میں نے جو بھی تمہیں بتایا ہے وہ سونہیدہ کی
جہی توہری دیہ پہلے کبیر احمد خود یہ انکشاف کر کے کیا
ہے کہ اچھو لگ بھگ ایک سال سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا
اور یہ کہ وہ اس کا گناہ کیا نہیں۔“

”جناب! میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ اچھو شاہ پور کا
بہنے والا ہے۔“ وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔
”اور بڑے لطف آلہ و کھٹائی والے بناتا ہے۔ اس سے

فریاد ہوئے چھپ چھپ کس تھا۔
 "میں تم سے، اس سے زیادہ کچھ پوچھوں گا بھی نہیں،
 تم کو انشاء پریشان ہونے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے
 سمجھا نے والے انداز میں کہا۔ "اس وقت یہ بات زیادہ
 اہم نہیں کہ اس چور کبیر احمد کا ساگ بیٹا تھا یا نہیں۔"
 "پھر کون کی بات اہم ہے گی؟" وہ الجھن زدہ نظر
 سے مجھ کو دیکھنے لگا۔

”اچھا چاہتے ہیں، غائب ہو گیا ہے، اپنی چھابڑی سمیت۔“ میں نے تنقیدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ایک دن بعد اللہ رکھا کی بیٹی صندل کو دو ڈاکوؤں نے رات کی تاریکی میں اغوا کر لیا۔ یہ کہیں ایک علی حسینی کی کڑیاں تو نہیں ہیں فیض محمد؟“

”سوہنار بھئی بہتر جانتا ہے جناب“۔۔۔۔۔ وہ سادگی سے بولا۔

”سوہنار تو ہمیشہ سب سے بہتر ہی جانتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی فیض محمد“ میں نے پورے احماد سے کہا۔ ”لیکن اس نے سوچے اور سمجھے کے لیے ہمیں بھی دماغ دیا ہے لہذا ہم بھی بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ میں تم سے یہ ساری باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ تم مجھے ایک مکمل مائنس انسان اور اللہ رکھا کے سچے پیروکار نظر آو۔ جو تم بھی یہی چاہتا ہو کہ اللہ رکھا کا بیٹا بن جائے۔“

”ہاں! جناب ا“ وہ جلدی سے اشتات میں گردن جاتے ہوئے بولا۔ ”آپ“ تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری اپنی بیٹی کو لاکھوں نے اغوا کر لیا ہو۔“

اس معاملہ سے اس حوالے سے پوچھ چڑھ کر ان کا یقین کم اس قدر ہو گیا ہے کہ ان کی طرف سے اس کی کوشش کرنا۔ یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے۔"

”آپ نے غر ہو جا میں جناب۔“ وہ غاسے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں اللہ کو کھارے کہ حقیقت انکاروں گا۔“

”اگر اچھو مندل سے ایک دن پہلے اچھا تک غائب ہو گیا ہوتا تو اسے شامل کش کر کے بہت چم اگڑا دیا جاسکتا تھا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب تو یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو گیا ہے۔“ میں نے لمبے بھر کے لیے توقف کیا تو فیض محمد سہواری نظر سے بچھڑے ہوئے نظر آئے۔

اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھا کر دے ہوئے کہا۔

”مجید بھی اور خاصاً خطرناک بھی۔ اللہ رکھا اور اس کی مہر والی مٹکی مندل کے کسی بھی حرو کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ دوسری جانب ڈاکوؤں کے الفاظ بھی جیسے یاد ہوں گے۔ وہ مندل کو کھانا کر لے جانے کی نیت سے اللہ رکھا کے کوارٹر میں نہیں تھے تھے بلکہ انہیں کسی ٹیلی فونی کی تلاش تھی جو ان ڈاکوؤں کے مطابق تاجا نامی کسی شخص سے مندل کو دی تھی۔ مندل نے جب تاجا اور نکیل فونی سے اپنی لاپرواہی کا اظہار کیا تو وہ یہ کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ باقی کی پوچھو کچھ وہ مندل کو تاجا کے سامنے بٹھا کر کریں گے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ تاجا اس وقت ان کے قبضے میں تھا۔“

”قہانے دار صاحب!“ فیض نے سرسری
 ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں یہ اچھو اور تاجا ایک ہی شخص کے
 دو نام نہیں؟“

”ایسا ہو سکتا ہے“ میں نے سناٹے نظر سے اس کی
 طرف دیکھا۔ ”کیونکہ کبیر احمد بھی اچھو کے ماضی سے پوری
 طرح واقف نہیں۔ ممکن ہے، اس کے پاس آنے سے پہلے“

”یہ تو بڑا ہی الجھا ہوا معاملہ نظر آ رہا ہے
جناب! فیض محمد کے چہرے پر فکر مندی چمکتی تھی۔
”ہاں، ابھی تک تو الجھا ہوا ہی ہے۔“ میں نے
مُڑ سوچ آغاز میں کہا۔ ”لیکن میں بہت جلد اس معاملے کو
سنبھالوں گا۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر مجھے اللہ رکھا کی آمد کی
اطلاع دی گئی۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلایا۔ اس نے
میرے پاس پہنچ کر ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اسے

بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی پہنچ کر بیٹھ گیا۔ فیض محمد کو پہلے سے میرے پاس موجود یا کردہ ایک بسے کے لیے چونکا ضرور تھا تاہم اس نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”اور سناؤ اللہ رکھا۔ جہاڑی ڈیوٹی کیسی چل رہی ہے؟“

”ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے جناب!“ وہ پر مردہ سی آواز میں بولا۔ ”ہر حال میں کرنی ہے۔ نہ تو تینیں رک سکتی ہیں اور نہ ہی میری ڈیوٹی، چاہے دنیا میں کچھ بھی ہوتا رہے۔“

ہات کے اختتام پر اس نے اپنی آنکھوں کے نم ہوتے گوشوں کا ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور امید بھری مگر شکستہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ کے ملبوم کو بہت گہرائی تک پڑھ لیا اور کئی بخش لکچھے میں کہا۔

”اللہ رکھا! مایوسی گناہ ہے۔ اس کی رحمت سے ہر حال میں امید رکھنا چاہیے، وہ بڑا منتوازا ہے۔“

”میں مایوس نہیں ہوں جناب۔ پر کیا کروں۔“

وہ روہائی آواز میں بولا۔ ”صنڈل کا چہرہ بار بار لگے ہوں گے سامنے کھم جاتا ہے۔“

”ایک سرائی ملا ہے مجھے۔“ میں نے اس کے چہرے پر لگا دھماکے ہوئے کہا۔

”سراغ۔“ اس کی دیران آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ ”کیسا سراغ تھانے دار صاحب۔“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا آپ نے میری صنڈل کا پتہ چلا لیا ہے؟“

”کسی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے۔“ میں نے۔

”دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جہاڑی تینیں ڈالیں تھانے دار صاحب!“ وہ اضطرابی لکچھے میں بولا۔ ”بتائیں، آپ کو صنڈل کے پارے میں کون سا سراغ ملا ہے۔ میرے۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔“

”جب ڈاکو تمہارے کوارٹر میں مجھے تھے تو انہوں نے کسی تاجا اور نیلی پونٹی کا ذکر کیا تھا۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے لکچھے میں کہا۔ ”کیا تھا یا نہیں؟“

”جی۔ کیا تھا۔“ وہ ابھین زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”نیلی پونٹی تو ابھی تک ممانی ہوئی ہے۔“ میں نے نفسیاتی حربے کو دھیرے دھیرے آزمانے کا عمل جاری رکھا۔ ”لیکن میں نے تاجا کا کھونج لگا لیا ہے۔“

”تک۔ کون ہے وہ۔“ وہ ہٹکا کر رہ گیا۔

”تم بھی اسے جانتے ہو۔“ میں نے سختی خیر انداز میں کہا۔

”میں۔“ اس کی آنکھوں میں ابھیرنے لگی چمک فیض محمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تھانے دار صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔“

میں نے اللہ رکھا کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی صنڈل کی تصویر کو اپنی میز کی درواز میں رکھ دیا تھا۔ میں نے مذکورہ تصویر اللہ رکھا کو دکھانے کے لیے درازی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

فیض محمد نے اللہ رکھا کے سوال کے جواب میں کہا۔

”پتا نہیں یار۔ ابھی تمہارے آنے سے پہلے تھانے دار صاحب مجھ سے بھی ملکی بات کر رہے تھے۔“

”یہ تصویر دیکھو اللہ رکھا۔“ میں نے صنڈل کی تصویر اس کی جانب سرکا دی۔

اس نے مذکورہ تصویر دیکھی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ”یہ تو میری بیٹی۔ میری صنڈل کی تصویر ہے۔“

”تم نے اپنی بیٹی کی تصویر کو ابھی طرح پہچان لیا ہے۔“

”جی۔ صنڈل کو میں نہیں پہچانوں گا تو پھر کون پہچانے گا۔“

”بتا ہے، یہ تصویر مجھے کہاں سے ملی ہے؟“

”پہنیں!“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تاجا کے سامان میں سے۔“ میں نے نفسیاتی ٹرینٹ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم مجھے بتاؤ گے کہ جہاڑی بیٹی کی تصویر تاجا کے پاس کیسے پہنچی، تم تو کسی تاجا کو جانتے ہی نہیں۔“

میری اس نوعیت کی پوچھ گچھ کا مقصد ہرگز اللہ رکھا کو ہراساں یا پریشان کرنا نہیں تھا۔ وہ بے جا رو تو پہلے ہی بے حد پریشان تھا۔ میں دراصل کوئی ایسا سراغ لگانا چاہتا تھا جو صنڈل کی تلاش میں میرے لیے مددگار ثابت ہو سکتا۔ ابھی تک جو حالات منظر پر آئے تھے وہ میرے لیے اطمینان بخش نہیں تھے۔ یہ شیک ہے کہ وہ ڈاکوؤں نے، دوروز پہلے اللہ رکھا کی بیٹی صنڈل کو رات کی تاریکی میں اغوا کر لیا تھا۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ ڈاکو ہاں صنڈل کے لیے نہیں بلکہ کسی نیلی پونٹی کی تلاش میں آئے تھے جو تاجا نے صنڈل کو دی تھی۔ صنڈل کو وہ پوچھ گچھ کرنے کے لیے اٹھائے گئے تھے اور جاتے جاتے یہ اعتراف بھی کر گئے تھے کہ تاجا ہاں انہی کے پاس ہے۔ اس صورت حال میں صنڈل کے ساتھ کسی مرد کا کشن لازمی شہر تاجا چاہے وہ تاجا ہو یا کچھ۔ صنڈل کی تصویر کا اچھو کے سامان سے برآمد ہونا اور صنڈل

کے اغوا سے ایک دن پہلے اچھو کا غائب ہونا تاجا اس زنجیر کی سڑکوں کو ملتا نظر آتا تھا۔ اگرچہ ابھی تک میرے ہاتھ ایسا کوئی سراغ نہیں لگا تھا کہ میں واقعی کے ساتھ کھسکا۔

دراصل تاجا اور اچھو ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔

”لیکن یہ تاجا ہے کون؟“ اللہ رکھا کی سچے سے مشابہ آواز میری ساعت سے ٹکرانی۔ ”اگر آپ نے اس کے سامان میں سے صنڈل کی تصویر ڈھونڈ لگائی ہے تو اسی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ اس نے یہ تصویر کہاں سے حاصل کی۔ میں کسی تاجا کو نہیں جانتا۔“

”جی تو مصیبت ہے۔“ میں نے لکچھے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ سوال میں فی الحال تاجا سے کر نہیں سکتا کیونکہ۔“

میں نے دانستہ جملہ احوال چھوڑ کر اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ اضطرابی لکچھے میں مضطرب ہوا۔ ”کیونکہ۔ کیا جی؟“

”کیونکہ۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ صنڈل کے اغوا سے ایک دن پہلے اچھو کا کہیں کم ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ڈاکوؤں کی بات درست ہی نظر آتی ہے کہ تاجا جان کے پاس ہے۔“

”لیکن اس سارے معاملے سے میری صنڈل کا کیا تعلق؟“ وہ پھر تکی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اسے کس جرم کی عزا دی جا رہی ہے؟“

”اللہ رکھا!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں صرف صنڈل اور تاجا کے باہمی تعلق کی تصدیق چاہتا ہوں۔ باقی معاملے سے میں خود ہی فٹ لوں گا۔“

”آپ قرآن پاک لا کر میرے سر پر رکھ دیں جناب۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، میں کسی تاجا سے واقف نہیں ہوں۔“

”اچھو سے تو واقف ہونا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آلو لڈو کھائی والے اچھو سے جہاڑی شہر پور میں رہتا ہے؟“

”جی۔ جی۔ اس کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گروں پلاتے ہوئے بولا۔ ”بڑا ہی جیابندہ ہے وہ۔“

”یہ جیابندہ صنڈل کے اغوا سے ایک دن پہلے کم ہو گیا تھا اور ابھی تک گمشدہ ہے۔“ میں نے ضمیر سے ہوئے لکچھے میں کہا۔ ”صنڈل کی تصویر اسی کے سامان میں سے

برآمد ہوئی ہے۔ آج صبح شاہ پور سے کیر احمد اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا۔ یہ تصویر بھی اسی نے مجھے دی ہے۔“

”اوہ۔“ اللہ رکھا نے انہو سناتے انداز میں گروں پلائی۔ ”جی میں کہوں، وہ اتنے دن سے کہاں غائب ہے۔ وہ تو روزانہ گھیرتی لگنے آتا تھا۔ ہم اس سے سو سے اور آلو لڈو کھائی والے خرید کر لیتے تھے۔ بڑا ہی شریف اور بھلا ماں بندہ ہے جی۔“

اللہ رکھا نے ایک بار پھر اچھو کی تعریف کی تو مجھے یہ سمجھے میں ذرا بھی وقت محسوس نہ ہوئی کہ اچھو صنڈل کے ساتھ ساتھ اللہ رکھا کو بھی اپنے شیشے میں اتار چکا تھا۔ خاصا کارنگ معلوم ہوتا تھا۔

”تمہارا یہ جیابندہ اچھو بڑی بیانی سے تمہاری بیٹی صنڈل کے ساتھ محبت کا کھیل کھیل رہا تھا اللہ رکھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور مجھے شک ہے کہ وہ اچھو نہیں

Alternative & Integrated medicine

فرقشی کورس برائے مرد حضرات

مردوں میں جڑو حوالی کی اور کڑواری کودور کر کے اولاد پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقوی و مکمل ہے

شادی کورس

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے زکمل شدہ توانائی کی بحالی کا مستقل اور مکمل کورس۔ انشا اللہ کسی قسم کی کمی اور عروزی محسوس نہ ہوگی

ازدواجی کورس

شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی قوت کا فوری اور مستقل علاج۔ کامیاب اور ازدواجی زندگی کے لئے موثر ترین کورس

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین

نزدیک بڑے گڑگڑ، نزدیکی، لاہور

03215528001, 03006653456

email: info@shahinclinic@gmail.com

www.shahinclinic.com

بلکہ "تاجا ہے!"

"جی۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میری تو اس سے اکثر بات ہوتی تھی۔ وہ مجھے اپنے اور اپنے باپ کبیر احمد کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ وہ تاجا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کی بات کو میں بالکل نہیں سمجھ سکا جناب۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے بڑی رسماً سے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ میں کون ہوں، اچھو کبیر احمد کی کیا ہے؟"

"جی، اچھو نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"وہ کب سے ادھر پھیری لگائے آ رہا ہے؟"

"کوئی سال، سو سال ہوا ہے جناب۔" اس نے بتایا۔

"اچھو کی عمر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے اللہ رکھا؟"

"میں جی نہیں اور میں کے درمیان ہوگی اس کی عمر۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ سال، سو سال سے سو سے اور آلودہ کھٹائی والے سچ رہا تھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے وہ پچیس سال کیا کرتا رہا ہے اس کے بارے میں بھی اچھو نے مجھے کچھ بتایا کہ نہیں؟"

"نہیں جی۔" اس نے ٹہنی میں گردن ہلائی۔ "نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتایا۔"

"تم پوچھتے بھی تو وہ بھی نہ بتاتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ وہ سال، سو سال پہلے ہی شاہ پور پہنچا تھا اور کبیر احمد کا پوتا بننا تھا۔"

"یہ بتانا تھا؟ اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔ "کیا وہ کبیر احمد کا پوتا نہیں ہے؟"

"نہیں؟" میں نے اٹل سہجے میں کہا۔ "یہ ساری کہانی کبیر احمد مجھے سنایا ہے اور مجھے یقین ہے وہ اچھو نہیں بلکہ وہی تاجا ہے جسے ڈاکوؤں نے صندوق سے ایک دن پہلے کم کر دیا تھا۔ وہ تاجا سے کسی نیلی پوٹی کو حاصل کرتا چاہتے تھے۔ یقیناً اس نے ڈاکوؤں کو بتایا ہوگا کہ اس نے نیلی پوٹی صندوق کو دی ہے یہی انہوں نے تمہارے کوارٹر پر دھاوا بولا تھا اور پوٹی کی تلاش میں ناگامی کے بعد وہ تمہاری بیٹی کو ہاتھ کر لے گئے ہیں۔"

"ادھر سے خدا یا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ "میں۔۔۔ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"تم پر یہ مصیبت تمہاری بیٹی کی وجہ سے نازل ہوئی ہے اللہ رکھا!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "صندوق نے

لفظی یا ہادائی میں ایک ایسے آدمی سے دل لگا لیا تھا جو خطرناک ڈاکوؤں کو مطلوب تھا۔ بس، یہ سب اسی دل کی کیا دھرا ہے۔ اچھو تمہارے ساتھ اسی لیے ملوث ہو گیا تھا۔ کیا کرتا تھا کہ صندوق کے ساتھ اس کا معاملہ بن رہا تھا۔"

"اب۔۔۔ اب کیا ہو گا جی؟" اس نے شکر ادا میں مجھے دیکھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بدترین حالات میں بھی پورے یقین کے ساتھ اسے تسلی دی۔ "تم پریشان نہ ہو اور جا کر اپنی گھر والی کو بھی تسلی دو۔ میں اللہ اللہ جلد صندوق کو ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"اللہ آپ کو حیا دی دے گی۔" وہ دعا سے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "اب اگر وہ کے گاؤں دیہات میں تو حاشا کر لیا گیا ہے۔ اب میں اپنی تعینات کے دائرہ کار پر مہم رہا ہوں۔ ڈاکوؤں کی تلاش میں نہیں جاسکتے۔"

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اللہ رکھا اور فیض محمد کو مل دلا سادے کرتھانے سے رخصت کر دیا۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ پچھلے تین چار روز میں، میں نے صندوق اور ڈاکوؤں کی تلاش کے سلسلے میں جو بھی کارروائی کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی البتہ یہی ایک حقیقت ہے کہ اس دوران میں "اچھو آلودہ کھٹائی والے" کے حوالے سے جو افشائات ہوئے تھے، چاہے وہ صندوق کے بارے میں ہوں یا کبیر احمد سے متعلق وہ وہاں اور سستی خیر تھے اور انہی افشائات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں۔۔۔ اچھو وہی تاجا تو نہیں جس کی ڈاکوؤں کو تلاش تھی۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگلے روز میں ایک دوا اٹھانوں گا ساتھ لے کر خود تھانے سے نکلوں گا پھر جراثیم کو منظور ہو۔

☆ ☆ ☆

آئندہ روز مطلع ابر آلود تھا تاہم ابھی آسمان نے رونا دھونا شروع نہیں کیا تھا۔ میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں آیا اور کاشییل محمود کو اپنے پاس بلا دیا۔ محمود نہایت ہی جانت و پختہ انداز میں ابھرا تھا۔ میں اس کی معاملہ بھی کا بھی قائل تھا۔

"جی ملک صاحب۔" وہ میرے پاس آکر ٹانگی سے بولا۔

"میں ابھی اور اسی وقت لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ضروری تیاری کرلو۔ تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔"

وہاں شام تک ہوگی۔"

"جانا کہاں ہے ملک صاحب؟" محمود نے پوچھا۔

"منزل کا صحن بعد میں کریں گے البتہ مقصد ملے شہ ہے، صندوق اور ڈاکوؤں کی تلاش میں نے گہری جستجو کی ہے کہ۔۔۔ ہمیں سڑک سے ہٹ کر کھیتوں اور کھیلوں میں بھی سفر کرنا ہوگا لہذا میرا خیال ہے کہ گھوڑوں کی سواری زیادہ موزوں رہے گی۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" وہ اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "میں دس چھترہ منٹ میں دو سو گھوڑوں کا بندوبست کرو دیتا ہوں۔"

"گھوڑوں کے ساتھ ہی اس امر کو بھی یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ اگر اچانک بارش شروع ہو جاتی ہے تو ہمارے پاس بچاؤ کا کیا انتظام ہوگا؟"

"جی، میں سمجھ گیا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں۔"

میں محمود کی طرف سے بے فکر ہو گیا اور حوالہ دار ارشاد کو اپنے پاس بلا دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج کا پورا دن میں تھانے سے باہر رہوں گا لہذا میری غیر موجودگی میں تھانے کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ ارشاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ ارشاد ایک ڈسے دار شخص تھا۔

لگ بھگ دس بجے میں اور کاشییل محمود دو گھوڑوں پر سوار ہو کر تھانے سے نکل پڑے۔ آسمان پر گہرے بادل بھائے ہوئے تھے۔ بجلی بجلی ہوا میں چل رہی تھی۔ فضا میں کھنکھریاتی بجلی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ رکھا اور اس کی گھر والی کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ وقوعہ کی رات ڈاکو صندوق کو اغوا کرنے کے بعد کس طرف لے گئے تھے۔ میں نے بھی اسی سمت میں سفر کا آغاز کیا۔

یہ ایک بگنی سڑک تھی جو جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف جاتی تھی۔ ریلوے چھانک سے لگ بھگ تین میل آگے جا کر یہ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی اور اپنا رخ تبدیل کرتے ہوئے جنوب مغرب کی جانب مڑ جاتی تھی اور ڈاکو فرنگ بھگ جیسے میل آگے ایک سرحدی گاؤں چکسچون پہنچا کر ختم ہو جاتی تھی۔

میرے اور کاشییل محمود کے درمیان صندوق اور اچھو کے حوالے سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آلودہ کھٹائی والے اچھو سے وہ بھی واقف تھا تاہم اس کی چٹ پٹی اور حمرے دار "پروڈکشن" کھانے کا محمود کو بھی اتفاق

نہیں ہوا تھا۔

وہ لگ بھگ گیارہ بجے کا وقت تھا جب ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ہم لوگ بگنی سڑک پر کم و بیش دو میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ یعنی نہر والے پہل تک پہنچنے میں ایک میل کا فاصلہ باقی تھا۔ مجھے سامنے وہ کاشییل کا آنکھ نظر آیا جسے میں نے صندوق کی سابق سرسراہ یعنی جمال پور کی طرف روانہ کیا تھا۔ موقع جمال پور ریلوے چھانک سے تین میل کی دوری پر واقع تھا اور نہر کے پل سے اس کا فاصلہ لگ بھگ ایک میل کا رہا ہوگا۔

کاشییل کا چہرہ جھٹکایا ہوا تھا جو اندرونی جوش و خروش کی خبر دیتا تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے گھوڑا روک لیا اور باری باری ہم دونوں کو دیکھنے کے بعد بولا۔

"ملک صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم کہاں جا رہے ہیں تو میں بعد میں بتاؤں گا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم اپنی سادہ۔۔۔ میں نے تمہیں جس کام سے بھیجا تھا اس کا کیا ہوا۔ اور یہ تمہارے حواس کیوں خطا ہو رہے ہیں؟ لگتا ہے تم نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہے۔"

کاشییل حیرت آمیزہ دھن کر بگل سا ہوا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "جناب! جس کام سے آپ نے مجھے بھیجا تھا اس کا تو کچھ پتا نہیں چلا مگر ادھر نہر کے پل کے قریب آج صبح ایک آدمی کی لاش ملی ہے۔ میں ابھی ادھر سے آ رہا ہوں۔"

میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ "کس کی لاش؟"

"ملک صاحب! اس آدمی کا نام اچھو ہے۔" حیرت آمیزہ دھن میں بولا۔ "وہ بندہ جو ہمارے علاقے میں آلودہ کھٹائی والے بننا تھا۔"

"اوہ۔۔۔!" میں نے اور کاشییل محمود نے یک دیک ایک دوسرے کو دیکھا پھر میں نے کاشییل حیرت سے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں موقع جمال پور بھیجا تھا۔ تم نہر کے پل کی طرف کیا لینے گئے تھے۔" کاشییل توقف کے بعد میں نے اضافہ کر دیا۔ "ابھی تم نے بتایا ہے کہ جائے وقوعہ سے آ رہے ہو؟"

ریلوے چھانک سے نہر کا پل اور موقع جمال پور ایک جیسی دوری یعنی لگ بھگ تین میل کے فاصلے پر واقع تھے تاہم دونوں کی سمت اور رخ میں اچھا خاصا فرق تھا اور جمال پور نہر کے پل کے چھ کم و بیش پانچ سو ایک میل کا فاصلہ حاصل تھا۔ جمال پور سے ایک کپڑا سٹیکل کس بگنی سڑک سے مل جاتا تھا جس پر اس وقت ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے تاہم

جنگی مزک اور کچے راستے کا ملاپ مل سے آدھا میل پہلے ہی ہو جاتا تھا یعنی اگر ریلوے پھاٹک کی طرف سے آئیں تو لگ بھگ دو حائل میل کے بعد مزک سے دو راستے نکل کر جمال پور گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ کاشمیل حقیقہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب ابا ت دراصل یہ ہے کہ میں تو آج صبح جمال پور سے واپسی کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن جب میں تھوڑا سا ہی آگے آیا تو مجھے پتا چل گیا کہ ادھر نہروالے مل کے قریب کھیتوں میں کسی بندے کی لاش پڑی ملی ہے۔ اندرونی جیس جسے کھینچ کر جانے دو کہ کی طرف لے گیا۔ بس اتنی ہی بات ہے۔“ ذرا دیر کو کر اس نے ایک بوہمیل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جب میں وہ قعر پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لاش اچھو آلودہ کھٹائی والے کی تھی۔ اس علاقے میں اچھو کو کوئی نہیں جانتا لیکن میں نے فوراً پیچان لیا۔ وہ ہمارے علاقے میں چھاپڑی سر پر اٹھائے ”آلودہ کھٹائی والے“ کی آوازیں لگتا پھر جاتا تھا۔“

”تم اس کی لاش کو دیکھ کر فوراً یہ تو پیچان گئے کہ وہ اچھو تھا۔“ میں نے فطرت سے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ وہ اچھو آلودہ کھٹائی والا نہیں بلکہ تاجا تھا۔ وہی تاجا جس کی وجہ سے ڈاکوؤں نے اللہ رکھا چھاٹک والے کی بیٹی حسد کی کورس کی تاریکی میں اغوا کر لیا تھا۔“

”ملک صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ حقیقہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے غصوں انداز میں کہا۔ ”آؤ، جانے دو کہ کی طرف پلٹے ہیں۔ باقی کی باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔“

اس کے بعد ہم اپنے ٹھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے نہر کے پل کی جانب بڑھنے لگے جو وہاں سے کم و بیش ایک میل کی دوری پر تھا۔ گزشتہ روز ابھی خاصی اور چمکی دھوپ تھی مگر لہذا مزک خشک ہو گئی تھی۔ اگر راستہ نکلا ہوتا تو ہمیں ٹھوڑوں کو بچانے میں اچھی خاصی مشکلات پیش آسکتی تھیں۔

اگرچہ ابھی تک ایسا کوئی غصہ شیت یا واقعاتی شہادت میرے ہاتھ نہیں لگ سکی تھی جس کی بنیاد پر میں دعوے سے کہہ سکتا کہ اچھو اور تاجا ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں لیکن اندر سے مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہے۔

جلدی ہم جانے دو کہ پر پہنچ گئے۔ وہ مقام نہر کے پل کے قریب ہی تھیں میں واضح تھا۔ وہاں پر درجن بھر

افراد بھی جمع تھے جو اپنی اپنی منزل کے مطابق چھوٹے چھوٹے میں مصروف نظر آتے تھے۔ میں نے سب کو جیسے جیسے ہٹا دیا لاش کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

اچھو (تاجا) کا پورا بدن زخموں سے چھرا تھا۔ اسے بڑی اذیت دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ میں اس کی موت کے حوالے سے تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا ہی جان لینا کافی ہو گا کہ وہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔ کاشمیل حقیقہ اور محمود نے اسے اچھو آلودہ کھٹائی والے کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔

میں نے سوچ پر موجود افراد سے بھی پوچھ چھگئی۔ ان میں سے کوئی بھی اچھو کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس کی موت کے سبب سے واقف تھا۔ اچھو کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ اسے پچھلی رات موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس کا قتل جانے دو کہ پر نہیں ہوا تھا یعنی اسے کسی اور مقام پر قتل کرنے کے بعد وہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔ اگر میں اس ”مقام“ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا تھاں اچھو کو زندگی سے محروم کیا گیا تھا تو اس کے تانوں تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ ویسے مجھے اس محاورے سے کئی طور پر اتفاق نہیں کیونکہ ڈھونڈا صرف اسی شے کو جاتا ہے جو ہم ہو گئی ہو۔ خدا کی ذات تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اسے اپنی ذات سے باہر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کبھی کوئی غلط فہمیت کے ساتھ ایک بار اپنے من میں ہماٹ کر دیکھے تو اس کی چشم بینا کو پھر کسی اور چیز کی حسرت نہیں رہے گی۔

بہر حال اس مقام کی تلاش بہت ضروری تھی جہاں پچھلے دو دو حائل دن سے اچھو آلودہ کھٹائی والے کو رکھا گیا تھا۔ میں نے گرد و پیش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”محمود! میں تھوڑا آگے جانا چاہتا ہوں۔“

کاشمیل محمود نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہ اندازہ لگنے کی کوشش کی کہ میں کس جانب کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب اس کی سمجھ میں نہ آتا تو مجھ سے پوچھا۔

”کس طرف جا رہے ہیں ملک صاحب؟“

”جدا رہے پکارا راستے جانے۔“ میں نے نہر کے پل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

”اوکے ملک صاحب!“ اس نے اپنا ٹھوڑا میرے گھونے کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا کہ۔

ہم ٹھوڑوں پر سوار، پیلو پیلو پیلو سوار کرتے ہوئے نہر کے پل پر پہنچے پھر گورہ ملی کو عبور کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس مٹی مزک کا اختتام ایک سرحدی گاؤں تک پہنچا۔

واقع تھا۔ میرے ذہن میں کافی دیر سے یہ سوال پھر رہا تھا کہ اچھو یا تاجا کی لاش کو وہاں کھینچنے والے کون تھے اور انہوں نے پچھلے دو دو حائل دن اسے کہاں رکھا تھا یا اگر آلودہ کھٹائی والے جیسے والا اچھو ہی بنا جاتا تھا تو یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ اسے بھی انہی ڈاکوؤں نے اغوا کیا ہو گا جنہوں نے حسد کو اغوا کیا تھا۔ میں سوچ پر موجود لوگوں سے خاصی تفصیل پوچھ چھگ کر چکا تھا۔ ان میں سے متقول اچھو کو کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی حسد کو دیکھا ڈاکوؤں سے کوئی واقف تھا۔

اچھو کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ اسے پچھلی رات موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اس کا قتل جانے دو کہ پر نہیں ہوا تھا یعنی اسے کسی اور مقام پر قتل کرنے کے بعد وہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔ اگر میں اس ”مقام“ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا تھاں اچھو کو زندگی سے محروم کیا گیا تھا تو اس کے تانوں تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔

کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ ویسے مجھے اس محاورے سے کئی طور پر اتفاق نہیں کیونکہ ڈھونڈا صرف اسی شے کو جاتا ہے جو ہم ہو گئی ہو۔ خدا کی ذات تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اسے اپنی ذات سے باہر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کبھی کوئی غلط فہمیت کے ساتھ ایک بار اپنے من میں ہماٹ کر دیکھے تو اس کی چشم بینا کو پھر کسی اور چیز کی حسرت نہیں رہے گی۔

بہر حال اس مقام کی تلاش بہت ضروری تھی جہاں پچھلے دو دو حائل دن سے اچھو آلودہ کھٹائی والے کو رکھا گیا تھا۔ میں نے گرد و پیش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”محمود! میں تھوڑا آگے جانا چاہتا ہوں۔“

کاشمیل محمود نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہ اندازہ لگنے کی کوشش کی کہ میں کس جانب کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب اس کی سمجھ میں نہ آتا تو مجھ سے پوچھا۔

”کس طرف جا رہے ہیں ملک صاحب؟“

”جدا رہے پکارا راستے جانے۔“ میں نے نہر کے پل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

”اوکے ملک صاحب!“ اس نے اپنا ٹھوڑا میرے گھونے کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا کہ۔

ہم ٹھوڑوں پر سوار، پیلو پیلو پیلو سوار کرتے ہوئے نہر کے پل پر پہنچے پھر گورہ ملی کو عبور کر کے آگے بڑھ گئے۔ اس مٹی مزک کا اختتام ایک سرحدی گاؤں تک پہنچا۔

جا کر ہوتا تھا۔ اس چمک کے بعد دوسرا ضلع شروع ہو جاتا تھا۔ میرے تھانے سے باہر سمجھ لیں ریلوے پھاٹک سے چمک چن لگ بھگ بائیس بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم اس سفر کے دوران میں بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ محمود نے مجھ سے کہا۔ ”ملک صاحب! اگر ہم اسی مزک پر آگے بڑھتے رہے تو شاید ہم تک چمک چن بھی جا سکیں گے۔“

”میرا چمک چن جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے محمود! میں نے گہری تنبیہ کی ہے کہ۔“ اس تھوڑا گھم بھم کر میں اس علاقے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پھر ہم واپسی کا رخ کریں گے۔“

چمک بات تو یہ ہے کہ مجھے خود کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ بس اندر سے کوئی اچھا ہی قوت سمجھا رہی تھی کہ مجھے جانے دو کہ کے ارد گرد کے علاقے کا باریک بینی سے جائزہ لینا چاہیے اور میں یہی کر رہی رہا تھا۔

جانے دو کہ سے کوئی دو فرلانگ آگے آئے تھے کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ گاؤں دیہات اور کھیت کلیان میں کسی کتے کا بھونکنا کوئی اچھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے چوتھے کا سبب ان کی آوازی شدت اور تسلسل تھا۔ وہ مخصوص گے کے ساتھ بھونک رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی غیر معمولی شے دیکھ لی ہو اور انسانوں کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”محمود! یہ کیسی آواز ہے؟“ میں نے اپنے ساتھی کاشمیل سے استفسار کیا۔

”ملک صاحب۔ یہ تین چار کتوں کے بھونکنے کی آواز ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی فقیر کا بچھا کر رہے ہوں۔“

اس نے کافی حد تک متقول جواب دیا تھا کتے عموماً ایسا کرتے ہیں لیکن محمود کے جواب سے میری تسلی نہ ہو سکی اور میں نے اس جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے انہیں زدہ لہجے میں کہا جدھر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔

”جہیں محمود۔ مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔“

اس گفتگو کے دوران میں ہمارا سفر بھی جاری تھا۔ وہ متاصل انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”کوئی اور معاملہ کیسا ملک صاحب؟“

”جب کتے کسی گداگر کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر ان کی ”بھوں بھوں“ نہیں سنا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یا تو وہ انہیں اپنی لامٹی دکھا کر بھگانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر زمین سے کوئی پتھر وغیرہ اٹھا

دھک دھک دل سے بول... مَرَحَبَا اسپغول

مرحبا اسپغول بدن میں لائے طاقت اور جستی کیونکہ جب نہ ہو تیز ایبتہ
معدے کی جلن اور کولیسرول بھی ہو کہ تو آپ دیر دلت اور سارٹ ہمیشہ



f Marhaba Laboratories

UAN: 111-102-152

www.marhaba.com.pk

نیم وا تھا۔ میں نے محمود کی طرف دیکھا اور کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی دروازے کے پاس پہنچا، میری سماعت نے سسکیوں کی آواز سنی۔ محمود کی میری تھلید میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن جلاستے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب! کمرے کے اندر کوئی عورت مصیبت میں لگی ہے۔“

اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ سسکیوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا عجز کسی خاتون کے سوا اور کوئی نہیں ملتا۔ عورت کا خیال آتے ہی میرا دھیان آپول آپ اللہ رکھا کی مٹوی پٹی صندل کی طرف چلا گیا۔ میں نے سرہن ریل اور کال لیا اور گرج دار آواز میں پکارا۔

”کون ہے کمرے کے اندر؟“

”میں ہوں۔“ کسی عورت کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔

وہیے تو کتوں کی مسلسل ”بھول بھول“ نے یہ راز کھول دیا تھا کہ کمرے کے اندر ایسا کوئی شخص موجود نہیں تھا جو آسانی سے حرکت کے قابل ہو ورنہ وہ باہر نکل کر انہیں دھکا دے گا۔ لیکن پھر بھی احتیاط اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ اندر داخل ہونے سے پہلے کھلی کر لی جائے۔

”تمہارے ساتھ اور کتنے افراد ہیں؟“ میں نے تھکاتے انداز میں پوچھا۔

”کتنی ہوئی آواز میں جواب دیا گیا۔“ ملک کوئی نہیں۔ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالیں۔ تم جو کوئی بھی ہو، جمہیں اللہ رسول کا واسطہ۔“

”کیا تم اللہ رکھا کی بیٹی صندل ہو؟“ میں نے کمرے کے اندر قدم رکھنے سے پہلے پوچھا۔

”جی۔ میں صندل ہی ہوں۔“

انگلی ہی تھمے میں کمرے کے اندر تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ انشیل محمود مجھ سے پیچھے رہ جاتا۔ وہ بھی چلک جھپٹنے میں میرے ساتھ کھڑا تھا۔ کمرے کے اندر وہی منظر نے ہمیں شرمسار کر کے رکھ دیا اور ہم آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کمرے کے فرش پر پراں بچھا کر اسے بیٹھے اور سونے کے قابل بنا دیا گیا تھا اور اسی پراں پر کمرے کے ایک کونے میں صندل نیم برہنہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کے

کر مارتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ کتے یا تو اس کا تعاقب چھوڑ دیتے ہیں یا پھر بھونکتے ہوئے اس کے پیچھے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں لیکن۔۔۔ میں نے لمبی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن پچھلے دس منٹ سے، ایک ہی جگہ سے ان کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ کیا تم نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے محمود۔۔۔“

”آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں ملک صاحب!“ وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ بدبخت ایک ہی جگہ کھڑے بھونکے جا رہے ہیں۔“

”جیسے فوراً وہاں پہنچ کر ان کے بھونکنے کا سبب جاننا ہوگا۔“ میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں آس پاس کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی اسی لیے ابھی تک کسی نے ان کے بھونکنے کی طرف توجہ نہیں دی۔“

ہم تقریباً گھوڑوں کو بھاگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی کیتوں کے پتوں میں ایک چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز ابھی اسی سمت سے آ رہی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر واضح ہوا کہ وہ عمارت دراصل ایک کمرہ تھا جو جلی سڑک سے تھوڑا بہت کرکیتوں کے درمیان بنا ہوا تھا۔ کتے بھی، میرے اندازے کے مطابق، اس کمرے کے آس پاس ہی کھیں موجود تھے اور لگا تار بھونک کر کسی خاص معاملے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس صورت حال نے مجھے یہ چین کر دیا۔ اندر سے مسلسل ایک آواز اٹھ رہی تھی کہ کسی شہسی خیر منظر سے میرا واسطہ پڑنے والا ہے۔ ہم گھوڑے دوڑاتے ہوئے مذکورہ کمرے کے قریب پہنچے تو تین کتے بھی نظر آ گئے جو کمرے کے دروازے کی طرف متاٹھا کر بھونکے جا رہے تھے۔ یہ مقام تھرو والے پل سے لگ بھگ آدھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم نے جلی سڑک کو چھوڑا اور کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔

میں اپنی جانب آتا دیکھ کر کتوں نے بھونکنا بند کر دیا اور گھوڑے فاصلے پر بہت کرکھڑے ہو گئے تاہم ان کی نگاہیں ابھی کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنی دھنوں کو اضطراری حرکت بھی دے رہے تھے۔ ہم کمرے کے سامنے جا کر رکے اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔

وہ نیچی چھت والا ایک عام سا کمرہ تھا جس کا دروازہ

ہاتھ پاؤں کو مضبوط رسیوں سے باندھ کر اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اس کے منہ پر بھی دو پٹے کی پٹی باندھی گئی تھی تاہم وہ پٹی اپنی جگہ سے ٹھیک لگی تھی جس کی وجہ سے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولنے کے قابل ہو سکی گی۔

میں صندل کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور گہری سنبیدی سے کہنا۔ "صندل! امیرانام ملک مستدر حیات ہے اور میں تمہارے علاقے کا قتلہ دار ہوں۔ پچھلے دو دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو اور آگے نہیں بند کرلو۔ جب تک میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی بندشیں نہیں کھولوں گا، تم اپنے بدن پر لباس کو درست نہیں کر سکو گی۔"

ایک لمحے میں، میری نگاہ نے جو شخص دیکھا تھا اس میں مجھے صندل غم پر پڑی نظر آئی تھی۔ وہ کسی حد تک لباس میں تھی۔ اس کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"جی۔ ٹھیک ہے۔"

آندھ پندرہ منٹ میں، میں نے کوشش کر کے صندل کے ہاتھ پاؤں اور منہ کو بندشوں سے آزاد کر دیا اور اس نے لباس کو اپنے بدن پر درست کر کے برنگی کا دروازہ بند کر دیا۔ میرے ایما پر وہ کمرے کے دروازے تک چلی آئی۔ میں نے اسے پرال پر بیٹھے کا اشارہ کیا اور تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی حالت خاصی نازک ہو رہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی قسم کی وقت محسوس نہ ہوئی کہ ڈاکوؤں نے اسے زد و کوب کرنے کے علاوہ اس پر مجرمانہ حملے بھی کیے تھے۔ ہر قسم کی زیادتی کا نشانہ بننے کے بعد وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ میں فوری طور پر پچھچھ شروع کر دیتا تاہم چند بنیادی نوعیت کے سوالات نہایت ہی اہم تھے۔ میں نے پوچھا۔

"دو دنوں ڈاکو کہاں گئے جو تمہیں تمہارے گھر سے اٹھا کر لائے تھے؟"

"وہ دو نہیں، تین تھے۔" صندل نے روپائی آواز میں بتایا۔ "ان کا ایک ساتھی یہاں موجود تھا۔ یہ تینوں آج صبح ہی یہاں سے گئے ہیں۔ مجھیں کہ لکھری اذان کے وقت وہ گھر کے لیے روکی پھر روہنے والے انداز میں بولی۔" ان ظالموں نے مجھے کئی بار برباد کیا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے اچھو کو بھی مل کر ڈالا۔۔۔"

"اچھو کی لاش مجھے نہروالے ہل کے قریب سے مل گئی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لکچہ میں کہا۔ "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ اچھو کو تاجا کیوں سمجھ

رہے تھے۔؟"

میں نے اپنے ذہن میں موجود ایک نہایت ہی اہم سوال کا جواب لینا چاہا تو وہ جلدی سے بولی۔ "تمہارے اور صاحب ادھو لوگ اسے تاجا سمجھتے ہیں۔ رہے تھے بلکہ وہ تاجا ہی تھا۔ ان کا کوئی پرانا بانی نہیں۔ اس نے مجھے اپنا نام لکھ بتایا ہوا تھا۔ میں نے ان کے درمیان ہونے والی باتوں سے اندازہ لگا دیا ہے کہ وہ سب جرائم پیشہ لوگ تھے۔"

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ گویا پچھلے تین دن سے میرے دماغ میں کتنی ہی خیر خیالات کی جھجھکی پک رہی تھی وہ اب تیار ہو چکی تھی۔ میں جس رخ پر سوچ رہا تھا صندل نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔

"مکملی باتیں تو تمہارے جاکر ہوں گی۔" میں نے بعد دی بھرے لکچہ میں کہا۔ "یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے صرف اتنا بتادو کہ وہ نامراد ڈاکو کس طرف گئے ہیں؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھا۔" صاحب۔۔۔ وہ بے ہوشی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ جب یہاں سے نکلے تو رات کا وقت تھا۔ ان کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی لکھری اذان میں ہونے لگی تھی۔ انہوں نے مجھے رسیوں سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ مجھے نہیں پتا وہ کہاں گئے ہیں۔ میں تو دل ہی دل میں یہ دعا بھی کر رہی تھی کہ اللہ جلد از جلد کسی کو اس طرف بھیج دے اور وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔ اللہ نے آخر کار میری دعا سن لی۔"

"وہ سب کی سنا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لکچہ میں کہا۔ "وہ ہماری شرگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ بس اسے محسوس کرنے اور کھینکے کی بات ہے۔"

وہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

میں نے صندل کو اپنی پیشی میں، اس کے گھر چھوڑ دیا تھا تا کہ وہ خود کو سنبھال سکے۔ پوچھ پچھ تو بعد میں بھی ہو سکتی تھی۔ وہ جس ذہنی، جسمانی اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی، اس میں اسے فوری طور پر اشد آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے ایک دن کے لیے کھینکے کا موع دیا اور آندھ روز آنے کا کہہ کر اس کے کوارٹر سے باہر نکل آیا۔

اگلے روز میں صندل کا بیان لینے کے لیے دو بارہ اندھ رکھا کے کوارٹر پر پہنچ گیا۔ صندل نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اندھ رکھا اور اس کی بیوی اپنی بیٹی کی زندگی سلامتی بازیابی پر اپنی قدر خوش تھے کہ میرا شکر یہ ادا کرتے ہوئے ان کی زبان

سو کر رہی تھیں۔ نہ تھا سلطان بھی تین راتیں اپنی ماں کے بغیر سویا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی نانی سے زیادہ مالوس تھا تاہم ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ اس وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھا سنی سے ٹھیل رہا تھا۔

صندل نے اپنے بیان میں مجھے جو کچھ بتایا میں اس کا غلام آج ہی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کا ذہن بھی اس سچی کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ ساری باتیں صندل نے ڈاکوؤں کی باہمی جنگوں سے اغذ کی تھیں۔

باتیں میری ذاتی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے۔

اب یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ اسلم عرف اچھو آلو لکھو کھائی والا درحقیقت تاج وین عرف تاجا ہی تھا۔ تاجا کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تاجا نے اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ مل کر کسی دوسرے قلع کے ایک گاؤں میں بڑی شیک شاک و شکست ماری تھی جس میں ایک خطیر رقم کے علاوہ طلائی زیورات بھی ان کے ہتھے لگے تھے۔ یہ ڈکیتی اس گاؤں کے چودھری کی حویلی میں ماری گئی تھی۔ حویلی سے نہ صرف یہ کہ ڈاکوؤں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی گئی بلکہ ان کا راستہ ٹھکانا کرنے کے لیے ان پر غارتگ بھی کی گئی تھی جس کے نتیجے میں تاجا کا ایک ساتھی مارا گیا تھا۔ تاجا اور دیگر تین ڈاکو ڈکیتی کے مال سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جائے واردات سے بہت دور نکل آنے کے بعد انہوں نے ایک محفوظ خطیہ مقام پر قیام کیا اور تازہ ترین صورت حال پر بات چیت کرنے لگے۔ ٹھوڑی دیر تک وہ اپنے جاں بحق ہونے والے ساتھی محذور عرف محذورے کے اہتمام پر انیسوں کا اظہار کرتے رہے پھر ان کے لیڈر محمد وٹے مال نہایت کو حصر۔ یہ قدر مرچہ تسلیم کر ڈالا۔ سب کورات اس محفوظ مقام پر گزرا کر اگلے روز مختلف سمتوں میں الگ الگ روانہ ہوا تھا لیکن دوسری صبح جب وہ سو کر اٹھے تو ایک ناقابل تین حیرت ان کی بختی گئی۔

تاجا غائب ہو چکا تھا۔ اور جاتے ہوئے وہ اپنے حصے کے علاوہ لیڈر کا حصہ (جو کہ سب سے زیادہ تھا) بھی چھوڑ کر لے گیا تھا۔ اس صورت حال نے محمد سمیت سب کو آگ بگولا کر دیا تھا۔ انہوں نے مختلف سمتوں میں بکھرنے کے بجائے نیکارہ کہ تاجا کی تلاش شروع کر دی۔ اس تلاش میں انیس ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا یا آٹھ سو سے زائد سال میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اب اسلم عرف اچھو کی حیثیت سے کیرا احم کے گھر واقع شاہ پور میں رہ رہا تھا اور آلو

لکھو کھائی والے بچا کرتا تھا۔

ڈاکوؤں نے تاجا پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس ویران کمرے کو اپنا مسکن بنایا جہاں سے میں صندل کو نکال کر لایا تھا پھر ایک رات انہوں نے تاجا کو جادو بروتی افوا کر کے مذکورہ کمرے میں پھانچا دیا۔ وہ مقام پوچھ پچھ کے لیے بہت موزوں تھا۔ تاجا کی آنکھ لکھو کھائی والی چھابڑی کو ڈاکوؤں نے نہروالہ اہل غور کرتے ہوئے شہر میں پھینک دیا تھا۔ پہلے تو محمد اور اس کے دو ساتھیوں الیاس اور بھولا نے تاجا کی خوب درگت بنائی اور اس کے بعد پوچھا کہ۔۔۔

بتا، تیری رضا کیا ہے۔ شرافت سے "مال" کے بارے میں بتاتا ہے یا تیری کمال چھٹی جائے؟

تاجا صورت حال کی تحقیق کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے بچے کے الفاظ میں اپنے بھائی بندوں پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس کے اپنے حصے کے ساتھ ساتھ لیڈر کا چھاپا ہوا مال بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کوئی اس سے بھی بڑا شیر اسب کچھ یچین کر لے گیا تھا اور۔۔۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

محمد، الیاس اور بھولا کو تاجا کی کہانی پر یچین نہ آیا۔ وہ سمجھے، تاجا انہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے لہذا انہوں نے بھولا کر اسے اور مارنا شروع کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتے، اس نے انہیں بتایا کہ مال ایک نیلی پوتلی میں بند ہے اور وہ پوتلی اس نے صندل کے پاس رکھوائی ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں نے اس سے صندل کا حدود وار بھر معلوم کیا اور محمد اور الیاس نے کیا ہر ذرہ کی رات اندھ رکھا پھاٹک والے کے کوارٹر پر دھاوا بول دیا۔ بھولا تاجا کی گھرائی کے لیے کمرے میں رک گیا تھا۔ انیس نیلی پوتلی کی تلاش تھی اور جب وہ اس تلاش میں ناکام رہے اور صندل نے بھی نیلی پوتلی اور تاجا کے حوالے سے اپنی مکمل لاطمی کا اظہار کیا تو وہ مجھنا بہت میں صندل کو اٹھا کر لے گئے تھے کہ باقی کی تحقیق وہ اس سے تاجا کے سامنے بٹھا کر کریں گے۔

صندل کو اس وقت حیرت کا شہ پہنچا کہ جب اسے پتا چلا کہ اچھو دراصل تاجا ڈاکو ہے جو اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو بھوکا دے کر شاہ پور میں پھینچا بیٹھا تھا۔ بہر حال جب صندل اس کمرے میں پہنچی اور صورت حال ان ڈاکوؤں پر واضح ہوئی تو تاجا دوبارہ سے اپنے پہلے والے بیان پر آگیا کہ ڈکیتی کا سارا مال اس سے بھی بڑے کسی ڈاکو نے چھین لیا تھا۔ تاجا کے جواب نے ڈاکوؤں کے صبر و برداشت کے سارے بند توڑ دیے اور انہوں نے اذیت دے دے کر

وہ زندگی ہی کیا جو حادثات و واقعات سے مزین نہ ہو۔ یہ اور بات کہ ان واقعات کا تعلق خوشگوار ہے یا ناگوار لیکن... اس کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا اس نے اس کی زندگی کو ایک نیا رخ ضرور عطا کیا تھا جیسے کسی نے کوئی قیمتی تحفہ عنایت کر دیا ہو۔

ثبت اور متنی سوجھن میں اچھے ایک ساتر کی بخیری کا عالم

سوج رہی ہوں کہ کیا تم۔ تم میری کچھ دکر سکتے ہو؟
مذہب اس کے لہجے سے عیاں تھا۔
میں نے شانے اچکا دیے۔ "میں۔ میرا تعلق اس علاقے سے نہیں ہے۔ بس چلی کے ساتھ تعطیلات منانے کے لیے آیا ہوا ہوں۔ میرے والدین آج رات مجھے یہاں چھوڑ کر لے آئے ہیں۔ مجھے اس مال یا باہر کسی بھی سڑک کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔"
"جیس، میرا مطلب ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے گال جھٹانے لگے۔ "میں کرمس کے لیے کیو لینڈ پہنچنا چاہتی ہوں۔ اپنی بہن کے پاس۔ لیکن میں۔ میں

یہ کرمس سے دو روز قبل کی بات ہے۔ میں شانے مال کے مجمع سے پرفوڈ کورٹ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی مال کے بندہ ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔
وہ لڑکی مجھے نوڈ کورٹ کے پاس دکھائی دی۔ لڑکی لکڑی تھی۔
جب میں نے اپنے چیز خزانے سے سر اٹھا کر دوبارہ دیکھا تو وہ میری میز کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن الفاظ اس کے دھنوں پر کھپکھپا رہے تھے۔
میں نے استغما یہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
"ہائے" وہ بول پڑی۔ "میں ہوں۔ میں

ایسے لوگ اگرچہ کم ہوتے ہیں مگر ضرور ہوتے ہیں اور مثبت و تعمیری عمل سے اپنی موجودگی کا ثبوت دلاتے رہتے ہیں۔
"تھانے دار صاحب! آپ بڑی مشکل باتیں کرتے ہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو کھاتے ہوئے بولی۔
"میرے کوسر میں درہونے لگا ہے۔"
"صنڈل اتنی اچال، میری باتوں پر زیادہ دھیان نہ دو۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اس وقت تمہیں زیادہ سے زیادہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہیے جس کے کرم سے تم زندہ سلامت اپنے ماں باپ اور بیٹے تک پہنچ گئی ہو ورنہ وہ سفاک ڈاکو تمہیں بھی قتل کر کے تباہی طرح تمہاری لاش بھی کھیتوں میں پھینک دیتے تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ میں تو یہ سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری کسی وقت کی کوئی نیکی کام آگئی ہے۔"
"میں نے ایک بار چھڑوں والی مرفی کو ایک بد معاش بیلے کے حلقے سے بچایا تھا۔" وہ سرسراہٹ بولی آواز میں بولی۔ "اگر میں نے بروقت مداخلت کر کے اس بیلے کو نہ کھڑے ہوتا تو مرفی کے ساتھ ہی اس کے آٹھ ہونٹے نئے چمڑے بھی اس بیلے کے پیٹ میں چلے جاتے۔"
"جیس، تمہاری نیکی ادا اور اس بچوں والی مرفی کی دعا قدرت کو پسند آگئی ہوگی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے آج تمہیں سلطان کی ماں صنڈل بھی زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھی ہے۔"
وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتی تھی۔
"میری ایک بات ذہن نشین کر لو صنڈل! میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "نیکی کسی سایہ دار درخت کے ماتھے ہوتی ہے جو سدا بہری بھری اور باد رقی ہے اور اپنے وجود سے زندگی بھر نیکی کرنے والے کو فیض پہنچاتی رہتی ہے۔ میں تمہیں سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری وہ نیکی آباد ہے۔"
صنڈل نے اثبات میں سر ہلایا پھر گردن جھکا لی۔
معدو اپنے کھنٹی کو تلاش کرنے کے لیے میں نے خنی المقدور کو کش کی مگر مجھے کامیابی نہ مل سکی۔ یہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ کسی دور دراز حلقے کی طرف کھل گئے ہوں گے۔ جلد یا بدیر ان تینوں کا انجام بھی اپنے ساتھیوں کی طرح صبرت ناک ہونا تھا۔
مستورے اور تاجا کی طرح انہیں بھی ایک دن حرام موت ہی سزا تھا، چاہے ان کی موت قاتلوں کے رکھوالوں یا قانون شکنوں کے ہاتھوں ہوئی۔
(تحریر: محسن مسلمان)

تاجا حکومت کے گھات اتار دیا۔ جب اس پر بھی ان کے انتقامی جذبات لفظ سے نہ ہونے تو انہیں نے حسب توفیق صنڈل کو بھی پالال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ایک رات وہ صنڈل کو کمرے میں چھوڑ کر یا معلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ تاجا کی لاش کو کھل کے قریب کھیتوں میں پھینک چکے تھے۔
صنڈل پچھلے دنوں وحشی ڈاکوؤں کے ہاتھوں جس عذاب سے گزر رہی تھی، میں نے اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہا اور غمیرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی صنڈل۔ اچھو یا تاجا، وہ جو کوئی بھی تھا، تم سے محبت کرنے لگا تھا اور تمہیں اپنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پھر اس نے کسی نیکی پوٹلی کے حوالے سے جھوٹ کیوں بولا؟"
"تھانے دار صاحب! تاجا کے رویے کو دیکھ کر تو میرا بخار اور محبت پر سے ٹھنک ہی اٹھ گیا ہے۔" وہ دھڑکی لہجے میں بولی۔ "جو شخص اپنی جان بچانے کے لیے کوئی ایسا جھوٹ بول سکتا ہے جس کی وجہ سے میرے جسم و جان اور روح کا جنازہ اٹھ گیا، اس شخص کے بخار یا محبت کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے بلکہ اگر آپ کو برائے لگے تو میں ایک بات کہوں۔"
بات مکمل کر کے اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں۔ یوں۔"
"جیسا بات تو یہ ہے تھانے دار صاحب۔" وہ اذیت بھری آواز میں بولی۔ "میری نظر میں دنیا بھر کے مرد فریبی اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔"
"صنڈل! میں تمہاری بات کا بڑا نہیں مناؤں گا۔" میں نے غمیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں تمہارے تجربے سے عمل اتفاق نہیں کر سکتا۔ ہر انسان اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں بات کرتا ہے اور کسی ایک انسان کے تجربے یا مشاہدے کو قارمولانا کر تمام انسانوں پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔"
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔
میں نے کہا۔ "میں ماننا ہوں کہ تاجا یا ایک بڑا مرد تھا اور تمہارا سابق شوہر تاجا بھی کوئی اچھا مرد نہیں تھا۔ ان دونوں کے علاوہ دنیا میں اور بھی بہت سے بڑے مرد موجود ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس جہان میں پائے جانے والے سارے کے سارے مرد ہی فریبی اور دھوکے باز ہیں۔"



ایک طریقے سے خالی ہاتھ ہو چکی ہوں اور مجھے کرسی سے پہلے ہر حال میں کلی لینڈ ہینچنا ہے۔

”میں۔۔۔“ میں جملہ بھول گیا تھا کہ میں کیا کہنے جا رہا تھا۔ میں اس کے حلیے کا جائزہ لینے لگا۔ باہر ہونے والی برف پاری سے اس کی جینز اور کیڑوں کے جوتے جھکے ہوئے تھے اور بدنما دکھائی دے رہے تھے۔ سادہ سا بلاؤز بھی مر جھایا ہوا لگا رہا تھا۔ یقیناً جب یہ خرید گیا ہوگا تو اس کی یہ حالت نہیں رہی ہوگی۔

”یقیناً، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن سنو، پہلے تم اس بات کی اجازت دو کہ میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ خریدوں۔ جو تمہارا پیٹ چاہے تم کھا سکتی ہو۔“

اس کی مسکراہٹ نروس زرد اور ہلکی سی تھی۔ البتہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا نام بھی تھا اور اسے چائینز کھانے پسند تھے۔ اس نے ”دی گولڈن بدھا“ نامی بوتھ سے موگو گائے کا ایک بھین خرید لیا جس کی قیمت میں نے ادا کر دی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس انگلیس سے صورت حال ابتر ہونے کی وجہ سے بھاگی ہے اور اپنی بہن کے پاس کلی لینڈ جا رہی ہے۔ اس نے اس انگلیس سے اپنے بھانجنے اور صورت حال کی ابتری کی تفصیل بیان نہیں کی۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس ایک انتہائی قدیم نوعیت کی شیر لیٹ کار ہے جو کسی بھی لمحے خراب ہو سکتی ہے۔ وہ یہاں تیرا سکاٹک کے تمام سڑیں ہر رات اسی کھانا دار میں سوئی رہی ہے کیونکہ اس کے پاس کسی موٹیل میں رات قیام کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔

اور اب وہ بالکل نکال ہو چکی ہے اور اس کے پاس کھانے اور بیٹروں کے لیے کوئی نقدی نہیں ہے۔

گو میں نے سچی کے لیے صرف ایک کھانا خرید لیا تھا لیکن کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے ہم دونوں کو ایک ایک ”قارچون کوئی“ تھما دی۔

”آؤ آؤں کھول کر دیکھتے ہیں کہ ان میں ہماری قسمت کے بارے میں کیا لکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تمہاری تقدیر ایک ایک بدلنے والی ہو۔“

اس نے اپنی کوئی توڑی توڑی کھانسی پر عمل نمودار ہو گئے۔ وہ دو خالی ہال تھا ہے ہوئے تھی۔ ”میرا خیال ہے کہ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔“ اس نے مایوس لہجے میں کہا۔

میں ہنس دیا۔ میں نے اپنی قسمت کا حال پر سے بغیر وہ کوئی سچی کی جانب بڑھا دی۔ ”مجھے اپنے مستقبل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارا ہوا۔“

ایک میری کوئی کا قسمت کا حال پر حاکم مسکرا کر اس تحریر کو اپنی جینز کی جیب میں اڑا لیا۔

”کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر میں نے بتا دیا تو یہ درست ثابت نہیں ہوگا۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر اس صورت میں تمہیں شاپنگ مال کے بندہ ہونے تک میرے ساتھ رہنا ہوگا۔“

اس نے جواب دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے گی۔ ہم نے میوزک اسٹور میں جانے کا فیصلہ کیا۔ متحرک میز صوفی کی سچی نے کہا کہ میں بے حد نفیس اور ہمدرد شخص ہوں۔ میری اس صفت کے جواب میں مجھے کچھ نہ کچھ ضرور دے گی۔ مجھے اس بارے میں کوئی یقین نہیں تھا کہ حقیقت میں اس بات کا کیا مطلب تھا جو وہ کہنا چاہ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک اچھا آدمی ہوں۔ واقعی“

”مجھے یقین ہے کہ تم حقیقت میں۔۔۔ ایک اچھے آدمی ہو۔“ سچی نے کہا۔ لیکن کیم ہر اسٹور سے کچھ نہ کچھ خریداری نہیں کر سکتے؟ جیسے کہ تم کی کوئی بات ہی نہ ہو۔ جب تم کیا خریدنا پسند کرو گے؟“

میں نے رد کر دینے والے انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ہم متحرک میز صوفی کے مال کی دوسری منزل پر اتر گئے جہاں لوگوں کی خاموشی بھرتھی۔

”مجھے اس شاپنگ مال میں موجود کوئی شے رد کر نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جن چند چیزوں کی مجھے ضرورت ہوتی ہے، ان کا میں آن لائن آرڈر دے دیتا ہوں۔“

”میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ ہر ایک اسٹور میں کوئی نہ کوئی ایسی شے ضرور ہوگی جو تم لینا چاہو گے۔“

”نہیں۔۔۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے۔ فرض کرو کہ ہمارے پاس دینا کی تمام دولت ہے۔ تم مجھے کیا دانا پسند کرو گے؟“ سچی نے کہا۔

میوزک اسٹور میں، میں نے اسے ٹیل ریک کی ڈی۔ وی ہولڈ اسٹری اور ڈائلز خرید کر دیے۔ اس نے میرے لیے دی مس فٹس، دی ڈورز اور دی بڑو کس کو خرید لیا۔ پارٹس اینڈ ٹولز اسٹور میں سچی نے ٹیبل جران، رچرڈ ڈارچ کی تصانیف پسند کیں۔ میں نے اس کے لیے ہارن اینٹلین کی، ڈیجیٹل اسٹوریز اور مائیکل پیوون کی تصانیف خرید لیں۔ اس نے میرے لیے ادا کار میگزینز کا

پسند کیا۔ میں نے اسے لیس ماس کا پلے بل دلا دیا۔ اس نے میرے لیے جس لیسپ کا انتخاب کیا، وہ آرٹ ڈیزائن کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ میرا منتخب کردہ لیسپ سادہ لیکن فٹل کے فریم میں تھا۔ سچی نے میرے لیے ایک چیلے سک شرت پسند کی۔ دی گیپ اسٹور میں، میں نے اسے ڈے گورنر سوئٹر دلا کر دیے۔ میں نے سلویڈر والی کا انتخاب کیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ اسے پسند ہے لیکن اس وقت میں تنگ رہ گیا جب اس نے مجھے ایک سوٹ دلا یا۔ اس نے مجھے ستر سالہ دو طوطا خرید کر دلا یا جو تین ڈبائیں بولتا تھا۔ میں نے اس کے لیے چھروہلی کے بچے، ایک روٹم دار بڑی مڑی اور اسپیکٹڈ کارولائٹل ایک خرید لیا۔

سچی کا پسندیدہ تقریبی مقام کوہ ہال تھا۔ میں نے کیرجین جزیروں کی جبری جبر سے میں سیر اور اس کے بعد ایک ہفتہ لیکن میں گزارنے پر اکتفا کیا۔ میں نے اپنے خیم ڈی وی ڈی کیشن میں اسپلڈنگ کرے کی ”مونستران اسے میں“ کا اضافہ کیا۔ اس نے اس کیشن میں ”گاڈ فار لونا“ کو بھی شامل کر دیا اور ساتھ ہی کریت ال پینو کا فلمی سین بھی دہرایا۔ اس نے میرے سر کو دو گول ہاتھوں میں پکڑا اور مجھے چھوڑتے ہوئے میرے ہونٹوں کا پکا سا بوسہ لے لیا۔

ساتھ ہی اس کا ڈائلاگ بھی دہرایا۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہ تم ہی تھے، فریڈ وائٹم نے میرا دل توڑ دیا۔ تم نے میرا دل توڑ دیا۔“

میں نے اسے ڈائمنڈ کی انگوٹھی خرید کر دی۔ اس نے میرے لیے خوس سونے کا انتخاب کیا جس کے اندر ایک پرائیویٹ لطیفہ کندہ تھا۔ میں نے اپنی خلوت گاہ کے لیے شاہ جادو کی لکڑی پسند کی۔ اس نے ہمارے بچے گھری آرائش کے لیے پائش کے کتیاں اور پٹلے گلابی رنگ کا انتخاب کیا۔ سی وی لکس فارمسی سے میں نے اس کے لیے مشہور ایوز کوکیز خریدے۔ سچی نے میرے لیے چائینس پسند کیے۔

جب اسٹورز کے گیٹ بند ہونا شروع ہوئے تو ہم غامدی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہاں دو خواتین انہیں میں کھڑی تھیں کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں لالچ بھرے ہوئے چیلے تھے۔ میں اور سچی خاموشی سے گیٹ کی جانب رواں تھے۔

اگلی میں نے یہ پوچھنے کے لیے من کھولا ہی تھا کہ اسے کیم ڈارک ہے کہ وہ میری جانب محو مٹی اور مجھے خاموش اپنے کاٹھارہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے میرے ہاتھ میں مراک

کی تھی ہوئی ہموار اور قدرے گرم مٹی شے پکڑا دی۔

میں نے دیکھا تو وہ دو ماسک تھے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ اور ایک منہ بھورتا ہوا۔ وہی ماسک جو تھیںز میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

”یہ کہاں سے آئے۔۔۔؟“

”میں نے اس اسٹور سے اٹھا ہے جہاں ہر شے ایک ڈالر میں فروخت ہوتی ہے۔ میں تمہیں کوئی ایسی شے دینا چاہتی تھی کہ جس کی وجہ سے تم مجھے ہمیشہ یاد رکھ سکو۔“ سچی نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ تم نے یہ ماسک چھری کیے ہیں؟“

”یقیناً، اور میں کیا کرتی؟ یا نہیں کہ میں ایک چھوٹی سی آواز لڑکی ہوں جو بالکل نکال ہو چکی ہے؟“

”نہیں۔ میں۔۔۔“ الفاظ میری زبان پر اتر گئے۔

”پلیز، کہہ دو کہ تم اسے آج کی ملاقات کے حوالے سے ایک یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھو گے؟“ سچی نے سچی لہجے میں کہا۔

جب دروازے پر کھڑی دو خواتین میں سے ایک نے ہماری جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ لہرا دیا اور آواز دی۔

”سچی! اب آ جاؤ۔ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”نہیں؟“ میں نے جھجک گیا۔

اس لڑکی کا نام سچی یا سچی جو بھی تھا، اس نے اپنی اگلی میرے لیوں پر رکھ دی۔ ”حقیک یو۔“ اس نے کہا۔

”میرا اس شے کے لیے جو آج تم نے مجھے دی ہے۔“

پھر اس نے میرا ایک بھر پور خصوصی بوسہ لیا۔

پھر وہ جاگنگ کرتی ہوئی ان خواتین کی جانب بڑھ گئی۔

میں اپنی جگہ خاموش کھڑا انہیں پارکنگ لاٹ کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ باہر ہلکی برلماری ہو رہی تھی۔

پھر ان خواتین نے اپنے شاپنگ بیگز ایک بالکل نئی جگہ لگائی۔ دارغ لی ایم ڈبلیو کار میں رکھے اور وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

”اف خدا یا ائی تھو گاتی بے دارغ لی ایم ڈبلیو“

لی ایم ڈبلیو کے نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد میں اپنے ہاتھ میں موجود دونوں جھینز ماسک کو گھٹنے لگا۔

میری کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے چہرے پر کون سا ماسک چاؤں؟

بہتے ہوئے چہرے والا ماسک یا منہ بھورتے ہوئے چہرے والا ماسک!

ڈاکٹر علی گور جانی..... وائیل

میں منزلوں کی کھوج میں خود سے چھڑ گیا
پھر عمر بھر تلاش ہی اپنی رہی مجھے
فہیم شناس صدیقی..... گلشن ظہور، کراچی
خواب کے شہر میں ایک فضا ستارے جیسا
نظر آیا تو سہی کوئی تہاڑے جیسا
تھکی جسم میں سہرا کی طرح پھیل گئی
ہم کو دیا نظر آتا ہے کندے جیسا
ایم افضل انصاری..... ونگڈ شہر
نہیں فرصت یقین مانو ہمیں کچھ کر کرنے کی
تیری یادیں تیری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں

دشت خیال..... خواب بھر

ہم جو پیچھے سر مٹل، تو یہ منظر دیکھا
سب سے اونچا تھا جو سر، ٹوک ستار پر دیکھا
زندگی بھر نہ ہوا ختم، قیامت کا عذاب
ہم نے ہر سانس میں برپا کیا "محشر" دیکھا!

رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

کہہ دینا سمندر سے ہم اویں کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے لئے نہیں آئیں گے
محمد قدرت اللہ نیازی..... سکیم ناؤن، کراچی
اس پار اس کا ہدف میری انا گئی
سو سچ کا پرچم جلا دیا میں نے
جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
اس نے کہا ہم سے! بھول جاؤ ہمیں
ہم نے بھی روتے روتے کہہ دیا کون ہو تم؟
حاجی محمد زہد اقبال زرگر..... نئی منڈی، سکیم
بہت حفاظت سے رکھا ہے ان چراغوں کو
بچتے بچتے بھی ہواؤں سے الجھ پڑتے ہیں
دیکھ فرعون کے لہجے میں بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ پڑتے ہیں



بادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس

ہر چہرہ مد میں ابھی گئی ہے
اک تم ہی ہو جو بے حد اچھے لگتے ہو
ڈاکٹر ناہیدہ..... سرگودھا
مجھ سے ناراض نہ ہونا پیارے لوگو
دل نے چنا فقط وہی سنگدل فضا
قاری وقاص، صدام..... جیل سرگودھا
تیرے فراق کے لئے شہر کرتے ہوئے
مگر چلے ہیں تمرا انتظار کرتے ہوئے
تجھے خبر ہی نہیں ہے کہ کوئی ٹوٹ گیا
تمہیں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے
عامر اقبال جہاں..... وشرکت جیل سرگودھا
روئے تو پھر نہیں آئیں گے تیرے کر
سن لے کہ قیامت کی آہ ہم بھی رکھتے ہیں

مرزا طاہر الدین بیگ..... میر پور خاص

مٹا ہی روح جب بیدار ہوتی ہے جو انوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور

کالج کو خاص تیرا کچھ ساری بھول ہماری تھی
اب سہرا کو دیا کچھ ساری بھول ہماری تھی
کتنی خوش تھی تھی ہم کو ان کی نہ کو ہاں گردانا
وہ کیا بولے ہم کیا کچھ ساری بھول ہماری تھی

اعجاز احمد راضی..... ساہیوال

اب کوئی کیا میرے قدموں کے نشان ڈھونڈے گا
چیز آدمی میں تو نیچے بھی اکڑ جاتے ہیں
فصل ادب اب ہنر پوچھتے کیا ہو کہ یہ لوگ
چروں میں بھی مٹی آئینے جڑ جاتے ہیں

اوریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

برائیاں نظر انداز کرتا رہتا ہوں
کہ دل تمہاری کچھ اچھائیوں سے واقف ہے
نا مر حسین..... اسلام آباد

کاش میری قسمت کی لکیروں پہ نام تیرا ہوتا
آکھ سے بچنے والے تیروں پہ نام تیرا ہوتا
جان تو جانے والی تھی مرتے کچھ اس طرح
کہ ہم پہ چلنے والے تیروں پہ نام تیرا ہوتا

امیر وارث..... سندھیلیا، کوئی

اگر لیے مانگا نہیں اسے خدا سے کبھی
دعا میں ہوتی ہیں مغفم بے شر ہو کر
بجھا بجھا اسے پایا تو ہوئی کچھ سکین
کہ خوش تو وہ بھی نہیں ہم سے بے خبر ہو کر
سید امتیاز حسین شاہ..... وشرکت جیل سرگودھا
جو جلاتا ہے کسی کو خود بھی جلا ہے ضرور
خج بھی جل جاتی ہے پروانے کے بعد

ملک مزل اسلم..... میاٹوالی

میں تیری بارگاہِ ناز میں کیا پیش کروں
نہری جہلی میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
مریم کلثوم..... پشاور

کئی آہٹ، کئی جنبش، کوئی دھتک نہیں ملتی
اگلے دشت دریاں میں بڑی فرصت کا موسم ہے

فیصل ربانی..... سرگودھا

اب یہ آنکھیں نہیں دیکھیں گی زمانے تیرے
اب کہاں غیرتائیں گے فسانے تیرے
اب تو بس یادوں کی دھتک ہی رہے گی باقی
اب کہاں آئے گا وہ دل قول بھانسنے تیرے

عثمان انصاری..... نیو نیٹرل جیل ملتان

یہ اس کے عیار کی باتیں فقط قصے پرانے ہیں
بھلا کچھ گھڑے پر کون دریا پار کرتا ہے
ہمیں یہ دکھ کہ وہ اکثر کئی موسم نہیں ملتا
مگر ملنے کا وعدہ ہم سے وہ ہر بار کرتا ہے

سولہانی..... حیدرآباد

رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم جو چھوڑے تو یہ بھی نہ سوچا
کہ ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

محمد صدیق تاجک..... پرنس روڈ، کوئٹہ

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہتے دو
میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
محمد نعمان ندیم..... صدر

صد جف کے برباد ہوئے ہم تیری خاطر
صد شکر کے تجھ پر کوئی الزام نہ آیا

رعنا رضوی..... مانچسٹر

اے نسیم سحر تجھ کو ان کی قسم
ان سے جا کر نہ کہنا میرا حال غم
عاطف عمیر..... کراچی

چارخ جاں لیے کسی دشت میں کھڑا ہوں میں
کوئی قافلہ یاس سے گزرنے والا نہیں
میں کیا کروں کوئی قصور گر اجوری ہے
میں اپنے رنگ تو اب اس میں بھرنے والا نہیں

احمد خان تو حیدی..... پاکستان اسٹیل، کراچی

دیوانگی نہیں ہماری تو اسے اور کیا کہیں گے
انسان ڈھونڈتے رہ گئے پر چھائیوں میں ہم

سید ظفر عباس زیدی..... چنیوٹ

آکھ میں پانی بھر کے لایا جاسکتا ہے
اب بھی جہاں شہر بچایا جاسکتا ہے

وعدہ تھا کیا ہوتا

فاکسر شیر شاہ سید

کہتے ہیں بنیا گز نہ دیہ کم از کم گز جیسی بات تو کہے... یہی فارمولا زندگی کے بیشتر سو پر بہت سچا اور کھرا اترتا ہے۔ وہ جو اس کی راہ نکلتے نکلتے تھک نہیں رہی تھی اور سماعت چند خوب صورت جملوں کو ترس رہی تھی جانے کیوں رفتہ رفتہ مایوس سی دل میں ڈہرے ڈالنے لگی تھی۔ ایسے میں ایک پوک سی دل میں انہی کاش... ساتھ نہ سہی کم از کم ساتھ نبھانے کا وعدہ تو کیا ہوتا... اب اس پوک میں بیسویں بھی شامل ہوتی جا رہی تھیں... ایسے میں زخموں کو مریم کی بہت شدت سے تلاش تھی۔

میتوں کے اسیر کسی کی یاد میں تعمیر بننے والوں کا اجرا



میں شراب پیتا تھا، یہی ایک خرابی تھی مجھ میں۔ ہوتی۔ ہم دونوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ اسے عمر میں کوئی بھی نہیں پیتا تھا بلکہ اٹھتے بیٹھے سگریٹ ہوا تھا۔ میں اور شیریں دونوں ہی ہاسٹل میں سلیم سے ملنے گئے تھے۔ سلیم کے کمرے کے ساتھ ہی اگلا دکانی کا کمرہ تھا۔

محمد اقبال... کوثر کی کراچی میں تو سورج سے اچھے کے لیے نکلا تھا کون لایا ہے یہ سایہ دار مجھے؟ محمد اشفاق سیال... شو کوٹ سی ان کا قاصد لے چلا ہے دل میرا تازہ فرمائش، نئی سوغات ہے حفیظ انصاری... سکھ میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر کے صنم آج بت خانے میں بیگم بنے بیٹھے ہیں انکھر حسین... ہزاری ہوتی ہوں تو کچھ لفظ بھی نہیں ہوتے چروں کے تاثر لوگ دیے ہوتے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں گزلیا... سرگودھا تو نے آنا ہی نہ تھا وسیع جلاتا کیسے تیری راہوں کو میں چلوں سے سچاتا کیسے جنید احمد ملک... گلستان جوہر کراچی آوارہ ہو گئے ہیں اس آرزو میں ہم شاید جہاں میں کوئی ہمارا دکھائی دے... لاہور وقت کی قید میں خود ہی گرفتار رہا دل تاداں کو تری دستک کا انتظار رہا محمد اسلم... خانوال نہ اہل تخت نہ ان کے خائنین کے ساتھ میری ساری ہمدردیاں ہیں زمین کے ساتھ مسز رباب احمد حسن عرضی... قبولہ شریف طلاق تو دے سب ہو غرور و تہر کے ساتھ مرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ مہرین ناز... حیدر آباد ہم تو شجر تھے اور شجر ہی رہے وہ بدل رہا موسموں کی طرح

محفل شاعر و سخن

کوین
برائے
شمارہ
نومبر
2014

دکانی تیرہویں سے پڑھنے کو لڑی آیا تھا۔ سلیم کی سارے
غیر علمی طالب علموں سے دوستی تھی۔ وہاں پر ایک شام دکانی
اور موذن کے گھر کے سلیم کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے
تھے۔ سلیم نے شیریں کو بھی ایک گلاس پکڑا دیا۔ ہم دونوں نے
نہ چاہئے کے باوجود آہستہ آہستہ گھونٹ لینے شروع کیے
تھے۔ کئی بات یہ ہے کہ حذر خراب ہونے کے باوجود مجھے
اچھا لگا پھر میری لوگ پونہر پٹی کی اس خطیہ جماعت میں باقاعدہ
شامل ہو گئے تھے۔ یہی کجگار باطل آقا اور اگر عین ایک
معمول سامنہ گیا تھا۔ ایسا معمول کہ شراب کو تم برا سمجھتے ہی
نہیں تھے۔

غیر ملکی طالب علموں میں بھی دوا گروپ تھے۔ ایک گروپ مذہبی قسم کے طالب علموں کا تھا جو اسلامی جمیعت طلباء کا حامی تھا۔ دوسرا گروپ آزاد خیال قسم کا تھا جو اپنے آپ میں مست رہتا تھا۔ کبھی پروگریسیو کی حمایت کر دی کبھی لیبرل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو ووٹ دے دیا۔ ہم دونوں کا تعلق کسی بھی قسم کی سیاست سے تو تھا نہیں، مگر وہاں بہت بڑھائی کے بعد آزاد خیال غیر ملکیوں کے ساتھ گھومتے رہتے تھے۔

وہ یوں درستی کے اچھے دن تھے، میں نے اور شیر نے تو بڑی بھرپور زندگی گزاری۔

ایم اے کرنے کے بعد شیر کو پی آئی اے میں نوکری مل گئی تھی اور میں بھی چھوڑے دن بے روزگار رہنے کے بعد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازم ہو گیا جس میں کام کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میری ٹریننگ ہی یہاں پر ہوئی تھی۔ مجھے ایک اسسٹنٹ کے طور پر لیا گیا تھا۔ ملک کی قومی اور بین الاقوامی کمپنیوں نے ہماری ایجنسی کی خدمات حاصل کی ہوئی تھیں۔

ہماری اسپہی کے مالک بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے کلاس فیلو، ان کے آقا، ان کے والد کے دوست، ان کے بھائی کے جاننے والے، ان کی بیوی کے قدروان اور ان کے سرال کی ہشتہ داریاں سب نے مل کر اسپہی کو چار چاند لگا دیے تھے۔ پارٹیاں ایک معمول سا تھیں۔ وہ خود ہی بڑی منت کرتے تھے اور ہم بھی ایک طرح سے ان کی شخصیت کے چال میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ کوئی بھی ان سے نہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں کام لینے کی زبردست صلاحیت تھی۔ انہوں نے میری فریڈنگ میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ان کی ساری اچھی باتیں سیکھوں اور میں نے سیکھی

مسکرا دی تھی۔ ”میں کوئی بات نہیں ہے، بس قصہ آہستہ آہستہ میں پیدا ہو گئی ہوں سارے کہنے ہیں اندر سے۔“

مجھے اس کی بات سے کوئی خاص اختلاف تو نہیں تھا۔

پھر میری باتیں سنا کر چھوٹا بھائی نے کہا: ”ارے کیا ہو گیا ہے، آخر بات تو یہی ہے؟“

[illegible]

اس دن میں تاریحہ خاتم آباد میں قانیو اسٹار ہوٹل کے پاس اس کے گھر گیا تھا جہاں اس کے ابو، امی اور بھائی سے

سگریٹ اور نوشی

سگریٹ نوش کو چھٹا نقصان سگریٹ نوشی سے
ہوتا ہے۔ اس سے کئی گنا نقصان سگریٹ نوشی کے
نقصانات بڑھ کر ہوتا ہے۔

مرسلہ - تفسیر عباسی پابرو، ادکار

اوقات ہوتی تھی۔ وہ لوگ بڑے سلیقے کے لوگ تھے۔ اس کے ابو حبیب بینک میں منیجر تھے، ماں ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں اور بھائی این ای ڈی میں انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ میں بہت دیر تک ان کے گھر بیٹھا مگ شپ کا کاروبار۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اس رات میں نے اپنی امی کو کہہ دیا تھا کہ میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے اب مقرب آپ کو ان کے گھر جانا ہوگا۔ ہمارے گھر میں بھی خوشی کی لہری دوڑ گئی تھی۔

بڑھتی ہوئی آلودگی کے بارے میں شہریوں کی بے بسی، اس بے بسی کو دور کرنے کی ہماری ناکام کوششیں۔ غربت کو دور کرنے کے لیے حکومت کے مختلف اداروں کو دیے جانے والے ہمارے مشورے اور فنڈز جو حکومت کے افسران اپنی امیری کو بڑھانے میں صرف کر رہے تھے۔ شہر کی بکڑی ہوئی حالت، اگلے ہونے لگے اور روزانہ جلنے کے جلنے جانے کا مکمل اس میں سوائے ڈپریشن کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے رنگ تصویر میں صرف شہر کی رنگینی تھی، اس کی فلسفیانہ باتیں، اس کا مورتوں کے حقوق کے لیے جہاد، زندگی میں ہونے والے حادثات پر اس کا رد عمل، اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے، وقت خوب گزرتا تھا مزے سے۔ ساتھ ساتھ وہ اب میری کمزوری بھی بن گئی تھی۔

پھر ایک دن میں نے اس سے پوچھ لی کیا تھا کہ کیا ارادے ہیں، مجھ سے شادی کرو گی یا بغیر شادی کے اسی طرح سے بیاہ کر رہی ہو گی۔ وہ بکا بکا ہنسی، پھر تنہید ہو گئی تھی۔ "ہاں کر سکتی ہوں، مگر ایک شرط ہے۔"

"شرط ہے، یہی شرط چاہیے پیارے سے جا کر سونے کے اندر سے لائے کوست کہنا۔"

"نہیں، اس سے بھی آسان ہے۔" اس نے ہنس کر کہا تھا۔ "مگر مالوے تو یوں کی۔"

"جب چاہیے ہو تو مانے کا کیسے وعدہ کر سکتا ہوں۔ بڑی بے وفائی کی بات کر رہی ہو۔" میں ہنس دیا تھا۔

نہیں بائی تو بھروسہ۔ پھر میں اس کی کوئی شرط رکھوں گی کہ تم مان نہیں سکتے ہو۔" اس نے پھر جیتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا بابا ابولو۔" ماننے والی بات ہوئی تو مان لوں گا۔ تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"وعدہ؟"

"وعدہ۔"

"اچھا تو پھر شراب پینا چھوڑ دو۔" اس نے رک رک کر بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

"ارے، میں روز توڑی پینا ہوں یہ کیا شرط ہوئی؟" میں نے احتجاج کیا تھا۔ "مجھے پتا ہے تم روز نہیں پیتے ہو مگر میں چاہتی ہوں کہ تم بھی نہ پیتے۔" اس نے پھر اسی لیے میں کہا تھا۔

"مگر یہ میری ذاتی آزادی میں تمہاری دخل اندازی ہے۔ تم یہ کیسی شرط رکھ رہی ہو؟" میں نے پھر احتجاج کیا تھا۔ "دیکھو تو تمہارے مذہب میں بھی منج سے ہے اور ایسی

کوئی بڑی بات ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن میں مذہبی نہیں ہوں۔" جیسے پتا ہے، ابھی طرح سے معلوم ہے۔" میں نے بھی ذرا سختی سے کہا تھا۔

"تم خدا کو مانتے ہو؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں مانتا ہوں۔" میں نے تھوڑا اچھے سے کہا تھا۔

"رسول کو مانتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"ہاں مانتا ہوں مگر یہ کیا سوال ہے؟" میں نے احتجاج کیا تھا۔

"تم نماز پڑھتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا تھا۔

"مید، بقرعید پر پڑھ لیتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"پڑھتے تو ہوتا؟" یہ کافی ہے۔" اس نے اسی لیے میں کہا تھا۔ "خدا کو مانتے ہو، رسول کو مانتے ہو، نماز پڑھتے ہو تو شراب بھی چھوڑ دو۔"

مجھے ہنسے کے باوجود ہنسی آ گئی تھی۔ "کیسی بے وفائی کی بات کر رہی ہو۔" جیسے پتا ہے میں کتنا مسلمان ہوں اور جتنا ہوں اتنا ہی پتا چاہتا ہوں۔ ہمارے تعلقات میں ان چیزوں کو نہ لاؤ تو بہتر ہے۔" میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

"تم میرے لیے ایک چھوٹا سا وعدہ بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے بڑے عجیب انداز سے مجھ سے پوچھا تھا۔ کچھ اچھا بھی، کچھ شکوک تھا، کچھ نصیحت سی تھی اور کچھ غم تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاس جواب دینے کے لیے الفاظ ہی نہ ہوں مگر پھر میں بولا تھا۔

"دیکھو اگر میں وعدہ کروں گا تو پھر مجھے زندگی میں کبھی بھی نہیں پینا ہو گی اور شاید میں ایسا نہیں کر سکوں۔ مجھے شراب اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے پینا اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھار سینے دو مہینے میں ایک بار دوستوں میں بیٹھ کر تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔ تھوڑا سا قہقہہ لیتا ہوں تو ایسی کوئی سی برائی ہے۔ میں شرابی نہیں ہوں، کبھی کبھار شاید پینا رہوں گا۔ آج اگر میں تم سے وعدہ کر لیتا ہوں اور پھر وعدہ نہیں بھاسا کہ تو پھر تم سے جھوٹ بولوں گا۔ مجھے یہ جھوٹ بولنا منظور نہیں ہے۔ تم مجھ سے یہ وعدہ نہ لو تو بہتر ہے بلکہ اس پھر میں ہی نہ پڑو۔" اس نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا تھا۔ "تو کیا تمہاری ماں کو پتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو؟"

"نہیں شاید نہیں پتا۔" میں نے جواب دیا تھا۔

"کیوں نہیں پتا؟" تم نے ان سے جھوٹ بولا ہے نا۔؟" اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"نہیں، میں نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میں نے یہ

دیکھ لی ہی نہیں ہے، اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔ وہ ایک چیز سے لالچ میں، انہیں لالچ میں رکھوں گا، اگر کبھی کسی نے کسی وجہ سے شراب کا ذکر آیا بھی تو ٹال دوں گا۔ میں جھوٹ اور جھج بولے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔ خدا کے لیے اس چیز کو ریمان میں مت لاؤ۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "نہیں اقبال جیسے وعدہ کرتا پڑے گا۔" جیسے شراب چھوڑ لی ہو گی۔ جب تم یہ وعدہ کرو گے تو پھر بات آگے بڑھے گی۔ تم سوچو، خوب سوچو اور سوچ کر مجھے بتانا۔ تمہارے فیصلے کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گی۔"

اس کا ایک دوسرا رخ تھا۔ میں نے مجھنے کی کوشش کی تھی، نہیں سمجھ سکا تھا۔ میری ماں کی نسل اور میری، ہماری نسل اور ہے۔ میں اپنی ماں سے شاید جھوٹ بول کر مطمئن رہ سکتا تھا مگر اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ ایک نسل کا قافلہ تھا۔ میری ماں پہلے اور ملک پھر آج کے گائے سنی تھی ہم لوگ اب تک میڈونا اور اٹلین جان سنتے تھے۔ ہماری دلچسپیاں مختلف تھیں، ہم مختلف ادوار میں تھے، میں سوچ سوچ کر بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ ہماری چاہت کے اندر سے میں شراب کہاں سے آجائے گی۔

مقبولی کی بات بڑھتی چلی گئی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں چاہتا ہوں مگر اس ایک شرط نے میں ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ میں جھوٹا وعدہ کرنے پر راضی نہیں تھا اور وہ اپنی بات پر الزامی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بکا بکا بہت دور ہو گئے تھے۔

میرے لیے اس جگہ کام کرنا مشکل ہو گیا تھا اور مجھے جلد ہی ایک اور امریکن بیٹی میں نوکری مل گئی تھی۔ پھر مجھے شہم کی شادی کا کارڈ ملا، کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے اس کی شادی ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے کرب کے ساتھ اس کی شادی میں شرکت کی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اسد اس کے شوہر کا نام تھا۔ آج پڑھو دونوں اچھے لگے تھے۔

میری بھی شادی حاس سے ہو گئی، میری ماں نے ہی اسے پسند کیا تھا۔ شہم کے بعد میری پسند پناہ نہ قسم ہو گئی تھی۔ حاس ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ عام بیویوں کی طرح سے شوہر کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار۔ وہ کافی مذہبی لڑکی تھی مگر اس نے مجھ سے میرے بارے میں نہ کوئی سوال کیا تھا اور نہ میں نے اپنی طرف سے ان سوالوں کا جواب دیا تھا جو پوچھنے کی نہیں گئے تھے۔

مجھے پتا تھا کہ شہم نے نوکری چھوڑ دی ہے بلکہ شوہر

نے چھڑا دی ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا کیونکہ اسے تو ہمیشہ کام کرنے کا شوق تھا۔ مجھے پھر بعد میں پتا لگا تھا کہ وہ اسد کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی ہے۔ اس کا بھی مجھے انہوں سے ہوا تھا کیونکہ وہ اکثر باتوں میں کہتی تھی کہ سعودی عرب عمرہ حج کے لیے صبح ہے، میں بھی وہاں کام نہیں کروں گی۔ کوئی بات ہے کہ عورت گاڑی تک نہیں چلا سکتی وہاں۔

میں زندگی کے پکڑوں میں الجھا رہا تھا مگر گے۔۔۔ بگاڑے کبھی کبھار اس کی یاد آ جاتی تھی۔ میں حاس کے ساتھ خوش تھا مگر وہ بھی میری زندگی کا ہی ایک حصہ رہی تھی۔ بہت سی باتیں لی تھیں ہم نے۔ کچھ وعدے کیے تھے اور کچھ وعدے نہیں کیے تھے۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے پھر ایک دن وہ نظر آ گئی تھی۔

میں شاپراہو فیصل کے عوامی مرکز میں حاس کے ساتھ کچھ خریداری کرنے گیا تھا۔ وہ اندر کچھ سامان اٹھا کر رہی تھی کہ سفید رقع میں بیٹیں ایک عورت مجھے نظر آئی تھی۔ سرتاپا جسم کا ہر حصہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر بھی دستانے پہنے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں ملکی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہی بڑی بڑی سیاہ سوچنے والی شریر آنکھیں۔ میں پہچان گیا تھا، شہم تھی وہ۔ وہ بھی آہستہ آہستہ میرے سامنے آ کر ٹھہری ہوئی تھی۔

"اقبال کیسے ہو؟" اس نے اسی لہجے میں اسی پیار سے پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک، یہ تم نے کیا کر لیا ہے اپنے ساتھ۔ خوش تو ہونا۔؟" میں نے بے اختیار ہو کر سوال کر لیا تھا جو شاید مجھے نہیں پتا چاہیے تھا۔ وہ مجھے تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی، آنکھوں میں وہی جذبہ تھا، وہی پیار کا سمندر تھا پھر وہ آہستہ آہستہ بولی تھی۔

"تم اگر ایک جھوٹا وعدہ کر لینے تو تمہارا کیا پتا، کیا بگڑتا، ایک چھوٹی سی بات تھی، قسم ہو جاتی۔ اچھا نہیں کیا تم نے۔" یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے میرے سامنے سے چلی گئی۔ میں بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھا کہ اسے روکوں اور دیکھ دو بات کروں کہ سامنے سے حاس آ گئی۔

"میں یہاں ہوں آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے زور سے آواز دے کر کہا تھا۔

اب بھی کبھی باتوں کو میری آنکھ کل جاتی ہے اور وہ بڑی بڑی سیاہ اور شریر، سوچنے والی اداس آنکھیں مجھے بے قرار کر جاتی ہیں۔





محمد امین نواب

گیارہویں حصہ

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرائی ویرانی ہو یا پرجوش امروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہو یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہوائوں کے چھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی ہوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی چمک، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنا یا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کریں چپکے سے ہمسایا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہ یہ نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سسہ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقرر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تخیل اور لطیف جذبوں میں سموتی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رفاقت کی چلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنہیل لمحات کی لمحہ لمحہ رو باد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تخیل خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عتائوں، ہرقاتوں اور رقاہتوں کا ایک دلربا سلسلہ



ماروی نے ذرا چپ ہو کر اسے دیکھا۔ اس نے پہلی بار مکمل کر کہا تھا: "تمہارے لیے یہی رہا ہوں۔۔۔" وہ ذرا ہلچلی کی طرح بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔ مجھے چاہے جس طرح میں کیا کروں؟ میں دل و جان سے اور پورے ایمان سے آپ کی قدر کرتی ہوں۔ آپ جیسا نیک اور شریف انسان میں نے نہیں دیکھا۔ آپ کی محبت کا یہ انداز مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں آپ کو دنیا کی ساری نعمتیں دوں گی لیکن یہ مجھ کی ہوں کہ جو محبت مراد کے لیے ہے۔۔۔"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "دوہرا کے لیے یہی رہے گی۔" وہ بولا۔ "تم بچپن سے اس کی ہو۔ اسی کی رہو گی۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں بھی تمہارے دل میں رہتا ہوں۔ اللہ کرے جلد ہی اس کی دہن بن جاؤ۔ محبت کی ایک روحانی حیثیت بھی ہے۔ وہ حیثیت میرے لیے رہے گی۔ مراد کے بعد میرا ہی نام تمہاری زبان پر آئے گا۔ میں نے تمہیں اتنی محبتیں دی ہیں کہ تم بھی مجھے دل سے نکال نہیں پاؤ گی۔"

"آپ درست سمجھتے ہیں۔ آپ اکثر میرے خیالوں میں آتے ہیں اور بے اختیار آتے ہیں۔ میں نے کہا تھا۔ میں آپ کی قدر کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ کے لیے میری چاہت یہی ہے تو پھر کوئی بن جاؤں تو شکایت نہ کریں۔ میں مراد کی داپھی کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ مجھے چاہتے ہیں تو میرے بولنے کا انتظار کریں۔" وہ پہلی گلی کی محبوب سوچ میں پڑ گیا۔ اس دوانے کی محبت تو کیسی تھی کہ اسے دیکھتا تھا اور دونوں کو دیکھتا اچھا لگتا تھا۔ ورنہ دنیا بھر تک بڑی گلی تھی۔ اس کی آواز سننا تھا تو دنیا کی ہر آواز سنی لگتی تھی۔ اب نہیں بولے کی تو شرمیلیت کا دم نکل جائے گا۔

وہ سرجھکا کر سوچ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ میں یہاں آتا رہوں گا اور اسے دور سے دیکھتا رہوں گا۔ وہ کوئی بن کر چپ رہے گی۔ میں یوں گا کہ وہ جواب نہیں دے گی کیونکہ ضروری بات ہوئی تو شاید گوشتے اشاروں سے جواب مل جائے گا۔

سمیرا بہت خوش تھی۔ سوچ رہی تھی۔ نہ وہ بولے گی۔ نہ اس کی کسی بات سے محبوب صاحب خوش تھی میں جتنا ہوں گے۔ یہ نہیں بولے گی تو ملاقات کرنے کی آدمی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ جب ماروی! آج تم نے دل خوش کر دیا ہے۔ وہ خوش ہو گئی تھی کسی حد تک لیکن پھر وہی کاروباری

محاملات سے اس کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ وہ دوسرے دن آفس میں آیا تو گویا سمیرا کے پاس نہیں آیا۔ اس کے دیوار نہیں ہوئے اس دن اس نے سمیرا کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ دوسرے دن ماروی کے پاس گیا تو وہ پہلے کی طرح ڈرائنگ روم میں اس سے ملنے نہیں آئی۔ وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر آئی۔ ہاتھ کے اشارے سے اسے سلام کر کے میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔

محبوب نے کھانے کے دوران کہا۔ "چائے آگیا۔" محبوب سا لگ رہا ہے۔ ہم بول رہے ہیں اور ماروی چپ ہے۔ ہم مراد کو دھوکے دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے وہ ابھی واپس آجائے۔"

اس بات پر ماروی نے بے اختیار سر اٹھایا جیسے آسمان کو دیکھ کر آمین کہہ رہی ہو۔

محبوب اپنی گلی میں آکر سوچنے لگا۔ وہ نہیں بول رہی تھی۔ پرانی لگ رہی تھی۔ ایسے کس طرح دن گزریں گے؟ چائیں مراد اب واپس آئے گا۔ آئے گا بھی یا نہیں؟

جس دن سے وہ حوالا پر چھائی تھی۔ اس دن سے اب تک جتنی امیدیں اس سے وابستہ تھیں وہ دم توڑتی رہی تھیں۔ لیکن امیدیں بھی نہیں مرتیں۔ پھر نئے سرے سے حوصلہ دیتی تھا۔

وہ رات گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ دل کہتا رہا۔ اس کی آواز میں سے گاتو وہ اور دور ہوئی ہوئی لگتی۔

"اے ماروی! میرے جیسا امیر کوئی نہ ہوگا۔ آزاد پھرنا ہوں اور تیرے زنداں سے نکل نہیں پا رہا ہوں۔ بہت ہو چکا۔ اب اسے کسی طرح بولنے پر مجبور کرنا ہی ہوگا۔ لیکن کیسے۔۔۔؟"

پھر اس کے ذہن میں ایک تدبیر پکنے لگی۔ اس نے دوسرے دن ایک نئی سم غریبی اور مگر آکر ماروی کے گھر پہنچ گئے۔ دوسری طرف بتل جاری تھی۔ وہ کسی سے بولی نہیں تھی۔ پھر فون کیوں اٹینڈ کرتی لیکن دل میں بڑا طنز کی آس تھی۔ امید تھی کہ مراد کسی دن کسی وقت بھی کال کر سکتا ہے۔

ماروی اپنے فون سے ابھرتی ہوئی رنگ فون کوٹن رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ "مراد کو کال نہیں ہوگی تو وہ کوئی جواب نہیں دے گی۔ فون بند کر دے گی۔" اس نے فون دبا کر اسے کان سے لگا لیا۔ اسے بہت ہی کمزوری بیماری آواز سنائی دی۔ "ماروی! میں تمہارا

بول رہا ہوں۔" وہ خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ تقریباً چلتی ہوئی بولی۔ "مراد۔۔۔ ایسے تم ہی بول رہے ہوتے؟"

وہ بے چینی کے مارے دوسرے ادھر جا رہی تھی اور کبہ رہی تھی۔ "تمہاری آواز ایسی کیوں ہے؟ کیا بیمار ہو گیا؟" وہ بولو بولو میں ابھی آ جاؤں گی۔

وہ کھانٹے ہوئے بولا۔ "میں تم سے بہت دور ہوں۔ اپنے ملک سے باہر ہندوستان میں ہوں۔"

"یاد آتا ہے وہاں کیسے ملے گئے؟" "تم نہ بولو۔ مجھے بولنے دو۔ فون کی بیٹری ڈاؤن ہو رہی ہے۔ یہاں نہ چارجر ہے نہ بجلی ہے۔ میں ڈیڑھ گھنٹے پہنچا ہوں۔ ایک جگہ چمپا ہوا ہوں۔ کسی طرح یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔"

"ذمن میرے پیچھے لگے ہیں۔ تم پریشان نہ ہونا۔ اتفاق سے یہ فون ہاتھ آیا ہے تو تمہیں تسلی دے رہا ہوں۔ میری جان۔۔۔ خدا پر ہر دوسرا کھو۔ میں ضرور وہیں آؤں گا۔"

"وہہ کرو تم آسو نہیں بھاؤ گی۔ میرے آنے تک ہنسی بولتی رہو گی۔" وہہہ کرو۔"

وہ بولی۔ "آج تو میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اطمینان ہو گیا ہے تم زندہ سلامت ہو اور بہت محنت والے ہو۔ ضرور میرے پاس آؤ گے وعدہ کرو۔ فون کرتے رہو گے۔"

"یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا۔ ویسے امید ہے کہ میں نہ کبھی پھر تم سے باتیں کرنے کا موقع ضرور۔۔۔"

فون اچانک بند ہو گیا۔ وہ آوازیں دینے لگی۔ "ہیلو۔ ہیلو مراد۔۔۔ ہیلو۔ ہیلو۔"

پھر کبھی نہ آیا کہ اس کے فون کی بیڑی جواب دے گئی۔ وہ مجبور ہو گیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ سب سے اہم بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ زندہ ہے۔

وہ خوشی سے جھومتی ہوئی بیٹھ پڑا کہ چاروں شانے بہت ہو گئی۔ پھر کڑے کے کٹنے کو کھانچ کر سینے سے لگا کر کھانچ لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے خوشیاں منائے؟

اگرچہ وہ اب بھی برے حالات سے گزر رہا تھا۔ تاہم یہ امید فوجی ہوئی کہ وہ کسی دن ضرور واپس آئے گا۔ اس کا بیٹا چارہ ہاتھ کا وہ شکنائے گا۔ اسے اور خوشی سے بھج جائے گی۔ اب تو وہ بول سکتی تھی۔ ساری دنیا کو اپنے مراد کی زندگی اور سلامتی کی خوش خبری سناسکتی تھی۔

وہ بیٹے سے اچھو کر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ چائے لاؤنج کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے بیچ کر آواز دی۔ وہ بیماری گھبراہٹ کی۔ وہ آکر اس سے لپٹ کر گھومتے ہوئے بولی۔ "مراد زندہ ہیں۔ چائے مراد زندہ ہیں۔ ابھی ابھی فون پر بات کی ہے۔"

مٹی نے اسے خوشی سے اور پلچا لیا۔ اسے چومنے لگی۔ خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ مراد کو سلامتی کی دعا میں دینے لگی پھر چمچا۔ "وہ کہاں ہے؟ کیا ابھی آ رہا ہے؟" وہ ذرا اداس ہو کر بولی۔ "میں چائے اودہ یہاں سے بہت دور ہندوستان میں ہیں۔ مجھ سے بہت دور پلے گئے ہیں۔"

وہ پاؤں پھینتی ہوئی مٹی سے دور ہو کر بولی۔ "ان کی مصیبتیں فحش کیوں نہیں ہو رہی ہیں؟ وہاں اور زیادہ مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ کبہ رہے تھے ڈیڑھ گھنٹے اور بیمار بھی ہیں۔ ان سے زیادہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔"

مٹی نے کہا۔ "یہ خوش خبری سامنے کو سناؤ۔ وہ تو اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑیں گے۔"

"وہ بہت اچھے ہیں۔ ہمارے محافظ ہیں۔ ہمارے سرپرست ہیں۔ میرے چپ رہنے سے نہ بولنے سے پریشان ہو گئے ہیں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی پھر بیٹھ پڑے اپنا فون اٹھا کر محبوب کے نمبر پر کئے۔ وہ اندازہ کر رہا تھا۔ تصویر میں دیکھ رہا تھا کہ ماروی خوشی سے پاگل ہو رہی ہے۔ جب اسے خوش خبری سنانے کا خیال آئے گا تو وہ ضرور اسے کال کرے گی۔

اور یہی ہو رہا تھا۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "میں حیران ہوں ماروی! تم نے تو چپ کا روزہ رکھا ہے پھر یہ کال کی؟"

اس کی آواز مسرتوں سے لبریز تھی۔ وہ بولی۔ "ہائے میں خوشی سے مر جاؤں گی۔ مراد زندہ ہے۔ میرا کچھا خوشی سے پھٹ رہا ہے۔ مراد زندہ ہے۔"

اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ "ماروی! یہ تو عجوبہ ہو گیا۔ ہم بایں بھی ہوتے تھے اور اس کی سلامتی کی دعا میں بھی مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری نلی۔ ماروی! آج ہماری امید ہو گئی ہے۔ یہ بتاؤ کیا اس نے فون کیا ہے؟ یا کسی سے پتہ چمچا ہے؟"

وہ چلتی ہوئی بولی۔ "اس نے خود فون کیا ہے۔ اللہ کتنے دلوں کے بعد میں نے اس کی آواز سنی ہے۔ میں کیا بتاؤں خوشی

سے چلتے چلائے تھے یوں لے لے لے ہی چل رہا ہے۔
 وہ جتنے ہوئے بولا۔ دیکھو خوشی سے پاگل نہ ہو
 جاتا۔ یہ بتاؤ وہ کہاں ہے اور کب آ رہا ہے؟
 وہ ذرا تجید ہوئی۔ ادا کی سے بولی۔ وہ بہت بیمار
 ہے۔ انڈیا میں کبھی ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کی آواز سے پتا چل
 رہا تھا کہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔
 ”فکر نہ کرو۔ وہ دلیر جوان ہے۔ بیماریوں اور
 دشمنوں سے لڑتا ہوا جلدی تمہارے پاس آئے گا۔“
 ”آپ بہت اچھے ہیں۔ ٹیکس بھی آجائیں۔ واقعی
 آج ہمارے لیے عید کا دن ہے۔ ہم خوب خوشیاں
 منا رہے ہیں۔“
 وہ بولا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی زندگی اور سلامتی کا
 ثبوت دے رہا ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔ ہم اس کے
 بارے میں خوب باتیں کریں گے۔“
 وہ سڑکوں سے ٹھکنائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہاں
 خوب باتیں کریں گے۔ میں تو پاگل ہو رہی ہوں۔ آپ
 آجائیں۔“
 ”بس ٹھیک آ رہا ہوں۔“
 وہ فون بند کر کے مسکراتے لگا۔ اس کی تدبیر نے
 رونے والی کو بڑا دیا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے دس
 بھر سے ٹھکانی ہوئی ہوتوں کے تالے توڑ دیے تھے۔ وہ کوئی بیٹے
 والی اب اس سے دن رات باتیں کرنے والی تھی۔
 ☆☆☆☆
 مرید فقیر کو نہیں مانتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ
 تدبیر سے اب تک اپنی تقدیر بناتی آئی ہے۔ اس کے لیے
 یہ پریشانی کی بات نہیں تھی کہ مراد کے معاملے میں دو بار
 تقدیر سے مات کھا چکی تھی۔
 وہ حوصلہ ہارنے والی نہیں تھی۔ اس کی قوت ارادی
 کہہ دیتی تھی کہ مراد کو انڈیا سے جانے نہیں دے گی۔ یہاں
 ہر قیمت پر ضرور اسے تاجدار بنائے گی۔
 وہ بڑی کامیابی سے اسے لوہے میں جکڑ کر سرحد پار لے
 آئی تھی لیکن کامیاب ہوتے ہوئے اسے مافی جہان لگا تھا۔ لوہا
 بھی موم ہو گیا تھا۔ ٹوٹ کر اس کی بالکونی میں آ گیا تھا۔
 یہ تو پریشانی تھی کہ وہ آزاد ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ
 ہی یہ خوف بھی سما گیا تھا کہ وہ تادیہ ہو گیا ہے۔ نظر نہیں آ رہا
 ہے۔ پتا نہیں کب کہاں سے چھپ کر اس کی موت بن کر
 آ جائے گا۔
 دوسرے دن جگ دیو نے بالکونی میں آ کر دور تک

دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمارے اس بیٹے کے اندر نہیں آ سکی
 تھا۔ دونوں گارڈ جاگ رہے تھے۔ وہ ان پھلوں اور
 بیڑیوں کو دور سے ہی بالکونی میں پھینک کر گیا ہے۔“
 مرید نے کہا۔ ”ان چیزوں کو پھینک کر جانے کا
 مطلب یہ ہے کہ وہ بہت زور دے رہا ہے۔“
 ”ہاں“ مرید نے بتا دیا۔ ”وہ کدو سے یہ چیزیں یہاں
 پھینکا سکتا ہے تو دوسرے نہیں گولی بھی مار سکتا ہے۔“
 وہ بولی۔ ”نہیں۔ ہماری دشمنی ایسی ہے کہ وہ دور سے
 گولی نہیں مارے گا۔ مجھے دوڑانے گا۔ پلان کرے
 گا۔ پہلے کی طرح زخموں سے چور کرے گا پھر مارے گا۔“
 ”جگ دیو نے کہا۔ ”عجب دشمنی ہے تم دونوں کی۔“
 ”ہاں تم دیکھو گے۔ میں پھر اسے زخمی نہ کر سکی۔
 ابھی تو یہ چیزیں یہاں پھینک کر وہ بتا رہا ہے کہ کسی کی قید
 میں نہیں ہے۔ آزاد ہے اور کسی وقت بھی میری موت بنے
 والا ہے۔ اچھا ہے۔ میرا غم بننے کے لیے آزاد ہے۔“
 ”تجیز یہ معلوم کر لو کہ وہ آزاد کیسے پھر رہا ہے اور اسی
 علاقے میں کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟“
 ”جگ دیو نے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ وہ نیکٹ راکٹ کی
 قید سے کیسے نکل بھاگا ہے؟ میرا خیال ہے اس نے ویکٹ
 راؤ سے کسی طرح کی ڈیلنگ کی ہے۔“
 ”وہ مجھے مار ڈالنے یا پہلے کی طرح نیم مردہ کر دینے
 کے لیے کبھی بھی کرسکتا ہے۔“
 وہ بولا۔ ”اب میں تمہیں بتا دوں کہ ماسٹر کو یوں نے
 بھی اسے آفریدی تھی کہ وہ ہارنلے دارین کر رہے گا تو اسے
 تمہاری زنجیروں سے نجات دلا دی جائے گی۔ وہ مافی
 ہو گیا تھا لیکن اس نے ماسٹر کی یہ بات نہیں مانی کہ وہ
 تمہارا ماتحت رہ کر کام کرے گا۔“
 وہ بولی۔ ”ہاں۔ وہ اپنی ناک چنپی نہیں کرے گا۔“
 وہ بولا۔ ”ماسٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم دونوں
 کے درمیان کسی طرح سمجھوتہ کراؤں۔ میں اس رات اسے
 تمہارے پاس لا رہا تھا۔ تم دونوں کے درمیان صلح کرانا
 چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ویکٹ راؤ کے آدمی اسے
 لے گئے۔“
 پھر وہ بولا۔ ”مرید ایسی کیا بات ہے کہ تم دونوں
 ایک دوسرے کے کبوتر کے پیاسے ہو گئے ہو؟“
 ”کوئی شک نہیں۔ وہ ایک مادی نامی لڑکی
 کا دیوانہ ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری عورت کو ہاتھ نہیں لگاتا
 چاہتا۔ بڑا پارسا جتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے

ساتھ زندگی گزارے۔
 لیکن مجھے ٹھیکہ کراس نے میری انسلٹ کی ہے۔ اب
 تو یہ خند ہے کہ اسے اپنے ساتھ کچھ راتیں گزارنے پر مجبور
 کروں گی جب دل بھر جائے گا تو اسے گولی مار دوں گی۔
 اس ذلیل کتے سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لوں گی۔“
 ”مرید اقامت مانو یا نہ مانو۔ تمہاری یہ خند نہیں مہنگی پڑ
 رہی ہے۔ دیکھ لو کہ اس نے لوہے کی بندھنیں توڑ دی
 ہیں۔ اب تمہاری نیندیں اڑا رہا ہے۔“
 ”ہاں اس نے قہر میں جتا کر دیا ہے۔ ویسے میں بے
 یارہ دغا دہائیں ہوں۔ ماسٹر کو یوں کی پتاہ میں ہوں۔“
 ”بے شک تم یہاں محفوظ رہو گی۔ ہماری پوری کوشش
 ہو گی کہ وہ دوبارہ اوجرتہ آئے۔“
 مراد واقعی پھر اوجرتہ نہیں کیا۔ مرید کے لیے اس کا نہ
 آنا بھی عذاب ہو گیا۔ ہر آنے والا دن ہر آنے والی رات
 ویکٹ بین جاتی تھی کہ کل نہیں تو آج آئے گا۔
 اگر آ کر گزر جاتا۔ وہ نقصان اضافی یا فائدہ حاصل
 کرتی تو سکون حاصل ہوتا کہ طوقان آ کر گزر گیا ہے۔ یہ اس
 کی کامیابی تھی کہ اسے دل دھڑکانے والے انتظار میں جتا کر
 پکا تھا۔
 وہ جگ دیو کی ایک رہائش گاہ میں سکون سے
 تھا۔ ماسٹر کو یوں نے کہا تھا کہ وہ مکمل ٹریننگ حاصل کرنے کا
 تو اس پر سے پابندیاں اٹھائی جائیں گی۔ اسے موہاں فون
 اور ایک گاڑی ملے گی۔ ہندی زبان اور وہاں کے طور
 طریقے سیکھ لینے کے بعد اسے کہیں بھی آزادی سے جانے
 دیا جائے گا۔
 اس کی تربیت کے لیے ایک عورت اور ایک مرد و
 شام آتے تھے۔ اسے ہندی زبان سکھانے اور ہندوستانی
 رسم و رواج کو اچھی طرح سمجھانے کے علاوہ مختلف ہتھیاروں
 کو استعمال کرنا بھی سکھاتے رہتے تھے اور بڑے اہم
 ذرائع سے اس کی ہندوستانی شہریت کے لیے اہم کاغذات
 بھی تیار کرائے جاتے تھے۔
 مراد نے ان کی تمام ضروری شرائط تسلیم کی تھیں اور
 اپنی بھی یہ شرائط تسلیم کرانی تھی کہ ٹریننگ حاصل کرنے کے
 بعد وہ ایک آزاد ہندوستانی شہری کی طرح کسی بھی شہر، کسی بھی
 علاقے میں رہے گا۔ ماسٹر کو یوں بھی اچانک آدمی رات کو
 بھی کسی مشن پر جانے کے لیے کہے گا تو وہ فوراً روانہ
 ہو جائے گا۔
 ماسٹر نے کہا تھا۔ ”بھی وقت ضرورت مرید کے

ساتھ رہ کر کوئی ذہنی انجام دینی ہوگی۔ تم دونوں آجس میں
 لڑتے جھگڑتے رہو۔ ہم مداخلت نہیں کریں گے لیکن آپس
 کے جھگڑے کے باعث ہمارے کسی پروجیکٹ کو نقصان نہیں
 پہنچنا چاہیے۔“
 اس نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے کسی پروجیکٹ کو بھی
 نقصان نہیں پہنچے دے گا۔ وہ بڑی کم سن سے ہندی زبان اور
 وہاں کے طور طریقے سیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا جلد سے جلد
 تربیت حاصل کر لے تاکہ موہاں فون ہاتھ میں آئے اور وہ
 سب سے پہلے مادی کو فطرت کرے۔ اسے بتائے کہ وہ اس
 کے لیے زہر ہے اور جلد ہی اس کے پاس آنے والا ہے۔
 مڈکیٹ دی ماسٹر کو اپنی خدمات سونپنے کے بعد یہ
 آسان نہیں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ہندوستان چھوڑ کر
 پاکستان مادی کے پاس چلا جاتا۔ وہاں سے جانے کے
 لیے لازمی تھا کہ وہ مڈکیٹ کے لیے بڑے کارنامے انجام
 دے اور انہیں مالی فائدہ پہنچائے۔
 وہ آئندہ اپنی جان حیات سے کب ملے گا؟ کیسے
 ملے گا؟ یہ انکی سوچا نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ تجربوں کے رنگ
 ڈھنگ دیکھ کر مڈکیٹ دی ماسٹر کی طاقت کا اندازہ کرنے
 کے بعد وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے والا تھا۔ اس نے یہ بات
 صاف طور سے کہہ دی تھی کہ پاکستان کے خلاف نہ کوئی کام
 کرے گا نہ کسی کو بھی پکڑے دے گا۔
 ماسٹر کو یوں عالمی سطح کے تجربوں کے درمیان اس کی
 جنگجوئی کو آزماتا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی نہ ماننے والی کچھ
 شرطیں بھی کسی بحث کے بغیر مان گیا تھا۔
 مراد پندرہ دنوں میں ہندی کتاب انک انک کر
 پڑھنے لگا۔ لکھنے کی بھی مشقیں کر رہا تھا۔ وہی میں پھیل اسکی
 کا ایک دن جگ دیو کے فٹنوں کی خدمت سے انکسٹن میں
 کامیابیاں حاصل کرتا تھا اور اس کا احسان مند تھا۔ اس نے
 مراد کے سنے نام سے ہندوستانی شہریت کے کاغذات تیار
 کیے تھے۔
 مراد کا نیا نام نوشادہلی تھا۔ اس ایم این اے کے
 علاقے میں رہنے والے بے شمار لوگ انگریز کے وقت یہ
 گواہی دیتے کہ نوشادہلی اس علاقے میں پیدا ہوا تھا اور
 وہیں پڑھ لکھ کر جوان ہوا تھا۔
 اسے ہر پہلو سے ایک ہندوستانی مسلمان ثابت
 کرنے کے تمام قانونی کاغذات تیار ہو چکے تھے۔
 وہ ایک ماہ میں انکی طرح ہندی بولنے لگا۔ بڑی حد
 تک لکھنے پڑھنے بھی لگا۔ ایک ماہ کے بعد جگ دیو اسے ایک

قریبی شہر ہے پورے لے گیا۔ وہاں اسے آزاد چھوڑ دیا گیا تاکہ وہاں کے لوگوں سے ملتے جلتے رہے۔

اس نے وہاں دو دن دریا میں گزارے۔ جب دو دور سے اس کی گھرائی کرتا رہا۔ پھر خوش ہو کر یولا۔ "کسی کو شہر نہیں ہو اس کی نہیں ہندوستانی مسلمان سمجھتے رہے اور آگے دو چار میٹروں میں پہلے ہندوستانی بن جاؤ گے۔"

اس نے ایک نیا سو بائیس فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر تم کہا تھا کہ جب میں تمہاری فریڈنگ کے بعد مطمئن ہو جاؤں تو تمہاری تمام ضرورتیں پوری کرتا ہوں۔"

"تم کل کی فلائٹ سے دہلی جاؤ گے۔ کاغذات کے مطابق تم وہاں پہاڑی کے علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس علاقے کا نام این اے دھرم داس نہیں ضروری معلومات فراہم کرے گا تاکہ تم اس شہر کو اچھی طرح دیکھ لو اور سمجھو۔"

"تمہارے پاس اپنا رہائشی بنگلا آیتا بنک بینکس اور اپنی گاڑی ہوگی۔ تم اس ملک کے جس حصے میں جاؤ گے تمہیں ضرورت کی تمام چیزیں ملتی رہیں گی۔ تمہیں فون کی سہولت حاصل ہوگی ہے۔ یہ یوٹو پہلے کے کال کرنے والے ہو؟"

"ماسٹر کو یوٹو نے ایک ماہ پہلے کہا تھا کہ وہ مجھ سے اس دن بات کرے گا جس دن میں فریڈنگ حاصل کروں گا اور مجھے ایک نیا فون ملے گا۔"

"یعنی ابھی تم ماسٹر سے باتیں کر رہے؟"

"ماسٹر سے تھوڑی دیر بعد بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلے میں اپنی ماری کو خوش کروں گا۔"

"جگ دیو اچھے ہوئے یولا۔" اچھا تو میں چپتا ہوں۔"

پھر وہ جاتے جاتے رک کر سسکرتے ہوئے یولا۔ "اب تو فون آ گیا ہے۔ میرے سے بھی چپتر چھاؤ کرو گے؟"

مراد نے کہا۔ "اسے بتایا گیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ماسٹر کو یوٹو کے لیے کام کر رہی ہے اور میں انڈر ورلڈ کے سربراہ وینکٹ راؤ کے لیے خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اس طرح ہم آج بھی ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ میں کسی وقت ضرور اسے کال کروں گا۔"

جب دیو مسکراتا ہوا چلا گیا۔ مراد نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اس نے آبرام سے صوفے پر بیٹھ کر فون کو یوں دیکھا جیسے ماری کو کچھ رہا ہو۔ اس نے بڑے پیار سے فون کو چوم لیا۔ پھر اس کے نمبر کیجے۔ اسے کان سے لگا کر دھڑکتے ہوئے دل سے دوسری طرف کی رنگ

فون سننے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی دس بھری آواز سنائی دی۔

"ہیلو... آپ کون ہیں...؟"

وہ فون پر سانس چھوڑتا ہوا دھیمی سرگوشی میں یولا۔

"ماروی... میری جان!"

وہ لپکتے پھرتے پڑی۔ "مراد... اہم مراد یوں رہے ہو؟"

یا اللہ پھر یولا۔

اس نے پوچھا۔ "میری جان... کیا تمہیں امید تھی کہ پھر میری آواز سن سکو گی؟"

"ہاں۔ تم نے مجھے حوصلہ دیا تھا۔ مجھے کہا تھا میں آئندہ تمہارا انتقام کروں۔ تم وہاں آؤ گے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کبھی ہو؟"

وہ یولی۔ "وہی کبھی ہوں جو تم نے ایک ماہ پہلے فون پر کہا تھا۔ تم زخمی تھے اور تیار بھی تھے۔ جانے کیے انڈیا پہنچ گئے تھے؟ اب تو تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے طبیعت سنبھل گئی ہے۔ کیا اب بھی دشمنوں سے چھپ رہے ہو؟"

وہ یولی رسی تھی۔ مراد حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے اس نے فون نہیں کیا تھا۔ پھر کس فرشتے نے اسے روکے نہیں دیا تھا؟ وہ کون تھا جس نے اسے حوصلہ اور تسلیاں دی تھیں؟

اور کون ہو سکتا تھا؟ فرشتے کی بات ہو تو ایک ہی نام دماغ میں آتا تھا۔ اس نے فوراً ہی رائے قائم کی کہ محبوب نے ہی اس کے آئسو پوچھنے کے لیے اس کے نام سے فون کیا ہوگا۔

وہ خیالات سے چٹک گیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "چپ کیوں ہو؟ جواب دو۔"

وہ یولا۔ "کیا جواب دوں۔ تمہاری منہی حزم آواز کے بحر میں کھو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے صدیاں گزر جانے کے بعد تم میرے کانوں میں دس گول رہی ہو۔"

"دیکھو پھر تمہارے فون میں کوئی گزب نہ ہو۔ پچھلی بار بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔ اب بینکس ختم ہو سکتا ہے۔ یا سسٹنل کا مسئلہ ہو سکتا ہے اس لیے پہلے کام کی بات کرو۔ یہ بتاؤ کب آرہے ہو؟"

"یہ بتانا مشکل ہے۔ میرے پاس نہ پاکستانی پاسپورٹ ہے اور نہ ہندوستانی۔ میں سرحد پار کر کے نہیں آسکوں گا۔"

"تو فوراً پاسپورٹ بنالو۔"

"یہ آسان نہیں ہے۔ میری دھن میرے قانون کے خلاف مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میں یہاں قانون کے چانکوں سے چھپ کر رہتا ہوں۔ اس دہس میں رہائش کے لیے مجھے قانونی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوگی۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ یہاں کے معاملات اور اپنی مشکلات سمجھاؤں گا تو جس سے شام ہو جائے گی۔"

"تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم نہیں آسکو گے۔"

تمہاری مشکلات بھی تم نہیں ہوں گی۔

"ضرور تم ہوں گی۔ یہی موقع ملے ہی دشمنوں سے نجات حاصل کرتے ہی سرحد پار کر کے آ جاؤں گا۔"

"میں آخری سانس تک تمہاری راہنمائی رہوں گی۔"

"تمہارا یہ پیار میری خوش نصیبی ہے۔ لیکن میں ساری عمر تمہیں انتظار نہیں کراؤں گا۔ اگر حالات بھی موافق نہ ہوں اور میں نہ بچھ لیا کہ کبھی پاکستان نہیں آسکوں گا تو تم سے صاف کہہ دوں گا کہ میرے انتظار میں اپنی زندگی برباد نہ کرو۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ اگر یہاں نہ آسکو تو مجھے بلا لو۔ وہاں جیسے بھی حالات ہوں گے تم ساتھ رہیں گے۔"

"ماروی! تم اس دنیا کے شیطان مفت مجرموں کو اور ان کے خطرناک میل تماشوں کو نہیں جانتی ہو۔ میں ایسے ہیما تک مجرموں کی دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔ تمہیں ایسے ماحول سے دور رکھنے کے لیے میں بے دوا رہے ہوں۔"

"کیا میں ہمیشہ دور رہوں گی؟ کیا تم خطرناک مجرموں کی دنیا سے نکل کر آسکو گے؟"

وہ پریشان ہو کر یولا۔ "یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی نہیں دے سکوں گا۔ میں نہیں جانتا" آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ جاننے کے لیے مجھے اور تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

وہ خاصی دیر تک ایسی باتیں کرتے رہے۔ پھر مراد نے کہا۔ "مجھے اجازت دو۔ میں پھر کسی وقت تمہاری آواز سنوں گا۔ روز تم سے باتیں کروں گا۔ یہ یاد رکھو کہ یہی رابطہ نہ کرنا میری خبر نہ ملے تو پریشان نہ ہونا۔ میں حالات کی دلدل سے نکل کر تم سے رابطہ ضرور کروں گا۔"

وہ فون بند کر کے پریشانی سے سوچنے لگا۔ "واقعی ماروی تک پہنچنے کے لیے آگے اٹھنا ہے۔ میں دور تک دیکھ رہا ہوں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا اور میں اس کے بغیر ہی نہیں سکوں گا۔ ایک طویل ٹھکا دینے والے

اچھی باتیں

☆ انسان پہاڑ کی چوٹی سے گر کر ٹھیک ہو سکتا ہے، مگر کسی کی نگاہوں سے گر کر دوبارہ وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

☆ موت سے محبت کرو گے تو زندگی عطا کی جائے گی۔

☆ اگر آسمان پر بھی مشہور ہونا چاہتے ہو تو اپنے دوسرے کی ساداری کرو۔

☆ دنیا میں کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔

☆ گالی کا جواب نہ دو کہ کیڑے کو بے گالی نہیں بول سکتا۔

☆ عمل دل کو ایسے زندہ رکھتا ہے جیسے بارش زمین کو۔

☆ دو جھوٹ اللہ کو بہت پسند ہیں ایک مہربان اور دوسرا غصے کا۔

مرسلہ۔ احسان مہربان لونی

انتظار کے بعد ماروی نے نکل کر مجھ سے محبت کا اور گہری اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ سائیکس بہت اچھے ہیں لیکن ناکام ہو چکے ہیں۔ میں بخاری بازی جیت چکا ہوں۔ اب بارہا نہیں چاہوں گا۔

"مگر آؤ اللہ پر مجھے مات دینے کے لیے ترسانے اور تر پانے کے لیے تھی دور لے آئی ہے۔ گن، بارود، موت اور مجرموں کی بھیل میں وہابی کے سامنے بند کر رہی ہے۔"

"او ماروی! آخر سے مصمم بھینک کی قسم تیری سزا دور جوانی کی قسم تجھے دہن بتانے پر حال میں آکاں گا۔"

رات کی تاریکی تھی۔ آسمان پر چاند ماروی کی طرح روشن تھا۔ وہ بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پہلے دہن پر بھینک کی مصممیت حاوی رہتی تھی۔ جوانی میں ایک بار اس کا ہاتھ پکڑا تھا تو اس نے جلدی سے چھو لیا تھا۔ اسے پہلی بار نرم و نازک بدن کی لطافت اور کشش محسوس ہوئی تھی۔

دوسری بار وہ حالات میں اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ اس نے چاند سے چہرے کو دووں ہاتھوں میں لیا تھا۔ لیکن اس رات تو اس دلربا کے بدن نے خوب چاؤ چکا یا تھا جب وہ میری گرفت سے نکل کر حلال میں گر کر لڑکتی ہوئی ایک بڑے پھر سے نگرارے ہوئے ہوئی تھی۔

اس وقت بھی وہ یاد آ رہی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہو گیا

تھا۔ خدا کی قسم میری زندگی میں پہلی بار ایسا خاموش و نوازا آیا تھا۔ جس نے مجھے توڑ پھوڑ کو بھی حیرتی غلب میں سالم رکھا ہے۔

یہ دل چلتا رہتا ہے کہ ایسا زلزلہ بار بار آتا رہے۔

اسے بد قسمتی! ہمارے درمیان سرحدی کاٹنے ہیں۔

اس نے سردار بھری پھر اپنے فون کو دیکھ کر عجیب کے نمبر پر کیے۔ رابطہ ہونے پر یولا۔ "سامی! السلام علیکم۔"

وہ ایک دم سے چونک گیا۔ پھر خوش ہو کر سلام کا جواب دیتے ہوئے یولا۔ "مرادو... ا خدا کا شکر ہے۔ تم یوں رہے ہو۔ اپنی زندگی کا ثبوت دے کر ہمیں نئی زندگی دے رہے ہو۔ ماروی تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے تم اس سے باتیں کر چکے ہو؟"

"ہاں۔ میں اس سے باتیں کر چکا ہوں۔"

"تم کہاں ہو؟ کب آ رہے ہو؟"

"کیا آپ نے مراد بن کر ماروی کو فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ مجبور ہی تھی۔ اسے دھوکا دینا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے آسودہی طرح کچھ نہ سکا تھا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے کہ ہم سمندر میں غوطے لگا سکتے ہیں لیکن وہ روئے تو ڈوب کے رہ جاتے ہیں۔ میں مانتا ہوں۔ میری طرح آپ بھی اس کے آسوں میں کچھ نہ سکتے۔"

آپ نے بڑی دانشمندی سے اسے بہلایا ہے۔

"میں نے ایک کال کے بعد پھر کوئی کال نہیں کی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ تم زندہ ہو اور کسی دن واپس آؤ گے۔ تم بتاؤ مرادو! کب آ رہے ہو؟"

وہ مایوسی سے یولا۔ "کیا یوں؟ میں نے پہلی بار مرید سے نجات حاصل کرنے کے لیے بندوق پکڑی تو یہ میرے مقدر سے چپک کر رہ گئی ہے۔ میرے خلاف ایسے حالات چیل آ رہے ہیں کہ یہاں سے سمندر پار تک دشمن پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔"

"تو فون کی نظروں سے دیکھا جائے تو میں قاتل اور ایسا خطرناک مجرم بن گیا ہوں کہ بدنام زمانہ مجرموں کی فہرست میں ایک ایسی میری خدمات حاصل کر رہی ہیں۔ آج میں ان ہی ایک ایسی کی سرپرستی میں ہوں۔ اگر ان کا سہارا نہ لوں تو یہاں انڈیا میں مجھے پاکستانی جاسوس کہہ کر کوئی مار دی جائے گی۔"

"فی الحال مجھے ان مجرموں کا احماد حاصل کرنا ہے جو مجھے سیکورٹی دے رہے ہیں۔ شاید مہینوں گزر جائیں گے میں یہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔ مختصر یہ کہ میں

جرائم کی دلدل میں دھنسا جا رہا ہوں۔

"آپ نے پوچھا ہے۔ ماروی بھی پوچھتی ہے کہ میں کب آ رہا ہوں۔ میں نے اسے بھی سمجھایا ہے کہ فی الحال جرائم کی دلدل سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ آپ بتائیں سامی! میں کیا کروں؟"

عجیب نے کہا۔ "واقعی تم جرائم کی بیوں بھٹیوں میں ہو۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر بھی تم اپنے ملک کو اپنی ماروی کو چھوڑ کر نہیں رہ سکو گے۔ میں تمہاری زندگی طبیعت سے سمجھتا ہوں تم آج نہیں تو کل ماروی کے پاس آنے کے لیے تمام خطرناک مجرموں کو اور سیکورٹی دینے والے مجرموں کو بھی اپنا دکن بنالو گے۔"

"ابھی طرح ہر پہلو سے سوچو تو یہی نظر آتا ہے کہ کبھی امن و امان سے ازدواجی مہر ملے زندگی نہیں گزار سکو گے۔"

"ماروی کو اور اپنے بیوں کو تحفظ اور سلامتی نہیں دے سکو گے۔ یہ سوچو کہ کبھی تم بھی تمہارے بچے کی گولیاں مار دی اور بیوں کی طرف آئیں گی اور وہ تم سے پوچھ کر نہیں آئیں گی۔ پھر انہیں سلامتی کیسے دو گے؟"

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ "سامی! بس کریں اور کچھ نہ یوئیں۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد میں نے ماروی کا دل جیتا ہے۔ میں اسے ہارتا نہیں چاہوں گا۔ حالات سازگار ہوتے ہی آؤں گا اور اسے اپنی دہن ضرور بناؤں گا۔ کوئی جیتتی ہوئی بازی ہارنا نہیں چاہتا۔ میں اسے شریک حیات بنانے کے لیے دشمن حالات سے لڑوں گا۔ میں ابھی کہہ نہیں سکتا کہ اپنی ماروی کے لیے کیا کر رہا ہوں گا۔"

"میں بھی سوچوں گا آپ بھی سوچیں کہ ماروی میرے ساتھ ہی خوش رہ سکے گی۔ آپ اس کی خوشی کے لیے کیا کر سکیں گے؟ میں کل ہی وقت بات کروں گا۔"

فون بند ہو گیا۔ عجیب اپنے فون کو دیکھ کر سوچتے لگا۔ "بے شک میں ماروی کی خوشیوں میں خوش ہوں میں اسے راضی خوشی مراد کی دہن بننے دیکھوں گا لیکن اس کی ازدواجی زندگی کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اس کے ساتھ خوش تو رہے گی لیکن دن رات خطرات میں گھری رہے گی۔ ان کی جو اولاد ہوگی وہ بھی جانے اچانک دشمنوں کے نشانے پر رہ جائے گی۔ میں بھی نہیں چاہوں گا کہ ماروی اسکی لکھی کرے۔"

پھر وہ بے یقینی سے پہلو بدلتے ہوئے زیراب۔۔۔

جڑایا۔ "میں کیا کروں۔ ماروی کے فیصلے کے خلاف اسے سمجھاؤں گا۔ اس کی بھری چاہوں کا تو یہی کہا جائے گا کہ

اب میں مراد کو قریب نہ کر پونے لگا ہوں۔

"چھپ کر فرض ہے۔ میں حقیقت بیان کروں گا جسے تب کا ذہن تسلیم کرے۔ وہ حقائق بیان کروں گا کہ کس طرح مراد کی بھراؤ زندگی ماروی کو برباد کر دے گی۔ میں اس راستے پر اسے جانے نہیں دوں گا جہاں آگے کانٹوں بھری خندق ہے۔ میں چاہتا چاہتا ہے اور معروف صاحب سے کہوں گا وہ بھی اسے سمجھائیں گے۔ شاید ہم سب کے سمجھانے سے وہ لکھی کرنے سے باز آجائے۔"

"اسے جلد ہی تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اس کی محبت تو ہے۔ اس کا حافظہ نہیں ہے۔ وہ جسے تجاری خدا بنائے گی، وہ نا خدا بن کر کسی دن اسے ڈوبے گا۔"

وہ دیر تک سوچتا رہا پھر فون اٹھا کر چاہتا ہے اور معروف لکھی سے رابطہ کرنے لگا۔

آخر مراد نے فون کو مضبوطی سے یوں قلم رکھا تھا جیسے ماروی اچھے سے چھوئے والی ہو۔ عجیب نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ماروی کو دہن بنا کر اس کی زندگی برباد کر دے گا اور اس نے درست کہا تھا۔ وہ بھی دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ ماروی اس کی شریک حیات بن کر طرح طرح کے مصائب سے گزرتی رہے گی۔

لیکن اس وقت فون پر عجیب کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا۔ "شاید اب سامی کے اندر رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ ماروی ان کی رگ رگ میں سائی ہوئی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ وہ میری ہو جائے۔"

اس نے فون کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ماروی کو چھوڑنے کی بات وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر یہ محبت تو نہیں ہوئی۔ وہ پیش و آرام کی برائے زندگی گزار رہی ہے۔ ایسے میں اسے سلامتی سے نکال کر موت اور مصیبتوں کی دنیا میں لے آئے گا۔

اگرچہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے نہ چاہنے سے ہوئی انہوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسا تو ہو سکتا تھا کہ وہ آگ سے بچتا رہے اور ماروی اس میں نہ بیٹے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ اس کے فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ ابھی کسی کو نیا نمبر نہیں دیا تھا پھر کون اسے کال کر رہا تھا؟

اس نے کئی اسکرین پر انجانے نمبر پر پڑے پھر بن کر دیکھا کہ اس کا نام ہے۔ دوسری طرف سے ماسٹر کیو کی آواز سنائی دی۔ "سہارک ہو تم پر سے تمام پابندیاں اٹھا لی گئی ہیں۔ جبک دیوئے تمہارا یہ نمبر بتایا میں نے سوچا پہلے

میں ہی تمہیں کال کروں۔"

وہ یولا۔ "تھیک ہو ماسٹر کیو یو ہم ایک ماہ کے بعد یوں رہے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

"تم شاید کل تک دہلی جاؤ گے وہاں تمہاری رہائش کا انتظام کیا گیا ہے۔ تم اس شہر کو ابھی طرح دیکھو۔ سمجھو گے۔ پھر تم سے ایک اہم کام لیا جائے گا۔"

"میں دو چار ماہ تک یہاں کے فرائض انجام دینے کے بعد پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ وہاں رہ کر آپ کا کام کرتا رہوں گا پھر وہاں سے جس ملک میں جانے کو کہا جائے گا جاتا رہوں گا لیکن اپنا مستقل قیام پاکستان میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم دنیا کے جس ملک میں رہو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا کام ہوتا رہتا ہے۔"

"وہ چار مہینے کی بات کیا کرتے ہو؟ ایک مہینے کے اندر میرا ایک اہم کام کر دو پھر پاکستان چلے جاؤ۔ اس کے بعد ضرورت کے وقت جس ملک میں جانا ہو وہاں جاتے رہو۔"

وہ خوش ہو کر یولا۔ "بہت بہت شکر ہے ماسٹر کیو۔ پھر تو میں تمام عمر آپ کا کام کرتا رہوں گا۔" ماسٹر نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔ "کیا پاکستان میں شادی کرنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں ماسٹر۔۔۔ ابھی جب سے یہاں آیا ہوں ابھی سے خوشیاں حاصل کرتے اپنی ماروی کے پاس جاتے اور اسے اپنی دہن بنانے کے لیے تپا رہا ہوں۔"

"جب پاکستان میں مستقل رہو گے تو گاڑی بیٹھا یہاں نہیں۔ وہاں دیا جائے گا۔ تمہارا ہوم سوٹ ہوم پاکستان میں رہے گا۔"

"شکر ہے ماسٹر! جس اے لاٹ۔ ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا شادی کرنے کے بعد میری بیوی بیوں کو خطرات نہیں آئیں گے؟ کیا دہن نہیں بھی لٹا دیتا ہے؟"

"ہاں۔ دشمنوں کی یہ فکر تھی ہوتی ہے وہ اپنی ناکامیوں سے بھینچا کر بے تصور مجرموں اور بیوں کو مار ڈالتے ہیں۔"

وہ ڈراما پس ہوا۔ پھر یولا۔ "آپ کے بیوی بچے ہیں؟"

"دو بیویاں ہیں۔ ایک لندن میں ایک ساؤتھ افریقا میں ہے۔ دونوں سے ہونے والے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ دو بیویوں کی شادیاں ہو چکی ہیں باقی دو کی بھی ہو جائیں گی۔ لیکن بیٹے مختلف ملکوں میں میرا کام سنبھال رہے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم نے پوچھا چاہتے ہو کہ میرے دشمنوں کی چلائی ہوئی گولیاں میرے بچوں تک کیوں نہیں پہنچیں؟"

"کی ہاں۔ میں بھی سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اپنی

ماروی کو اور اپنے بچوں کو دشمنوں سے کسے بچا کر رکھوں گا؟
 "کوئی برا بھلا نہیں ہے۔ بالکل سیدھی سی بات ہے
 ان کے لیے سچ گارڈز اور سکیورٹی کے جدید آلات اپنی
 رہائش گاہوں میں اپنی گاڑیوں میں رکھا کر دے۔
 پرائیویٹ سروس فراہم کنندہ کی خدمات حاصل کرتے رہو
 گے۔ وہ دشمنوں کے خلاف خبری کرتے رہیں گے اور ہم ہمیشہ
 دشمنوں سے باخبر رہا کر دے گے۔ اگر چاہیں پہلی ہی سکیورٹی
 میں اختراعات بہت ہیں۔ ہونے دو کوئی بات نہیں آخر ہم
 کماٹے کس کے لیے ہیں۔ آئے دن خطرات سے کھیلنے کس
 کے لیے ہیں؟ صرف اپنی محبوب بیوی اور بچا کر دینے والے
 بچوں کے لیے..."
 وہ خوش ہو کر بولا۔ "آپ کی باتوں سے مجھے بہت
 حوصلہ مل رہا ہے۔ کیا میں ان کی سکیورٹی کے لیے اپنی دولت
 کما سکوں گا؟"
 "یہ تو تم اپنی صلاحیتوں کو اپنی طاقت کو اپنے حوصلوں
 کو خودی تو لو اور سمجھو۔"
 "میرا حوصلہ تو یہ ہے کہ اپنی ماروی کے لیے کروڑوں
 روپے حاصل کروں گا۔"
 "میرا بات واضح کر دیں کہ آپ کے کام سے الگ میری
 جو کمائی ہوئی "وہ صرف میری ہوگی۔"
 "تمہاری پرسنل انکم میں میرا فوری پرفمنٹ ہوگا
 کیونکہ میں دنیا کے تمام ملکوں میں تمہارے جانے آنے رہنے
 سب سے اوپر تمہاری سکیورٹی کے انتظامات کرتا رہوں گا۔"
 "میں مقول بات ہے میں سسٹمی پرفمنٹ کمانے کی
 خاطر اپنی ذاتی آمدنی کا یہ سلسلہ شروع کروں گا۔"
 ماسٹر سے فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ ماروی کے ساتھ
 سلامتی سے اڑوہائی زندگی گزارنے کی تدبیر اور حکمت عملی
 معلوم ہو گئی تھی۔ اب کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی
 رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ وہ مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ ماسٹر
 کو یوں نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر ایک اہم فرض کی
 ادائیگی کے بعد پاکستان جاسکتا ہے یعنی وہ ایک ہفتے بعد اپنی
 ماروی سے مل سکتا تھا۔ وہ راضی ہو جاتی تو چٹ پٹ پٹ بیاہ
 ہو سکتا تھا۔ وہ جیسے جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اپنی جان
 حیات کے لیے کسی گردش میں تھا؟ کہاں کہاں بھٹک رہا
 تھا؟ کیا کیا کر رہا تھا۔
 بھی عرض پر بھی عرض پر بھی ان کا درجہ اور بدر
 تم زندگی بھر یہ نہیں کہاں کہاں سے گزار گیا
 ایسے وقت اسے مرینہ یاد آئی۔ اس نے ناگواری

سے سوچا۔ "اگر وہ حقائق مجھے یہاں نہ لاتی تو ابھی میں اپنی
 ماروی کے قریب رہتا۔ اسے تو میں چھوڑوں گا نہیں..."
 ماسٹر کو یوں اور جگہ دینے لگا تھا کہ وہ مرینہ سے
 چاہے جیسی بھی دشمنی کرے لیکن اسے ہلاک نہ کرے۔ اس
 سے جان لینے والی دشمنی بھی نہ کرے۔ ان کی مثالاً غیرتوں
 سے "وہی ماسٹر ڈسٹ کیٹ" کو بھی نقصان نہ پہنچے۔
 اب وہ مجبور تھا۔ اسے جنم میں نہیں پہنچا تھا لیکن
 اس کی ابھی طرح مرثت کر سکتا تھا۔ وہاں اس کا جینا حرام
 نہ تھا۔
 اس نے کچھ سوچ کر اسے کال کی۔ مرینہ نے اپنے
 فون کی اسکرین پر اچانک فہر پر مڑے پھر اسے کان سے لگا
 کر پوچھا۔ "ہیلو... اکون ہو..."
 وہ سرد لہجے میں بولا۔ "تمہاری موت..."
 وہ اچانک اس کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ کچھ غور غور
 ہوئی کچھ حیران ہو کر بولی۔ "تم...؟ مراد تم...؟ تم کہاں
 ہو مراد..."
 وہ اپنے طور پر دلیری ظاہر کرنے کے لیے ہنسنے
 ہوئے بولی۔ "میں روز تمہارا انتظار کرتی ہوں کہ آؤ
 گے۔ ضرور آؤ گے۔ بھلاؤں اور بیڑیوں کی طرح کچھ
 پھینکنے کے لیے ایک تو لی میرے نام سے چلانے آؤ گے۔"
 "یعنی تم اپنی موت کا انتظار کرتی رہتی ہو؟"
 "موت کو تو ایک دن آتا ہی ہے۔ میں ڈرنے والی
 نہیں ہوں۔ تم پر مرنے والی ہوں۔ تم میری محبت کو کب سمجھ
 گے؟ تمہارے ساتھ صرف ایک پارے ہونے کے بعد تمہارے
 ہاتھوں میں جانا چاہتی ہوں۔"
 "تم یہ حسرت لے کر دنیا سے جاؤ گی۔ اتنی بڑی دنیا
 میں صرف ایک ہی ہستی ہے جو میری دھڑکنوں سے گئی
 اور تم اسے ابھی طرح جانتی ہو۔"
 "جانتی ہوں۔ میں نہیں اس سے بہت دور لے آئی
 ہوں۔ میرا کمال دیکھنا چاہو تو پھر اس کے پاس پہنچا دوں
 گی۔ شرط یہ ہے کہ پہلے میری پیاس بجھا دو۔"
 "میں اپنی ماروی تک پہنچنے کے راستے خود بنا سکتا
 ہوں۔ تم اپنی سانس نہیں رکھو۔ تمہیں یہاں زندہ چھوڑ کر نہیں
 جاؤں گا۔"
 "دعویٰ نہ کرو۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتانے کا کہ
 ہم میں سے کون کس پر حاوی ہوگا۔ یہ تو بتاؤ تم جیسا ہمارا
 آئے ہو اور آتے ہی ہم سے کچھ کرکس کے ساتھ کام کرنے
 گے ہو؟"

وہ بولا۔ "اگر روز ملے کے ایک پاس وینکٹ راؤ سے
 معاملات طے کر چکا ہوں۔ اس کا ایک کام کرنے کے لیے
 دلی آیا ہوں۔"
 وہ پریشان ہو کر بولی۔ "دلی...؟ تم دلی میں ہو۔"
 وہ بولا۔ "یوں سمجھو۔ تمہارا پیچھا کرتا ہوا آیا ہوں۔ تم
 جن جن کمرہ کی کمری نظروں میں ہو۔ میں تمہاری رہائش
 گاہ دیکھ چکا ہوں۔ جب چاہوں گا تمہاری شرک تک پہنچ
 جاؤں گا۔"
 اس نے دھمکی دے کر فون بند کر دیا۔ مرینہ مقابلے
 پر آنے سے ڈرتی نہیں تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ پھر ایک بار
 سامنا ہو جائے اور وہ اپنے حسن و شباب کے ہتھیاروں سے
 اسے مات دینے کی ایک آخری کوشش کرے لیکن اس وقت
 یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی کہ مراد اس کے پیچھے دلی آ گیا
 ہے۔ وہ اس کی نظروں میں رہتی ہے اور وہ خود اس کی نظروں
 سے اوجھل رہتا ہے۔
 بڑے بڑے شہر و دیہی اس وقت ڈرتے ہیں جب
 مقابلے موجود ہو کر بھی نظر نہیں آتا۔ مرینہ نے جگہ دینے سے
 فون پر کہا۔ "وینکٹ راؤ کے آدمی تمہارے آدمیوں سے
 زیادہ ہوشیار اور باخبر رہتے ہیں۔ مراد کو معلوم ہو گیا ہے کہ
 میں دلی میں ہوں۔ وہ بھی یہاں پہنچا ہوا ہے۔"
 جگہ دینے لگا۔ "جس نے مجھے تم سے کہا ہے کہ مراد
 دلی میں ہے تو غلط کہا ہے۔ ہمارے آدمیوں کی رپورٹ
 کے مطابق وہ ابھی ہے پور میں کھین ہے۔"
 وہ بولی۔ "مجھے مراد نے خود کہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ
 میں دلی کے کسی علاقے میں ہوں۔"
 "میں ابھی معلوم کر دں گا کہ وہ کہاں ہے؟"
 جگہ دینے اس سے رابطہ ختم کر کے مراد کو فون پر
 مخاطب کیا پھر کہا۔ "تم نے مرینہ کو یہ کہہ کر دھلا دیا ہے کہ
 دلی میں ہو اور اس پر نظر رکھتے ہو۔ ویسے تم کل کی فلاح
 سے جانے والے تھے لیکن اب کچھ تبدیلی ہوئی ہے تم آج
 رات بائی روڈ دلی جاؤ گے۔"
 اس نے بتایا کہ اس کی نگرانی میں سرحد پار سے سونا
 اگلے ہو کر آتا ہے۔ وہ اور اس کے آدمی سونا خریدنے والوں
 کو پاس سے چھاتے ان کے گھروں تک پہنچاتے ہیں۔
 جگہ دینے کی سکیورٹی ایسی ہوتی ہے کہ راستے میں کوئی
 انہیں لوٹنے کی جرات نہیں کرتا اور مال کو پہنچانے تک پہنچتی
 نہیں چڑکیاں آتی ہیں انہیں مقررہ رشتہ ادا کر دی جاتی
 ہے کروڑوں کا مال روک لو کہ بغیر پہنچ جاتا ہے۔

ماروی

سمجھ کر دھاری لال دلی کا بہت ہی معروف جیولر
 تھا۔ بڑی رازداری سے اسے اگلے کیا ہوا سونا سرحد سے لاتا
 تھا۔ دلی پہنچ کر کولکھ اور دھارم کی مارکیٹ میں دھکی قیمت
 پر فروخت کرتا تھا اور اب پتی جیولر کہلاتا تھا۔
 اس بچا سے عجیب دولت مندی کمزوری پشپارانی
 تھی۔ تیس برس کی اچھی کھائی کھاتی ہوئی عورت
 تھی۔ گرد دھاری لال بچاس برس کا تھا۔ تیس برس دلی پر دل
 آ گیا تھا۔
 پشپارانی ایسے دولت مندوں کو دہانہ بنانا جانتی
 تھی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔ وہ اس کا ایسا
 دہانہ ہو گیا تھا کہ اسے اپنے کاروباری راز میں شریک
 کرنے لگا تھا۔
 پشپارانی پچھلے دو برسوں میں کئی بار پاک بھارت...
 حد پر مال خریدنے آ چکی تھی۔ گرد دھاری لال کئی بار جگہ دینے
 سے کہہ چکا تھا کہ پشپارانی اس کی حرم تھی ہے۔ کئی وہ مال
 لینے نہیں آئے گا تو اس کے دل کی رانی میں دین کے لیے آیا
 کرے گی۔
 اس روز وہ اپنے پتی گرد دھاری لال کے ساتھ آئی تو
 اس کے ساتھ ایک جوان محنت مند تھا۔ اس کا نام شہباز
 خان تھا۔ گرد دھاری لال نے بتایا کہ وہ اس کا پاؤں گاڑ رہا
 آئندہ ان کے ساتھ وہاں آتا رہے گا۔
 شہباز حقیقتاً پشپارانی کا نیا پار تھا۔ وہ گرد دھاری لال
 سے بچھا چھڑا چاہتی تھی۔ اس نے اسے گنگ کے مال خریدنے
 سے اور اسے مارکیٹ میں فروخت کرنے کے گزنیٹھ لیے
 تھے۔ باؤں پر جگہ دینے جیسے وعدہ کرنے والوں کا اعتماد بھی
 حاصل کر لیا تھا۔
 اس نے جگہ دینے سے تنہائی میں کہا۔ "ایک کروڑ ہی
 لاکھ کا سونا لے جا رہی ہوں۔ اگر راستے میں تمہارے آدمی
 رکاوٹ نہیں بنیں گے تو میرا یہ پاؤں گاڑ کر دھاری لال کو
 ترک میں پہنچا دے گا۔ میرا ساتھ دو گے تو میں ابھی دس لاکھ کا
 سونا چھپیں دے کر جا رہی ہوں۔ بلو مجھ سے ٹیل کرتے ہو؟"
 جگہ دینے نے ماسٹر کو یوں کو فون پر پشپارانی کے
 ارادے بتائے پھر کہا۔ "رانی بہت چالو عورت ہے آئندہ
 اسی سے ہمارا لین دین رہا کرے گا ابھی دس لاکھ کا سونا مل
 رہا ہے۔ کیا حکم ہے؟"
 کو یوں نے کہا۔ "پشپارانی سے ڈن کرلو۔"
 ☆☆☆☆
 پاک بھارت سرحد سے قریب وہ ایک چھوٹا سا گاؤں

ہو۔ بدھوق کے بغیر اسے یوں لگ رہا تھا کہ اسے زبردستی چوڑیاں پہنا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ فون پر رابطہ قائم ہو گیا۔ مراد نے غصہ کیا۔ ”بٹھائے! میں بول رہا ہوں۔“ وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ”مراد... اقم زندہ ہو؟ اوکا ڈا میں تو تم پر قانع بڑھ چکا تھا۔“ مراد نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”قسمت ہمارے ساتھ ہوتی کوئی اپنے پاس کن رکھ کر بھی نہیں مار سکتا۔“ شہباز نے اسے گھور کر دیکھا۔ پشیمانے اسے صبر کرنے اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ فون پر بول رہا تھا۔ ”تم کہاں ہو؟ اور کس حال میں ہو؟“ ”بہت بُرے حال میں ہوں۔ عالی جناب کے سٹوں سے چھٹا پھر رہا ہوں۔ اپنی مٹی سے ملنے کے لیے توب رہا ہوں لیکن کراچی نہیں جا سکتا۔ کیا کروں؟ کہیں سے کوئی کہا ہاتھ مارنے کا پاس نہیں مل رہا ہے۔“ ”فکر نہ کرو۔ میں کل تک تمہارے لیے کچھ کروں گا۔“ ”تم کہاں ہو بتاؤ۔ میں ابھی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ ”میں ابھی نہیں جتا سکتا کہ کہاں ہوں۔ کل تک تمہیں کال کروں گا پھر اپنے حالات بتاؤں گا اور تمہارے لیے بھی ضرور کچھ کروں گا۔ ابھی زیادہ بول نہیں سکتا۔ کل تک انتظار کرو۔“ اس نے رابطہ ختم کر کے فون کو ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی رنگ فون ابھرنے لگی۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا۔ سرینے کال کر رہی تھی۔ ”پچھلی سیٹ سے پشیمانے کہا۔“ ”تم فون پر باتیں کرنے کے لیے کار دوسرے چار رہے ہو۔ یہی رفتار رہی تو ہمیں تھنے دنوں میں دہلی پہنچاؤ گے؟“ وہ بولا۔ ”جب عورت بولتی ہے تو مرد کی رفتار بڑھ جاتی ہے ابھی فون پر ایک عورت بول رہی ہے۔“ اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”میں اب ایک عورت تعقیف میں ہے۔ خدا خیر کرے۔ تم یوں نہیں کیا تکلیف ہے؟“ پشیمانی اپنی سیٹ پر یوں پہلو بدلنے لگی جیسے صبر کر رہی ہو۔ اُدھر مرید نے کہا۔ ”ہائے مراد...! پورا پورا تھل آیا ہے۔ تم بھی کہیں سے تھل آؤ...! جوانی بہت ستا رہی ہے۔“ مراد نے عجب لہا آئینے میں پیچھے بیٹھی ہوئی پشیمانی کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو ایک ہاتھ سے عورت کو پیچھے سے لگاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بلاؤڑی زپ کو اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں۔“

اس کے ساتھیوں نے شہباز کو اپنی بدھوقوں کے لٹانے پر رکھ لیا۔ ایک نے کہا۔ ”لے مسٹر پاؤی گاڑو...! اپنی گن میں دو۔ ورنہ ابھی کو لیاں چلیں گی۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تم ڈرائیو کرنے والے کو مارو۔ تم جو تم تینوں کی لائیں گرا دیں گے۔“ شہباز دوطرف سے لٹانے پر تھا۔ مراد نے اس سے گن جھین لی۔ پشیمانے پریشان ہو کر کہا۔ ”شہباز کے پاس گن رہے دو۔ جگ دیو نے تم کو گن کو بتایا ہوگا۔“ ایک نے کہا۔ ”ہاں بتایا تھا۔ ہم جانتے ہیں اس گن کو تمہارے پاؤی گاڑو کے پاس کیوں رہنا چاہیے۔ یہاں سے اتنی کھوٹے فاسٹے پروہ جگ مناسب ہے۔ وہاں اسے گن واہیں دے دی جائے گی۔“ مراد کا سرے لٹل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کی جیب تک گیا۔ ان سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ گردھاری نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پشیمانی سے کہا۔ ”میرے دل کی رانی! ابھی محض سے کام لو۔ ہمارا کروڑوں کا مال ان کے آسرے پر ہے۔ ان کے منہ نہ لگو۔ انہوں نے ہمارے گاڑو سے گن لے لی ہے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارا مال تو حفاظت سے پہنچا میں گے۔“ شہباز نے کہا۔ ”میرے پاس گن ہونی چاہیے۔ اگر ان کی نیت خراب ہوگی، ہمارا مال لینا چاہیں گے تو آپ دیکھیں گے میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ گردھاری نے پوچھا۔ ”ابھی تمہارے پاس گن تھی تو تم نے کیا کر لیا؟ ابھی تم بچھ نہ کر سکو۔ وہ ہمیں مار ڈالیں گے ہمارا مال لے جائیں گے تو تم کیا کرو گے؟“ وہ جھپٹ کر پشیمانی کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے شہباز! ان کے منہ نہ لگو۔ انہوں نے کہا ہے آگے جا کر تمہاری گن واہیں کر دیں گے۔“ مراد واہیں آ کر ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ پورا چاند نکل آیا تھا۔ ان کے چاروں طرف کاویر ان علاقہ چاندنی میں دو رنگ نظر آنے لگا۔ مراد نے موبائل فون نکال کر مسکراتے ہوئے شہباز سے پوچھا۔ ”اب کوئی تم کو دے گا؟“ وہ ناگوار سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ دو نمبر بیچ کرتے ہوئے بولا۔ ”میری کھوپڑی میں ابھی طرح یہ بات آگئی ہے کہ یہ دنیا بدھوق کے زور سے چلتی ہے۔“ شہباز ایسے تھوک لٹکے لگے جیسے خون کے کھوٹ لیا رہا

گردھاری لال رات کے آٹھ بجے اپنی زندگی کا آخری کھانا کھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر اپنی پشیمانی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ پر شہباز گن لیے ہوئے تھا۔ مراد ڈرائیو تک سیٹ پر آ گیا۔ ان کے پیچھے ایک جیب میں مراد کے دو ساکھی تھے۔ وہ آگے پائیس چو کیوں میں دوسرے کے مطابق قانون کے محافضوں کو کھلاتے پلاتے جاتے والے تھے۔ رات کے نو بجے وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ مراد نے اس ایک ماہ میں کئی بار پلے کو یاد کیا تھا۔ سوچا تھا جب فون ہاتھ میں آئے گا تو اس سے رابطہ کرے گا وہ بہت سی مایوس تھا۔ اس نے عروٹ میں بڑی جواں مردی سے مراد کے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔ کار ڈرائیو کرتے وقت اسے پھر بلا یاد آیا اس نے اسی وقت فون نکال کر اس کے نمبر بیچ کیے۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے شہباز نے کہا۔ ”گاڑی ڈرائیو کرتے وقت فون نہ کرو۔“ مراد نے کہا۔ ”آرام سے بیٹھ رہو کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔“ وہ بولا۔ ”بحث نہ کرو۔ میں غم دیتا ہوں۔ فون نہ کرو۔“ پیچھے بیٹھی ہوئی پشیمانے کہا۔ ”تمہیں میرے پاؤی گاڑو کا حکم ماننا چاہیے۔ میں بھی یہی حکم دے رہی ہوں۔“ شہباز نے کن کا رخ مراد کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”رانی صاحبہ کا حکم موت کی طرح مل جاتا ہے۔“ مراد نے رفتار دھبی کرتے ہوئے گاڑی روک دی۔ پیچھے جیب بھی گن کی۔ اس کے دونوں ساکھی دوڑتے ہوئے مراد کے پاس آئے۔ ایک نے پوچھا۔ ”گاڑی کیوں روک دی؟“ مراد نے کہا۔ ”اس پاؤی گاڑو کے پاس جب تک گن رہے گی گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔“ پھر اس نے پچھلی سیٹ کی طرف سرگھا کر کہا۔ ”سیٹ صاحب! تمہارا کروڑوں کا سونا یہاں مٹی ہو جائے گا۔“ گردھاری نے پریشان ہو کر کہا۔ ”ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ شہباز تم اسے گن کیوں دکھا رہے ہو؟“ پشیمانے کہا۔ ”ہم ہمیشہ اپنی مرضی سے سفر کرتے ہیں۔ ہماری رکھتا کرنے والے ہمیں یہاں سے لے جاتے والے ہمارے تابع دار بن کر رہتے ہیں۔“ مراد نے کہا۔ ”میں کسی کا تابع دار نہیں ہوں۔ مال آگے لے جانا چاہتے ہو یا نہیں؟“

تھا۔ وہاں مٹی کے کچے گھروں میں تقریباً ساٹھ ستر گھرانے آباد تھے۔ ان گھروں میں رہنے والے سب ہی مرد و عورتیں اس گھروں کے تابع دار تھے۔ وہیں ایک گیسٹ ہاؤس بنایا گیا تھا جہاں اس گھٹک کا مال خریدنے والے تاجر آ کر قیام کرتے تھے۔ پشیمانی اس گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں لباس بدل رہی تھی۔ کمرے کے باہر پاؤی گاڑو شہباز گن لیے کھڑا تھا۔ دروازے پر ہلکی مارا دروازہ دنگ ہوئی تو وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اسی کمرے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سیٹھ گردھاری لال ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ دوسری کرسی پر اس کے پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ملازم اس کے پیچھے کھڑا سر کی مائش کر رہا تھا۔ ایسے وقت مراد گیسٹ ہاؤس کے پیچھے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک جذباتی منظر دکھائی دیا۔ پشیمانی گاڑو کے بازوؤں میں گئی اور وہ ایک ہاتھ سے اس کے بلاؤڑی زپ چڑھا رہا تھا۔ ایسے دل دھڑکا دینے والے نظارے کا نظارہ کرنے کے لیے قدم زک جاتے ہیں۔ ایک کھٹائی کھاتے دیکھ کر دوسرا اٹھاتا ہے کہ تم بھی کھا میں گے۔ اسی لیے صحت کی جاتی ہے کہ گناہ ہوتا رہے تو نہ دیکھو۔ منہ پھر نہ گناہ ہوتے دیکھنا بھی گناہ ہے۔ بلکہ گناہ کرنے سے زیادہ دیکھنا گناہ ہے۔ کیونکہ دیکھنے ہی سے سوئی ہوئی ہوس جاتی ہے۔ فوراً ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ دیکھنے سے اور اس نظارے کو تصور میں محفوظ رکھنے سے غلیظ خواہشیں پرورش پاتی ہیں۔ اسے بے ہوش ماروی کا بدن یاد آ گیا تھا۔ وہ منہ پھیر کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کی زندگی میں ماروی کے بعد مرید اس کے بہت قریب تھی لیکن اسے کبھی نہ نہیں لگا تھا۔ گھر اس کھڑکی سے بیٹھے ہی ماروی کے ساتھ مرید بھی اس کے خیالوں میں آئی۔ گناہ سے گناہ کا رابطہ ہوتا ہے۔ ایک عورت کے مسلسل سے دوسری عورتیں دماغ میں چلی آئیں۔ اس نے سر کو جھٹک کر مرید کو بھی اندر سے نکال دیا۔ جگ دیو نے اسے بتایا تھا کہ راستے میں کہیں گردھاری کی آخری سانسیں ختم کر دی جائیں گی۔ یہ کام پشیمانی کا پاؤی گاڑو شہباز خود کرے گا۔ مراد اور اس کے آدمی مداخلت نہیں کریں گے۔ محض تماشا ہی بن کر رہیں گے۔

لبہ لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



ایک گھنٹے بعد جب ان کے آگے آئی تو مراد نے کارو روکتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک گیت یاد آ رہا ہے۔"

وہ گنگنا لگا۔ "یاد سے جان جائے گی تو شاید ہم بھی دیکھیں گے۔ مری جاں ہم بھی دیکھیں گے۔"

شہباز کار سے باہر نکلا۔ جب سے اتر کر آنے والوں نے اس کی گن اسے دے کر کہا۔ "یہاں نہیں سوکڑ سے دور لے جاؤ۔"

شہباز نے گردھاری کا نشانہ لے کر کہا۔ "سیٹھ ہاؤس۔"

وہ ہم کر بولا۔ "تم مجھے بندوق کیوں دکھا رہے ہو؟"

پشپارانی نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ "نفل جا گردھاری اخیر آخری وقت آ گیا ہے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو میرے دل کی رانی؟ میں نے تمہیں صرف دل ہی نہیں دیا ہے۔ تم پر اپنی دولت بھی لگا رہا ہوں۔"

رانی کار کے ایک طرف سے گھومتی ہوئی ذرا مطلق ہوئی شہباز کے پاس آ گئی۔ اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ "دولت بوزھ سے پاس ہو اور جوانی کے ہاتھ میں بندوق ہو تو عورت جوان مرد کا ساتھ دیتی ہے۔"

اپنی رانی کو گارو کے بازو سے لگے دیکھ کر کچھ میں آ گیا کہ اس کی موت لازمی ہے۔ وہ خوف سے کاہنے ہوئے مراد اور اس کے ساتھیوں سے بولا۔ "میں جگ دیو کا پرانا گاہک ہوں۔ اسے منہ مائی رقم دیتا ہوں تم لوگوں کو میری جان بچائی جاوے۔"

مراد نے کہا۔ "جہاد رانی نے تم سے زیادہ مال دیا ہے۔ یہ عورت کا کمال ہے یہ جہاد سے ہی مال سے ہمیں دیا لاکھ کا سونا دے چکی ہے۔ میں ابھی فون پر باتیں کرتے وقت کہہ رہا تھا۔ جہاد سے جیسے مردانو کے مجھے ہوتے ہیں جب عورت بے وقافی کرتی ہے تو ان کے مجھے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔"

گردھاری نے پشپا کو دم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے پریم کرتا رہا۔ تم پر دولت لٹاتا رہا اور تم مجھے مار ڈالتا جاؤ؟"

پھر وہ مراد سے بولا۔ "جگ دیو سے میری بات کراؤ۔ میں اسے میں لاکھ کا سونا ابھی دوں گا۔"

شہباز نے اس کا نشانہ لے کر کہا۔ "یہاں سے مت کرو۔ سوکڑ سے دور اچھڑو۔"

مراد نے کہا۔ "شہباز آؤ رارک جاؤ۔ یہ پشپارانی سے ڈرنا چاہتا ہے۔ تم اپنی رانی کو بھاڑ بڑھانے کا بیو۔"

پشپا چونک گئی۔ پیٹھے پیٹھے پہلو بدلتے ہوئے چہرہ نظروں سے شہباز کو دیکھنے لگی۔ شہباز کھڑکھڑا کر اٹھ رہا تھا۔

مرید نے کہہ دی تھی۔ "جہاد رانی بات کچھ مجھ میں نہیں آئی۔ اتنا مجھ کی ہوں نہیں زپ والا لباس پسند نہیں ہے۔ چلو فلیک ہے میں وہ نہیں پہنوں گی۔"

"ہائے مراد اس چاند رات کی قسم۔ جہاد سے لیے پاگل رہتی ہوں۔ قسم کھاتی ہوں تم سے دشمنی نہیں کروں گی۔ مجھے ایک رات دے دو۔"

"وہ مرد کتنے الو کے مجھے ہوتے ہیں جو عورت کو اپنی راتیں دینے یا اس کی راتیں لینے کے لیے خواہ مخواہ دوسروں کی زندگیوں سے کھینچ لیا۔"

شہباز نے مضیاں کھینچ لیں۔ پشپا پریشان ہو گئی۔ وہ ان پر مڑ کر رہا تھا اور وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ذہانت سے اور چالاکی سے دولت کمانے والے بھی چالاکی بھولی کر عورت کے پیچھے پاؤں لے جاتے ہیں۔ مجھے ہیں وہ عورت ان کی وفادار ہے۔ جب وہ بے وقافی کرتی ہے تو سٹھلے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔"

پشپا نے فٹے سے کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟"

گردھاری نے اسے اپنے قریب کھینچ کر کہا۔ "وہ اپنی عورت سے بول رہا ہے بولے وہ۔ میری رانی تو وفا کی پتلی ہے۔"

اچھر مرید نے کہا۔ "میری مجھ میں نہیں آ رہا ہے تم جو بول رہے ہو اس سے میرا کیا تعلق ہے۔ یہ جہاد سے پاس کچھ لوگ بول رہے ہیں۔ تم ابھی کہاں ہو؟"

"میں تو ہیں ہوتا ہوں یہاں گولیاں چلنے والی ہوتی ہیں۔ یہ میرے مقدّر میں لکھ دیا گیا ہے۔ میں اپنے فون کا سوچ آف کر رہا ہوں۔ صبح تک کسی سے نہیں بولوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون کا سوچ آف کر کے اسے جیب میں رکھ لیا۔ پشپا نے پوچھا۔ "کیا ہم شراقی میل دور نہیں آئے ہیں ہاں آدھوں سے یو لوشہباز کی گن داہیں کریں۔"

اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے گاڑی کی اسپرڈ بڑھا دی ہے۔ وہ جگہ آتے ہی جپ ہمارے آگے آئے گی میں کار روک دوں گا۔ آپ کے گاڑ کو گن دے دی جائے گی۔"

مراد نے فلیک ہی کہا تھا کہ گن نہیں تو یاد نہیں۔ وہ مجبور تھے۔ ان کے پاس یہ یاد نہیں تھی کہ وہ گاڑیاں رکوا کر سیٹھ گردھاری لال کی چوٹی کر دیتے۔ وہ مجبوراً چپ رہے۔ مناسب جگہ پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

شہباز نے کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایک بار سودا ہو چکا ہے۔ میں سیٹھ کو گولی مار کر رانی صاحبہ کے ساتھ مال لے جاؤں گا۔"

مراد نے کہا۔ "وہ سودا بیک دو سے ہوا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ سیٹھ پشیا کے مقابلے میں ڈبل سونا دے گا۔ اب یہاں بیک دو کا بیکس میرا فیصلہ مانا جائے گا۔" شہباز نے اچانک ہی گن کارخ مرادی طرف کرتے ہوئے اس کے ساتھیوں کو لالکارا۔ "خبردار! کسی نے مجھ پر گولی چلائی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

اس کے ساتھی بننے لگے۔ ایک نے کہا۔ "چلو اسے گولی مارو پھر ہم جیسے مار ڈالیں گے۔ اس کے بعد رانی کس کی ہوگی۔" سیٹھ جواب اس کے منہ پر نہیں تھوکتے۔ "دوسرے ساتھی نے کہا۔ "اور ہم اس کو زندہ ور نہیں گے جو زیادہ مال دے گا۔"

پشیا نے پریشان ہو کر کہا۔ "شہباز! میں نے پہلے ہی سمجھا یا تھا ان کے منہ نہ لگو۔ ان پر ہمر وسا کرو۔ یہ ہمیں مال کے ساتھ حفاظت سے لے جائیں گے۔" پھر وہ مراد سے بولی۔ "میں گردھاری سے دس لاکھ کا سونا زیادہ دوں گی۔"

گردھاری نے کہا۔ "وہ میرا سونا ہے۔"

وہ بولی۔ "تمہارا نہیں میرا سونا ہے۔" مراد نے کہا۔ "میں نہیں مانتا کہ یہ مال ایک بے وفا اور دغا باز عورت کا ہے۔ سیٹھ کے ساتھ چاروی برسوں کی ڈینگ ہے۔ یہ سونا اسی کا ہے۔" سیٹھ نے خوش ہو کر کہا۔ "تم انصاف سے بول رہے ہو۔ میں تمہیں انعام دوں گا۔"

مراد نے کہا۔ "زندہ رہو گے تو انعام دو گے۔ میں تو یہاں اسی کو زندہ کی دوں گا جو مجھے پورے ایک کروڑ کا سونا دے گا اور چالیس لاکھ کا سونا بیک دو کو دے گا۔ جسے یہ منحور ہوگا وہ باقی چالیس لاکھ مال لے جائے گا۔" گردھاری نے کہا۔ "ایک کروڑ تو بہت زیادہ ہیں۔ تم بیکاس لاکھ کا سونا لے لو۔"

پشیا نے جلدی سے کہا۔ "میں دوں گی ایک کروڑ کا سونا۔"

مراد نے گردھاری سے کہا۔ "اب بولو۔ نہ تم رہو گے نہ تمہارا سونا۔ تم جان سے جاؤ گے رانی چالیس لاکھ کے مال کے ساتھ جان بچا کر چلی جائے گی۔" سیٹھ کو زندہ رہتا تھا۔ وہی بمبئی، کولکٹہ اور مدراس کی

مارکیٹوں میں اس کے پانچ سو کروڑ روپے گردش کر رہے تھے۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ "مجھے نہ مارو۔ جتنا سونا لینا ہے لے جاؤ۔ اس بازاری عورت کو میرے سامنے گولیاں سے چھلنی کرو۔"

مراد نے فون نکال کر کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں ابھی بیک دو سے تمہاری سلامتی کی بات کرتا ہوں۔" "نہیں... پشیا نے سچ کر کہا۔" شہباز! مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

شہباز نے فوراً ہی گن کی ٹال کو مراد کے سینے پر رکھ کر کہا۔ "تم فون نہیں کرو گے۔ رانی کی بات مانو۔" مراد نے ہتھے ہوئے فون پر سر پھینچ کرتے ہوئے کہا۔ "بلا سے جان جائے گی تمہارا ہم بھی دیکھیں گے۔" وہ مضطرب سے بولا۔ "گولی چل جائے گی۔ میں آخری وارنگ دے رہا ہوں۔ فون بند کرو۔"

اس نے فون کو کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف تیل جا رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کو بولو بولو کا لٹی تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو مراد! کیا بات ہے؟ وہاں تو آدمی رات ہو چکی ہوگی۔ اس وقت کال کر رہے ہو؟" اس نے کہا۔ "بیک دو نے پشپارانی سے ڈیل کی تھی اور آپ نے اسے سون لیا تھا۔"

مراد کے فون پر بولنے ہی شہباز نے گن کے ٹریڈر کو دبا دیا۔ ایک بار دو بار پھر تین بار کھٹ کھٹ کی آواز ابھر کر رہی۔ ایک بمی گولی تھیں چلی۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی گن خالی کر دی گئی تھی۔ حیرانی اور پریشانی سے منہ مہل گیا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ مراد کے ساتھیوں نے اسے اپنے نشانے پر رکھ لیا۔

وہ فون پر بولا ہوا ان سے دور آ گیا۔ کو بولو نے کہا۔ "ہاں۔ پشیا سے دس لاکھ کا سونا مل رہا ہے اس لیے میں نے ڈن کیا ہے۔"

وہ بولا۔ "آپ نے کہا تھا کہ مجھے پرسل دستا کرنے کی آزادی ہوگی۔ میں اپنی اس ذاتی آمدنی سے آپ کو چالیس پر سٹف دیا کروں گا۔"

ہاں یہ کہا تھا۔ کیا کسی سے پرسل ڈینگ ہو رہی ہے؟ "جی ہاں۔ آپ کو دس لاکھ کا مال مل چکا ہے۔ میں اور تیس لاکھ کا سونا دوں گا۔ اس کے علاوہ میں ذاتی طور پر ایک کروڑ کا سونا حاصل کر رہا ہوں۔ اس میں سے آپ چاہیں پر سٹف ملے۔ بولیں۔ سودا کیا رہے گا؟"

"یہ تو تم نے بڑی زبردست ڈینگ کی ہے۔" وہ بولا۔ "ماسٹر! سیٹھ گردھاری ہمارا برسوں پرانا کسٹر ہے۔ آئندہ بھی ہمارے ساتھ ڈینگ رکھے گا۔ اسے ایک عورت کے مکر و فریب سے نجات حاصل کر کے زندہ رہنا چاہیے۔"

"درست کہتے ہو۔ میں تمہارے سونے کو ان کرتا ہوں۔" "آپ بیک دو کو بھجا دیں کہ وہ میری پرسل ڈینگ پر اعتراض نہ کرے۔"

"وہ نہیں کرے گا۔ تم اپنا کام کرو۔" مراد نے رابطہ ختم کر کے پشپا گردھاری اور شہباز کو دیکھا۔ وہ تینوں اپنی زندگی یا موت کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ شہباز اپنی خالی گن کی طرح کھوکھلا ہو گیا تھا۔ ایک چیخنی کو بھی نہیں مار سکتا تھا پھر اپنی پشپارانی کے لیے گن والوں سے کیسے لاتا؟

مراد نے ان کے قریب آتے ہوئے پشیا سے کہا۔ "ابھی تم نے کہا تھا بولو! اسے پاس دولت ہو اور جو ان کے پاس بندوق ہو تو عورت جو ان کا ساتھ دیتی ہے۔ اب تمہارے بار کے پاس بندوق نہیں ہے۔ ہاں بولو! اسے سیٹھ کے پاس دولت ہے۔"

وہ قریب آ کر پشپا کو اپنا رول اور دیتے ہوئے بولا۔ "یہ لو اور بولو! گولی مارو!؟ دولت مند بولو! گولی لٹکے یا روگو۔"

پشپا نے رول اور نہیں لیا۔ مراد کو کچھ بڑے ہی قاتلانہ انداز میں مسکرائی۔ پھر بولی۔ "کیا میں بھرہر جو ان ہوں؟" مراد نے کہا۔ "ہاں۔ ہمیں کچھ کر من میں پالی آجاتا ہے۔" وہ فوراً ہی قریب آ کر اس کے بازو سے لگ گئی۔ مراد نے شہباز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "لو تمہاری رھیل نے پٹری چلا لی ہے۔"

پھر وہ پشپا سے بولا۔ "تمہارے دو بار ہو گئے۔ فوراً بولو! تم کس کی زندگی چاہو گی؟"

وہ بولی۔ "تمہاری۔"

"کس کی موت چاہو گی؟" اس نے شہباز کی طرف اٹھی اٹھائی۔ مراد نے اسی لمحے میں اسے گولی مار دی۔ اس نے گولی کھا کر ڈگمگاتے ہوئے گرے۔

پشپا کو ایسے دیکھا جیسے کھرا ہو۔ "اسے عورت... ایسے وفائی تجھ سے شروع ہوئی ہے اور تجھ پر ہی ختم ہوئی ہے۔" سیٹھ گردھاری لال بھی ہوئی نظروں سے شہباز کی

لاش کو دیکھ رہا تھا۔ مراد نے پشپارانی کو اپنے بازو سے الگ کیا۔ پھر اس سے کہا۔ "تم زیادہ سے زیادہ سونا حاصل کرنے کے لیے سیٹھ کی سے بے وفائی کر رہی ہو۔ جبکہ مجھے ایک کروڑ چالیس لاکھ کا سونا مل رہا ہے۔ یہ دولت حاصل کرنے کے لیے سیٹھ کی کو زندہ رکھنا ہوگا۔"

"تم بولو! میں دولت حاصل کروں یا تمہیں کیسے سے لگاؤں؟"

وہ بولی۔ "مصل سے کام لو۔ اسے گولی مار دو گے تو سونا بھی ملے گا اور شباب بھی..."

وہ بولا۔ "جس کا سونا ہے، اسے کیوں ماروں؟ جو بازار ی قاحش ہے اسے بازار بجائے رکھنے کے لیے زندہ کیوں رکھوں؟"

یہ کہتے ہی اس نے پشپا کا نشانہ لے کر ڈنگر کو دبا دیا۔ اس کے منہ سے آخری چیخ نکلی۔ اس کے ویدے پھیل گئے۔ وہ زمین پر گر کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی پڑ گئی۔

سیٹھ گردھاری لال بڑی طرح سہا ہوا تھا۔ اس نے پہلے شہباز کو پھر پشپا کو تپ تپ کر اپنے لبو میں جھپکتے ہوئے دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر دوڑتا ہوا آ کر مراد کے پیروں سے پٹ گیا۔

وہ اپنے ایک کروڑ چالیس لاکھ کا نقصان بھول گیا تھا۔ مراد نے اسے پانچ سو کروڑ کے بزنس کے ساتھ زندہ رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دہلی پہنچے کے بعد بمبئی جان کر سوتا رہا۔ کچھ ہوش نہ رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ کالنگ ٹون کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نیند بھری آنکھوں سے فون کی تھپی سی اسکرین کو دیکھا۔ عجیب اسے کال کر رہا تھا۔

اس نے ہماہی لے کر فون کے شن کو دبا دیا پھر اسے کان سے لگا کر سلام کیا۔ عجیب نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ "کیا سو رہے تھے؟ میں بعد میں کال کروں گا۔"

"نہیں اب تو نیند پوری ہو گئی ہے۔ آپ بات کریں۔" "بات کیا کروں؟" "تم نے کہا تھا کہ ماروی کو اپنی دہن بناؤ گے۔ مجھے اعتراض نہیں کرتا چاہیے۔ ہمیں صرف اسے خوش رکھنے کے حلق سوچنا چاہیے۔"

"میری سوچ اب بھی نیکی ہے اور کوئی بھی ذرا سی عقل رکھنے والا یہی کہے گا کہ ماروی ایک بھرا مانہ زندگی گزارنے والے کے ساتھ نہ خوش رہے گی نہ ٹھوکارے گی۔" مراد نے کہا۔ "میں ہمیشہ بھرا مانہ زندگی نہیں

گزاروں گا۔ میں نے برتاؤ کو چاک کرنے کے بعد پاکستان میں ایک نامی حاصل کی ہے۔ یہ آپ مانتے ہیں؟

”ہاں مانتا ہوں۔ مگر....“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”پلیز۔ پہلے آپ میری پوری بات سن لیں۔ میں اسخندہ بھی وہاں رہ کر اپنے ملک اور قوم کی بہتری کے لیے کام کرتا رہوں گا تو میری ایک نامی میں اضافہ ہوگا اور میں مجرموں سے بھی نجات حاصل کرنے کی کوششیں کرتا رہوں گا۔ میرا دل کہتا ہے اور یہ میرا ایمان ہے۔ میرے ارادے نیک رہیں گے تو خدا مجھ سے میری ماروی سے اور میرے ہونے والے بچوں سے راضی رہے گا۔“

”مقتل کبھی ہے جب تک مجرموں سے نجات حاصل نہیں کرو گے وہ جیسے پڑے رہیں گے۔ تمہارے ایک ارادے جراثیم کے کانٹوں میں الجھتے جا رہے ہیں۔ اگر ماروی کی بہتری چاہتے ہو تو پہلے مجرموں کے حصار سے نکلو پھر اسے شریک حیات بناؤ۔ جذبات سے نہیں، عقل سے سوچو۔ یہاں آکر شادی کرنے کی جلدی نہ کرو۔“

”میں اگلے دو تین ہفتوں میں آؤں گا اور خوب سوچ سمجھ کر اسے اپنی شریک حیات بناؤں گا۔“

”یعنی اپنی بے جا حسد سے باز نہیں آؤ گے؟“

”پلیز میں اپنی شادی اور ازدواجی زندگی کے معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔“

”مراد....! میں نے ماروی کو دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ اس کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا۔“

”آپ کیا کریں گے؟“

”جب تک تم مجرموں سے نجات حاصل نہیں کرو گے میں شادی نہیں ہونے دوں گا۔“

”میری خوشیوں کو کوئی رقیب ہی روک سکتا ہے۔“

”تم کچھ بھی سمجھو۔ رقیب سمجھ لو، دشمن سمجھ لو لیکن اس کا کوئی ایک دن تسلیم کرو گے کہ میں ماروی کو تباہی سے بچانے کے لیے تمہاری مخالفت کرتا رہا ہوں۔“

مراد نے اس سے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ دونوں دوست نہیں تھے۔ بھائی نہیں تھے۔ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ شخص ماروی کی خاطر ایک دوسرے سے ددنی اور محبت کرتے چلے آئے تھے۔

ان کے لیے دوستی کا لفظ مناسب نہیں ہے کیونکہ ایک دیکھیں! اعلیٰ درجہ اور غریب اور محتاج تھا مگر محتاج نہیں رہا تھا۔

ایک احسانات کرتا آیا تھا۔ دوسرا احسانات اٹھاتا

آیا تھا مگر اب وہ احسانات اٹھانے والا نہیں تھا۔ وہ زمین اور آسمان کی طرح ایک دوسرے سے دور رہے تھے۔ اور دور بہت دور اقی میں ایک دوسرے سے ملنے دکھائی دیتے تھے۔ تجلی نظروں کا دھوکا تھا۔ زمین اور آسمان دور اقی میں بھی نہیں ملے۔ وہ دونوں محض ماروی کو جیتنے کے لیے یہ کہتے آئے تھے کہ ایک دوسرے کے رقیب نہیں ہیں۔ یہ تاثر دیتے آئے تھے کہ ماروی کو خوش رکھنے کے لیے ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔ کچھ بھی ہو جائے۔ بھی آپس میں عداوت نہیں رکھیں گے۔ لیکن دونوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی رہتی تھی کہ ماروی میری شریک حیات بن کر خوش رہے گی اور اب وہ مطمئن آ گیا تھا۔ جہاں فیصلہ ہوتا تھا کہ وہ مراد کی مشکوک بن کر شادی یا دورہ کی کیا نہیں؟

دونوں اپنی جگہ درست تھے۔ محبوب چاہتا تھا ماروی سلامتی سے شریک حیات بن کر اس کی زندگی گزارے۔ ایسا جانے کے پیچھے یہ بات واضح تھی کہ پڑا سن ہستی کھلی زندگی محبوب ہی اسے دے سکتا ہے اور مراد کو کدہ رہا تھا حالات نے اسے مجرم بنا دیا ہے۔ وہ جلد ہی مجرموں کی دنیا سے نکل آئے گا اور یہ کہ اس کی طرح کئی مجرم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سلامتی سے زندگی گزارتے ہیں۔ وہ بھی ماروی اور اپنے ہونے والے بچوں کو سلامتی دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہے گا۔

ویسے یہ حقیقت محل گئی تھی۔ لاشعور میں بھی ہوئی رقابت ظاہر ہوئی تھی۔ مراد ہاتھ میں فون لیے بیڈ پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔

سوچ یہ تھی کہ اب سامعین سے پہلی جیسی اپنایت نہیں رہے گی۔ وہ سامعین کی اب بھی عزت کرے گا۔ وہ اسے نقصان پہنچا نہیں گے۔ ماروی کو اس کی زندگی میں آئے نہیں دیں گے۔ جب بھی وہ انہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔

کوئی ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ دونوں کے درمیان کبھی رقیبانہ فکرا نہ ہو۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ”میرے جانے اچانکے دشمنوں کی کمی نہیں ہے۔ اب یہ نئی بات ہوئی کہ اگلے دو چار ہفتوں میں ماروی کو دیکھ بنانے پاکستان جاؤں گا تو سامعین ایک نئے دشمن کی طرح سامنے آئیں گے۔“

”مجھے سمجھنا چاہیے۔ معلوم کرتا چاہیے کہ وہ میرے اور ماروی کے درمیان کسی بھی رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں؟“

اس نے اپنے ہاتھ میں فون کو دیکھا پھر ماروی کے منہ پر حلق کر دیا۔ اس کے منہ کو چھو کر دیا۔ وہ خوش ہو کر

بولی۔ ”مکمل سے تمہارا انکار کر رہی ہوں۔ اٹھتے بیٹھے اپنے فون کو دیکھتی رہتی ہوں کہ اب بولنے ہی والے ہو۔ تم نے پڑا انکار کر لیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں نے دیکھی ہے مگر جیسے خوش کر دینے والی بات کہہ رہا ہوں۔ میں اسی ایک ماہ کے اندر رہا ہوں۔“

”جج....؟“ وہ خوشی سے قہقہہ پڑی۔ ”تم جج کہہ رہے ہو نا۔۔۔ مراد؟ آجاء۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے آجاء۔ یہاں میری پریشانی پڑ جاتی جارہی ہیں۔“

”کیسی پریشانی؟“

”یہاں سب ہی کہہ رہے ہیں کہ تم خطرات سے بھری زندگی گزار رہے ہو۔ مجھے تم سے دور رہنا چاہیے۔“

”تم کیا کہتی ہو؟“

”ایک ہی بات کہتی ہوں۔ تمہارے ساتھ جیوں گی تمہارے ساتھ مرموں کی اور میں نے جب سے یہ فیصلہ کیا ہے جب سے یوں لگتا ہے کہ کچھن سے لے کر اب تک کی کھینچیں جو بھولی ہوئی ہیں وہ میرے اندر بیدار ہو رہی ہیں۔ تم ہی میرے اول اور آخر تکتے ہو اور دل سے کہتی ہوں کہ واقعی ہوا دور ہو گے۔“

”میری جان! تمہاری یہ باتیں یہ جذبے مجھے نئی زندگی اور نیا حوصلہ دے رہی ہیں۔ یہی چاہتا ہے ابھی آکر آجاء! ویسے جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے۔“

”کیا انہوں نے ایسی کوئی بات کی ہے؟“

”وہ صاف لفظوں میں تو نہیں کہتے لیکن میری سلامتی اور خوشحالی کی بات کرتے ہیں۔ کہتے تو ہماری بھلائی کے لیے ہیں کہ جب تک مجرموں کی دنیا سے نکل کر شریکوں کی طرح پڑا سن زندگی نہیں گزارو گے وہ ہماری شادی نہیں ہونے دیں گے۔“

”معروف جتنی صاحب بھی مجھے سمجھا رہے تھے کہ محبوب صاحب میری بہتری کے لیے مخالفت کر رہے ہیں۔ میں اس مخالفت کو خوشی نہ سمجھوں۔“

مراد نے کہا۔ ”دشمنی اور کینسی ہوتی ہے؟ جیسے جیتنے کے لیے ہمیں مجھ سے دور کرنے کے لیے اب تک تکیوں اور ہراسوں کی محاسن گھولتے رہے۔ یہ انکار کرتے رہے کہ تم کسی دن ان کی طرف مائل ہو جاؤ گی۔ لیکن تم نے پھر سے حق میں فیصلہ نہ کرنا انہیں بائیں کر دیا ہے۔ جب وہ محل کر ایک رقیب بن کر سامنے آ گئے ہیں۔“

”مراد وہ بہت دولت مند ہیں بہت طاقتور ہیں۔“

”ہوئے وہ۔ اب میں بھی کچھ کم نہیں ہوں۔“

”میں ان کی کوئی نہیں ان کے سامنے میں رہتی ہوں۔“

”میں وہاں آتے ہی تمہارے لیے نئی کوئی خریدوں گا۔ تمہارا وہاں جینک اکاؤنٹ ہے؟“

”محبوب صاحب نے اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ میرے پانچ لاکھ ہیں اور تم نے پانچ کے پاس بائیس لاکھ کھواتے تھے۔ دور تم بھی اکاؤنٹ میں ہے۔“

”آج یا کل تک ساتھ لاکھ روپے تمہارے اکاؤنٹ میں آئیں گے۔ میں وہاں آتے ہی تمہارے ساتھ ایک نئی دنیا بساؤں گا۔ ابھی اپنا اکاؤنٹ نمبر Send کرو۔ میں پچیس وقت کال کروں گا۔ دن رات میرے فون کا انکار نہ کیا کرو۔ مجھے جب بھی تنہائی اور سکوت حاصل ہوتی ہے میں پہلے تمہیں ہی یاد کرتا ہوں۔“

”میں کیا کروں؟ میرا اور کوئی کام نہیں ہے۔ انکار۔۔۔ انکار اور انکار۔ جج تو یہ ہے کہ انکار مارے ڈال ہے پھر بھی سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے۔“

وہ کچھ دیر تک چار بھری باتیں کرتے رہے پھر رخصت ہوتے وقت مراد نے فون کو چھو لیا۔ وہ ایک دم سے شرمائی۔ اپنے آپ میں سمٹ کر بہتر پر گزرتی۔ کسی شرارت کی گئی اس نے؟ دل پاگل ہو کر سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔

وہ ایک کمرہ پر آرام سے نیم دراز ہو کر خپلی آنکھوں سے ماروی کو دیکھنے لگا۔ وہ دیکھتی ہوئی چھوٹوں کی سچ پر جیسی ہوئی تھی۔ مراد اس کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ آتش بازی اور پٹاخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی دہکن کا کھنکٹا تھا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت پٹاخوں کی آواز فائرنگ میں بدل گئی۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ خیالوں کی رہنمائی دینا سے باہر آتے ہی محبوب کی بات یاد آئی۔ ”تمہارے دشمنوں کی طرف سے آنے والی گولیاں ماروی کا مقدر بن سکتی ہیں۔“

اس نے محبوب کو دماغ سے جھٹک دیا۔ کچھ بھی ہو گولی طے یا گولے دھماکے کرتے رہیں وہ دشمنوں سے خوفزدہ ہو کر ماروی کے حصول سے باز آنے والا نہیں تھا۔ اس نے ماسٹر کو بوسے رابطہ کیا۔ وہ بولا۔ ”فرودست محل رات تم نے بہت لمبا ہاتھ مارا ہے۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ کا سونا ہماری تحویل میں آ گیا ہے۔ یہ بتاؤ اپنے منہ کے ساتھ لاکھ روپے کب لیتا جاوے گا اور کہاں لیتا جاوے گا؟“

”پاکستان میں ایک بینک اکاؤنٹ کا نمبر

Send کر رہا ہوں۔ تم وہاں جمع کرادیں۔"
 "مجھ کو وہاں پہنچانی ہے۔ اب وہاں دہلی کے ایم این اے حرم داس سے اس کے اہم سیاسی ساتھیوں اور ان کے کام آنے والے مکمل لوگوں سے شناسائی رکھو۔ دو چار دنوں تک اپنی کارڈرائیو کرتے ہوئے پورے دہلی کو اچھی طرح دیکھ لو۔"
 "آپ فکرت نہ کریں۔ میں اس شہر کو اچھی طرح سمجھ لوں گا۔"
 وہ رابطہ فتح کر کے ماروی کا ڈاؤنٹ ٹاؤن خیر Send کر کے ہاتھ روٹ میں چلا گیا۔ اس نے فون کا سوچ آف کر دیا تھا تا کہ کسی کی مداخلت کے بغیر آرام سے فریش ہو جائے۔ جب دو تازہ دم ہو کر لباس بدل کر ڈرائنگ روم میں آیا تو ایک ملازم نے کہا۔ "حرم داس جی کا آدمی آپ کو لینے آیا ہے۔"
 اس نے اپنے فون کو آن کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ابھی ان سے ملنے جاؤں گا۔"
 فون پر بک دیو کا منہج آیا ہوا تھا۔ مراد نے اس سے رابطہ کرنے کے بعد پوچھا۔ "تم نے مجھے کال کی تھی۔ میں نے پگھلے کے لیے سوچ آف رکھا تھا۔ فحیریت تو ہے؟"
 وہ بولا۔ "کل رات میں نے جس دینک کے ذریعے دس لاکھ کا منافع کمایا تھا۔ اسی دینک سے تم نے ایک کروڑ چالیس لاکھ کا حیران کر دیا ہے۔"
 مراد نے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا میں نے تمہارے سودے پر سودا کیا ہے۔ تمہیں برا لگے گا۔"
 "انکی بات بھی نہ سوچا کرو۔ تم ماسٹر کا پیلا کام کرتے ہی مجھ سے آگے نکل گئے ہو۔ میں اس لیے بھی برا نہیں مانوں گا کہ تم آئندہ مجھ سے آگے نکلنے کے لیے یہاں نہیں رہو گے۔ ماسٹر نے بتایا ہے تم دو چار ہفتوں میں پاکستان چلے جاؤ گے۔"
 "ہاں جگ دیو اقم بھی کوشش کرو کہ کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو اور میں یہاں سے چلا جاؤں۔"
 "تم ضرور جاؤ گے۔ یہ بتاؤ وہاں دہلی میں مرینہ ہے۔ کیا اسے ساؤڈی؟ لائف انجوائے کرو یا رہا۔"
 "ہاں ایسا انجوائے کروں گا کہ وہ آگے آگے بھاگتی پھرے گی۔ مجھے اس کا پتا لگانا تاکہ میں اس پر نظر رکھتا چاہتا ہوں۔"
 جگ دیو نے اس کی رہائش گاہ کا پتا بتایا پھر اس سے رابطہ قائم ہو گیا۔ اسے ابھی حرم داس کے پاس جانا تھا۔ لیکن اپنے

سے بھی ضروری باتیں کرنی تھیں۔ اس نے فون پر اسے خبر کیا پھر کہا۔ "میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے یہ بتانا ہوتا ہے کہ تمہاری ضرورتیں کیا ہیں؟ کیا کرائی یا کارروائی سکتے ہو؟"
 وہ بولا۔ "میں تو کرائی جانے اور اپنی ٹیم سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ اگر میرے پاس اتنی رقم ہو کہ میں وہاں چھپ کر وہاں اور دشمنوں کی کوئیوں کا جواب کوئیوں سے دیتا رہوں تو قریبی کی قسم ابھی وہاں جاؤں گا۔"
 مراد نے کہا۔ "کرائی میں میرا اور تمہارا ایک ہی دشمن عالی جناب ہے۔ اس نے میرے پیچھے تمہیں لگایا تو پھر تم نے بھی میری خاطر اس سے دشمنی مول لی۔"
 "تمہارا کیا خیال ہے اگر ہم اس ایک دشمن کو ختم کر دیں گے تو شاید پھر کوئی ہم سے دشمنی نہیں کرے گا۔"
 جگ نے کہا۔ "اسے ختم کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر ہمارے پاس شوٹز کو خریدنے اور ان سے کام لینے کے لیے کم از کم پانچ لاکھ روپے ہوں تو شاید ہم پگھل کر سکیں گے۔"
 "میں آج کل پانچ لاکھ روپے ہی چاہتا ہوں۔"
 اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا واقعی؟"
 "اگر تم عالی جناب تک پہنچنے کا راستہ نکالتے رہو گے۔ اگر تمہارے کرائے کے شوٹز عالی جناب پر تحفے کرتے رہیں گے تو میں لاکھوں روپے تمہیں دیتا رہوں گا۔"
 "ارے کیا بولتے ہو مراد... لاکھوں روپے میں گے تو میں عالی جناب کے پیارے خاندان کو قبرستان پہنچا دوں گا۔"
 "تو پھر ابھی کرائی جاؤ اور وہاں میری ماروی سے ملو۔ وہ تمہیں پانچ لاکھ کا چیک دے گی۔ میں تمہیں اس کی کوئی کا پتہ بتا رہا ہوں۔"
 "تم کہاں ہو؟ مجھ سے کیوں نہیں مل رہے ہو؟"
 "میں انڈیا میں ہوں۔ میرے آنے تک اگر تم نے عالی جناب کو فحش کرنے لگا دیا تو مجھ پر ہم دونوں کرائی میں اس دن سکون سے رہ سکیں گے۔ تم اپنی بی بی سے شادی کر دو گے اور میں اپنے رقیب کی مخالفتوں کے باوجود ماروی کو اپنی دہلی بناسکوں گا۔"
 مراد بہت سوچ بچھ کر چالیس چل رہا تھا۔ منسلک بھی رہی تھی کہ برتاؤ کو ہلاک کرنے کے بعد بھی کئی دن گزر گئے۔ اس کے پیچھے پڑ گئے تھے اور ان سب کو عالی جناب نے اس کے پیچھے لگا تھا۔
 اگر عالی جناب نہ رہتا تو ہو جاتا تو پھر کرائے کے قاتلوں کو خریدنے والا اور اس کے پیچھے لگنے والا

وہاں کوئی نہ رہتا۔
 جب وہ مجبور سے کہہ سکا تھا کہ وہ مجرموں کی دنیا سے نکل آیا ہے اب نہ کوئی جانی دشمن ہے اور نہ ہی ماروی کی صلاحاتی کو خطرہ ہے۔
 اس نے ماروی کو فون کر کے کہہ دیا کہ بال احمد عرف بلانہ نامی ایک شخص اس کے پاس آئے گا۔ جب وہ ملاقات کے لیے کوئی میں آگے تو مراد فون پر تصدیق کرے گا کہ وہی بلانہ ہے۔ جب ماروی اسے پانچ لاکھ کا چیک دے گی۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد وہ وہ حرم داس کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کے لیے اس کی کوئی میں آگیا۔ وہاں اور بھی اہم لوگوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ کھانے کی میز پر بہت سی دشمنوں کے ساتھ تڑکا لگانے کے لیے چند حسینا بھی تھیں۔
 حرم داس نے کھانے کے بعد کہا۔ "تم دہلی شہر دیکھنا چاہتے ہو۔ ان میں سے جو چیز پسند ہے اسے لے جاؤ۔ ان میں سے کوئی بھی تمہیں شہر کے ایک ایک حصے میں ٹھہرائے گی۔"
 مراد نے کہا۔ "عورت کیسے تمہارا رکھ دیتی ہے میں خوب جانتا ہوں۔ میں کسی مرد کا گناہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔"
 حرم داس نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے سنا ہے تم عورتوں سے کھرتے رہتے ہو۔"
 وہ بولا۔ "حرم داس جی...! عورتوں سے کھانے کا مطلب یہ ہے کہ موت سے کھرتا ہوں۔ عورت ماں ہے نہیں سے بیٹی ہے اور بیٹی ہے بیٹی کی جگہ کسی دوسری کو دو گے تو گویا اپنی بیٹی یا بیٹی کو دھوکا دو گے۔ پھر اس عورت سے بھی دھوکا لے گا۔ جب ہلاکت ہوتی ہے تب پتا چلتا ہے کہ وہ آستین کا بھرجھی۔"
 حرم داس نے کہا۔ "بے فکری میں نے بھی نہ کمن بھی شہر ہلاک نہیں دیکھی تھی۔ میں تمہاری باتوں سے انکار نہیں کروں گا۔"
 مراد نے کہا۔ "میں دو پرائیویٹ جاسوسی کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"
 اس نے فون پر خبر پھیر کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ایک جاسوس کو کال کرتا ہوں۔ کل دوسرا بھی آجائے گا۔"
 اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ "ہیلو ہنڈلری تمہارے لیے ایک کام نکل آیا ہے۔ فوراً چلے آؤ۔"
 وہ جواب سن کر فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "وہ آ رہا ہے۔ ویسے میں ایک بات سمجھا دوں۔ ہر نام کی دنیا میں

عورتیں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔ جہاں کرنسی اور تصنیار کام نہیں آتے وہاں ان کی جوانی کام دکھا دیتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں سے جتنا رہو مگر ان سے اپنا کام نکلانے کے لیے دوشی بھی رکھو۔"
 "میں آپ کے مشورے پر غور کروں گا۔"
 ہنڈلری آدھے گھنٹے میں آگیا۔ حرم داس نے مراد سے تعارف کرایا۔ "یہ نو شاہد ملی ہیں۔ کلکتہ سے آئے ہیں۔ جب تک یہاں رہیں گے تم ان کے لیے کام کرو گے۔"
 ہنڈلری نے مراد سے کہا۔ "ضرور کروں گا۔ آپ بتائیں کام کیا ہے؟"
 مراد نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔ بتاؤں گا۔"
 وہ اپنے گاڑی اور ہنڈلری کے ساتھ اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ اسے اشارت کر کے میں روڈ پر آکر بولا۔ "مجھے اپنے نکلنے سے یہاں تک کا راستہ معلوم ہے۔ اب میں کالی باڑی کے کٹھنی داران مندر کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ بولو کدھر چلوں؟"
 گاڑی نے راہنمائی کی۔ وہ احرار چل پڑا۔ ہنڈلری پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مراد نے اس سے کہا۔ "کٹھنی داران مندر کے پیچھے ایک اسٹریٹ میں... مکان نمبر پانچ ہے۔ میں اس مکان کے چھلی نمبر کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ وہاں کتنے افراد رہتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟"
 جگ دیو نے مراد کو بتایا تھا کہ مرینہ اس مکان میں رہتی ہے۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا۔ اس اسٹریٹ میں آیا۔ ہنڈلری نے وہاں پانچ نمبر کے مکان کو دیکھ کر کہا۔ "آپ مجھے یہاں ڈراپ کر دیں۔ اپنا فون نمبر دیں۔ میں جلد ہی آپ کو کال کروں گا۔"
 مراد اپنا نمبر دے کر اسے وہاں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا بنگلا تھا۔ باہر اجالے میں روشنی تھیں۔ کھانے کے اندر تاریکی تھی۔ وہاں کے مین یا تو سو رہے تھے یا باہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی سے پوچھا۔ "اب ہم کہاں سے گزر رہے ہیں؟"
 اس نے کہا۔ "یہ بابا کھڑک سنگھ روڈ ہے۔ آگے کناٹ ٹیلین کا سرکل ہے۔ میلوں دور تک پہنچے ہوئے اس سرکل کے اندر سنیما تھیٹر مینا بازار شاہ پگ سینٹر اور نائٹ گلیس ہیں۔"
 کناٹ ٹیلین کے سرکل میں جتنی سڑکیں مختلف سمتوں میں گئی ہیں۔ ان سڑکوں کو ریڈیل Radial کہا جاتا ہے۔ ریڈیل روڈ نمبر دوں میں پالیس بازار کی روٹی گئی

تھی۔ وہ کارڈ رائیو کرتا ہوا وہاں سے گزرتا ہوا ریڈیو ٹیکل روڈ
نمبر نو میں آیا تو کالنگ ٹون نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے
انجیٹے نمبر پڑھ کر پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون؟“
”سرا میں ہینڈ آر ی پول رہا ہوں۔ میں نے معلوم کیا
ہے۔ اس منٹکے میں جو ان پتی پتی رہتے ہیں۔ یہ ایک ہفتہ
پچھلے سے یہاں آئے ہیں۔“
”مراد نے پوچھا۔“ اس منٹکے میں اندھرا کیوں ہے؟“
”میں نے چونک کر اسے کہا کہ میں اخباری رپورٹر
ہوں وہاں رہنے والوں سے انٹرویو لینے آیا ہوں۔
”اس نے کہا۔ وہ پتی پتی نہیں باہر گئے ہیں۔ میں نے
پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہاں گئے ہیں؟“
”وہ یوں۔ صاحب لوگ نوکروں کو جتا کر نہیں جاتے۔
ویسے وہ صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنی پتی سے
کہہ رہا تھا۔ وہی ہاٹ کلب چلتے ہیں۔ وہ جیسے پسند نہیں
آئے گا تو وہاں سے دوسرے کلب میں جائیں گے۔“
”مراد نے گامڑے پوچھا۔“ وہی ہاٹ کلب کہاں ہے؟“
”اس نے کہا۔“ آپ ریڈیو ٹیکل روڈ نمبر چار اور پانچ کو
گراس کرنے کے بعد چہرے پر ہیں۔“
اس نے ادھر کارڈ کرتے ہوئے ہینڈ آر ی سے
کہا۔ ”مٹی مٹی ٹیکس۔ فی الحال کوئی کام نہیں ہے۔ اب
آرام کرو پھر کسی ضرورت کے وقت کال کروں گا۔“
اس نے فون بند کر دیا۔ جگ دو نے اسے یہ نہیں
بتایا تھا کہ وہ کسی کرائے کے پتی کے ساتھ پتی بن کر رہتی
ہے۔ کلب جا کر اسے دیکھنا ضروری تھا کہ وہ سریندی ہے یا
کچھ پتی پتی اس منٹکے میں آکر رہتے ہیں۔
وہی ہاٹ کلب کے سامنے درختوں جتنی کاریں کھڑی
ہوئی تھیں۔ وہاں امیر کبیر لوگ تپتے گائے اور چیتے چلانے
آتے تھے۔ اس نے ایک جگہ اپنی کار پارک کی۔ پھر گامڑے
سے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔“
وہ کلب کے ایک دفتری کمرے میں آیا پھر وہاں
انٹری فیس ادا کر کے اندر پہنچا۔ ایک بڑے ہال
میں حسیناؤں کا میلا لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے
ساتھ کھانے کی میزوں پر تھیں۔ ان میزوں کے درمیان
ایک بڑے اسٹیج پر دھن بج رہی تھیں اور ساقی بن کر
شراب کے جام بھی پیش کر رہی تھیں۔
مراد نے دور سے سریند کو دیکھا۔ اسٹیج پر کئی
خوبصورت جوڑے رقص کر رہے تھے۔ وہ بھی ایک قد آور
بڑی ہنڈر کے ساتھ حرکت کر رہی تھی۔

اس وقت وہ ایک ہندوستانی عورت کے روپ میں
تھی۔ ماتھے پر بندیا مانتک میں سندور تھا۔ جلاؤں اور
ساڑی میں خوب گل رہی تھی۔
پورے ہال میں تھیں جیسی سے روشنی تھی تھیں تھیں
تھی۔ کھانے کی میزوں پر موسم بیاں روشن تھیں۔ اسٹیج پر
اسپاٹ لائٹ میں سریند رقص کرنے والے جوڑوں کے
درمیان حرکت کر رہی تھی۔ وہ اچانک ہی ٹھٹک گئی۔ رقص
کرنے والے پاؤں تھم گئے۔
اسے دور ایک میز کے پاس مراد نظر آ رہا تھا۔ وہ نیٹے
میں تھی۔ اس نے پٹلیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ اس کے
سامنے بڑے پوچھا۔ ”کیا ہوتا؟“ ”کون کیوں نہیں؟“
وہ جھوٹی ہوتی ایک انگی سے اشارہ کرتے ہوئے
بولی۔ ”وہ وہ ظالم ادھر ہے۔“
”کون ہے؟ تم کسے دیکھ رہی ہو؟“
”وہ میری جان کا دشمن میرا بیٹا میرا والدہ۔۔۔“
”اوڈر لنگ اقم نے بہت نیلی پی ہے۔ جان کا دشمن
بھی کہہ رہی ہو؟“ ”یا رادو دلدار بھی کہہ رہی ہو۔“
وہ ہاتھ بچا کر بولی۔ ”تم نہیں سمجھو گے یہ وہی
ہے۔ جس کے ساتھ سونے کے لیے تمہارے ساتھ سونے
سے انکار کرتی ہوں۔ پہلے وہ پھر کوئی اور میری تنہائی میں
آئے گا۔“
وہ ڈھنگاتی ہوئی اسٹیج سے اترتی ہوئی بولی۔ ”جلدی
آؤ۔ نہیں تو وہ جگہ جگ جائے گا۔“
اس کا سامنے اسے سنبھالنا ہوا اسے سہارا دینا ہوا اور
اس میز کے پاس آیا۔ سریند ادھر ادھر ستلائی نظروں سے
دیکھنے لگی پھر اپنے نام لگا پتی سے بولی۔ ”کیونکہ وہ ابھی
یہاں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اس میز کے
پاس کھڑا تھا۔“
کیٹھونے کہا۔ ”یہاں کینڈل لائٹس کی روشنی
ہے۔ روشنی کم ہے۔ اندھرا زیادہ ہے تم نے اسے دور سے
کیسے دیکھا؟“
”میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں؟ میں اسے
اندھیرے میں بھی پہچان سکتی ہوں۔ وہ میرے اندر۔۔۔“
وہ ہلکتے ہوئے رقص کر رہی تھی۔ ”کیونکہ وہ بازو کو جھنجھوڑتے
ہوئے بولی۔“ ”وہ دیکھو۔ وہ وہاں اسٹیج پر ہے۔“
وہ تیزی سے اسٹیج کی طرف جاتے ہوئے ڈھنگانے
لگی۔ ”کیونکہ اسے سہارا دے رہا تھا۔ اسے گرنے سے بچا رہا
تھا۔ وہ اسٹیج کے قریب آکر رک گئی۔ آکھیں پھاڑ پھاڑ کر

دیکھنے لگی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔
اس پارکیٹو نے تسلیم کیا۔ ”ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔
میں نے یہاں اسٹیج پر ایک شخص کو دیکھا تھا۔ وہ ڈانس نہیں کر
رہا تھا۔ تمہاری طرف دیکھ رہا تھا۔“
وہ ادھر ادھر دو رنگ نظریں دوڑا رہی تھی۔ بڑبڑا رہی
تھی۔ ”وہ مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا ہے۔ میں ڈرنے والی نہیں
ہوں۔ مرنا تو ہے ایک دن۔۔۔“
”ارے آؤ۔۔۔“ ”جھپٹا کیا ہے؟ آؤ۔ ایک رات کے
لیے آؤ۔ اور قصہ تمام کرو۔“
وہ نشے میں جھومتی ہوئی گرین روم میں آئی۔ وہاں
عورتیں اپنا ہنڈ بیگ اور دوسرا سامان رکھی تھیں۔ ایک ملازم
سامان کی نگرانی کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نوک دیکھا
کر اپنا ہنڈ بیگ حاصل کیا پھر اس میں سے فون نکال کر مراد
کے نمبر پر کال کرنے لگی۔
کیٹھونے کہا۔ ”میں گھر جانا چاہیے۔ بہت رات
ہوتی ہے اور تم کچھ اور دیر ہی ہو۔“
اس نے جواب نہیں دیا۔ رابطہ ہوتے ہی فون پر کہا۔
”اے اتم عورتوں کی طرح جیسے کیوں ہو؟ سامنے کیوں
نہیں آتے؟ کیا مجھے خوف زدہ کرنا چاہتے ہو؟“
مراد نے کہا۔ ”کیسے آؤں؟ جب نیام میں ایک کھوار
ہو تو دوسری کھوار کیسے آئے گی؟“
سریند نے کیٹھون کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ”ارے یہ
تمہاری طرح کھانے والی کھوار نہیں ہے۔ یہ میرا ساتھی شوہر
ہے۔ ماسٹر کو بویو نے کہا ہے۔ میں کسی کی دھرم پتی بن کر
رہوں گی تو یہاں کے جاسوس مجھ پر شبہ نہیں کریں گے۔“
”اے میں جانتی ہوں تم ہمیشہ میرے بن کر نہیں رہو
گے۔ پھر بھی۔ ہاں مجھے بھی قسم کھا چکی ہوں ایک بار صرف
ایک بار ضرور تمہیں حاصل کر کے رہوں گی اور جب تک
حاصل نہیں کروں گی جب تک کسی پتی شوہر کو کسی جیلے کو
بھی اپنی تنہائی میں آئے نہیں دوں گی۔“
مراد نے کہا۔ ”اگر انکی بات ہے تو اپنے اس پتی کو
لات مارو۔ انکی اپنے منٹکے میں جاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔“
”ابھی یہاں آجاؤ۔ ہم ساتھ چلیں گے۔“
”سہری۔ میں نہیں چاہتا کوئی مجھے تمہارے ساتھ دیکھے۔“
”ابھی بات ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ منٹکے میں انکی
رہوں گی۔ بالکل انکی۔۔۔ میں ڈرنے والی نہیں
ہوں۔ آجاؤ۔“
اس نے فون بند کر کے کیٹھو سے کہا۔ ”تم جاؤ اور کسی

ہوئی میں رات گزارو۔“
”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں پتی پتی کی طرح ساتھ رہتا
چاہیے۔ اگر میں ہوئی میں رہوں گا اور کوئی تمہارے ساتھ
منٹکے میں دیکھا جائے گا تو یہ تمہاری جانب کے خلاف ہوگا تم
بھارتی جاسوسوں کی نظر میں آ جاؤ گی۔“
وہ بولی۔ ”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اسی شرط پر جیسے
شوہر بن کر رہنے کی صحت کر رہی ہوں کسی بی بی باغی میں بھی
نہیں کرو گے۔ بیٹھ جاؤ۔ میرا وقت بڑا دن کرو۔“
وہ زور زور سے چلا گیا۔ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ سریند
نے کلب سے باہر اپنی کار کے پاس آکر دور تک
دیکھا۔ شاید وہ نظر آجائے لیکن وہ کم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی کار
میں بیٹھ گئی اسے ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگی کیا وہ
آئے گا؟ اگر آئے گا تو اس کی جانب تک کیا ہوگی؟ ماروی کا
جادو ایسا چل رہا ہے کہ اسے میری ضرورت نہیں ہے۔ میں
یہی اس کی بیوی ہوں اور۔۔۔ اور لہو کی بی بی بھی۔ وہ عاشق
نہیں ہے۔ انو بننے کے لیے نہیں آ رہا ہے۔ آج تو میں
رہوں گی یاد رہے گا۔
اس نے منٹکے کے احاطے میں پہنچ کر فون پر
کہا۔ ”شاید تم دیکھ رہے ہو۔ میں اپنے منٹکے میں آگئی ہوں
اور تنہا ہوں۔“
وہ بولا۔ ”سریند اہم دونوں ایک دوسرے سے جان
لینے والی دشمنی کرتے آ رہے ہیں۔ میں نے انہیں مار ڈالنے
میں کوئی کس نہیں چھوڑی تھی اور تم مجھے جھکریاں اور بیڑیاں
پہنا کر میرے وطن سے میری ماری سے دور لے آئی
ہو۔ انکی زہریلی دشمنی کے پیش نظر کیا انکی ہمیں ملنا چاہیے؟“
”میں تو ملنا چاہتی ہوں۔ تمہارے بازوؤں میں آکر
دشمنی قسم کرونا چاہتی ہوں۔ آج میں نے خوب نیلی ہے اور
تمہارے آنے تک اپنے بیڑیوں میں اور پتی رہوں گی۔“
وہ اپنے بیڑیوں میں آگئی تھی۔ فون آن تھا۔ اس نے
ایک بھرے ہوئے پتول کو اپنی ساڑی میں چھپایا۔
مراد دوسری طرف فون کو کان سے لگا کر سن رہا تھا۔ وہ
ایک جگہ کھول کر گلاس میں پانی اٹھاتے ہوئے بول رہی
تھی۔ ”آواز سن رہے ہو۔ اپورنڈ ہسکی سے گلاس بھر رہی
ہوں۔ آج تو میں مست ہو جاؤں گی۔ مجھے کدو کے تونٹے
میں پتائی نہیں پہنے گا کہ بارے کا تھوڑا موت کیسے آگئی تھی۔“
وہ بولا۔ ”میں نے کلب میں دیکھا ہے۔ تم نشے
میں بہت ابھی لگ رہی تھیں۔ تم ابھی اور پی رہی ہو تو اور
ابھی لگو گی۔“

پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ حیرت سے بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکا ہے؟ یہ بھرا ہوا تھا؟“
یہ کہتے ہی وہ چلاٹک لگا کر بیڈ پر آئی بھر کر وٹ
بدلتے ہوئے کچے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریو اور کو نکال
لیا۔ وہ حیرانی سے بولا۔ ”اوکا ڈاقم نے ایک اور گن چھپا
رہی تھی؟“

وہ بولی۔ ”میں سمجھ گئی۔ جب میں وائس روم میں تھی
جب تم نے یہاں آکر بیٹول کو خالی کر دیا تھا۔
”میں انٹری نہیں ہوں۔ یہ دیکھو کس طرح باری ہوئی
بازی جیتنا چاہتی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”جس کی کمپریٹل عقل سے خالی ہو“ اس
کے ہتھیار بھی تو بیلو سے خالی ہوتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے پھر ایک ٹانگ
کا نشانہ لے کر ٹھیک کر دیا تو مارے حیرت کے منہ کھل
گیا۔ وہ بے پیمانی سے گئے۔ اس نے پلٹ کر کہا۔ ”تم واقعی
انٹری نہیں ہو اور نہیں ہتھیار چھپا کر رکھا ہے تو اسے بھی
ٹالو۔“

اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر ریو اور کو ایک طرف
پھینک دیا۔ پھر کہا۔ ”ہائے مراد! میں تمہاری اسی مراد کی
اور ایسی تیز و فطرتی پر مہر تھی ہوں۔“

”دیکھو تم نے کیسے منوالیا کہ مجھ کے دوران عداوت
نہیں ہوئی۔ کوئی ہتھیار نہیں ہوگا۔“

”ہاں مگر ہتھیار کے بغیر تم مجھ سے کیسے کرو گی؟ اور مجھے
مجھت کرنے پر مجبور کیسے کرو گی؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”ہتھیار نہیں پھول چیش کروں
گی۔ تم آپ ہی آپ مجھے چیلے آؤ گے۔“

اس نے ساڑھی کے آچھل کو اوپر سے اُدھر لہراتے
ہوئے سینے سے ہٹا کر توند تکاب کا پہلا ورق الٹ گیا۔ یہ
مرد کے دماغ کو اٹلانے کی ابتدا ہوتی ہے۔

پھر اس نے گھوم کر ساڑھی کے ایک پلیٹ کو کھولا تو
اعداد رنگ تارنگ کا ایک ورق کھل گیا۔

مریض نے کبھر سے ڈانٹ کے مطابق خود کو مختلف
زادوں سے چیش کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی کوشش کر ڈالی۔

وہ ایسا لٹا رہا تھا کہ شرابی کے ہاتھ سے جام چھوٹ جاتا ہے۔
اس نے سحر زدہ سا ہو کر اسے دوڑوں بازوؤں میں اٹھا

کر کہا۔ ”واقعی تم بھری ہوئی بندوبست سے زیادہ خطرناک

پہلے حسن و شباب سے متاثر کر کے وہ ایک لپ اسٹک اٹھا
ہوٹوں کو اٹکار کے کی طرح دھکا دے گی۔ پھر ایک دم سے
گھبرا گئی۔

وہ توقع کے خلاف اچانک وقت سے پہلے اس
تھا۔ اس نے آئینے میں اپنے چہرے اسے دیکھا تو ایک دم سے
اجمل پڑی۔ خوف اندر چھا ہوا تھا۔

اس نے لپ اسٹک کو پھینک کر بڑی بھرتی سے بیٹول
کو اٹھا لیا۔ مراد نے سب سے ہونے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا
کر کہا۔ ”یہ کیا؟ میں تو سمجھا تھا چار کرو گی۔ آج میں بھی چار
کے موڈ میں ہوں۔ سچ کہتا ہوں ساڑھی میں بڑی بھرتی
لگ رہی ہو۔“

وہ ہانپیں پھیلا کر بولی۔ ”تو پھر آؤ میرے
دلدار... اچھے بازوؤں میں لے کر چار کرو۔“

وہ بولا۔ ”جان من! کیا آج تک کسی نے بندوبست
ہاتھ میں لے کر مجھت کی ہے؟“

وہ بولی۔ ”تم وہ عاشق نہیں ہو کہ ہاتھ میں پھول لے کر
آؤں گی۔ یہ بیٹول ہاتھ میں رہے گا اور تم چار کرتے رہو گے۔“

”سوری۔ میں ایسا جھیل نہیں کھیلوں گا۔ ایک وقت
میں ایک ہی بات ہوگی۔ یا تو ہم مجھت کریں گے یا پھر
عداوت۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شاید ایسا کھیل کسی نے
نہیں کھیلا ہوگا۔ میں عداوت کرتے کرتے تمہیں مجھت کرتے
رہنے پر مجبور کرتی رہوں گی۔“

”میں مجبور ہونا نہیں جانتا۔ بیٹول پھینک دو۔ میں
دھنکی بھول چکا ہوں۔ تم جی بھول جاؤ۔ ورنہ چلا جاؤں گا۔“

”پلیز میری بات مان لو۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ میں سچ
کہتی ہوں آج ہر حال میں تمہیں حاصل کروں گی۔ جو بھی
ہوں وہ کرو۔ ورنہ تمہیں اپنا چہرہ بنا دوں گی۔“

وہ اس کے پیروں کی طرف نشانہ لیتے ہوئے
بولی۔ ”جیسے ہی تم پھیر کر جانا چاہو گے۔ تمہاری ایک ٹانگ
ڈھکی کروں گی۔ تمہیں جانے نہیں دوں گی۔“

وہ بولا۔ ”میں ہوا ہوں اور ہوا کو آنے جانے سے کوئی
روک نہیں سکتا۔ لو جا رہا ہوں۔ تمہیں کوئی چلانے کا بہت
شوق ہے۔ چلو اپنا شوق پورا کرو۔“

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ اس نے فوراً ہی ڈھکی کر
دیا۔ کھٹ کی آواز آئی۔ کوئی نہیں چلی۔ اس کی آنکھیں
حیرت سے کھیل گئیں۔ اس نے دوسری تیسری بار گولی
چلائی۔ پھر کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ مراد نے

وہ بیڈ کے پاس آکر ایک بھر سے ہونے ریو اور کو
کچے کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ ”کب تک فون پر باتیں
کرتے رہو گے۔ اب آگیا جاؤ۔ میں نے چوکیدار سے کہہ
دیا ہے۔ وہ تمہیں نہیں روکے گا۔ دروازے کھلے ہیں سیدھے
بیڈ روم میں چلے آؤ۔“

وہ اپنی چال چل رہی تھی۔ وہ اپنی چال کے مطابق
اس سے پہلے ہی اس کے ہتھکے میں پھنک گیا تھا۔ مریض نے
چوکیدار سے کہا تھا ابھی ایک صاحب آنے والے ہیں۔
انہیں تھوڑا کٹنا میں دیکھ کر دروازہ بھی کھلا رکھوں گی۔

مراد ہم چار کی میں ہتھکے کی دیوار سے لگا کھڑا
تھا۔ چوکیدار اپنی ڈیوٹی کے لیے مین گیٹ کی طرف جانے
لگا تو وہ دروازہ کھول کر ہتھکے کے اندر آ گیا تھا۔

مریض فون کو کان سے لگاتے ہوئے میں مصروف
تھی۔ پیچھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ مراد نے اس سے اتنا فاصلہ رکھا
تھا کہ اس کے پلٹ کر دیکھنے سے پہلے کبھی چھپ سکتا تھا۔

وہ بے حد شہر میں کھینچ گئی تھی کہ مراد اپنی جلدی اس کے
استے قریب آجائے۔ کیونکہ فون پر اس کی آواز سن رہی تھی۔

وہ بیڈ روم کے باہر ایک کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ مریض
بیٹول اور ریو اور کو چھپا رہی تھی اور گلاس میں پانی اٹھ لیتے
ہوئے کھد رہی تھی کہ وہ اپنا پور بند دھنکی سے گلاس بھر رہی ہے۔

اس نے کہا۔ ”تم چینی رہو۔ میں ہتھکے سے کچھ دور
ہوں۔ اپنی کار لاک کر کے پیدل آ رہا ہوں۔ آؤ مجھے گھنے
میں بھی جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ مریض نے وال کھاک
کو دیکھا۔ پھر بڑبڑائی۔ ”اوہ۔ بہت محتاط ہے اپنی گاڑی
دور روک کر پیدل آ رہا ہے۔“

وہ ساڑھی کے اندر سے بیٹول نکال کر بیڈ پر رکھتے
ہوئے وائس روم میں چلی گئی۔ اس نے دروازے کو اندر
سے بند نہیں کیا تھا۔ ویسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ دبے قدموں اندر آ گیا۔ اس نے بھرے ہوئے
بیٹول کو خالی کر کے گولیاں جیب میں رکھ لیں۔ بیٹول کو اسی
جگہ رکھ دیا۔ پھر کچے کے نیچے رکھے ہوئے ریو اور کے ساتھ

بھی چلی گیا۔ اس کے بعد دبے قدموں چلا ہوا کمرے سے
باہر آ گیا۔

وہ وائس روم کے اندر کھٹنا رہی تھی پھر تویا سے منہ
ہاتھ پر چھتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ بیٹول کو اٹھا کر آئینے
کے سامنے آکر اپنے حسن کا جائزہ لینے لگی۔

وہ چاہتی تھی بیٹول سے اسے صرف دھنکی دے۔

آئے۔ چوکیدار نے کہا۔ "ہے رام ان پر دیا کرو۔ دونوں نے خوب پی ہے۔ آگے نہیں جاؤ ضرور ہوگا۔"

مراد کو گناہ کرنے والا دور اپنی کار کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی وہی قماش دیکھا پھر اس کار کے پیچھے قافلہ دکھ کر ملتے لگا۔

مرید نے یہی کوشش کی کہ وہ پہلی بار قہقہے میں آ رہا ہے تو حسن و شباب کی جادوگری سے اسے ابھی طرح میکر لے اور وہ اپنے تجربات کے مطابق طرح طرح سے جادو جگا رہی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ کہاں ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ جب کار آہستہ آہستہ جھٹکے کھا کر رکنے لگی تو اس نے دیکھا وہ ایک ایسے علاقے میں آئی تھی جہاں رات بھر چہل پہل رہتی ہے۔ کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کبھی روٹی تھی۔ کبھی اندھیرا تھا۔

کار میں تاریکی میں آ کر رہی تھی۔ مرید نے سیٹ کے نیچے جھپٹے ہوئے پوچھا۔ "یہ کہاں لے آئے ہو؟"

"ہم یہاں رکنے نہیں آئے ہیں۔ گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہے میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں تم چھٹی رہو۔ ابھی چند منٹوں میں ہم آگے نکل جائیں گے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ سیٹ کے نیچے دیکھی ہوئی آگڑوں بیچی تھی۔ اس کا انتظار کرنے لگی۔ دس منٹ میں منٹ گزر گئے۔ وہ وہاں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک ذرا سہارا کھد دیکھا۔ وہ دکھائی نہیں دیا۔ جب کچھ میں آیا کہ وہ دھوکا کھا چکی ہے۔ وہ اسے بیچ بازار میں مادروڑ چھوڑ کر گیا ہے۔ اب وہاں سے لٹکانا تو دور کی بات ہے وہ سہارا کر سیٹ پر بھی چڑھ نہیں سکتی تھی۔ ابھی تو خیریت تھی، کوئی اور نہیں آیا تھا۔ لیکن کوئی بھی آگڑا تھا۔ شیشے کے باہر سے اندر جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ کوئی ایک دیکھتا تو پھر دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ وہ صرف وہیں قماش نہ دیتی۔ دوسرے دن اخباروں میں بھی اس کی شرمناک تصویریں شائع ہوئیں۔

ایسے وقت وہ کسی سے کیا کہتی؟ اخبار والوں کو کیا بیان دیتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔

پھر فون کی رنگ ٹون نے اسے چمکا دیا۔ اس کے پاس اپنا فون نہیں تھا۔ لباس کے ساتھ اسے بھی بیڈروم میں چھوڑ آئی تھی۔

اس نے ذرا سہارا کھد دیکھا۔ وہ وٹس پور پر رکھا ہوا تھا۔ مراد اس کے لیے ہی اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے فون کو وہاں سے اٹھا کر بھیجی سی اسکرین پر مراد کا نام پڑھا تو

فوراہٹن دپا کر اسے کان سے لگا کر بولی۔ "مراد اب تم ہو؟" وہ بولا۔ "ہاں میں بول رہا ہوں۔ تم نے مجھے لوہے کی پھٹکڑیاں اور بیچیاں پہنائیں تھیں۔ میں کبھی بھاگ نہیں سکتا تھا پھر بھی تمہاری گرفت سے نکل گیا۔"

"اب تم بھاگو۔ میں نے لوہا نہیں پہنایا ہے تمہارے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے ہیں۔ بولو میری ان دیکھی زنجیروں سے کیسے نکل سکتی؟ میری طرح زنجیریں توڑو۔"

وہ اٹھا کرنے لگی۔ "پلیز ایسی سزا نہ دو۔ یہاں کسی نے دیکھ لیا تو قماش بن جاؤں گی۔ بھاری جاسوس کی نظروں میں آؤں گی تو شامت آجائے گی۔"

"میں نے پہلی بار جھپٹیں مرنے نہیں دیا تھا۔ اسپتال جانے کا موقع دیا تھا۔ اس بار بھی بچا لیوں گا۔ وعدہ کرو آئندہ کبھی مجھ سے دشمنی نہیں کرو گی۔ ابھی میرے راسے میں نہیں آؤ گی۔"

"میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ کبھی تم سے دشمنی کا خیال تک دل میں نہیں لاؤں گی۔"

"وعدہ کرو میرا ایک نام بھول جاؤ گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں تمہارا نام بھی بھول جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ فون تمہارے لیے ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔ اسے بنا سیتی پتی کونوں کر وہ ابھی آکر تمہیں میکرے پہن کر لے جائے گا۔ میرے گاؤ نے مجھے بتایا ہے کہ اس وقت تم شافی ٹگر کے بازار میں ہو۔"

اس نے فوراً ہی کیٹو سے فون پر رابطہ کر کے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ فوراً آؤ۔"

اس نے پوچھا۔ "کہاں آؤں؟"

"شافی ٹگر میں جہاں ایک برکدک درخت ہے۔ اس کے سائے میں تاریکی ہے۔ وہاں میری کار کھڑی ہے۔ جلدی آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی آ رہا ہوں۔"

"اور سنو میرے لیے کوئی سازش یا کوئی سازگاری لباس لے آؤ۔ جلدی آؤ۔ ورنہ یہاں کوئی آجائے گا۔"

"میں نکل رہا ہوں۔ لیکن اتنی رات کو کوئی دکان کبھی نہیں رہتی۔ کہیں سے لباس خرید نہیں سکوں گا۔ تم جس لباس میں ہو اسی میں گھر چل کر بدل لیتا۔"

وہ غصے سے بولی۔ "میں لباس میں نہیں ہوں۔ جلدی آؤ۔"

اس نے تھرائی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ تم تو میرے ساتھ سازشی بینکر لگی تھیں؟"

وہ جھنجھلا کر بولی۔ "مجھ سے بحث نہ کرو۔ اپنا ہی کوئی

لباس لے کر آؤ۔"

کچھ رات گزارنے کے لیے وہیں قریب ہی کسی ہوٹل میں تھا۔ وہ اپنی ایک چنٹ اور شرٹ لے کر بیٹ منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ کار کے اندر ہی لباس پہننے ہوئے مراد کو کالیں دیتے تھے۔ دل ہی دل میں یہ وعدہ کرنے لگی کہ آئندہ کسی کو پھانسنے کے لیے کبھی یہاں نہیں ہوگی۔

☆ ☆ ☆

معروف جلی اور مراد جلی پریشان تھے۔ محبوب پر ہر دہائی طاری ہوئی تھی۔ وہ کار بار سے پھر غافل رہنے لگا تھا۔ میرا اب ماروی کے خلاف بولنے لگی تھی۔ صاف کتنی تھی کہ محبوب کو پاگل بنانے والی اور اس کے بڑس کوتاہی کی طرف لے جانے والی وہی ایک خوبصورت بلا ہے۔

وہ بلا نہیں رہے گی۔ مر جائے گی تو مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ محبوب صاحب بھی اس کی ابدی جدائی کا مدد۔ برداشت کر لیں گے پھر وہ پہلی کی طرح اپنے بڑس کی طرف دھیان دیتے لگیں گے اور یہ یقین تھا کہ وہ اپنی قربت سے اسے متاثر کرتی رہے گی۔

وہ تینوں محبوب سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اس کی بہتری کے لیے فیصلہ کیا کہ اب آپاریا ایک ایک نیچے پر پہنچا جائے۔ مراد یا ماروی میں سے کسی کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر مراد کی آخری سانسیں پوری ہو جائیں گی تو ماروی ایک نہ ایک دن ضرور محبوب کی ہو جائے گی۔ صرف ایک کی موت سے کتنی مسائل حل ہو جائیں گے۔

میرا چاہتی تھی ماروی کا قصہ تمام ہو جائے۔ معروف اور مراد چاہتے تھے مراد کی دیوار گر جائے۔ محبوب کی زندگی میں ماروی آجائے گی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا وہ سرتوں سے بالامال رہے گا تو بڑس بھی خوب پھٹا پھوٹا رہے گا۔

ان تینوں نے محبوب کی کوئی شے آکر اس سے ملاقات کی۔ اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ معروف نے کہا۔ "تم یہی زندگی گزار رہے ہو؟ اس طرح حالات کی دھماکا کر گوشہ نشین ہو جاؤ گے تو کیا ماروی تمہیں حاصل ہو جائے گی؟"

محبوب نے کہا۔ "وہ میرے مقدر میں نہیں ہے۔ مراد کے حق میں فیصلہ کر چکی ہے۔"

"بڑے بڑے فیصلے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ماروی نادان ہے۔ ہم اپنی حکمت عملی سے اس کا فیصلہ بدل دیں گے۔"

"آپ اس کی گردن پر چھری رکھ دیں تب بھی وہ انکاحی کمر پڑھتی رہے گی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ فیصلہ تبدیل کرانے کے لیے گردن پر چھری رکھی جائے۔ ہم اپنی ذہانت سے اور چالاکی سے اسے تمہاری زندگی میں لے آئیں گے۔"

محبوب نے ان تینوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "بڑے یقین سے بول رہے ہیں۔ معلوم تو ہوا آپ لوگ کیا سوچ کر آئے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

میرا نے کہا۔ "ہم نے بہت کچھ سوچا ہے۔ پہلے آپ یہ تسلیم کر لیں کہ آپ کی ٹیکہوں نے اور شرافت نے ماروی کو کتنا شرمیں کیا ہے۔ آپ کی نیکیاں راکاں کی ہیں۔"

"آپ یہ تسلیم کر لیں کہ وہ احسان فراموش ہے۔ یہ فقط دھمکا ہے۔ آپ کی شان کے خلاف ہے لیکن مجبوراً کتنی ہوں کہ اس نے مراد کی ذہن بننے کے لیے آپ کو ٹھکرا دیا ہے۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ خدا کے لیے آپ کچھ تو اپنی توہین محسوس کریں۔"

محبوب نے کہا۔ "تم کیا سمجھتی ہو میرے توہین محسوس کرنے سے وہ میری زندگی میں آجائے گی؟"

"آپ نیکی اور شرافت سے باز آجائیں گے تو اپنی توہین کا انتقام لے سکیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ کیا میں ماروی سے انتقام لوں گا...؟ ہرگز نہیں... آئندہ ایسا خیال اپنے دماغ میں نہ لانا۔"

معروف نے کہا۔ "مراد... انتقام اس طرح لو گے کہ ماروی کو ایک ذرا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

اس نے معروف کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "اور اصل مراد کے خلاف ایسی کارروائی کی جائے گی کہ وہ ماروی کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔"

"ایسی کیا کارروائی کی جائے گی؟"

میرا اور معروف نے حما کو دیکھا۔ حما نے کہا۔ "سراپہ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ ایک خطرناک مجرم بن چکا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مالی جتاپ جیسا قصباتی سیاستدان اسے قتل کرانے کے لیے اپنے کئی شرذوہ اس کے پیچھے لگا چکا ہے۔"

"مراد کی حال میں بیچے کا نہیں۔ وہ انڈیا سے یہاں آئے گا تو اس بار اس کے شوگر اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

محبوب نے کہا۔ "کتنے ہی شوگر مارے جا چکے ہیں۔ لیکن کوئی اسے ایک گولی بھی نہ مارے گا۔"

حما نے کہا۔ "اس بار اسے کوئی لگے گی۔ وہ ہمیں اپنا کھتا ہے۔ میں اور میرے آدمی اسے کوئی ماریں گے تو وہ

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

ٹوپ ٹریٹمنٹس

ایک ایسی جلد کی صحت میں نکھری جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے نکھار دیتی ہے اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت نکھلتے ہوئے جسم میں بدل جاتی ہے اور جلدی جیسے کے داغ، بے آکھوں کے گڑھے جیسے اور گردن کی جھریاں دور ہو جاتی ہیں۔ غواہین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے کیاں منہ سے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ جلدی دور کر دیں لہذا ٹوپ ٹریٹمنٹس کا استعمال کرنے کے لئے بہت گمان ہے۔

www.facebook.com/top.treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو مسر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں موجود ہورمون ڈیوڈن کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے چربیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!



ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دوا خانے پر دستیاب

042-35789145 & 6,0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

II

کرنے لگی۔

معروف نے کہا: "ماروی کو کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ یہ ایسا ڈراہم ہے کہ اس کے گھر چھاری اور احسان منہ ہوگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اسے اسے انوار کرنے والوں کے شیعہ سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہو۔"

عادی نے کہا: "ہمارے ذہن میں ایسی جھوس پانکھ ہے کہ جس پر عمل کرتے رہتے سے وہ آپ کی منگوہ میں جائے گی۔"

وہ بولا: "ایسا ہو جائے تو میں آپ لوگوں کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں یہی چاہوں گا کہ مراد کے یہاں آنے سے پہلے ماروی اس سے دور ہو جائے لیکن یہ بتاؤ وہ میری منگوہ بننے کے لیے کیسے راضی ہوگی؟"

معروف نے کہا: "ماروی کو معلوم ہوگا کہ تم اس کی رہائی کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہو۔ پھر وہ دیکھے گی کہ دشمنوں نے ہمیں بھی پکڑ لیا ہے۔ تم بھی نصیبت میں گرفتار ہو گئے ہو اور جھوس بھی اسی کرے جس میں پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ قیدی بنی ہوئی ہے۔"

عادی نے کہا: "اس طرح آپ دن رات ماروی کے ساتھ ایک کمرے میں قیدی بن کر رہا کریں گے۔ وہ دیکھے گی کہ دشمنوں سے طویل مذاکرات ہو رہے ہیں۔ رہائی کی کوئی بات نہیں بن رہی ہے۔ اس ایک کمرے کے اندر ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ وہ آپ کی ہونکر رہ جائے گی۔"

محبوب چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ ماروی اس کی آغوش میں آکر خود کو ہار دی ہے۔ معروف نے پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ خیالات سے چونک کر بولا: "آں۔ ہاں مجھے منگوہ ہے۔ اسی تدبیر پر عمل کیا جائے۔"

محبوب کو دیکھ کر وہی سمجھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر معروف اور عادی اس تدبیر پر کامیابی سے عمل کرتے رہیں گے تو محبوب نہ جانے کتنے دنوں کتنے مہینوں اور کتنے برسوں تک ماروی کے ساتھ بند کمرے میں رہے گا؟

محبوب کے سینے پر سانپ لوث رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تھلا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی: "ماروی کو انوار نہیں چاہیے۔ انوار ہونے سے پہلے ہی اسے دوسری دنیا میں لے جانا چاہیے۔"

مقابلے کے بغیر دھوکے میں مارا جائے گا۔"

محبوب فوراً ہی کچھ نہ بول سکا۔ مراد کا اور معروف کا منہ جیسے لگا۔ معروف نے کہا: "میں تمہارے مزاج کو سمجھتا ہوں تم مراد کی ہلاکت نہیں چاہو گے۔ جب مراد کا مقدمہ کمزور ہو سکتا تھا تم رقیب بن کر اسے چھائی کے چاند سے تک پہنچا سکتے تھے۔ جب تم نے اس پر احسان کیا اور زیارت داری سے اس کا مقدمہ ملاڑتے رہے۔"

"یوں تو اس کا صلہ نہیں کیا مل رہا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے اب وہی مراد جسے انوار رقیب کہہ رہا ہے۔"

"وہ ایسا کہہ رہا ہے تو پھر رقیب بن کر دکھاؤ۔ تم ماروی کی خوشیاں چاہتے ہو۔ اسے اس کی دہن بننے اور اسے تھاپی سے بچانے سے روکنا کی تمہارا فرض نہیں ہے؟"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا: "ہاں میں اسے ایک مجرم کی شریک حیات بننے نہیں دوں گا۔ وہ اس کی منگوہ بننے کی فطرتی کرنے والی ہے۔ میں اس کی بہتری چاہتا ہوں۔ آپ سب میری بہتری چاہتے ہیں تو کسی طرح مراد کو اس سے دور کرو۔ یہی کی تدبیر کریں۔ لیکن میں اس کی ہلاکت نہیں چاہوں گا۔"

معروف کچھ کہنا چاہتا تھا۔ محبوب نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر کہا: "میں اس حد تک راضی ہوں کہ مراد کا وجود ہمارے ملک میں ہمارے شہر میں نہ رہے۔ عادی... ان کوئی تدبیر کرو۔ اسے کسی طرح یہاں آنے سے روک دو وگھرا سے ہلاک کرنے کی بات نہ کرو۔"

"جب وہ مجھے رقیب کہتا ہے تو میں رقیب بن کر دکھاؤں گا۔ ماروی کو اس کی منگوہ بننے نہیں دوں گا۔ بس یہ یاد رکھو کہ اس کی ہلاکت نہیں چاہوں گا۔"

ان تینوں نے ایک دوسرے کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر معروف نے کہا: "یہ ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ تم اس کی ہلاکت بھی پسند نہیں کرو گے۔ تمہارے لیے بہت دور تک سوچنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم ایک اور تدبیر سوچ کر آئے ہیں۔"

محبوب کی خاموشی نظروں نے پوچھا: "وہ تدبیر کیا ہے؟"

عادی نے کہا: "ہم ماروی کو مراد سے دور کر دیں گے۔ اسے رازداری سے ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں صرف آپ ہی جاسکیں گے۔ مراد اسے زندگی بھر ڈھونڈتا رہ جائے گا۔"

محبوب نے انکار میں سر ہلا کر کہا: "ماروی کو معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اسے انوار کیا ہے وہ مجھ سے نفرت

اس کے ذہن میں ابھی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ فی الحال ایک عورت کی خدمت تھی جسے قید تھا کسی عورت کو اپنے مرد کے ساتھ بند کر کے نہیں رہتے جس دے کی اور ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جب عورت خنجر آجاتی ہے تو بہت کچھ کر گزرتی ہے۔ وہ بھی کچھ کرنے والی تھی۔

حالات کے بدلنے میں بڑی اور بازی کے پلٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہاں بازی ایسی چلتی تھی کہ جو دوست تھے وہ دشمن ہو گئے تھے۔ سیراماروی کی دشمن ہو گئی تھی اور محبوب کی حد تک مراد سے دشمنی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ معروف اور مہاجر طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہے تھے اور کسی تدبیر پر عمل کرنے والے تھے۔

ایک سوچ یہ تھی کہ مراد کو قتل کر دیا جائے۔ دوسری سوچ یہ تھی کہ ماروی کو انور کیا جائے۔ اور تیسری سوچ سمیرا کی مٹی کی ماروی کو ہی ختم کر دے۔ نہ رہے گا پانس نہ بچے گی بہت کی پانسری۔ لیکن یہ سب کیا تھا؟ محض تدبیریں ہی تدبیریں تھیں۔ ان کے پاس دولت تھی طاقت تھی مضبوط ذرائع تھے وہ اپنی ہر تدبیر پر عمل کر سکتے تھے۔ لیکن نقد پر کیا پانچ تھی؟

مراد کے دن رات مختلف علاقوں کی سڑکوں اور گلیوں میں گزر رہے تھے۔ وہ پرانی دہلی اور نئی دہلی کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں سے مل رہا تھا۔ ہندی زبان بول کر ان کے ساتھ مل رہا تھا۔

ماسٹر کو بونکر راجپوت بھٹی رہی تھی کہ وہ بڑی کامیابی سے ہندوستانی شہری جٹا جا رہا ہے۔ اب بھارتی جاسوس اس پر شبہ نہیں کریں گے اور نہ ہی یہ کچھ کشیں گے کہ وہ پاکستانی ہے اور نہ ہی اسے ماسٹر کا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ ماسٹر نے مراد سے کہا۔ "تم بڑی توجہ اور بڑی محنت سے وہاں کے ماحول میں ڈھل رہے ہو۔ میں نے کہا تھا کہ تمہیں ایک بہت اہم پروہیت میں آزمایا جائے گا۔ تم کامیاب ہو گے تو وہاں پاکستان جاسوس گئے۔"

"مجھے پاکستان جانا ہے۔ میں جی جان سے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ پروہیت کیا ہے؟"

"جگ وی دہلی بھٹی رہا ہے۔ وہ تمہیں تمام تفصیل بتائے گا۔"

اسی شام جگ وی نے دہلی آکر مراد سے ملاقات کی۔ اسے بتایا کہ ہمارے ماسٹر کو بونکر راجپوت سہ کیٹ

ریڈ البرٹ کا سربراہ نیکی البرٹ یہاں آیا ہوا ہے۔ ماسٹر چاہتا ہے وہ اپنے مشن میں ناکام رہے۔ جو حاصل کرنے آیا ہے وہ حاصل نہ کر سکے۔"

مراد نے پوچھا۔ "کیسے کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "بھارت اور اسرائیل کے تعلقات مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی دھچکی نہیں ہے۔ دھچکی اس خفیہ معاہدے سے ہے جو ان دونوں کے درمیان ہوا ہے۔"

"ریڈ البرٹ کا نیکی البرٹ اس خفیہ معاہدے کی سیکرٹ فائل حاصل کرنے آیا ہے اور ہم وہ فائل اس کے ہاتھوں میں پہنچنے نہیں دیں گے۔ اسے ہم حاصل کریں گے۔" اسے حاصل کرنے کا راستہ کہاں سے ملے گا؟ میں نیکی البرٹ اور اس کے آدمیوں کو کیسے پہچانوں گا؟"

"مرید نیکی البرٹ کو ابھی طرح پہچانتی ہے۔ وہ نیکی سے اور اس کے آدمیوں سے ٹکرائے گی۔ تم دور سے اس کی نگرانی کرو گے اور دشمنوں کو ہلکانے لگاؤ گے۔"

"نیکی البرٹ وہ سیکرٹ فائل کیسے حاصل کرے گا؟"

"وہ اس فائل کی مائیکروفلم حاصل کرے گا۔ آج رات ریڈ روم کا ایک انچارج پرانے منصوبوں آکر نیکی البرٹ کو وہ فائل دے گا۔ مرید وہاں ان پر حملہ کرے گی۔"

مراد پرانی دہلی کے ایک علاقے میں اس پرانے مندر کو دیکھ چکا تھا۔ دہلی شہر سے میں میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں وہ مندر یوں پرانے مندر تھا۔ ماسٹر کو بونکر نے مراد کو یہ حقیقت بتائی تھی کہ پاکستان میں اس پر جو جان لیوا منصوبے ہوتے رہے ہیں وہ دراصل نیکی البرٹ کے حکم سے ہی ہوتے رہے ہیں۔

اس طرح مراد کو معلوم ہوا کہ اس کا اصل دشمن نیکی البرٹ ہے اور عالی جناب پاکستان میں اس کا ایک ایجنٹ ہے۔ مراد نے اپنے کو عالی جناب کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس نے کراچی پہنچ کر ماروی سے ملاقات کی تھی۔ اس سے پتا لگھ روپے لیے تھے اور کرائے کے دو شوٹرز کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ بڑی تندی سے کام کر رہا تھا۔ کسی ایسے موقع کا انتظار کر رہا تھا کہ عالی جناب بھی چارو بھاری کے باہر کمزور دیکھ رہی کے سامنے میں نظر آجائے پھر اسے زندہ نہیں جانے دے گا۔

ادھر مراد اس رات اپنے اصل دشمن نیکی سے ٹکرائے والا تھا اور وہ ایک ہی دشمن نہیں ہوگا۔ وہاں دوسری دشمن مرید بھی۔ مراد اسے بونکر کے بیچ بازار میں ملے گا۔

تھا۔ وہ اپنی انسلٹ پر فتنے سے پاگل ہو رہی تھی۔ ایسی جھنجھالی ہوئی تھی کہ اسے دیکھتے ہی اس پر گولیاں برسنا شروع کر دیتی۔

ایک ایک جہتی اور جان سے کھیلنے والے کئی تھے۔ کیا نصیب تھے۔ وہ یہاں سے فک کر ماروی کے پاس جاتا تو وہاں بھی موت اسے خوش آمدید کہنے والی تھی۔ معروف بھٹی اور حماد صدیقی نے بڑی رازداری سے یہ طے کیا تھا کہ ماروی کو انور نہیں کیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہی مراد کو اوپر پہنچا دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ عالی جناب کے شوٹرز نے اسے ہلاک کیا ہے۔ اس طرح ماروی مراد کو محبوب کا منکظم ایک ہی دن میں ختم ہو جاتا۔ ان تینوں کے تمام مسائل ایک ہی کوئی سے حل ہو جاتے۔

مراد بڑی ذہانت اور حاضر دماغی سے جانی انہماقی عداوتوں کو کھیل رہا تھا۔ اس کے باوجود انہوں کی سازشوں سے بے خبر تھا اور بے خبری میں ہی اس کی شامت آنے والی تھی۔ حالات ایسے تھے کہ وہ ذہنی طور پر الجھا رہا تھا۔ اس رات نیکی البرٹ اور مرید سے ٹکٹا تھا اور وہ خوش بھی تھا ان سے ٹکٹے کے بعد ایک دور دراز میں پاکستان جاسوس تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ماروی منکھرا رہی تھی۔ وہ اسے خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ دو چار دنوں میں ہی اس کے پاس آنے والا ہے۔ دل کھیر رہا تھا اس سے خوب باتیں کی جا رہیں لیکن اس نے دل کو کھینچا کہ آج رات جن خطرات سے ٹکٹا ہے ان پر پہلے توجہ دی جائے۔

اس نے اپنے جاسوس بھٹاری کو بلوایا۔ جب وہ آیا تو اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر پرانا مندر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "وہاں آج رات مجھے دشمنوں سے ٹکٹا ہے۔" بھٹاری نے پوچھا۔ "دشمن کتنے ہوں گے؟"

"ایک اندازہ ہے کہ دو چار یا پانچ ہوں گے۔ وہ ایک خفیہ معاملے میں ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں۔ چونکہ معاملہ بہت ہی خفیہ ہے اس لیے ان کی تعداد کم ہوگی صرف رازداری پرستوں کے سامنے وہاں ہوں گے۔"

بھٹاری نے پوچھا۔ "دشمن کس سطح کے لوگ ہیں؟ کیا وہ بھارتی اسلحہ استعمال کریں گے؟"

"وہ عالمی سطح کے مجرم ہیں۔ رات کے سامنے میں شور مچانے والے ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔ ان کے پاس سائیکلنگ لگا ہوا اسلحہ ہوگا۔"

"کیا آپ کو ان کے معاملات کا پتا ہے؟"

"معاملات کچھ بھی ہوں۔ وہ دونوں میرے دشمن

ہیں اور میں انہیں وہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔" اس نے پرانا مندر کے سامنے پہنچ کر کار روک دی۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی دن کی روشنی تھی۔ وہاں ایک گاڑی رکتے دیکھ کر ایک بھاری اس کھڑے کے کسی حصے سے نکل کر آیا۔

وہاں سے گزرنے والے اسے نقدی کی صورت میں دان دکھانے کے کر جاتے تھے۔ مراد نے اسے سو سو کے پانچ نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پانچ ہزار بھی مل سکتے ہیں۔ ہمیں اس مندر کے اندر چھپنے اور بھاگنے کے راستے دکھاؤ۔"

بھاری نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ آپ پولیس والے ہیں یا پھر پولیس سے بھاگنے والوں میں سے ہیں۔"

بھٹاری نے کہا۔ "ہم پولیس سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے ہمیں پانچ ہزار دیں گے۔"

"تو پھر میرے پیسے آگیا اور مندر کا اندر سے دیکھیں۔"

وہ اس کے پیچھے چلے گئے۔ اندر تاریکی تھی۔ دن کا آجالہ وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ بھاری نے چار جراثیم آن کر لی پھر ایک گاڑی طرح بولتے ہوئے ان کے آگے آگے جانے لگا۔ "اس مندر کے پیچھے اور اوپر بائیں تین دروازے ہیں۔ پولیس ایک طرف سے آئے تو آپ دوسرے تیسرے دروازے سے نکل سکتے ہیں۔"

مندر کے اندر کئی کمرے اور راہداریاں تھیں۔ راہداریاں بھول بھولیں کی طرح کھوتی ہوئی اور ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی گزرتی تھیں جو ایک ایک راہداری کو یاد رکھتے ہوئے نہ گزرتا وہ اس مندر کے اندر بھٹکا رہ جاتا۔ یوں بھاگنے والا کوئی دشمن گھوم پھر کر پھر دوسرے دشمنوں کے سامنے پہنچ جاتا۔

بھاری نے کہا۔ "بھڑی کرنے اور ڈاکا ڈالنے والے یہاں مال چھپانے اور خود چھپنے آتے ہیں۔ کچھ چھپنے میں اور فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ راہداری کی بھول بھولیوں میں مارے جاتے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "ایسے وقت تم کہاں ہوتے ہو؟"

"میں تو رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ قریب ہی دو کوں پر میرا مکان ہے۔ وہاں بستر پر بڑا گولیاں پلنے کی آوازیں سن رہا ہوں۔"

وہ مندر سے باہر آگئے۔ باہر پچاس گھر میں بھکوان خری کرشن کی بڑی سی مورتی تھی۔ مراد نے پوچھا۔ "کیا آج پائل یہاں کوئی آیا تھا؟"

”روز کتنے ہی آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”کوئی آکر نہ آیا تھا؟“

”ہاں ایک آکر نہ آیا تھا۔ اس نے مجھے دو سو ڈالر دیے تھے۔ اس نے بھی مندر کے اندر آکر خوب گھوم پھر کر دیکھا تھا کسی جگہ کی تصویریں اتار کر لے گیا تھا۔“

مراد نے اسے پانچ ہزار دیتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک عورت کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ خوبصورت ہے اور اس کا قد لمبا ہے۔ اس کے ماتھے پر زخم کا نشان ہے کیا ایسی کوئی عورت آئی تھی؟“

”ہاں آج صبح آئی تھی۔ اس نے بھی مندر کو اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ اس عورت نے اور اس آکر نہ نے یہ پوچھا تھا کہ میں ابھی ہوئی راہداروں کو کیسے یاد رکھتا ہوں؟“ مراد نے کہا۔ ”ہاں میں بھی کیا پوچھتا ہوں۔ تم نے یاد رکھنے کے لیے ہر راہداری کے سوڈ پر کوئی نشانی رکھی ہوگی؟“

وہ بولا۔ ”کوئی نشانی نہیں رکھی ہے۔ آپ پھر وہاں چل کر دیکھ لیں۔ میں یہاں کچھیں برس سے ہوں۔ مجھے آپ ہی آپ ان راہداروں سے گزرنا آ گیا ہے۔“

بھنڈاری نے کہا۔ ”کوئی خطی نشانی ہوگی تو ہماری جگہ میں نہیں آئے گی۔ اگر تو ہمیں بتا دو۔“

نوٹ دیں گے۔ ہم یہاں بھٹکانا نہیں چاہتے۔“ وہ بولا۔ ”نوٹ دیتے رہیں تو بیٹے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ راہداروں کو یاد رکھنے کی کوئی خاص نشانی نہیں ہے۔ جس کی یادداشت غیر معمولی ہوتی ہے وہی بھول جلیں سے گزر جاتا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ۔ کیا اس عورت نے اور آکر نہ نے کہا تھا کہ پھر یہاں آئیں گے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی مگر میں لوگوں کے ارادوں کو ان کی باتوں سے سمجھ لیتا ہوں وہ آج یا کل پھر ادھر آئیں گے۔ میں نہیں جانتا۔ آپ بھی یہاں کس لیے آئے ہیں۔ میں جان کر کروں گا بھی کیا۔ مجھے گند نارائن (رقم) مل جاتا ہے۔ سبکی بہت ہے۔ اب میں جا رہا ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ چلا گیا۔ مراد نے بھنڈاری سے کہا۔ ”اندھرا ہو چکا ہے۔ پتا نہیں سکی اور مرید یہاں کب آئیں گے۔ میں یہاں چھپا رہوں گا۔ تم میری کار لے کر جاؤ اور کرائے کے دو شورڈز کو مندر کے پیچھے لے آؤ۔ پیچھے اور داہیں بائیں تین دروازے فرار ہونے کے لیے ہیں۔ آج رات ان دروازوں سے جو بھی نکلے اسے

گوئی مارا ہے۔“

”آپ کو بھی وہاں سے فرار ہونا پڑا تو...؟“

”مجھے ان دروازوں سے نکلنا پڑا تو میں نکلنے سے پہلے فون پر چھپیں اطلاع دوں گا۔“

بھنڈاری کا ریکی چانی لے کر چلا گیا۔ مراد نے اپنے فون کو سائلنٹ کر دیا تاکہ رنگ فون کی ٹون سنائی نہ دے۔ پھر فون کی تاریخ روشن کر کے شری کرشن جی کی بڑی سی مورتی کے پاس آ گیا۔ اس کے پیچھے چھپنے کی جگہ تھی۔ اوپر چھت کے نیچے چھان بھی تھا۔ وہ اس چھان پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

یہ تو نیکی البرٹ اور یکاڑا روم کے انچارج کوئی معلوم تھا کہ وہ کب وہاں آئیں گے۔ ان کے پیچھے مرید آئے والی تھی۔ وہ ان تینوں کا انتظار کرنے لگا۔

ایک گھنٹا گزر گیا پھر دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ بڑا ہورہا تھا۔ بھنڈاری نے فون پر سچ کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ شورڈز کے ساتھ مندر کے پیچھے پہنچ گیا ہے۔ ادھر کے تینوں دروازے ان کی نظروں میں نہیں۔ کوئی وہاں سے فرار نہیں ہوگا۔ پھر اس نے آدھے گھنٹے بعد اطلاع دی کہ ایک کار مندر سے کچھ فاصلے پر آ کر ٹوٹی ہے اور ایک شخص کار سے نکل کر بڑے قحط انداز میں مندر کی طرف جا رہا ہے۔

مراد نے چھان سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک شخص تاریخ کی روشنی میں چلتا ہوا مورتی کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ ادھر ادھر روشنی میچتے ہوئے امینان کر رہا تھا کہ وہاں اور کوئی نہیں ہے۔

پھر اس نے فون پر کہا۔ ”بیلو نیکی صاحب امین واسو دیو پل رہا ہوں۔ مندر میں آ گیا ہوں ادھر کوئی نہیں ہے۔ آپ بھی دیر میں آ رہے ہیں؟“

دوسری طرف سے نیکی البرٹ نے کہا۔ ”میں قریب ہی ہوں اس منٹ میں آ رہا ہوں۔“

دس منٹ بعد بھنڈاری نے مراد کو اطلاع دی۔ ”ایک اور گاڑی چکی والی کار کے قریب آ کر ٹوٹی ہے۔ اس میں سے دو شخص اگل کر مندر کی طرف گئے ہیں۔“

مراد چھان سے دیکھ رہا تھا۔ ایک اوجھڑا آکر بڑا ایک ہندوستانی گن بین کے ساتھ آیا تھا۔ مراد نے اندازہ لگا لیا کہ وہ آکر نہ نیکی البرٹ ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔

پھر واسو دیو نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا نام لیا۔ ”ویل مسٹر نیکی امین اس فائل کی بائیکو رقم لے آنا

ماروی

ہوں۔ آپ بھی وہاں کے مطابق پوری رقم لے آئے ہوں گے۔“

ایک بڑے سے چوڑے پر شری کرشن جی کی مورتی کھڑی تھی۔ نیکی نے اس چوڑے پر پریف کیس کو رکھ کر کھولا۔ اس میں امریکی ڈالرز کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔

نیکی نے کہا۔ ”یہ تمہاری انڈین کرسی کے مطابق پورے دو کروڑ روپے ہیں۔“

واسو دیو نے اپنے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر صدر کی جیب سے ایک بائیکو رقم نکالی پھر اس کی طرف بڑھائی۔ نیکی نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایسے ہی

دقت ایک فائر کی آواز گونجی۔ گوئی نیکی کے ہاتھ میں لگی۔ بائیکو رقم ہاتھ سے نکل کر چوڑے سے پڑھتی ہوئی کرشن جی کے چنوں میں آ کر گر پڑی۔

ان کے سینے سے پہلے دوسری گوئی نے نیکی کے گن میں کو پھرتی دھکا دے کا موقع نہیں دیا۔ اسے بیٹھ کے لیے سلا دیا۔ وہ دونوں تاریخ بچھا کر چھپنے کے لیے ادھر ادھر ہو گئے۔

پتا نہیں مرید کیسے وہاں پہنچا تھا۔ بھنڈاری اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔ وہ بہت دور سے پیدل چلتی ہوئی چھپتی ہوئی آئی ہوئی۔ مندر کی تاریکی میں اس کی آواز ابھری۔ ”نیکی البرٹ مجھے آواز سے پہچانو۔ میں نے مراد کو تمہارے پیچھے چڑھتے نہیں دیا۔ اسے پاکستان سے یہاں لے آئی ہوں۔

یہ بائیکو رقم بھی یہاں سے لے جاؤں گی۔“ تاریکی سے نیکی کی آواز ابھری۔ ”مرید امین نے تمہاری خدمات حاصل کرنے سے انکار کر کے غلطی کی تھی۔ میں جانتا ہوں تم جرائم کی دنیا کی زبردست کھلاڑی ہو۔ آؤ سمجھو تاکہ وہ دوستی کرو۔ میں تمہاری تمام شرائط مان لوں گا۔ یہاں میرے معاملے میں مداخلت نہ کرو۔ جلیز

مجھے نقصان نہ پہنچاؤ۔ میں جیسے من مانی جیٹ کروں گا۔“ ”یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں تمہارے جانی دشمن ماسٹر کو بیوی کے لیے کام کر رہی ہوں۔ جب تک اس سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تب تک اسے چھوڑ کر تمہاری طرف نہیں آؤں گی۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک گوئی سناتی ہوئی مرید کے قریب سے گزری۔ نیکی نے آواز کی سمت قاز کیا تھا۔ وہ فرش پر گھٹنوں کے بل چبک گئی۔

پھر نیکی کی آواز ابھری۔ ”مرید امین یہاں ہوں۔“ وہ بڑی بھی ہوئی کھلاڑی تھی۔ کچھ نیکی کی راہنما آواز

سناتے ہی وہ داہیں یا بائیں چھپنے کے لیے جاتے گا۔ اس نے اسی انداز سے سے آواز کی سمت سے بائیں طرف گوئی چلائی تو نیکی کے سٹن سے کراہ لگی۔ دھپ سے فرش پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ مر گیا یا زخمی ہوا تھا۔ مرید فرش پر اوندھی لیٹ گئی تھی اور بڑے قحط انداز میں رکتی ہوئی ادھر جا رہی تھی جدھر سے اس کے گرنے کی آواز آئی تھی۔

مراد بڑی آہستگی سے آواز پیدا کیے بغیر چھان سے اتر گیا۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا مورتی کے پاس آ گیا۔

نیکی اور واسو دیو نے تاریخ روشن کی تھی اس نے اندھرا ہونے سے پہلے بائیکو رقم کو لے لیتے ہوئے کرشن جی کے چنوں کی طرف آتے دیکھا تھا۔

وہ اسے حاصل کرنے کے لیے مورتی کے پیچھے آ گیا۔ وہاں سے ہاتھ بڑھا کر مورتی کے قدموں کے پاس اندھے کی طرح ٹٹولنے لگا۔ اسے تلاش کرنے لگا۔

ایسے ہی دقت اس کا ہاتھ ایک زنانہ ہاتھ سے ٹکرایا۔ وہ ہاتھ اور کس کا ہو سکتا تھا؟

وہ سمجھ گیا۔ مرید سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پھر ایک بار سنگدل یا زکاظم ولددار سے ٹکرا رہی ہے۔ اس نے سوچا یہ کون ہے؟ کہاں سے آ گیا ہے؟ گرانے سے پتا چل رہا ہے ہاتھ پتھر کی طرح مضبوط ہے۔ میں اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ نہیں سکوں گی۔ میرے ایک ہاتھ میں ریلو اور ہے۔

مراد نے ایک ہاتھ سے اسے پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے بائیکو رقم کو تلاش کرنے لگا۔ آخر وہ مل گئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ گوئی چلا نا نہیں چاہتی تھی یہ اندیشہ تھا کہ نیکی زندہ ہوگا تو اس پر قاز کرے گا۔

وہ منہ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ تاریکی میں گولیاں آواز کی سمت ہی آتی تھیں۔ ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ ہاتھ پکڑنے والے پر گوئی چلا کر فوراً فرش پر لیٹ جائے۔

ایسا کرنے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ مطلوب چیز ہاتھ آگئی تھی۔ پھر اسے پکڑ کر لے کر نکلتا؟

اس نے انداز سے سے سامنے دو فائر کے پھر فرش پر لیٹ گئی لیکن کسی کی کراہ سنائی نہیں دی۔ وہ گوئیوں نے کسی طرح کی کھیل پیدا نہیں کی تھی۔

اس کا اندیشہ درست تھا کہ نیکی زندہ ہوگا کیونکہ اس

کی فائزنگ کے جواب میں دور تاریکی سے ایک گولی
سنائی ہوئی اس کی طرف آئی تھی۔

اب وہ مائیکرو فلم کو دھڑکنے کے لیے وہاں ٹھہر نہیں
سکتی تھی۔ فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر رہتی ہوئی مورٹی اور
چوڑے سے دور جانے لگی۔

واسو دیو کو وہ روڈ روپے کی قرچی۔ بریف کیس
چوڑے پر رکھیں پڑا تھا۔ وہ بھی اوندھے منہ فرش پر بیٹھا
ہوا آ رہا تھا۔ پھر اس نے چوڑے کے پاس کچھ رکھنے کے
بل اٹھ کر ادھر ادھر ٹوٹا تو وہ ہاتھ میں آگیا لیکن اسے اپنی
طرف کھینچنے وقت آواز پیدا ہوئی۔ مرینہ اوندھے منہ مٹی اس
نے پلٹ کر آواز کی سمت گولی چلائی۔ کہیں سبکی کی طرف
سے بھی گولی چلی کسی کی گولی تو گئی ہی تھی۔ وہ مٹی چھڑا کر چٹن
ہوا ہیٹھ کے لیے خاموش ہو گیا۔

مرینہ کی گولی سبکی کے ایک باؤسوں کی تھی۔ دھم دھم
نہیں تھا۔ وہ مردانہ اور تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ اس کے
لیے اور مرینہ کے لیے مائیکرو فلم زیادہ اہم تھی۔

ان کا خیال تھا کہ وہ ابھی تک بنگالوں کے چٹوں میں
پڑی ہوئی ہے۔ اسی لیے وہ دونوں اس مورٹی اور چوڑے
سے دور نہیں جا رہے تھے۔ اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ رہے
تھے کہ ادھر کسی کے لیے بھی موت ہے۔ مرینہ نے اندازہ
لگا لیا کہ اس نے ابھی واسو دیو کو ہلاک کرنے کے لیے کسی جگہ
سے گولی چلائی تھی۔ وہ اس سمت تڑا تڑا جا رہا تھا۔ گولی
فرش پر لڑکتی ہوئی دور چلی آئی۔ اس کا اندازہ درست
تھا۔ گولیاں سبکی کی سمت گئی تھیں۔ وہ اندھیرے میں اچھل
کر ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ گولیاں سے بچ گیا لیکن سخت
چوٹیں آئیں۔ ہڈیاں دکھنے لگیں۔ وہ چاروں ہاتھوں پاؤں
سے چلتا ہوا مندر کے اندرونی کمروں اور راہداریوں کی
طرف چلا آیا۔ تاریکی میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں
سے کہاں آگیا ہے۔ وہ دونوں کے اہالے میں وہاں کی بھول
بھلیوں کو دیکھ چکا تھا۔ منسل نے سمجھا کیا کہ اندھیرے میں
اندھروں کی طرح آگے جانے کا تو راہداریوں کے جال سے
کل نہیں پائے گا۔

وہ ایک طرف گھوم کر جانے لگا۔ یہ اندازہ تھا کہ
وہاں آ رہا ہے لیکن وہ ایک راہداری سے ٹکرا کر دوسری
راہداری میں چلا گیا تھا۔ جب تک تاریخ روشن نہ
کرنا گمراہی کا علم نہ ہوتا اور وہ تاریخ روشن کر کے موت کو
بلانا نہیں چاہتا تھا۔

وہاں سب مجبور تھے۔ کوئی اپنی تاریخ روشن نہیں کر سکتا

تھا۔ مرینہ فرش پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی انتظار کر رہی تھی کہ
سبکی کی طرف سے کوئی آہٹ ملے گی اور یہ خیال پریشان کر
رہا تھا کہ چوڑے کے پاس مورٹی کے پیچھے کون تھا؟ کون سی
چلائے والے سب ہی مورٹی کے آگے تھے۔ پیچھے بہت کم
جگہ تھی۔ وہاں ضرور کوئی پہلے سے چھپا ہوا تھا۔

پھر اس نے سوچا کوئی بھی چھپا ہوا سب نے وہ
گولیاں چلائی تھیں۔ اب وہ وہاں رہنے کی جرأت نہیں
کرے گا۔ وہاں سے بھاگ گیا ہوگا۔

اس نے حوصلے سے سوچا۔ مجھے ہر حال میں وہ
مائیکرو فلم وہاں سے اٹھانی ہے پھر اس چوڑے کی طرف جانا
ہی ہوگا۔

وہ سر اٹھا کر تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے
لگی۔ ابھی بڑی دور تک فرش پر رہتی اور لڑکتی آئی تھی۔

اب اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ چوڑے کو دھڑکے؟ کسی سمت تو
جانا ہی تھا۔ تاریکی میں بھٹکتے رہنے کے بعد ہی چوڑے سے ایک
پتلی سکتی تھی۔ وہ اندازے کے مطابق ایک سمت آہستہ
آہستہ ٹھہر ٹھہر کر نکلتی گئی۔

مراد بھی بھٹک گیا تھا۔ مائیکرو فلم تو حاصل ہوئی تھی
لیکن وہ کہہ دے کہ بریف کیس حاصل کرنے سے پہلے مرینہ نے
گولی چلائی تھی۔ اسے فرش پر گر کر وہاں سے رہتے ہوئے
دور جانا پڑا تھا۔ اب وہ ایک جگہ رک کر سوچ رہا تھا کہ کہاں
پہنچا ہوا ہے؟

کہیں سے گولی چلے؟ کسی کی آہٹ ہو تو معلوم ہو کہ
کون کہاں ہے؟ سب ہی کے لیے وہ چوڑے کا اہم تھا۔ سب
ہی وہاں جانا چاہتے تھے لیکن کوئی ادھر نہیں پہنچ رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور دور تک ایسی خاموشی تھی جیسے
وہاں سے سب جا چکے ہوں لیکن ان میں سے کوئی خود کو وہاں
تجما سمجھ کر دھوکا کھانے والا نہیں تھا۔ اس لیے سب ہی موت
کی طرح خاموش تھے لیکن آہستہ آہستہ حرکت

تھے۔ مراد بھی اندازے سے ایک سمت بڑھتا جا رہا
تھا۔ فرش پر چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر گھوڑے کی طرح
رک رک کر کسی کی آہٹ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے ہی

وقت بالکل قریب ہی سانسوں کا پھپکا سا آیا تو وہ ٹھیک
گیا۔ کوئی اتنا تک ہی بالکل قریب آگیا تھا۔

وہ بھی گھوڑی بن کر چلی آ رہی تھی۔ اسی کی سانسوں کا
پھپکا اس کے منہ پر لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا رخ الٹ
استعمال کرتی مراد نے اسے دیوچ لیا۔ وہ چاروں شانے

چت ہوئی تھی۔ چند ساتوں کے لیے لوکھا لٹی تھی کیونکہ

اس پر ایک پھاڑا آن پڑا تھا۔

وہ ایسا ہی بھاری بھر کم تھا۔ پتا نہیں کون تھا؟

ان لمحات میں اسے مراد یاد آیا۔ وہ سمندر یاد کر
محسوس کر رہی تھی لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مراد کو اس
نکلے معاملے کی خبر ہوگی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس مندر
میں آ سکتا ہے۔

ابھی تو وہ اس حاوی ہونے والے سے نجات پانا
چاہتی تھی۔ وہ ایسے سوار ہو گیا تھا جیسے باپ کا مال ہو۔ ایک
ذرا ہٹانے نہیں بہت رہا تھا۔ اتنی پریشانی میں بھی اسے کچھ
ہونے لگا تھا۔

مراد کا ایک ہاتھ اس کی ٹھوڈی کے نیچے معلق پر
تھا۔ سانس لینا وہ بھربھو گیا تھا۔ اسے یوں کمزور بنا کر اس
نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ریو لوور جھین لیا۔

ایسا پھینچنا جھنجھٹ کے دوران آدھریں ابھر رہی تھیں۔ وہ
باپ رہی تھی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے کرا رہی
تھی۔ اس طرح یہ بات سمجھ میں آئی کہ سبکی آس پاس نہیں
ہے۔ اگر ہوتا تو کوئی ضرور پتلی۔ شاید فرار ہو گیا ہے۔

مرینہ نے سوچا۔ کیا وہ مائیکرو فلم لے گیا ہے؟
وہ آزادی کے لیے ترقی ہوئی یولی۔ "کون ہو
تم؟ مجھے جانے دو۔ سبکی وہ ہم لے جائے گا۔"

کچ تو یہ ہے کہ اسے بھی کچھ ہو رہا تھا۔ وہ اسے پتھلوں
کے بغیر دیکھ چکا تھا۔ ان پتھلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ وہ
دھنکی کے وجود تار کی مٹی میں اچھی لگ رہی تھی۔ جو کچھ روشنی
میں دیکھ چکا تھا وہ تاریکی میں روشن ہو رہا تھا اور اسے ہکا
رہا تھا۔

وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے رہائی کی کوشش ترک کر
دی۔ شکست خوردہ سی ہو کر ہانپتا جا پھینچا ہوئی یولی۔ "یہ یہ تم
ہو۔۔۔ مراد۔۔۔ اتم ہو۔۔۔؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ جذبات اسے بھی جھنجھوڑ
رہے تھے۔ وہ چپکے سے پہلے پھیل گیا۔ اسے چھوڑ کر
چاروں ہاتھوں پاؤں سے ریٹھا ہوا دور جانے لگا۔ مرینہ
نے اپنی ایک جگہ کے ساتھ ایک پتھول باندھ رکھا تھا۔ اس
نے ریو لوور سے محروم ہونے کے بعد پتھول نکال لیا۔

اس نے فائزنگ کرنے کی کٹھنی نہیں کی۔ اتنی مٹی تھی
کہ وہ ٹکرانے والا ابھی اس کے ریو لوور سے آبی پر گولیاں
چلائے گا۔

وہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت تاریکی میں کہاں
ہے؟ وہ چوڑے کی طرف پھر اندازے سے سرگردش لگتی

ہوئی بڑھنے لگی۔ ایسے وقت وہ ایک دیوار سے ٹکرائی پھر
وہاں سے بہت کر دائیں طرف چند قدم چل کر آئی تو دوسری
دیوار سے ٹکرائی۔ جب پتا چلا کہ وہ ایک راہداری میں آگئی
ہے۔ اسے وہاں جانا چاہیے۔

وہ وہاں بھی نہ جا سکی مراد نے کہیں سے چھپ کر وہ
فائزنگ کی تو وہ دیوار کے سارے نیوی سے آگے بڑھتی ہوئی
دوسری راہداری میں پہنچ گئی۔ اب اسے آگے بھٹکتے ہی رہنا
تھا۔ شاید صبح تک بھٹکتے رہنے کے بعد وہ کسی دوسرے
تیسرے دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔

مراد وہاں آدھے کھٹے تک ایک ستون کے ساتھ لگا
کھڑا رہا۔ پھر اس نے تاریخ روشن کی تو پتا چلا کہ وہ ایک
راہداری کے قریب کھڑا ہے۔ اگر آگے بڑھتا جاتا تو سبکی

اور مرینہ کی طرح راہداریوں کے جال میں پھنس کر رہ جاتا۔
اس کی کچھ باتیں ابھی بات آئی کہ مرینہ اور سبکی اس جال
میں پھنس گئے ہیں۔ وہ نہ تو تاریخ روشن کر سکیں گے اور نہ ہی

قون پر کسی کو دھڑکے کے لیے کال کر سکیں گے۔ یہی دھوکا ہے کہ
کہ ان کی آواز پر کہیں سے کوئی گولی آ جائے گی۔

مراد نے اور چندہ منٹ تک انتظار کیا۔ پھر تاریخ کی
روشنی میں چوڑے کے پاس آیا۔ وہاں بریف کیس رکھا ہوا
تھا اور قریب ہی واسو دیو کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

لاش کی جیب سے موہاں ٹون بھاگ کر رہا تھا۔ اس
نے ٹون کو وہاں سے نکالا۔ اسے یاد آیا کہ واسو دیو نے مندر
میں آکر سبکی الیٹ کو کال کی تھی۔

اس نے وہ نمبر دیکھ کر پتا نہیں بچ گیا۔ ٹھوڑی دیر بعد
سبکی کی دھنکی سی آواز سنائی دی۔ "میں ٹون پر بات نہیں کر
سکوں گا۔"

مراد نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں مرینہ اتنی جلدی تمہاری
راہداری تک نہیں پہنچتی۔"

اس نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"
"میں وہی مراد ہوں جسے تم کرائے کے سلسلے میں تم
نے مراد رہے ہو۔ اب میں تمہاری موت بن گیا ہوں۔ ذرا

اس مندر سے باہر آ کر تو دھوکا موت کیسے آتی ہے؟"
اس نے ٹون کو بند کر کے اسے ایک طرف پھینک دیا
پھر اپنے فون پر بھنڈاری سے کہا۔ "یہاں ابھی کوئی خطرہ نہیں
ہے۔ اپنے دونوں شوٹرز کو بلی پھوڑ کر میری کار لے آؤ۔"

وہ دس منٹ میں مندر کے سامنے آ گیا۔ مراد نے کار
میں بیٹھے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم مندر کے پیچھے رہیں
گے۔ میرے دو فٹکار بھول بھلیوں میں ہیں۔ وہ کسی وقت بھی

تقدیر

اوسمسی

جب کوئی مرنے والا ہوتا ہے تو اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے کچھ بھی سوچنے سے پہلے تقدیر نے بھی بہت کچھ سوچ لیا ہے... یہ خبری کے اسی عالم میں زندگی کے کسی بھی مقام پر جب انسان اور تقدیر کے منصوبوں کا ٹکرائو ہوتا ہے تو احساس ہوتا ہے انسان کا سوچا کتنا ناپائیدار ہے... اسے بھی ان آخری لمحوں میں اس بات کا ادراک ہوا مگر بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

بلند پایک دعوے کرنے والوں کے لیے تاریک کنوں کا فلسفہ



ارنٹ جیٹلے دس سال سے ایک بینک میں ملازم تھا اور وہاں کے ملازمین کے لیے ایک مثال تھا۔ وہ اپنے قلمی کے لوگوں کے گھر گھر جا کر بینک سے لیے ہوئے قرضوں کی قسط وادار دینے والوں کے شام کو بینک میں جمع کروا دیا کرتا تھا۔ اس کام پر اسے تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی ملتا تھا جس سے اس کا گزارہ ابھی طرح ہو جاتا تھا تاہم یہ سب اتنا زیادہ نہ

کسی دروازے سے باہر آ سکتے ہیں۔ انہیں ہلاک نہیں کرنا ہے صرف اپنے سامنے انہیں بے بس کرنا ہے۔ اس کے بعد میں ان سے ٹھٹھک لوں گا۔ وہ مندر کے پیچھے آگئے۔ مراد نے مرید کے نمبر بیچ کے۔ رابطہ ہونے پر اس کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ "مراد! یہ تم ہو؟"

"ہاں یوکرادہاریاں کسی لگ رہی ہیں؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "اوگا... اتم کیسے جانتے ہو کہ میں کسی راہداری میں ہوں؟"

"میں نے ہی نہیں سمجھنے کے لیے راہداری میں پہنچایا ہے۔ تمہارا یوکرادہاریاں سے پاس ہے۔"

"مائی گاڈ! تو وہ تم تھے؟"

"تم نے بہت بڑی فطرت کی ہے۔ مجھے ہندوستان میں لا کر اپنی موت کو ساتھ لے آئی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ میں نہیں ہلاک نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں مزاحمت دے کر چھوڑ رہا ہوں۔"

"اس بار یہ سزا ہے کہ جو مانگیر و لقمہ حاصل کرنا چاہتی تھیں، اسے میں لے جا رہا ہوں۔ تمہارے لیے یہ خوش خبری ہے کہ ابھی تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ ایسی ہی دہائی اور جسمانی آجیٹیشن پہنچا کر زندہ چھوڑ دیا کروں گا۔ ابھی دیکھو یہاں آجیٹ انکف لگائے کر رہی ہو۔"

وہ دانت چیں کر بولی۔ "مجھے بازار میں سے لباس چھوڑ کر گئے۔ بڑول کہنے... میں قسم کھا چکی ہوں کہ تمہیں دیکھنے کی گولی ماروں گی۔ تمہیں تو اچانک سامنا ہوگا۔"

"ابھی توڑی دیر پہلے ہوا تھا۔ تم نے کیا کر لیا؟"

"تم تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کم ہو گئے۔ ورنہ میرے پاس وہی ایک ریو اور نہیں تھا۔ ابھی سامنے آؤ تو میرے ہاتھ میں تمہیں اپنی موت نظر آئے گی۔"

"تمہیں زندہ رکھنے کے لیے کہتا ہوں مندر کے جس دروازے سے باہر لگو تو دونوں ہاتھ اٹھا کر لٹکنا اور میرے شوٹر کو پانا تھپا کر دھکا کر پھینک دینا۔ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ واسو ویک اور سکی البرٹ کی گاڑیاں وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بھنڈاری کے دو شوٹر انہیں دھکا لگا کر مندر کے دائیں بائیں والے دروازے کی طرف لے آئے۔ پچھلے دروازے کے سامنے مراکی کار کھڑی ہوئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد سکی ایک دروازے سے باہر آیا تو گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہو گئیں۔ وہ روشنی میں نہا گیا۔ ایک دم

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز کرداریں ابھام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے باب ملاحظہ فرمائیں

حساب کتاب کے اندراجات میں نقص نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے بنائے ہوئے کھاتوں کو کئی مرتبہ چیک کرنے کے بعد اعلیٰ افسران کے حوالے کرتا تھا۔

حق و محبت اور شراب خانوں کے چکروں سے دور وہ تنہا اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا فلسفہ خاصا عجیب تھا۔ وہ عورت ذات سے خاصا بدچلن تھا کیونکہ بچپن ہی میں اس کی ماں اسے باپ کے پاس چھوڑ کر چلی گئی تھی، پھر باپ کے مرنے کے بعد وہ یتیم خانوں کی آیاؤں کے ہاتھوں میں پلا جنہیں بچے سنبھالتے سے زیادہ خواہ پائے کا لالچ وہاں لے آیا تھا۔ جس علاقے میں وہ رہتا تھا، وہاں کے لوگ اسے ایک بے مروت اور اپنی دنیا میں مکن نقص کے طور پر جانتے تھے، خود اس نے بھی کسی بھی شخص کے سامنے بہت اچھا بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اکثر لوگ اس سے پوچھتے کہ حساب کتاب کرنا تو جیتنا تمہارے لیے اعصاب شکن ہوتا ہوگا اور بڑے نوٹ دیکھ کر تمہاری طبیعت بھی لپٹائی ہوگی تو وہ سختی سے جواب دیتا۔

”رقم کے نوٹ جو میرے نہیں ہیں، میں انہیں کاغذ کے ٹکڑے خیال کرتا ہوں۔“

اس کی روزانہ کی روٹین بہت تھکا دینے والی تھی۔ درحقیقت اسے یہ کام پسند ہی نہ تھا، تاہم وہ اس بات کا حائل تھا کہ ملازمت میں اپنی پسند ناپسند کو پس پشت ڈال کر ہی اگر کوئی کام کیا جائے تو وہ کام انتہائی احسن طریقے سے ہو جاتا ہے۔ وہ ایک جگہ چلے کر کرنے والے کام کو پسند کرتا تھا مگر اس کی تعلیم اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ بہت کم پڑھا لکھا تھا۔

اس کا بہت ہی چاہتا تھا کہ اس کے پاس اپنی رقم جمع ہو جائے کہ وہ کوئی اسٹور یا دکان خرید لے اور حے سے اپنی باقی زندگی ایک جگہ چلے کر گزارے۔ مگر اس کی محدود آمدنی اور ضرورت کی اشیاء بھی ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ صبح سات بجے اٹھتا، ناشتے کے بعد کپڑے تبدیل کرتا اور چٹک جاکر اپنی حاضری لگاتا، پھر اپنا شیڈول دیکھ کر اپنا راستہ طے کرتے ہوئے پہلے مقرض کے پاس چلا جاتا، رقم کی وصولی کے بعد دوسرے اور تیسرے مقرض کے گھر کا چیک لگاتا۔ یوں سارا دن محوم پھر کر شام کو کوئی چار بجے کے قریب وہ گھر چلا جاتا۔ وہاں تازہ دم ہونے کے بعد دن بھر کی رقم کی وصولی کا کھانا بناتا، پھر پیسے گن کر چیک چلا جاتا۔ پہلے پیل وہ رقم وصول کر کے سیدھا بینک جاتا تھا مگر اب جگہ کی

اور اس کی دیانت داری کی بدولت اسے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ گھر جاکر حساب کتاب کی تفصیل تیار کر لے۔ ایک تھکا دینے والے دن کی شام کو وہ جب رقم لے کر آ رہا تھا تو دل ہی دل میں اپنے مستقبل کے منصوبے بن رہا تھا۔ اس بات کا ادراک ہونے کے بعد کہ وہ نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہو جائے گا اور مطلوبہ رقم جمع نہ کر سکے گا، اس کی سوچ ہی بدل گئی۔ بددیانتی کا خیال نہ پہلے ہی اسے آیا تھا اور نہ ہی کسی کو اس سے ایسی بات کی توقع تھی۔ آج سیرے کی پہلی تاریخ تھی۔ اس لیے آج اس کے پاس معمول سے خاصی بڑی رقم تھی۔ اس کے پاس کوئی دو لاکھ ڈالر زرخے اور اس رقم سے ابھی زندگی گزارنے کا خیال آچکا تھا ہی اس کے دل میں وہ آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ غفلت۔ اسے اپنے خیال پر خاصی حیرت بھی ہوئی کیونکہ اپنی دس سالہ پیشہ وارانہ زندگی میں بڑی بڑی رقمیں کتنے ہوئے اس کے دل میں ایسا کوئی خیال نہ آیا تھا مگر جب اسے دو لاکھ ڈالر زرخے ملنے والے ثمرات کا اندازہ ہوا تو اس نے سوچا۔

”خیال تو زبردست ہے۔ میں دس سال سے اربڑیاں ٹھس ٹھس کر ٹھک گیا ہوں لیکن میری تنخواہ اور کمیشن اتنا کم اتنا ہی ہے۔ یقیناً رقم میری آئندہ کی خوش حال زندگی کی ضمانت ہوگی۔“

آج وہ معمول سے جلدی فارغ ہو گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے جو قدم مگر کی جانب حساب کتاب کرنے کے لیے اٹھ رہے تھے ان کا رخ تبدیل ہو کر مخالف سمت ہو گیا۔ وہ ایک ویران جگہ پہنچا اور اپنا حلیہ بدلنے کی غرض سے اس نے اپنے حلیے سے دھوپ کا چشمہ نکال کر لگایا، پھر جینٹ اتار کر اندر رہی۔ پھر حلیے میں سے ایک ہیٹ نکالا جو کوئی چار سال سے اس کے حلیے میں اس کے ساتھ تھا مگر کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔ ہیٹ مین کر ایک کالا مارکر جب سے نکال کر اس نے مل بنایا۔ یہ مارکر حساب کتاب نوٹ کرنے کے کام آتا تھا۔ اب اس کا حلیہ خاصا تھمیل ہو چکا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی، سات بجتے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، وہ سات بجے بینک رقم جمع کرانے جایا کرتا تھا۔ اب اس کے قدم ایک ہون کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک قریبی جگہ سے تھا جہاں ایک آدمی رہا کرتا تھا جسے ادا گلی کر بھی۔

ہوئی میں وہ ایک بے فکر آدمی کے روپ میں داخل

ہوا۔ آج اس کے چہرے سے تنہید کی گہرے مٹی جیسی اور وہ سبکی بچاتے ہوئے ایک کونے کی میز پر جا بیٹھا۔ اس کا رخ دواور کی جانب تھا۔ ایک ویٹر اسے دیکھتے ہی آگے بڑھا اور اس کے قریب آکر سینو کا روٹا اسے دے دیا۔ ارٹسٹ نے بھوسہ سینو کا روٹا کھڑا، کچھ دیر اس پر نظر ڈالا مگر کچھ سوچ کر سینو دواور کا کافی کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر نے مطلوبہ چیزیں اس کے سامنے لا کر رکھ دیں۔ ارٹسٹ نے سوچا شروع کر دیا کہ آئندہ کے لیے کیا حکمت عملی طے کرے۔ بہت دیر وصال لڑا کہ ایک ترکیب آچکا تھا اس کے ذہن سے نکلائی، اس ترکیب میں کچھ مشقت ضرور تھی مگر اس کی بے گناہی کی سو فیصد یقین دہانی بھی تھی۔

ہوئی سے نکل کر اس نے بازار کا رخ کیا اور کچھ ضروری چیزیں خریدیں۔ پھر گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ اب اس کی گھڑی سات بج رہی تھی مٹی اپنی اسے جو کچھ کرنا تھا فوراً کرنا تھا۔ اس نے رقم کو ایک حلیے میں ڈالا۔ پھر اسے ابھی طرح سی لیا۔ اس کے بعد اس نے اس حلیے کو مختلف کاغذوں میں لپیٹا پھر ایک لوسے کے مضبوط ڈبے میں بند کر دیا۔ یہ اچھا خاصا بھاری ڈبا تھا جو وہ بازار سے خرید کر لایا تھا۔ چاہا یا سنبھالنے کی کوفت سے بچنے کے لیے اس نے ڈبے کو ٹائٹن لگایا۔ اب وہ رابرٹ کے دفتر کی جانب جا رہا تھا جو ایک دیانت دار وکیل کے طور پر مشہور تھا۔ ارٹسٹ نے اپنا حلیہ خاصا تھمیل کر لیا تھا۔ رابرٹ کیسوں کی بیرونی کے علاوہ لوگوں کی ضروری اور اہم اشیاء الامانت کے طور پر بھی سنبھالتا تھا۔ چنانچہ ارٹسٹ اس کے دفتر میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

”محترم میں چندہ سال سے مسلسل کمار رہا ہوں اور اب تک خاصی بڑی رقم جمع کر چکا ہوں۔ اب میں دنیا کی سیاحت پر جانا چاہتا ہوں لیکن میرے پیچھے کوئی وارث نہیں ہے۔ اس لیے اپنے اہم کاغذات آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اگر زندگی رہی تو لے جاؤں گا۔ میں نے آپ کی ایمان داری کی خاصی شرت سنی ہے اور آپ کا بھیا وصف مجھے شہر سے اس قصبے میں لے آیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں ایک رسید بنا دیتا ہوں، آپ اسے دکھا کر جب چاہیں مجھ سے اپنے کاغذات لے کر جاسکتے ہیں۔“ وکیل نے تنہید سے کہا۔ ارٹسٹ نے اپنے دل میں سوچا۔ ”رسید اارے نہیں ہیں۔ ایسے تو میں بکڑا جاؤں گا۔“

اس کے منصوبے میں رقم لے کر بھاگنا نہیں تھا بلکہ اس نے پولیس کو سنانے کے لیے ایک من گھڑت کہانی سوچ رکھی

صال

ابا مجھے مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ امی بنا کر کریں تو ابا کیا کریں گے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے میں نے امی کا کھانا مانا۔ انہوں نے کہا کہ بازار سے دواور لادو۔ میں نے لایا انہوں نے سائلن کم دیا میں نے زیادہ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا بچہ می کے اوپر چند کروٹی کھاؤ میں نے زمین پر دردی بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ کپڑے میلے کر لیے۔ میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا، مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر انہوں نے یہ کیا۔۔۔ کہ مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ ”کیوں دواور پتر میں صدمہ بنا رہا تو نہیں ہے تو۔۔۔؟“ اس وقت میرے آنسو تھے کہہ رہے تھے۔

مرزا اوپ کی کتاب ”مٹی کا دیا“ سے اقتباس
مرسلہ۔ تفسیر عباس پیر، ادکار ۷

مٹی اور یہ رسید اس کی کہانی میں رخنہ ڈال سکتی تھی، وہ جانتا تھا کہ پولیس اس کے گھر کا کوئی نہ کوئی جھان مارے گی اسے میں وہاں رسید کا چھاپا داخل سنانا نہ فیصلہ نہ ہوگا۔ اس کی زیادہ لوگوں سے بے تکلفی بھی تھی اور جن سے مٹی ان پر اسے اعتماد نہ تھا۔

اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر رابرٹ نے پوچھا۔ ”آپ کہاں کھو گئے ہیں؟ رسید بناؤں؟“

”ارے نہیں، آپ رہنے دیجئے رسید کے منجبت کو۔ مجھ سے تم ہو جائے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ رسید نہ دیں۔ ویسے بھی یہ زیادہ اہم کاغذات نہیں ہیں۔ اگر تم بھی ہو گئے تو میرا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ اپنا نام تو بتاتے جائیں۔“ رابرٹ نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں۔ مجھے یاد ہی نہ رہا۔ میرا نام مارکس قلم ہے۔“ یہ نام اس نے خاصی دیر لگا کر سوچا تھا۔

جب وہ وکیل کے دفتر سے نکلا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ اس کے منصوبے کا پہلا حصہ کامیابی سے مکمل ہو چکا تھا۔

اب اس نے اپنا حلیہ درست کیا اور پہلے والا ارٹسٹ بن کر گھر چلا گیا۔ ایک نام جو وہ بار بار دہرا رہا تھا، وہ تھا۔

"ہاں! ایک خیالی آدمی — مارکس قلم۔" اس نے قہقہہ لگا کر سوجھا اور آگے بڑھ گیا۔

اسی رات دو دشمنی حالت میں پولیس کو اپنے ہی گھر میں ہاتھ بٹے ہوئے ملا۔ اس کے سر پر پٹی بندی ہوئی تھی جس میں خون جذب ہو کر اُتر رہا تھا۔ اس نے خود کی کانٹیکشن لگایا ہوا تھا تاکہ پولیس کو اس کی حالت کا جلدی رحم معلوم ہو، اس کا چنگ ٹیچر پہلے تو اس کا انتظار کرتا رہا مگر کافی دیر بعد اس نے پولیس میں رپورٹ درج کروادی۔ پولیس کو بتاتے ہوئے اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ اسے ارست پر بالکل بھی شک نہیں ہے۔ یقیناً اسے کسی نے لوٹ کر مار دیا ہوگا یا زخمی کر دیا ہوگا مگر قہقہے کا پولیس انسپکٹر جانسن خاصا کایاں اور ہٹ جرم قصص تھا اور ٹیچر کے مصافی قہقہے کرنے کے باوجود وہ بے چارے ارست کو خود کی حالت ہی میں پولیس اسٹیشن اٹھالایا۔

اس کی صحت یابی کے بعد انسپکٹر جانسن نے اس سے مختلف زاویوں سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اس کے پوچھنے پر ارست نے اپنی گفتگو کر دہ کہانی سنا دی کہ جب وہ رٹم کے چنگ کی جانب جا رہا تھا تو دو آدمیان آدھیوں نے ایک سٹیشن جگہ پر اسے گھیر لیا اور گن پر اسٹیک پر ساری رٹم تھپتھپائی۔ پھر اس کے سر پر پستول کا آئی ڈیوسٹ مارا اور فرار ہو گئے۔ "تمہیں کسی پر شک ہے؟" انسپکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جناب! لیکن میرا خیال ہے کہ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے ہوں گے جن سے میں قتلہ دار ادا ملکی وصول کرتا ہوں۔" اس نے رمانیت سے کہا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" انسپکٹر نے ٹھوڑے ہوئے اگھا سوال دیا۔

"جناب! ان کے علاوہ اور کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں اپنے بدلہ خلیے میں رٹم لے کر جاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"بہر حال! اگر تم چھ جیت ہو گئے تو عدالت کہیں کڑی سے کڑی سزا دے گی۔"

"مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ میرا دل صاف ہے۔" اس نے یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

پولیس کی خاموشی دوڑ دھوپ کے باوجود ارست کے بتائے ہوئے صلیے کے لوگ نڈل سکے اور وہاں میں یہ کیس سرد خانے میں چلا گیا تاکہ مگر لوگوں کی عدم دستیابی کی بدولت رٹم

کا ذمے دار ارست کو توڑ ٹھہرا دیا گیا مگر انسپکٹر جانسن کے تڑپ جراثیم کی وجہ سے ارست کو غفلت برتتے پر چھ ماہ کی قید ہوئی۔ وہ اس کے لیے بلکہ اس سے بھی بڑی قید کے لیے تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس جسمانی مشقت کے بعد وہ لوگوں کے سامنے بے گناہ ثابت ہو جائے گا۔

جنیل میں سزا کے دوران میں ایک نئے سب سے اپنے تعلقات رکھے۔ جیل کو اپنا گرویدہ بنایا، اپنی صحت کا خاصا خیال رکھا اور بہت سے دوسرے قیدیوں کو اچھا لگا کر دوس دیا۔ سب ہی اس سے بہت متاثر تھے اور انہیں کرتے تھے کہ وہ بے گناہ قید میں کیوں گیا ہے۔ ٹھیک چھ ماہ بعد اسے دو ہائی ٹی ٹی۔ جنیل ہی میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا پرانہ ٹیچر وہاں سے چلا گیا ہے اور اس کی جگہ نیا آ گیا ہے۔ نئے ٹیچر کے دل میں ارست کے لیے کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔ ارست کو یہ بات معلوم بھی لیکن وہ دل برداشتہ نہ تھا۔ ٹھیک چھ ماہ کی تکلیف کے بعد وہ اپنے حساب سے ایک بڑی رٹم کا مالک بن چکا تھا۔ اس نے جنیل سے نکلے ہوئے اپنے منصوبے کے اگلے مرحلے کے بارے میں سوچا تھا کہ وہ ہر مٹنے والے سے اپنی باتیں کرے گا جس سے انہیں معلوم ہو کہ وہ اس قہقہے سے دل برداشتہ ہو گیا ہے اور اسے چھوڑ کر کہیں اور جانا چاہتا ہے، ایک اور اہم بات جو اس کے منصوبے کا حصہ تھی، وہ یہ تھی کہ وہ نئے ٹیچر سے ایک بار ضرور مل کر اپنی ملازمت کے بارے میں دریافت کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے ملازمت سے فارغ کر چکا ہوگا اور یہ بھی کہ ایک سزا یافتہ کے لیے کوئی نوکری ملنا خاصا مشکل ہے مگر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا یہ انداز بھی خاصا اہم تھا تاکہ کسی کو ہینک بھی نہ پڑے کہ وہ کوئی ہوئی رٹم کے مل پر آئندہ زندگی گزارے گا۔

اس نے جنیل ہی میں منصوبہ بندی کر لی تھی کہ وہ رٹم لے کر کہاں جائے گا۔ اگھیلے؟ نہیں۔ وہاں کا موسم اسے راس نہیں آئے گا۔ اسی طرح اس نے کچھ اور ممالک کے بارے میں بھی سوچا تھا مگر پھر خود کی کوئی وجہ بنا کر مسترد کر دیتا۔ فرانس کا خیال آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہاں، وہ فرانس جانا چاہتا تھا۔

لہذا اس سلسلے میں ملنے ملانے والوں سے ملنے لگوے کر کے اور قہقہے کی پولیس کی بے مروتی کا رونا روتے ہوئے اس نے اس بات کا بڑا اظہار کرنا شروع کر دیا کہ وہ بہت جلد یہ قہقہہ چھوڑ جائے گا۔ کچھ لوگوں کو اس کے جانے کے خیال سے افسوس ہوا، کچھ حامدوں کو خوشی بھی ہوئی۔ چنگ کے ٹیچر نے اسے نوکری دینے سے انکار کر دیا۔ ملے میں اس کے

گرویدہ لوگوں نے خاصا شور مچایا مگر حکم حاکم مرگ مناجات کے مصداق وہ زیادہ سرتا اٹھا سکے اور یہ معاملہ جیل دب گیا۔ اس ذرا عرصے میں ہوا اور ارست کے قدم رابرٹ کے پاس چل پڑے جہاں دو لاکھ ڈالر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ وکیل کے دفتر میں داخل ہوا اور دعا بیان کیا۔ رابرٹ نے کہا: "رید کہاں ہے؟"

اس پر وہ غور فرمایا۔ "جناب! امہ نے کوئی رسید نہیں بنائی تھی۔ آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ میں صرف نام بتا کر وہ ڈبا لینے کا چاہتا تھا۔"

"ہاں ہاں یاد آیا۔ آپ کا نام کیا تھا؟ میرے ذہن میں ہے لیکن میں اسے بے چارہ ہوں کہ میں کوئی اور شخص تو نہیں جو یہ امانت لے کر جا رہا ہو۔" یوڈے وکیل نے رمانیت سے کہا۔

ارست سوچنے لگا۔ "نام؟ ہاں ایک فرضی نام تو بتا دیتا تھا میں نے مگر۔" اچانک ارست کو محسوس ہوا کہ وہ نام تو وہ بھول چکا ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کسی عجیب بات ہے کہ میں وہ نام بھول رہا ہوں ابتداء میں جس کا وہ میں روزانہ کرتا تھا۔ کیا نام تھا وہ؟" اس نے سوچا۔ اس نے اپنا نام غلطاً گھڑا اسے غلطی پایا۔ وہ پھر کرسی پر بٹھ گیا اور خود کائی کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔ ارست یاد کرو وہ کیا نام تھا۔" وہ سوچتا رہا۔ دوسری طرف وکیل اس کی کیفیت دیکھ کر کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے ارست کی پریشانی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ کوئی الحال اسے کاغذات کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، وہ پھر آ کر لے لے گا۔

وکیل نے اسے تعجب سے دیکھا لیکن وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اور ایک پارک میں جا بیٹھا۔ وہ جانے کتنے گھنٹے اپنے گرویدہ قہقہے سے بے نیاز اپنے دماغ پر زور دے رہا تھا کہ شاید کوئی سرائل جائے، وہ حرف ہی یاد آجائے جس سے وہ نام شروع ہوتا تھا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ نام اس کے سامنے اسے نہ آتا ہوا محسوس ہوا، یوں لگتا تھا کہ وہ الفاظ اس کے گرد گھوم رہے ہوں مگر ارست کی کچھ میں کچھ نہ آیا۔ یہی ایسا بھی ہوتا کہ اسے کچھ کوئی نام اس کے ذہن سے نکلتا، وہ اچھل کر کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اسے اونچی آواز میں دہراتا تو سب کچھ اٹھ لگتا۔ پہلے تو صرف اس کا دماغ چکراتا رہا مگر اب اسے اپنا جھمکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب و غریب سوچوں کی کڑی لہر اس کے دماغ سے گزرتی رہتی۔

اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بے بسی پر روئے یا

لمحہ فکریہ

ایک شخص شادی کے متعلق مشورہ دینے کے دفتر میں گیا۔ دفتر بند تھا، باہر یہ ٹوٹس آؤ رہے ان تھا۔ "دفتر ایک بیچے سے تین بجے تک بند رہتا ہے۔ آپ پھر سوچ لیں۔"

بے خیالی

بیچہ مڑم سے۔ "تم نے ٹھیک پولیس کے ایک ذمے دار افسر سے ملنے کے لیے کچھ میں گفتگو کیوں کی؟" مڑم۔ "مگر نہیں جناب عالی، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ وراسل یہ مجھے اس طرح ہدایات دے رہے تھے جیسے میری بیوی دیتی ہے۔ حسب عادت بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔" ٹھیک ہے۔

مادری زبان

استاد، شاگرد سے۔ "بتاؤ ہم اردو کو اپنی مادری زبان کیوں کہتے ہیں؟" شاگرد جس کے گھر میں اردو بولی جاتی تھی اس نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ جب ابی بولتی ہیں تو کوئی بھی نہیں بول سکتا۔"

سیاسی محاورے

دکھتی رگ چھیننا۔ کسی وزیر کی گرہن کے متعلق بات کرنا۔ ری دراز کرنا۔ ملازمت میں توسیع دینا۔ منہ ٹھکرے بھرونا۔ شوگر مل کی بجلی فری کرنا۔

لائگ مارچ کرنا، چنگ پارٹی پر اسلام آباد آنا۔

نہلے پردھلا

☆ محبت کی جنگ کیسے جیتی جاسکتی ہے؟ رقیب کو رشوت دے کر۔

☆ شاہنشاہ کیسے کیوں ایجاد ہوئے؟ کچھ انہماک ہونے کی وجہ سے۔

☆ رانی کا بھانجک بٹا ہے؟ بیوی کے سامنے کسی اور عورت کی تعریف کرنے سے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

دیدہ تر

امبدوس

یہ دنیا جب سے وجود میں آئی ہے تب سے قتل و غارت گری کے میدان میں کیا کچھ رونما نہیں ہو چکا لیکن... یادداشت کا خنڈام انسان کے پاس زندہ رہنے کا بہت بڑا سہارا ہے، جس میں یادوں کی مخصوص گنجائش بہت سی غیر اہم باتوں کو مٹا دینے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر یہ خونی یادیں ذہن میں محفوظ رہ جائیں تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ان خونی لمحات کو بھلا دینا چاہتا تھا۔

آئسروں کی لہروں میں ڈوبنے والے مہرے والے دلوں کا عبرت اثر مضر

لڑائی عروج پر تھی۔ شدید اور متواتر۔ مارو یا مرجائو۔ فضا کی آلودگی اور ذراتِ ریش اہل کا گواہ تھا۔ ماحول بہ زبان خاموشی صورتِ حال کی عکاسی کر رہا تھا۔ انسان یہ مقابلہ انسان سے خونریز لڑائی ازل سے جاری تھی۔



جیسے مگر ہرگز رستے لمبے کے ساتھ اس کا دماغ خاصا کام کر رہا تھا۔ وہ بار بار ان لمحات کو یاد کر رہا تھا جب وہ وکیل کے سامنے بیٹھا تھا اور پھر وہ اسے فرضی نام بتا رہا تھا مگر کوئی بھی سوچنے سے مطمئن نہ کر سکا۔

اچانک وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ کون سی بڑی بات ہے، یہ تو قتل پریشانی ہے، اگر میں اس بارے میں سوچتا چھوڑوں کہ وہ نام کیا تھا تو شاید خود بھی چند لمحوں بعد میرے ذہن میں آجائے گا۔“ اپنے آپ کو تسلیاں دیتے ہوئے وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ کر سکا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنا دھیان پارک میں سیر کرتے لوگوں میں لگانا چاہا اور ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے پردوں کے چھپانے کی آوازیں سننے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا دماغ نافذ ہو رہا تھا اور تھک پار کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

پھر وہ بار بار کئی ناموں کی تکرار کرنے لگا۔ رات گہری سے گہری ہوتی گئی۔ پارک صحرا کا منظر پیش کرنے لگا۔ وہاں اس کے سوا اور کوئی نہ رہا۔ اس نے ٹپک لگا کر آنکھیں بند لیں مگر فینڈ اس کی آنکھوں سے کہوں دور تھی۔ ایک اور خیال اچانک اس کے ذہن میں آنے لگا۔ اس خیال نے اس کے ہوش و حواس اڑا دیے۔ لیکن یہ نام اسے مہر جی نہ یاد آئے۔ مگر اس کے لیے تو اس نے ساری کشتیاں جلا ڈالی تھیں۔ اس کو سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے تو گری مٹی خشکی تھی اور اس پر ایک اور ذہنی دباؤ طاری رہتا کہ وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہونے کے باوجود کبھی دست ہے۔

رات گزر گئی۔ اگلا دن گیول میں دیر انداز پھر لگاتے گزرا۔ پھر رات آئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑا اور کہا۔ اس طرح تو میں مرجائوں گا یا بالکل ہی پاگل ہو جاؤں گا۔

اس سے خیال نے اس کی رسی کئی کسری بھی نکال دی۔ وہ لاکھ ڈالر حاصل کرنے کے لیے اس نے ستنے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے پہلے اپنی ایمانداری پر داب لگا، پھر چھ ماہ کی قید کالی، وہ اب محض ایک سوچنے والی مشین بن کر رہ گیا تھا۔ جس رقم کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی مشقت کی۔ آج اسے وہ ہاتھ لگانے کے بھی قابل نہیں ہے۔ وکیل کی تجویز میں رقم اس کا اٹھارہ کر رہی ہے مگر وہ صرف ایک نام بھول جانے کی وجہ سے اس رقم کو حاصل کرنے سے معذور تھا۔ یہ قدرت کی کبھی قسم نہ تھی۔

اس کا سر پکڑنے لگا مگر قابو میں رہنے کے لیے اس

انہیں دہلیا جا رہا تھا۔

یہ بات سنی کہ تمہیں بھی۔ اس بھونگ فضا میں بھی کسی دل بٹنے کی حس مزاج ابھی تک سانس لے رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”ڈرا لیتے۔ کام میں غفارت کی ضرورت ہے۔“

لاٹوں کو خنجروں میں پہلو پہ پہلو لٹایا جا رہا تھا۔ ہر گردپ میں بارود لٹک رہا تھا۔

جنگل میں لاشیں ڈھکی اور گھڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ان کے درمیان کچھ سپاہی اسٹریچرز لیے کھوم رہے تھے، وہ ان ڈھکیوں کو تلاش کر رہے تھے جن میں زندگی کے آثار باقی تھے۔

بیشتر زخمیوں نے دوران جنگ ہی انفجار کی حالت میں دم توڑ دیا تھا۔ آرمی ریگولیشن کے مطابق انہیں انفجار کرتا تھا۔ ان کا بہترین علاج یہی تھا کہ جنگ جیت لی جائے۔ فتح ایک بے حد حقیقت ہے جس کے ثمرات سینے کے لیے کم ہی پہنچتے ہیں۔

جس مقام پر تدمین کے لیے ختم ہونے والی تھی، بعض زخمی وہاں سے بہت دور تھے، لہذا ان کو اسی جگہ دہلیا جا رہا تھا۔ یہی حالت زخمیوں کی تھی، لڑتے لڑتے وہ بہت دور نکل گئے تھے، بعض کا اتنا پتا ہی نہیں تھا۔ بہر حال اسٹریچر بدست سپاہیوں کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔

جنگ کر تدمین پانی شاخت اور تانوں میں دلچسپی لے رہی تھی تاکہ فتح کی خاطر جان دینے والوں کی فہرست مرتب کی جاسکے جبکہ شکست خوردہ قہیم بے دلی سے محض تدمین محل ٹھٹھانے میں لگا تھا۔ ان کی دلچسپی لاٹوں کی تھی تاکہ جھوٹی۔

☆☆☆

تدمین پاریوں سے کچھ فاصلے پر ایک سپاہی درخت سے ٹپک لگے کھڑا تھا۔ وردی سے وہ فیڈرل آفیسر معلوم ہوتا تھا۔ بیروں سے سرنگ انفجار ٹپک رہا تھا۔ وہ نیم کر بتا کہ انداز میں سرگودا میں پائیں ہلا رہا تھا کو یاں کا وائس آرام کی حالت میں نہیں تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ وہاں رکتا نہیں چاہتا۔ بظاہر اس کی نظر جبرائیل تھی، اور حقیقت وہ نہیں بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے وہاں سے ہٹانا تھا۔ تاہم ذہن فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس سمت میں جائے، وہ تادیر وہاں رکتا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ زخموں سے جہانگیر سورج کی کرنیں اشارہ کر رہی تھیں کہ آگ بھڑائی کا لہو لہان ظاہر کرنے کے بعد مغرب کی سمت جھٹکا جا رہا ہے۔ اس بھونگ زمین پر وہ رات بھی نہیں گزار سکتا تھا جہاں چھٹ فٹ نیچے اس کے سامنے دفن تھے۔ دس میں سے نو سے وہ ایک ہی نوعیت کا

سوال کر چکا تھا۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کھو گیا ہے یا اس کا کوئی کوئی غائب ہے۔ کام تیزی سے منت رہا تھا اور زخمیوں کو دفن ہوتی جا رہی تھی۔

بہر حال آفیسر نے ایک ست اختیار کر لی۔ اس وقت وہاں سناٹا چھا چکا تھا۔ وہ سیدھا مغرب کی سرنگ کی جانب جنگل میں داخل ہو گیا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، اس کا اتحاد بحال ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے وہ راستے اور ماحول کو پہچانتا جا رہا ہے۔

اس کے ہتھیار اس کے پاس تھے، وردی پر خون کے دھبے تھے، تاہم اس کی چال بتا رہی تھی کہ اسے کوئی گہرا زخم نہیں لگا ہے۔ جنگل میں سامنے سامنے کر رہا تھا۔ آفیسر کو یوں لگا جیسے اشجار باہم کسان تھے جیسے سسکاں لے رہے تھے۔ اس کے ارد گرد لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی مرد سپاہی کی مدد کر رہا تھا۔ وہ دھکی جاتی۔ یہ وہ دھکی تھی جسے جنگ لداوی پارٹیاں پہنچ نہیں سکی تھیں۔ ان کا کوئی پرسان حال تھا۔ وہ بندرتیج اذیت ناک موت کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اس معاملے میں آفیسر بے دست و پا تھا۔ نہ وہ ڈاکٹر تھا، نہ اس کے پاس پانی تھا کہ وہ ڈرا میڈیکین کے لیے کسی زخمی کے حلق میں چند قطرے پکڑا دیتا۔

اس کے سینے میں تیس سی ایچ۔ اس کی سلاخی آنکھیں دائیں بائیں کھوم رہی تھیں۔ وقت اس نے سامنے کی جانب ایک ڈھلوان نما خندق بھیجو جو آگے جا کر پھر برج زمین کے مانند ہو گئی تھی۔ کنارے پر اسے کچھ اجسام دکھائی دیے۔ وہ ڈھکا، پھر یکدم تیزی سے آگے بڑھا۔

وہ ٹپکتا اور بے قراری کے ساتھ باری باری سب کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخر وہ ایک بے حس و حرکت سپاہی کے قریب رک گیا جو دوسروں سے قدرے ہٹ کر پڑا تھا۔ آفیسر نے آنکھیں کھلی کر اسے دیکھا۔ دفعتاً بظاہر مرد سپاہی کے جسم نے حرکت کی۔ آفیسر کھنکھنوں کے غل جھجھکیا اور اپنا ہاتھ اس کے منہ اور غون سے آلودہ چہرے پر رکھ دیا۔ سپاہی کے حلق سے کھلی کھلی قہقہا نکلی، آفیسر اپنے دوست تک پہنچ گیا تھا۔ آفیسر کوئی اور نہیں بلکہ کپتان ڈیرک میڈل تھا۔ وہ جس زخمی کے پاس بیٹھا تھا وہ سارنٹ ”کوڈی ہالکرو“ تھا۔ کپتان کا گہرا دوست۔ دونوں کا تعلق رجمنٹ کی ایک ہی کمپنی سے تھا۔

☆☆☆

رجمنٹ میں دو بھائی تھے۔ کوڈی ہالکرو اور کرنیہ ہالکرو۔ ایک کے فرق کے باوجود کوڈی کپتان ڈیرک کا

پران دوست تھا۔ دونوں ساتھ بٹے پڑے تھے، ایک ہی ادارے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ کوڈی کو ملٹری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، تاہم دل کے رشتے آتی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ ڈیرک سے بھائی پر داشت نہیں تھی۔ لہذا کوڈی نے بھی ملٹری میں اپلائی کر دیا۔ دونوں نے ترقی کی لیکن دو ایک کا فرق قائم رہا۔ تاہم ان کی دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ کوڈی کا بھائی کرنیہ ہالکرو سمجھتا تھا، دونوں بھائیوں کی افتاد طبع میں بہت فرق پایا جاتا تھا۔ کرنیہ دونوں کی دوستی کے ہمیشہ خلاف ہی رہا۔ مسیح جنگ کے آغاز پر رجمنٹ کی ڈیوٹی آرمی سے ایک سیکل دور تھی۔ ان پر حملہ کیا گیا۔ ہوا جو درختوں سے گھری تھی لیکن رجمنٹ ڈٹ گئی۔ مین دوران جہاز پھر کرنیہ کپتان ڈیرک کے پاس آیا۔ کپتان نے زخمی انداز میں سلام کیا۔ سمجھنے لگی جواب دیا اور بولا۔

”کرنل کا حکم ہے کہ تم اپنی کمپنی کو لے کر جنگل میں قدرتی خندق نما مقام پر رہو، جب تک کرنل دوسرا حکم جاری نہیں کرتے۔ وہاں خطرہ زیادہ ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ تم سنبھال پاؤ گے۔ اگر تم چاہو تو یہ ڈیوٹی کسی اور کے۔“

حوالے کر سکتے ہو۔ چونکہ میں اس تہذیب کا بھائی نہیں ہوں۔ اس لیے اس شخص ایک مشورہ سمجھو۔ غیر رسمی مشورہ۔“

اس کلمی سے غرتی پر کپتان نے جواب دیا۔

”سرا اس موہنت کے لیے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔ آپ کی موجودگی نہ صرف کمپنی کا مورال بلند کرے گی بلکہ بہادری سے لڑتے ہوئے اگر آپ مارے گئے تو آپ کی کلمی کے لیے سارا زکی بات بھی ہوگی۔“

سمجھنے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند سیکنڈ کپتان کو گھورتا رہا پھر واپس روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

نصف گھنٹے بعد کپتان کی کمپنی اچھلی گھائی پر تھی۔ گھسان کا رن پڑا اور کپتان کے ایک تھائی سپاہی کام آگئے۔ کرنے والوں میں کپتان کا دوست سارنٹ کوڈی بھی تھا۔ کوڈی ہالکرو۔

اس وقت کمپنی کوئی نہیں بلکہ رجمنٹ کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ لڑائی مرکزی میدان جنگ سے دور ہوئی تھی لیکن رجمنٹ نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کی جوابی سکھائی عملی اپناتے ہوئے کرنل نے مارہ یا مرو کے تحت کارروائی ڈالی۔ قہیم کے پاؤں اٹھنے لگے۔ توپوں کے دھماکے، بندو قوں اور وینڈ گن کی آوازیں، گھوڑوں کی جہنماہٹ اور سپاہ کے نعرہ ہائے ہو۔ لڑائی فیصلہ کن مراحل

لطائف

ایک سردار اسے فی ایم مشین سے رقم نکال رہا تھا، کچھ کھڑے دوسرے سردار نے کہا۔ ”میں نے تیرا لٹک کوڈ دیکھ لیا ہے۔“

پہلا بولا۔ ”ڈرا تا تو کیا ہے میرا لٹک کوڈ؟“

دوسرا بولا۔ ”5 ستارے“

پہلا۔ ”ہا ہا ہا ہا نہیں 5129 ہے۔“

☆☆☆

پانچ سردار بیٹس کو چھت پر چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک آدمی جو کھڑا دیکھ رہا تھا

پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

سردار۔ ”اوپر جا کر فوج کرنی ہے۔“

آدمی۔ ”مجھے کرنی ہے۔“

سردار۔ ”یاد رکھو تو لیتے لیکن کیا کریں چھری

اوپر پڑی ہے۔“

☆☆☆

میں داخل ہوتی ہوئی پھر جنگل سے قریب تر ہو گئی۔ رجمنٹ کی فتح پر لڑائی اختتام پزیر ہوئی۔

☆☆☆

سارنٹ کوڈی بری طرح زخمی ہوا تھا۔ کپتان اپنے دوست کے پاس موجود تھا۔ کوڈی کے خون آلود کپڑے دھوئے ہوئے تھے۔ جب تک کے بن ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ جسم سے الگ پڑی تھی۔ چوڑے کی بیٹ بھی کھلی ہوئی تھی غالباً کوڈی خود کو غیر ضروری کپڑوں کی قید سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ وہ جہاں زخمیں یوں ہوا تھا، وہاں سے ٹھٹھانے کا نشان تھا۔

تاہم نشان زیادہ طویل نہیں تھا۔ اگرچہ کپتان کو اخراج خون کی زیادتی نظر نہیں آتی لیکن پیٹ کا خطرناک زخم حیات واضح تھا۔ زخم کی چوڑائی ہلاکت خیز تھی۔ وہاں مٹی کے ساتھ پتے بھاگ رہے تھے اور ایک آنت پیٹ سے باہر آئی تھی۔ کپتان نے اپنے پورے کیرئیر میں ایسا زخم نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر نے لگا تھا۔ اس نے دونوں مضیاں سمجھ کر درد اور مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ کوڈی اب تک زندہ تھا۔ اس کے کپڑے، بیٹ کس نے الگ کیے؟ کیا وہ خود جان بچانے کے لیے اچھا بھلا مارا تھا یا تھا بھلا مارا تھا؟

کینٹن نے ایک بار پھر نگاہ ڈالی۔ پیاس گز کے فاصلے پر لاشوں کے آس پاس اسے چند بیوے حرکت کرتے نظر آئے۔ وہ جنگی خزانے تھے۔ کینٹن نے اپنے جاں پر لب دوست کو آواز دی لیکن وہ محض کسمپاس رہ گیا۔ کینٹن کھڑا ہو گیا۔ اس نے جنگی جانوروں کی طرف دیکھا۔ ایک خنزیر لاش کے سینے پر دونوں اگلے بچے رکھے کھڑا تھا۔ اس کا سر لاش کے پیٹ میں گھسا ہوا تھا۔ کینٹن نے نگاہ پھیر لی اور زمین پر اپنے دوست کو دیکھا۔ کوڑی کی آنکھیں کھلی تھیں، وہ غالی غالی نظروں سے کینٹن کو دیکھ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ بدن کو حرکت دیتا رہا۔ ہر سانس کے ساتھ اس کی کراہی کرب و اذیت کی فغاڑی تھیں۔

کینٹن بے بسی سے پھر دوست کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تڑپل کے طور پر کوڑی کی پنج لکھ گئی۔ بولناک اذیت سے تڑپ کر اس کا اوپری دھوٹوڑا سا اٹھا، پھر پٹے گر گیا۔ اس کی انگلیاں زمین کودنے کی کوشش میں ڈبھی ہوئی تھیں مگر اسے احساس نہیں تھا۔ وہ اپنا مانی اظہیر بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بلبے خرد تھے لیکن بے آواز۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک جتنی ہوئی وہابی چھپی تھی۔ آنکھیں سراپا دعا تھیں۔ کینٹن کے سینے میں گڑھا دھواں بھر گیا۔ چہرے کے جینے ہوئے تاثرات اور آنکھوں کی دعا میں مٹنی شدت تھی۔ کس قدر گہرا تاثر تھا۔ یہ سب کچھ کوئی امتحان بھی بے آسانی بڑھ سکتا تھا۔ یوں کی حرکت، آنکھوں کی دعا، چہرے کا تاثر سب ایک ہی چیز طلب کر رہے تھے۔ موت!

کینٹن کو اپنے دوست کی طلب کا فوراً احساس ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھرنے والا پانی چمک پڑا۔ آنسوؤں کے قطرے رخساروں پر برکت رہے تھے۔ کینٹن بھیگی آنکھوں کے ساتھ کوڑی کا نام پکار رہا تھا۔ ایک بار دوبار۔ بار بار۔ اس کی نظر دھندلائی تھی۔ اس نے اپنی بندھنی پیشانی پر ماری اور کھڑا ہو گیا۔ اس کا بدن غیر محسوس انداز میں لرز رہا تھا۔

کینٹن اس کی جگہ سے ہٹ گیا۔ اس کا بدن ماؤف ہو رہا تھا۔ جنگی جانور اسے دیکھ پکے تھے۔ وہ چلتا رہا۔ جانور کرب آواز میں چلائے پھر وہاں سے بھاگ لٹے۔ کینٹن کو دیکھ کر ایک قریب الرگ گھوڑے نے کمزوری آواز نکالی۔ اس کی اٹھی دونوں ٹانگیں توپ کے گولے نے اڑا دی تھیں۔ اسے گھوڑے کی آنکھوں میں کوڑی جیسی اچھا کھس نظر آیا۔

انسان بھی عجیب ہے، انسان کی انسان سے لڑائی ختم ہی نہیں ہوتی۔ خود کو بھی موت مانگتے پر مجبور کرتا ہے اور جانور کو بھی۔ کینٹن نے ریو اور نکال کر گھوڑے کی دونوں آنکھوں کے درمیان گولی ماری اور اسے زندگی و موت کی کشمکش سے آزاد کر دیا۔

سورج تقریباً ڈوب چکا تھا۔ یہاں سے کپ میلوں دور تھا۔ وہ ڈھیلے انداز میں گھوڑے کی لاش کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا ذہن غالی تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور وہاں اپنے گہرے دوست سار جنت کوڑی کی جانب بٹل پڑا۔ وہ ایک گھٹنے کے بل پر بیٹھ گیا، اس کا دل بہت زور سے دھڑکا اور پیشانی پیٹنے سے تر ہو گئی۔ اس نے ریو اور مڑتے ہوئے دوست کی پیشانی پر رکھ کر منہ پھیر لیا۔ ٹرک پر اٹھی کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

گھوڑے پر چلائی گئی گولی آخری تھی۔ ریو اور غالی تھا۔ کوڑی نے درد بھری سسکی لی۔ اس کے ہونٹ عجیب انداز میں بل کھا رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

کینٹن ڈیرک کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی کوار نکالی۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں نے کوار کی دھار کو پکڑ لیا۔ اس نے کوار کو زمین کے ستوازی اپنے سامنے مضبوطی سے پائل سیدھا پکڑا جیسے اپنے اعصاب کے بارے میں اندازہ لگا رہا ہو۔ تیز دھار بلیڈ میں کہیں لرزش نہیں تھی۔ وہ ہچکا اور کوار کی نوک کوڑی کے منہ دل کے مقام پر رکھ دی۔ اس مرتبہ اس نے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ دستہ دونوں ہاتھوں سے تمام کراس نے پوری طاقت لگاتے ہوئے جسم کا وزن بھی استعمال کیا۔

کوار کا قاتل بلیڈ نیم جان کوڑی کے بدن سے گزر کر زمین تک چلا گیا۔ وہ خود گرتے گرتے سجھ کوڑی کا بالائی بدن ایک جھٹکے سے بلند ہوا اور کینٹن کے منہوں تک آ گیا۔ ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور اتنی سختی سے فولادی بلیڈ کو پکڑا کہ انگلیوں کے جوڑ سفید پڑ گئے۔ آخری سانس لینے ہوئے عالم دیوانگی میں جیسے اس نے کوار کو باہر نکالنا چاہا لیکن یہ ایک کمزور کوشش تھی۔

مین اسی لمبے درختوں کے جھنڈ کے عقب سے تین افراد برآمد ہوئے۔ دو میڈیکل ورکر تھے جن کے ہاتھوں میں اسٹریچر تھا۔ دونوں بڑی طرح ہاب رہے تھے۔ کینٹن کی پشت ان کی جانب تھی تاہم آخری ساعت میں کوڑی نے ریو سک و کرگز کو دیکھ لیا تھا۔ اور تیسرا شخص خود بخود کھڑا تھا۔ کرین ہاکرو۔

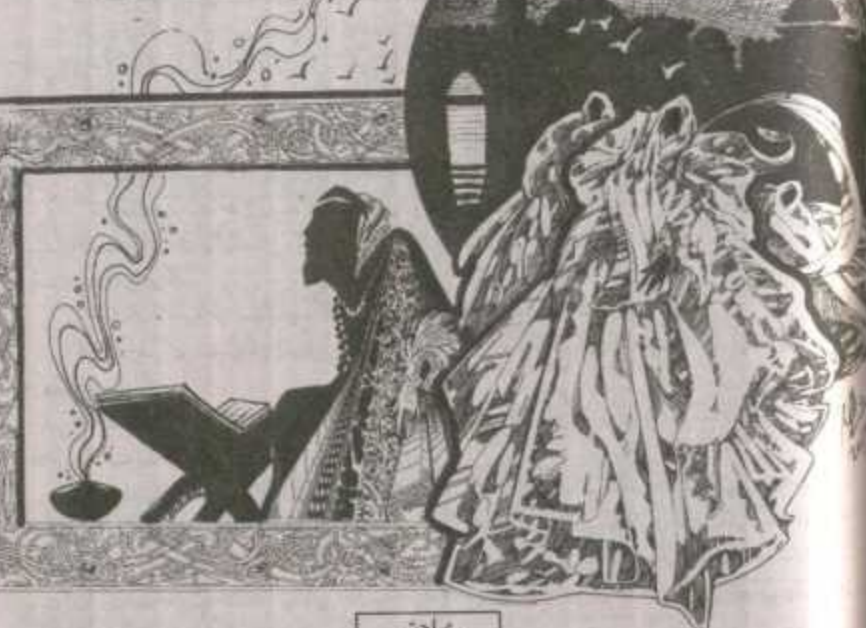


رب کائنات کی منش اور حکمت عملی کو سمجھنا انسان کی بس کی بات نہیں۔ قدرت کا قانون یہ کہ جب اندھیرا حد سے بڑھ جائے تو کہیں قریب ہی اجالا چھپا ہوتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ظلمت کی یہ چادر سمٹتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب مخلوق اپنے خالق سے غافل ہو کر بت پرستی میں مشغول تھی اور صنم خانے آباد تھے ایسے میں اللہ تعالیٰ کو معجزہ دکھانا مقصود ہوا اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین پر اتارا جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ذات کے پونے کی وجہ تلاش کرتے۔۔۔ اپنے خالق کی جستجو اور تسلیم و رضا کے سانچے میں ڈھلنے میں گھڑا۔۔۔ اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے خداتوں کو زمین بوس کر کے آپٹتہ تے کسی معبود کے پوتے کا یقین دلا یا اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔۔۔ حتیٰ کہ انہی کو شمشوں میں حج بیت اللہ کے مناسک بھی رقم ہو گئے جن پر دینی دنیا تک تمام مسلمانان عالم کو عمل کرنا ہے۔

نمرود سے گھراٹے اور اللہ کی آزمائشوں پر پورا اترنے والے اعلیٰ القدر تغیر کی سوانح حیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

رضوانہ صاحبہ



دوہرہ حنفیہ

وہی بھی نازل ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہی کے الفاظ آپ تک پہنچا دیے۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں نبی مقرر کیا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ تم اپنی قوم کی طرف جاؤ جو سدوم میں رہتی ہے اور بنو مینہ صلیف کی تبلیغ کرو۔

ایک ہجرت اور ہوئی لیکن یہ ہجرت پہلی ہجرت سے مختلف تھی۔

”عظیم الٰہی یہ ہے کہ تم سدوم طے جاؤ اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کرو اور میری رسالت کا پیغام حق سناؤ اور میں واپس فلسطین چلا جاؤں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم کو سر بلند کروں گا۔“

حضرت لوط علیہ السلام سدوم اور عامورہ کی طرف طے گئے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے جدا ہوجانے کے بعد اللہ عزوجل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور منس جگہ تو بے دہاں سے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف دیکھ کیونکہ یہ ملک جو تودیکھ رہا ہے جس جگہ کو اور تیری نسل کو پیش کے لیے دوں گا اور میں تیری نسل کو خاک کے ذروں کے مانند بنادوں گا ایسا کہ اگر کوئی شخص خاک کے ذروں کو گن سکے تو تیری نسل بھی گن لی جائے گی۔ اللہ اور اسی ملک کے طول و عرض میں میرے کینک میں اسے چھ کوہوں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم سے شام کی طرف لوٹ گئے اور بیت المقدس کو مغرب میں چھوڑ کر اسی جگہ پر رہنے لگے وہ جہاں مصر آتے ہوئے آپ نے قربان گاہ تعمیر کی تھی۔

وہ قہوڑے سے لوگ بھی آپ کے ساتھ آئے تھے جو آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ انہوں نے بھی اصرار دیکر خیمے لگا لیے اور ایک چھوٹی سی بستی بنی۔ یہی لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھٹی باڑی کرنے اور بچوں کو چرانے کھانے لگے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اب دنیاوی مال و دولت کی کثرت تھی لیکن بڑھاپا سوسے ہو کر گزر رہا تھا اور دونوں بیٹیاں اب بھی تنگ اولاد سے محروم تھیں۔

کہتے تھے یہاں رہتے ہوئے آپ کو بیس سال ہو چکے تھے۔

خدا کا کلام آپ پر نازل ہوا۔ ”اے ابراہیم تو مت ڈر، میں تیری پھر اور تیرا بہت بڑا اجر ہوں۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے خدا تو مجھے کیا دے گا۔ میں تو بے اولاد چلا جا رہا ہوں اور میرے گھر کا محتار و مشقی البھر (غلام) ہے۔ تو نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی۔ کیا میرا خالہ اور تیرا وارث ہوگا؟“

خدا کا کلام نازل ہوا۔ خدا نے فرمایا۔ ”تیرا وارث نہ ہوگا بلکہ وہ ہوگا جو تیرے صلب سے پیدا ہوگا۔ وہی تیرا وارث ہوگا۔ آسمان کی طرف نگاہ کرو اور اگر تو ستاروں کو گن سکے تو گن۔ یہی تیری اولاد ایسی ہی ہوگی۔“

”میرے ایک بیٹے کیسے ہوگا۔ میری بیوی تو باندھ ہے۔ خبر زمین سے بھٹی کی امیر کیا رکھوں۔“

”میں خدا ہوں۔ تجھے کس دیوں کے“ اور ”سے نکال لایا۔ یاد کر میری ہی قدرت تھی کہ تو آگ سے محفوظ رہا تھا۔ میں ہی تھا جو تجھے گمراہی سے راہ راست کی طرف لایا۔ میں مژدوں کو زندہ اور زندوں کو مردہ کرتا ہوں۔ میری شان بہت عظیم ہے۔ میں تجھ کو یہ ملک میراث میں دوں گا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”میں کیونکر جانوں کہ میں اسی ملک کا وارث ہوں گا۔“

خدا نے کہا۔ ”میرے لیے تمہیں برس کی ایک بھینچا اور تین برس کی ایک بکری اور تین برس کا ایک میٹھ حلا۔ ایک قمری اور ایک کبوتر کا بچہ۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور خدا کے حکم سے ان کو بچے سے دو گلوے کیا اور ہر گلوے کو اس کے ساتھ کے دوسرے گلوے کے مقابل رکھا مگر ہر گلوے کے گلوے نہ کیے۔

سورج ڈوبے وقت آپ پر غمزدی غیر غالب ہوئی اور ہولناک تاریکی چھا گئی۔ تب خدا عالم رو یا میں آپ سے مخاطب ہوا۔

”یقین جان کہ تیری نسل کے لوگ ایسے ملک میں جو ان کا نہیں پرندگی ہوں گے اور وہاں کے لوگوں کی غلامی کریں گے اور وہ چار سو برس تک انہیں دکھ دیں گے لیکن میں اس قوم کی عدالت کروں گا جس کی وہ غلامی کریں گے اور بعد میں وہ بڑی دولت لے کر وہاں سے نکل آئیں گے اور تو صحیح سلامت اپنے باپ دادا سے جائے گا اور نہایت بھری میں دُہن ہوگا اور وہ چوتھی پشت میں یہاں لوٹ آئیں گے کیونکہ اسویوں کے گناہ اب تک پورے نہیں ہوئے۔

اس کے بعد ایک عرصہ میں سے وہاں اٹھتا تھا دکھائی دیا اور ایک جلیق مشعل ان نگاہوں کے سچ سے ہو کر گزری۔ اسی وقت خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریا سے مصر سے لے کر اس بڑے دریا یعنی دیارے فرات تک۔ اس میں آباد تمام قومیں سمیت میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔

آنکھ کھلی تو اطمینان قلب نے اپنے حصار میں لے لیا۔ اپنے آپ پر یقین تھا۔ مجھ گئے کہ کوئی مجھ کو ہونے والا ہے۔ اسی

بڑھاپے میں مجھے اولاد ملے گی اور میری نسل اس کثرت سے ہوگی جیسے آسمان پر ستارے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملنے والی اس بشارت عظمیٰ میں یہ امت محمدیہ بھی داخل ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد میں یہ زیادہ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت اس امت کے بغیر کامل نہیں ہوسکتی۔ اس بات کی تائید حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔

”یہ ملک اللہ نے میرے لیے زمین کو سمیٹ دیا پھر میں نے اس کے مشرق و مغرب کو دیکھا اور مغرب میری امت کی سلطنت وہاں تک پہنچی گی جہاں تک اس کو میرے لیے سمیٹا گیا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خوش خبری حضرت سارہ کے گوش گزار کی تو حجب ہوئی اور اپنے بڑھاپے پر نظر ڈال کر خاموش ہو گئیں۔

”سارہ تو خاموش کیوں ہو گئیں؟ کیا تمہیں میرے سب کی باتوں پر یقین نہیں؟“

”یقین نہ ہوتا تو ایمان کیوں لاتی۔ بس اپنے بڑھاپے کا خیال آ گیا تھا۔ پھر یہ بھی سہتی ہوں کہ میں تو سدا کی بانجھ ہوں۔ میرے اولاد کیسے ہوگی۔“

”تم ہاں مجھ کو کہو۔ یہ تو خدا کی مصلحت تھی کہ تمہارا دامن اولاد سے خالی رہا۔ اب اسی کی مصلحت ہے کہ میں وارث ملنے والا ہوں۔“

حضرت سارہ کو اس وقت یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ حضرت ہاجرہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ تھیں۔ یہ خوش خبری ان کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ انہیں تو یہ اس وقت یاد آیا جب اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔ حضرت ہاجرہ نے یہ خوش خبری خود انہیں سنائی کہ وہ امید سے تھیں۔

حضرت سارہ نے اس خبر کو نقل اور خوشی سے سنا۔ ایک احساس یہ ضرور ہوا کہ یہ وعدہ اگر میرے ذریعے ہوتا تو میں منتی خوش قسمت ہوتی۔ اس روز حضرت ہاجرہ ان کے پاس آکر بیٹھیں تو نہ جانے کیوں یہ احساس ہونے لگا کہ اس گھر میں میرا جو جو شخص وجود ہے، مگر کی اصل مالک تو یہ ہے۔

اس زمانے کے رواج کے مطابق چھوٹی بیوی بڑی کی خدمت گار ہوا کرتی تھی۔ اب تک حضرت سارہ انہیں اس نظر سے دیکھتی رہی تھیں لیکن اب اچانک وہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ حضرت ہاجرہ سے اب کوئی خدمت نہیں لی جاسکتی۔ کچھ دن نہیں گزرے کہ کہ ہاجرہ کا مرتبہ مجھ سے بڑھ جائے گا۔ اگر بیٹا بنا تو اور مردہ کی عورتوں کی نظر میں بھی اس کا مقام مرتبہ مجھ سے بڑھ جائے گا۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام مجھ سے زیادہ اس سے محبت کرنے لگیں گے۔

آپ ان جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن یہ بشری تقاضے تھے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی چلے گئے۔ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام گھر میں داخل ہوئے تو ان جذبات کو زبان مل گئی۔

”اب کیا ہاجرہ مجھ سے زیادہ باعزت ہو جائے گی؟“

”عزت تو اسے ملے گی جسے میں دوں گا۔“

”کیا وہ آپ کے بیٹے کی ماں بننے کے سبب مجھ پر سبقت نہیں لے جائے گی؟“

”کیا میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم مجھ پر اس وقت ایمان لائی تھیں جب کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔“

”یہ تو آپ کی بات ہوئی ورنہ میں دیکھ رہی ہوں وہ اب بھی میری برابری کر رہی ہے۔ اب وہ میری خدمت گار نہیں رہی۔“

”وہ اب بھی تمہاری خدمت گار ہے۔ تم اس کے ساتھ جو جی چاہے کرو۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بات کو رفع دفع کرنے کے لیے کہا۔

حضرت ہاجرہ ایک پردے سے لگی یہ سب باتیں سن رہی تھیں۔ آپ نے اس وقت یہ دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کی طرف سے بدل گئے تھیں۔ حضرت سارہ کے حقد بدلنے لگے ہیں اب وہ میرے ساتھ نہ جانے کیا کریں۔ بس یہ خیال آتا تھا کہ گھر سے نکل کھڑی ہو گئیں۔ ممکن ہے یہ خیال بھی آیا ہو کہ یہاں رہ کر کہیں ان کے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

انہیں کہاں جانا ہے یہ ابھی سوچا نہیں تھا بس وہاں سے آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ کچھ دور جا کر ایک خستہ پر نظر پڑی بیٹیاں کی شدت نے آگے نہیں بڑھنے دیا اور آپ وہاں ٹھہر گئیں۔ ابھی آپ نے پانی سے ہونٹ تر کیے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی آتا

نظر آیا۔ آپ کو ڈر ہوا کہ کہیں یہ آدمی نقصان نہ پہنچائے۔ وہ چاہتی تھی کہ بھاگ کھڑی ہوں لیکن اتنی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اس آدمی نے ان کا نام لے کر پکارا تھا۔

”ہا جڑ تو کیوں بھاگی اور کدھر جاتی ہے۔“

”تو کون ہے اور مجھے نام سے کیسے پکارتا ہے؟“

”میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ہوں۔“

”کیا تو نہیں جانتا کہ ابراہیم کی پہلی بیوی کو بچہ ہو چکا ہے اور میں اس کی طرف سے بچنے والے نقصان سے بچا کر بھاگ آئی ہوں۔“

”اُمی لیے تو مجھے بھیجا گیا ہے۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ تو بی بی سارہ کے پاس لوٹ جا اور اپنے کو اس کے قبضے میں دے دے۔ تو حاملہ ہے اور تیرے بچہ ہوگا۔ اس کا نام اسمعیل رکھنا۔“

آپ واپس آئیں اور حضرت سارہ سے معافی کی خواہش کر رہیں۔

انہوں نے حضرت سارہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے چرادرادہ سادیا کہ کس طرح وہ فرشتہ ملا اور اس نے بیٹے کی بشارت دے کر کہا اس کا نام اسمعیل رکھنا۔

وقت اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

بچے کا نام طے شدہ تھا لہذا ”اسمعیل“ رکھ دیا گیا۔

وہی پھر نازل ہوئی۔ ”میں نے اسمعیل کے حق میں تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس کے گیارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔“

اس مقام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نظروں میں حضرت ہاجرہ کی وقعت بڑھ گئی۔ آپ ہر طرح سے ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگے آپ ان کے پاس بیٹھ کر شیر خوار سے کھیلنے اور حضرت ہاجرہ کی قرینگی کرتے تو حضرت سارہ کی اداسی و دواڑ ہو جاتی۔ آپ سوچنے لگیں کاش میں نے بیٹا نہ جانتا ہوتا۔ شوہر کی نظروں میں سرخرو ہوئی ہوئی۔

آپ برگزیدہ و مغیر کی بیوی تھیں۔ صاحب ایمان تھیں۔ اللہ کی مشیت کی قائل تھیں لیکن بشری تقاضے تھے جو ان کے لیے سو جان روح بنے ہوئے تھے۔ یہ حسد اتنا بڑھا کر اپنے گھر میں حضرت ہاجرہ کے بچے کا وجود کا نشان کرکھنے لگا کہ محجب کج پر سوچنے لگیں اور اس کا اظہار انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کر بھی دیا۔

”اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ میں ہاتھ ہوں اور ہاجرہ اپنے بچے سے کھلتی ہے۔“

”یہ تو خدا کی مصلحت ہے۔ کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ میرا وارث میرے سنگن میں کھیلے؟“

”یہ وارث میرے پیٹ سے ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔“

”خدا کی قدرت سے کیا بعد ہے۔ کیا خبر وہ ہمیں بھی صاحب اولاد کر دے۔“

”پھر بھی میں یہ نہیں چاہوں گی کہ ہاجرہ کا بچہ میرے بچے کے ساتھ کھیلے۔“

”پھر تم کیا چاہتی ہو؟“

”ان کو میری آنکھوں سے دور رکھنا۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ میری آنکھوں کے سامنے آجائیں۔“

آپ حضرت سارہ سے بے حد محبت کرتے تھے لیکن حضرت ہاجرہ بھی پرانی نہیں تھیں اور جس بیٹے کو نکالنے کے لیے کہا جا رہا تھا وہ ان کا بیٹا ہی تھا اور ان کی تو گویا بیٹی ہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اپنی ماں کا سہارا بن سکے۔

حضرت ہاجرہ کو کسی ایسی ہی مقام پر چھوڑا کہ آپ کے نزدیک غلامانہ فیصلہ تھا۔ دوسری طرف حضرت سارہ کے تقاضے تھے کہ بڑھتے جا رہے تھے۔ آپ کی فیصلہ پر نہیں کھینچی جا رہے تھے کہ وہ بی بی لائی نہ ہو گی۔

آپ سے فرمایا گیا۔ ”سارہ نے جو کچھ کہا ہے اس پر کان رکھ۔“

حضرت ہاجرہ کو کہیں لے جا کر چھوڑ دینا چونکہ مشیت ایزدی کا حصہ تھا اس لیے آپ کو اس مقام سے بھی باز کر دیا گیا جہاں اس شیر خوار اور حضرت ہاجرہ کو چھوڑنا مقرر فرمایا گیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت نرم دل تھے۔ اتنی گواہی تو قرآن نے بھی دی ہے۔

”بے شک ابراہیم بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔“

انہیں یہ فیصلہ ہرگز قابل قبول نہ ہوتا کہ وہ چار بڑی دعاؤں کے بعد ملنے والے بچے کو عالم شر خوارگی میں خود سے الگ کر دیں اور ایک ایسی ہی مقام پر سب سہارا چھوڑ آئیں۔ یہ فیصلہ خوشگوار تھا لیکن عزم الہی سے سر تابی ملن بھی نہیں تھی۔ وہی کے ذریعے انہیں بھی بتایا گیا تھا کہ وہ حضرت سارہ کی بات مان کر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمعیل علیہ السلام کو بیابان میں چھوڑ آئیں۔ ایک صبح آپ نے ایک مغیرہ پانی کا ساتھ لیا اور ایک جھلی میں بھجوریں بھر لیں۔ حضرت ہاجرہ سے فرمایا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ اس فرماں پر دار بیوی نے بے تک نہ چھوڑا کہ وہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ بچے کو گود میں اٹھایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چل دیں۔

جب بستی پہنچے وہ گئی اور ویرانہ سامنے آگیا۔ گرمی نے انہیں دکھائی شروع کر دیں تو حضرت ہاجرہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ بچے ہوئے سحر کا سفر شروع ہوا تو پریشانی مزید بڑھ گئی۔

”یہ آپ نہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ یہاں تو صحرائی صحرا ہے۔“

”میں ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”مجھے خبر ہے کہ آپ نے سارہ کو ساتھ نہیں لیا مجھے ساتھ رکھا لیکن بستی تو پیچھے رہ گئی۔ کیا آپ کا دوست اس بستی و بستی صحرائی میں رہتا ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس چلتی رہو۔ جب دوست کا گھر آ جائے گا تو وہ خود مجھے آواز دے لے گا۔ ہم وہیں رک جائیں گے۔ تم خود کچھ لینا۔“

اس کے بعد کچھ اور بچے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”اے ابراہیم، تجھے بس اسی مقام پر رک جانا ہے۔“

ایک آواز نے انہیں رک جانے کو کہا اور آپ ترک گئے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں آج کعبہ ہے اور زم زم کا کنواں ہے۔ اس وقت نہ کعبہ تھا نہ زم زم، بس ایک قدرے ابھری ہوئی زمین تھی اور ایک درخت کھڑا تھا۔ دور دور تک نہ کسی آبادی کے آثار تھے نہ کوئی بھولا بیٹا انسان نظر آ رہا تھا۔ تین نفوس کے سوا کچھ تھا کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک کوئی پرندہ بھی اڑتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں قریب میں کبھی پانی بھی نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ کو درخت کے نیچے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ یہ درخت کھنکھناتے تھے جو دھوپ کھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن پھر بھی صحرائی بے جنگلی درخت قیمت تھا۔

حضرت ہاجرہ اس درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ وہ یہی بھی ہوں گی کہ دوست کا گھر تو کہیں آگے ہے۔ یہاں حصن اتارنے کے لیے کھدیر کے لیے انہیں بھنایا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پانی کا مغیرہ اور بھجوروں کا قھیلا ان کے پاس رکھ دیا۔ کچھ دیر کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر مزہ موڑ کے چل دیے۔

حضرت ہاجرہ نے جب دیکھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر واپس اسی راستے پر جا رہے ہیں جس طرف سے آئے تھے تو ان کے دل میں اندیشے نہ سرا اٹھایا۔ آپ نے بچے کو زمین پر رکھا اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دامن پکڑ کر جمبول گئیں۔

”اے ابراہیم! آپ تو واپس جا رہے ہیں۔“

”ہاں نہیں وہ مقام ہے جہاں دوست سے ملاقات ہوگی۔“

”پھر آپ کیوں جا رہے ہیں؟“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس شاید اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا یا آپ جواب دینا نہیں چاہتے تھے۔ آپ آگے بڑھتے جا رہے تھے، حضرت ہاجرہ حالت اضطراب میں دوڑتی جا رہی تھیں اور سوال کرتی جا رہی تھیں۔ ”آپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“

جب آپ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی سوال کا جواب نہیں دے رہے ہیں اور رکتے کو بھی تیار نہیں تو آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

”کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم فرمایا ہے؟“

”ہاں ایسا ہے۔“

”اللہ نے فرمایا ہے تو وہ ہم کو منع نہیں کرے گا۔“ حضرت ہاجرہ نے فرمایا اور مطمئن ہو کر واپس اسی مقام پر تشریف لے آئیں جہاں وہ اپنے بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لٹا کر رکھی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مڑ کر چل پڑے تھی کہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ گئے جہاں سے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ان کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھ دیے۔

”اے ہم سب کے پروردگار۔ ایک ایسے میدان میں جہاں بھیجی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی اولاد تیرے محترم مگر کے پاس لاکر بیانی کی ہے کہ لٹا کر قائم رکھیں۔ پس تو اپنے فضل و کرم سے ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامانِ رزق مہیا کر دے تاکہ تیرے شکر گزار ہوں۔“

اس دعا کے منظر ہونے تک بہت سے سر ملے تھے جن سے حضرت ہاجرہ کو گزرتا تھا۔

مقلین سے میں پانی اور قبیلے میں بھڑکیں سننے وان کی مقدار تھی؟ یہ بات پریشانی کی ضرورت تھی لیکن آپ کہہ چکی تھیں کہ اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ اس لیے دل کو مطمئن تھا کہ کوئی ضرورت ضرور نکلے گی۔

وہی ہوا جس کا ذکر تھا۔ پہلے بھڑکیں ہم بوسیں پھر مقلین سے کا پانی ختم ہو گیا۔ دو وقت کے فاصلے ہوئے۔ بچے کو دودھ پلانے نہیں تو دودھ کہاں سے آتا رہے۔ یہ صورت حال تھی جو آپ نے سوچنی بھی نہیں تھی۔ صرف یہ سوچا تھا کہ اگر بھڑکیں ختم ہو گئیں تو میں کیا کھاؤں گی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے نہیں کھاؤں گی تو دودھ کیسے آئے گا۔ مقام ایسا تھا کہ میں ان گزرنے کے بعد کسی انسان کو اس طرف آتے نہیں دیکھا تھا۔ دودھ کے لیے پکارا تو کسی کو۔

گرمی اپنے جوبین پر تھی۔ سورج کی قنارت تھی کہ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ بیاس کی شدت سے بچے تڑپ رہا تھا کئی مرتبہ دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن ایک قطرہ بھی نہ آتا۔ بچے کے ہونٹ مائل کی چھانچوں کی طرح خشک تھے۔ اب شاہ بچے میں اتنی سخت بھی نہیں رہی تھی کہ آگھیں کھولے۔ آپ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں تھی۔ اللہ کرکھڑی ہو گئیں اور دوڑتی ہوئی قریب کی پہاڑی ”صفا“ پر چڑھ گئیں کہ شاہ باندی سے انہیں کوئی انسان نظر آجائے اور وہ اسے اپنی دھوکے لیے پکار لیں یا کہیں پانی کے آگے نظر آجائیں۔ دیکھا ضرور لیکن ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ پھر خیال آیا ”میرا بچہ۔“ وہ وہاں اکیلا پڑا ہے بچے کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آئیں۔ بچے کی حالت بدستور رہی تھی۔ انہوں نے اپنے گرتے کا دامن اٹھا لیا اور ایک ایسے انسان کی طرح دوڑیں جو پوری طاقت سے دوڑتا ہے۔ دوسری جانب ”مرودہ“ کی پہاڑی تھی۔ وہ پوری رفتار سے پہاڑی پر چڑھتی چلی گئیں کہ شاہ یہاں سے کسی انسان کو دیکھ لیں۔ یہاں سے بھی ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ پھر اتریں اور واپس آکر بچے پر ایک نظر ڈالی۔ امید نے پھر آپ کو ”صفا“ کی جانب دوڑا دیا۔ پھر اتریں اور وادی کو یاد کر کے ”مرودہ“ پر چڑھ گئیں۔ صفا اور مرودہ کے درمیان آپ دو اونٹوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔ ہر پھیرے میں بچے پر ایک نظر ڈال لیتیں اور پھر پہاڑیوں کی طرف دوڑ پڑتیں۔ اس طرح آپ نے سات مرتبہ چکر کاٹے (سبکیا وہ ”سعی بین الصفا والمرودہ“ ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں)

آخری پھیرے میں جب وہ ”مرودہ“ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی۔ اس آواز پر آپ چٹکیں اور کہنے لگیں کہ کوئی پکارا ہے۔ کان لگا تو پھر آواز آئی۔ آپ سے اختیار تھا انہیں۔ ”اگر تمہارے پاس سے آواز آئی تو میں نے سن لی ہے۔“ آپ نے دیکھا بچے کے پاس کوئی کھڑا ہے۔ یہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے، جو اپنے پاؤں کی اڑی سے زمین کو ریزہ ریزہ تھے پھر آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا تو زمین سے چشما ابل پڑا۔ حضرت ہاجرہ یہ دیکھ کر ”مرودہ“ سے نیچے اتر آئیں اور اٹھتے ہوئے پانی کے گرد باڑھ بنائے لگیں تاکہ پانی بہت جائے اور کہنے لگیں۔ ”زمزم“ یعنی رک جبارک جا۔ اسی لیے اس پانی کو آج تک زمزم کہا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر مقلین نے فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم کرے“ اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ دیتے تھے اور اس کے چار جانب پاؤں لگاتے تھے تو آج وہ زبردست چشم ہوتا۔“ حضرت ہاجرہ نے یہ پانی پیا اور پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلایا۔

سنہری باتیں

عربی نبوی ﷺ سے صحت معذرت کی حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک
 ”کھانا ہاتھ دھو کر کھاؤ۔ اپنے ہاتھ سے تم اللہ پر دھ کر شروع کریں۔ یہ کلام انہماں کی بھڑکی کے لیے پختہ میں روز نہ کھیں۔
 ”میرے بچے کے پاس بیٹھ کر کھانا نہ کھاؤ۔“ بچے کھڑے ہو کر کھانے سے بدشگونی ہوتی ہے۔
 ”کھانا کھانے کے بعد گرم کھانے سے مدد نہ کرو ورنہ ہوتا ہے۔“ بچہ اکیلے کھانا مت کھاؤ۔
 ”دو سرخان پر گرمی ہوئی چیز کھانا کھانے سے رزق میں فراخی ہوتی ہے۔
 ”انچھ کھانے سے انسان مرضِ قویج سے محفوظ رہتا ہے۔
 ”لوکی بھینی کدو کھانا یا کرہ پیل و دماغ کو تفت بھٹاتا ہے۔
 ”تھیر مدد کے لیے کھیر امولی، گاجر، بٹماٹر کھایا کرو۔
 ”زیادہ عرصہ صحت مند رہنے کے لیے صبح اور رات کھانا باقاعدگی سے کھایا کرو۔
 ”کھانا کھانے کے بعد اللہ کا بھوکھ پانی کھانے سے پہلے اور درمیان میں پئیں۔
 ”کھانا کھانے کی ابتدا میں صحن میں یا ختم میں صحن چیز کے استعمال سے تزیار یاں دور ہوتی ہیں۔
 ”دو پھر کے بعد کھانا جوڑوں میں دور پیدا کرتا ہے۔
 ”رات کو سو کر یا کرو کیونکہ گات زمین لپیٹ دی جاتی ہے۔
 ”اگر سورہ قدر 21 مرتبہ پڑھ کر ساری (مثلاً جہاں بھینی شقی ترین موڑ کا رکھو) اسکو زعفران و غیرہ) پر سار ہوں گے تو سواری ہر قسم کے غلطی سے محفوظ رہے گی اور کھیر و عافیت منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔
 ”مسلمان کا بھوکھ کھانا کھانے میں شفا ہے۔“

مرسلہ: روشنی رشید و صمیمیال یکپ ہر اولینڈی

فرشتے نے ہاجرہ سے کہا۔ ”خوف اور غم نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچے کو ضائع نہیں کرے گا۔ یہ مقام ”بیت اللہ“ ہے جس کی تعمیر اس بچے (اسماعیل) اور اس کے باپ ابراہیم کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا۔“

اسی دوران میں نبی کریم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آکر ٹھہرا۔ قافلے کے لوگوں نے دیکھا کہ کچھ قافلے پر ہمارے ہیں۔

”تو کیا قریب میں کہیں پانی ہے؟“

”ہم یہاں سے ہزاروں مرتبہ گزرے ہیں۔ دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں۔ اسی لیے تو اس صحرا کو کد کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کے ایک معنی پانی کم ہونے کے ہیں۔“

”پھر یہ پتہ کیوں اڑتے دکھائی دے رہے ہیں؟“

”کچھ لوگ جا میں اور کچھ کر میں کہ کیا ہاجرہ ہے۔“

یہ لوگ زمزم کے مقام تک آئے اور خبر نہ کر کے واپس چلے گئے۔ انہوں نے اپنے سردار کو بتایا۔ ”محب ماجرا ہے۔ ویرانے میں ایک عورت اپنے بچے کے پاس بیٹھی ہے اور ان کے قریب چشمہ جاری ہے۔“

قبیلے کے لوگ یہ خبر سننے ہی اس مجھ سے کوئی کھینے کے لیے خشکی کی طرف چل دیے۔ دیکھا تو جو سنا تھا وہی تھا۔

”تم کون اور یہاں کیوں؟“

”میرے اللہ نے مجھے یہاں بٹھا دیا ہے۔“

”اور یہ پانی؟“

”یہ بھی اللہ کی دین ہے۔“

”اب یہ جگہ ہے کہ لائن ہو گئی ہے۔ تم کچھ ہم بھی یہاں قیام کر لیں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ خود بھی باہمی انس ورفاقت کے لیے یہ چاہتی تھی کہ کوئی یہاں آکر مقیم ہو۔ اس لیے انہوں نے مسرت کے ساتھ نبی جرم کو قیام کی اجازت دے دی۔

جرم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خانہ کو بھی بلایا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے لگے۔ پانی میسر آ گیا تھا لہذا کچھ باڑی بھی کرنے لگے۔

ان ہی میں رہتے تھے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بھی پرورش ہونے لگی۔

☆☆☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام پچھلی تین راتوں سے ایک ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک گناہار یک جگہ ہے۔ وہ اس جگہ میں اپنے پیارے بیٹے اسماعیل کو لے جاتے ہیں اور اس کے گلے پر چھری پھیر دیتے ہیں۔

آپ نے یہ خواب پہلی مرتبہ دیکھا تو صدمہ کے طور پر اونٹ قربان کر دیا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی کیا لیکن تیسری شب کسی نے نپار کر کہا۔ "ابراہیم! انوکھاری راہ میں اگوتے بیٹے کی قربانی دے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ آزمائش پہلی مرتبہ نہیں ہو رہی تھی۔ اب تک آپ کو مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا اور ہر مرتبہ کمال و کمالات ہوتے تھے۔

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قارآن کے بیابان میں چھوڑنے کا حکم ملا تو وہ کوئی معمولی امتحان نہیں تھا۔ بڑھاپے کی اگلی اولاد جسے یہ کہہ کر مانگا تھا کہ میں بے وارث جاتا ہوں۔ اسی وارث کو صرف علم الہی کی تکمیل کے لیے بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ آئے اور اب کہا جا رہا تھا کہ اسی نور نظر کو تھری راہ میں قربان کر دو۔

یہ امتحان سب امتحانوں سے گزرا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چشم تصور سے دیکھا۔ پچھلے دنوں جب آپ بیٹے کو دیکھنے کے لیے قارآن کی طرف گئے تھے تو وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ دوڑنے لگا تھا۔ ان کے گلے میں بھول جاتا تھا۔ اس نے چھری کی لکڑی کی طرح سے وہ تیرا انداز کی شوق کر رہا تھا۔ اب کہا جا رہا تھا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر دو۔ یہ سوچتے ہی جگر چھری سی آگئی لیکن پھر استقامت نے آواز دی۔ "میں الہی سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔ مجھے اس آزمائش سے بھی سلامت دینی سے گزرنا ہے۔ آپ نے کہہ جانے کی تیاری شروع کر دی کہ وہ جگہ کو خیر و خیر تھا۔

یہ معاملہ تمام اپنی ذات سے وابستہ نہیں تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا اجڑا ہوا بیٹا تھا جس کی قربانی کا حکم دیا جا رہا تھا اس خواب سے اسے بھی آغا کرنا ضروری تھا۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ بیٹے کو کچھ نہ بتایا جائے لیکن یہ تو دھوکا ہوتا۔ آپ نے سوچا یہ امتحان صرف میرا نہیں اسماعیل کا بھی ہے۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔

کہا جاتا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں پہنچ گئے۔ یہ خیال آئے ہی کہ کچھ دیر بعد اسے اللہ کی راہ میں قربانی کرنا ہے، آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

بیٹے کی نظر باپ پر پڑی تو قدموں سے لپٹ گیا۔ آپ نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آؤ اس ہاتھ پر بیٹھ جاؤ۔ ہم تم سے کچھ باتیں کریں گے۔"

"مگر کیوں نہیں چلتے۔ وہاں اماں بھی ہوں گی۔"

"یہ باتیں ان سے کرنے کی نہیں ہیں۔ صرف تم بن لو۔"

"کیا بات ہے اماں جان۔ بتائیے۔"

"بیٹا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے گلے پر چھری پھیر رہا ہوں۔ تیرا کیا خیال ہے، مجھے یہ کہنا چاہیے؟"

"میں کا آپ کو کچھ ہوا ہے کہ اے! انشاء اللہ آپ مجھ کو صابریں میں پائیں گے۔"

اس کم سن سی بیٹی کی زبان سے ایسے خندہ کلمات سننے تو ایک مرتبہ چھراپ کی آنکھیں پھر آ گئیں۔

"اپنی ماں کو اس خواب کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔" آپ نے فرمایا اور بیٹے کو لے کر گھر کی طرف چل دیے۔

وفا شعار بیوی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پاؤں تک اپنے سامنے دیکھا تو کھل گئیں۔ ہاتھ قدام کر کر رہ بیٹھا۔ کچھ دن آپ کی خیریت دریافت کرتی رہیں۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرتی رہیں۔ پھر آپ کی خاطر مدارات کے لیے اٹھنا چاہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے روک لیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

"میں زور جلدی میں ہوں۔ ایک جگہ جانا ہے۔ اسماعیل کو تیار کر دو۔ اسے بھی ساتھ لے جانا ہے۔"

حضرت ہاجرہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو تیار کر دیا۔ خوشبو لگائی اور اچھی طرح تیار کر کے والد کے حوالے کر دیا۔

"جلدی آجائے گا۔ اسماعیل کے بغیر میرا دل نہیں لگتا ہے۔ اس کے سوا میرا یہاں اور ہے کون۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس چھری اور دوسری چھری کو خوب اچھی طرح چھپایا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور بیٹے کو لے کر گھر سے باہر نکل آئے اور ایسے راستے پر چل کھڑے ہوئے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو کہ کتاب یہاں نبی جرم کے لوگ آباد ہو گئے تھے۔

آپ کے باہر لپکتے ہی ایک بزرگ نما شخص نے دو دروازے پر دستک دی۔ حضرت ہاجرہ اس آواز پر پیر آئیں تو ایک ایسے آدمی کو اپنے سامنے پایا تھے یہاں بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

"باقی ہے تیرا شوہر تیرے بیٹے کو کہاں لے گیا ہے؟"

"اسے کئی دوست سے ملوانے۔"

"تجھے یاد ہے؟ ایک دن وہ تجھے بھی یہاں اسی بہانے سے لایا تھا اور پھر ویرانے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب وہ تیرے بیٹے کو قتل کرنے کے لیے لے گیا ہے۔ دوڑ کے جا اور اس کو روک لے۔"

"میں کیوں جاؤں۔ میرے خدا نے مجھے بھی پیری مدد کی تھی اب بھی کرے گا۔"

حضرت ہاجرہ اس سے باتیں کر رہی تھیں کہ یہ شخص کون ہے اور اتنی بھردری کیوں جتا رہا ہے۔ انہیں اچانک خیال آیا کہ یہ ضرور شیطان ہے۔

"مرد دو تو کھنکھشتاں تو نہیں۔"

چہ مٹا تھا کہ وہ شخص کھڑے کھڑے غائب ہو گیا۔

یہ شخص واقعی شیطان تھا جو انسان کا روپ بدل کر حضرت ہاجرہ کو بہکانے آیا تھا۔

جب اسے یہاں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا قب کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسے پہچان لیا اور مٹی کے پچھلے اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے شروع کر دیے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی باپ کی پیروی کی۔

یہ ادا اللہ تعالیٰ کو کافی پسند آئی کہ قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا شیوہ بنا دیا کہ وہ اسی مقام "مٹی" پر شیطان کو ننگریاں مار دیں۔

آج تک یہ رسم ادا کی جا رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ آپ نے ری نکالی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں ماندہ دیے۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔ شاید اس لیے کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر رنج نہ آجائے۔ ایک چھری چھری تیزی اور آنکھیں بند کر کے بیٹے کی گردن پر چلا دی لیکن چھری نے خراش تک نہ لگائی۔

اسی وقت وہی آگئی نازل ہوئی۔

"اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بے شک اب بہت سخت آزمائش تھی۔ اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ میزہ کا کھڑا ہے اس کو بیٹے کے بدلے ذبح کر۔ ہم نیکو کاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں۔"

آپ نے میزہ حاد کھینے کے لیے اصرار اور دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ببول کا ایک درخت تھا۔ اسی درخت کے ساتھ میزہ حاد تھا اور وہاں تھا آپ نے اسے کھولا اور اس کے گلے پر چھری پھیر دی۔

جیسا کہ قرآنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی قبول ہوئی کہ بطور یادگار ہمیشہ ملت ابراہیمی کا شعار قرار پائی۔

فرمان باری تعالیٰ ہے۔ "ہم نے اس (ابراہیم) کو (بدلے میں) عظیم قربانی عطا کی یعنی ہم نے ابراہیم کو اپنے بیٹے کی قربانی کے بجائے ایک دوسرا نیا نور عطا کیا۔"

حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ اس میزہ سے نے جنت میں چالیس سال چھ اٹھا۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں اس ہرگز باطل اور ان تھا اور وہ محمد آسموں اور نیگوں والا تھا۔

طریقہ کار

اثر نمائی

طریقہ واردات جو بھئی ہو، اثر تو ارادوں میں پوتا ہے... جیسی منشا ہوتی ہے ویسے رستے ملتے ہیں... یہی حال ان کا بھی تھا جو اپنے اصولوں پر کاروبار حیات چلانے کے عادی تھے۔ انہیں دوسروں کی نہ منطق سمجھ آتی تھی نہ منطقی لوگ انہیں اچھے لگتے تھے... البتہ وہ اپنا فلسفہ دوسروں پر تھوپنے کے ماہر تھے اور ان کی یہی مہارت ان کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ مختلف طریقہ کار اختیار کرنے والے ایک ہی منزل کے مسافر نکلتے۔

بہروں پر چہرے بچانے والے ہندوستانی کی دوستی کا سنگین احوال

پندرہ سٹیشن کی بچاس سالہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے پرچم خود ایک آدمی کو کٹس ہوتے دیکھا۔ وہ اپنے سروں کلب کے ہفتہ واری اجلاس میں شرکت کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اجلاس میں اخبار ”دی نیوز“ کے مگر جوش پبلشر اور ایڈیٹر مارٹن نے تقریر کرتے ہوئے پاک و صاف سیاست کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اجلاس ختم ہوا تو اس نے پیدل دفتر جانے کا فیصلہ کیا اور یوں محض اتفاقاً وہ پلٹ کر اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ پلٹ کر اسٹریٹ ایک چھوٹی سی گلی تھی

تو ریت کے مطابق بھی یہ میٹھ جانی تھا۔

”اور ابراہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک میٹھ حاد دیکھا جس کے سینک جھاڑی میں اگے تھے۔ جب ابراہام نے جا کر اس میٹھ سے کوئی کچھ اور اپنے بیٹے کے بدلے کوئی قربانی کے طور پر چڑھا۔“

میٹھ سے تک تو بات ٹھیک ہے لیکن تو ریت کے نزدیک قربانی دینے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے چنانچہ تو ریت میں ہے۔

”ابراہام نے سچ سورے اٹھ کر اپنے گدھے پر چار چاند کسا اور اپنے ساتھ دو چرواہوں اور اپنے بیٹے اسحق کو لایا اور سورہ یسعی قربانی کے لیے لے لیا۔“

”ابراہام نے قربان کا دہانتی اور اس پر کھڑا ہوا۔ اس نے اسحق کو بائعہ حاد اور اسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا۔“

تو ریت کی ہی ایک مہارت اس کی تھی کہ یہ ہے۔

”تب اس (خدا) نے کہا تو اپنے بیٹے اسحق کو جو حیران کن تھا ہے اور جسے تو بیکار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جاہل اسے وہاں پہاڑوں میں سے جوس میں جھے بتاؤں گا سو حق قربانی کے لیے چڑھا۔“

صاف معلوم ہوتا ہے کہ انکو اپنے بیٹے کے ساتھ حضرت اسحق علیہ السلام کا نام بے عمل جوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جس وقت یہ قربانی ہوئی حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی انکو تے بیٹے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے تیرہ سال بعد حضرت اسحق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اگر انگریز اسحق علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو قرآن بھی انکو تو ریت بھی یہ کہتے کہ بڑے کو قربان کر یا چھوئے کو۔ دو بیٹوں کی موجودگی میں ”انکو تے بیٹے“ کہہ کر کیوں غلط کیا جاتا؟

قرآن کی مہارت یہ ہے۔

”بشارت دی ہم نے ان کو برادر لڑکے کی پھر جب وہ اس کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے تو ابراہیم نے کہا اسے میرے بیٹے ابراہیم نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ پس تو دیکھ کیا کہتا ہے؟“ اسے میرے باپ ابراہیم کی بات کا تجھے حکم کیا گیا ہے وہ اگر اللہ نے چاہا تو تجھے میرے کرنے والوں میں پائے گا۔ پس جب ان دونوں نے رضا تسلیم کو اختیار کر لیا اور

پیشانی کے تل اس (بیٹے) کو بچھاڑ دیا۔ ہم نے اس کو پکارا۔ اے ابراہیم اتو نے خواب سچ کر دکھایا۔ بے شک ابراہیم ہی طرح نیک کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بلاشبہ یہ سچی باتی ہوئی آزمائش ہے اور بدلہ دیا ہم نے اس کو بڑے ذبح (میٹھ سے) کے ساتھ اور ہم نے

آنے والی نسلوں میں اس کے حقیقی بیٹے باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو۔ اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہے اور بشارت دی ہم نے اس کو اسحق علیہ السلام کی جوئی ہوگا۔“

اس مہارت کے مطابق حضرت اسحق علیہ السلام کی بشارت دی جا رہی ہے۔ ابھی وہ پیدا نہیں ہوئے یعنی انکو تے اسماعیل ہی ہیں جن کی قربانی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

دراصل تو ریت کے نصوص میں تحریف کی گئی ہے اور اسحق کا نام جوڑ دیا گیا ہے۔

ابلی کتب کو دراصل اس بات پر حسد ہے ابراہیم کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام عرب کے باپ ہیں اور انجی میں سے پیغمبر آخر الزماں ﷺ ہیں جبکہ حضرت اسحق، حضرت یعقوب کے والد ہیں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب حضرت اسرائیل تھا جس کی طرف بنی اسرائیل منسوب ہیں۔ اس وجہ سے بنی اسرائیل نے چاہا کہ یہ شرف دہر جہاں بنی طرف چھٹا لیں۔ اس مذہب مقتصد کے حصول کے لیے انہوں نے تو ریت میں تحریف کر دی۔

حضرت محمد رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عالم سے جو مسلمان ہو گیا تھا یہ چھا کہ ابراہیم کے دو بیٹوں میں سے کس کے لیے ذبح کا حکم دیا ہوا تو اس نے کہا۔ ”اے امیر المؤمنین! وہ اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہود اس کو جانتے ہیں لیکن تم عربوں پر حسد کرتے ہو کہ تم کو تمہارے باپ کی وجہ سے یہ شرف حاصل ہو۔“

(ہارڈی)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ نوریت۔ حضرت ابراہیم از علامہ عباس محمود

جس میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے ٹھک و تاریک مکانات واقع تھے۔ پریسٹن نے ایسے ہی ایک مکان سے ایک عورت اور تین مردوں کو نکلے دیکھا۔ ابھی یہ چاروں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ ایک قریبی موڑ پر بہت تیزی سے آتی ہوئی ایک پولیس کار نمودار ہوئی۔ کار سے ایک پارسا سائرن بجایا گیا جو اس بات کا انتہاء تھا کہ گلی میں چلتے والے اپنی جگہ رک جائیں لیکن سائرن سننے ہی ان چاروں نے مختلف سمتوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔

کار کچھ ہی دوڑ چکی تھی دونوں اطراف سے نکل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ ایک مرد اور عورت واپس اس مکان کی طرف لپکے جہاں سے وہ نکلے تھے۔ باقی دوسرے جنوب کی طرف بھاگے۔ پریسٹن سے جس وحشت اپنی جگہ کھڑے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ عورت بڑے اضطراب کے عالم میں مکان کا مستقل دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا ساتھی مکان کے قطعی آہنی زینے کی طرف بڑھا وینکلیو نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عورت ایک چنگی مار کر اس سے لپٹ گئی۔ وینکلیو نے کبھی مار کر عورت کو پیچھے دھکا دیا اور پھر بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک زبردست گھونسا مارا گھونسا نشانے پر لگا۔ عورت تکلیف سے کراہتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ وینکلیو نے پلٹ کر آدمی کی طرف جھٹ لگا کر اسے پکڑ لیا اور جب اس نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکالنے کی کوشش کی تو ریح اللور کا دست آتی زور سے اس کے سر پر مارا کہ وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

دوسرا وینکلیو جو کہ باقی دوسروں کے پیچھے بھاگ رہا تھا، جلد ہی ان میں سے ایک کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس اسکو کو اپنے سر پر دھینچے ہی اس آدمی نے جلدی سے خود پھر دیگی کے اندر زمین اپنے دونوں ہاتھ سر کے اوپر بلند کر دیے۔ وینکلیو نے ریح اللور کے دستے سے اس کے سر پر ایک بھر پور ضرب ماری۔ وہ آدمی ہاتھوں اور گھٹنوں کے شل زمین پر گر گیا۔ اس کے سر سے خون نکلنے لگا تھا۔ دوسرا آدمی جو آگے بھاگ جا رہا تھا اب سڑک کے موڑ کے قریب کچھ چکا تھا۔ وینکلیو نے لٹکار کر اسے رکنے کا حکم دیا اور جب وہ نہیں رکا تو نشانے لیتے ہوئے کوئی چلا دی۔ پریسٹن نے فائر کا دھماکا سنا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کوئی گولی اس طرح اس بھاگنے والے آدمی کے گئی، کس طرح وہ اچھلا گھٹنوں کے شل چکا اور ایک لمحہ اس حالت میں رہنے کے بعد بے جان ہو کر زمین پر گر گیا۔

اس وقت تک گلی میں لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ پریسٹن نے موقع واردات پر جانے کے لیے سڑک پار کرنا چاہی تو ایک پولیس مین نے اس کا راستہ روک دیا۔ دوسرے افراد کو بھی جانے سے روک رہا تھا۔ پریسٹن نے تیز نظروں سے پولیس مین کو گھورا۔ آج وہ ایک پولیس والے کو بالکل نئی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ وہی دل میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہ تیزی سے گھبراہٹ و جھجکاؤ کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے قریبی ڈرگ اسٹور کی جانب بڑھنے لگا جہاں سے وہ اخبار ”دی میوز“ کھنڈ کرنا چاہتا تھا۔

اگلے دن کینٹن براڈوی سینٹرل پولیس اسٹیشن میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اخبار ”دی میوز“ کی ایک کاپی پڑی تھی اور انکھروں کے سامنے وہ صفحہ کھلا ہوا تھا جس پر ادرار پتھر تھا۔ اخبار کی یہ کاپی اسے پولیس کمانڈر کرنل اسٹیڈ نے دی تھی جو اس وقت کافی فیسے اور جوش کے عالم میں کینٹن کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

”کینٹن۔“ وہ تیز لہجے میں بلا۔ ”ادارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ کہاں تک سچ ہے؟“

پتھر ادرار یہ اس وقت زیر بحث تھا، اس کا عنوان تھا۔ ”ہماری پولیس کی لاقانونیت“۔ یہ ادارہ اخبار کے چیئر مین اور ایڈیٹر مارٹن نے بذات خود تحریر کیا تھا۔ اس میں اس حادثے کی تفصیلی تصویر کشی کی تھی جو گزشتہ دن پریسٹن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ادارہ میں بڑے سخت الفاظ میں سارا جٹ ٹوٹا اور وینکلیو پر میکیک کے طرز عمل کی مذمت کی گئی تھی۔ یہ دونوں آفسر اس حادثے میں ملوث تھے۔ ایڈیٹر نے اس پر نہیں کیا تھا بلکہ ماضی کے کئی واقعات کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔ جن میں متعدد پولیس آفیسروں نے لاقانونیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے ایڈیٹر مارٹن نے ایک مثال دی تھی کہ کسی طرح ماضی پر معاش۔۔۔ اخبار اخبار ”دی میوز“ کی کوششوں کے باعث پکڑا گیا ہے اور کس طرح انگریز کی تھی۔ اسٹیل جو کہ اب اخبار کی پتاہ میں تھی، اس بد معاش کے خلاف گواہی دینے اور اس کا کچا چھایا بیان کرنے پر آمادہ ہے۔ مارٹن نے لکھا تھا کہ یہ کامیابی اسے صاف سحر ہے، قانون کے اندر رہتے ہوئے تحقیقات کے ذریعے حاصل ہوئی ہے نہ کہ پولیس کی طرز کسی سخت گیر یا غیر قانونی کارروائی کے نتیجے میں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پولیس وینکلیو کی اپنی موجودہ رویہ اختیار کرنے میں ہرگز متنبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ادارہ کے

آفسر مارٹن نے سنے تاحر دو پولیس کمانڈر کرنل اسٹیڈ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ سارا جٹ ٹوٹا اور وینکلیو پر میکیک اور اس جیسے پولیس افسران کے خلاف ضروری کارروائی کریں اور اس بات کا پورا خیال رکھیں کہ آئندہ پولیس یا عوام دونوں میں سے کوئی اپنی قانونی حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

”تقریباً سچ ہے۔“ کینٹن براڈوی نے تنبیہ کی سے جواب دیا۔

”مگر میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔“ کرنل اسٹیڈ نے زور دے کر کہا۔ ”ان دونوں آدمیوں کو بلاؤ۔ میں انہیں فوراً معطل کرنا چاہتا ہوں۔“

”ڈراما سکون سے کام لو۔“ کینٹن بولا۔ ”ٹوٹا اور میکیک دونوں ایک بہت اہم کیس کے سلسلے میں آج تک قیے سے باہر چلے گئے ہیں اور میں کم سے کم دو دن تک ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی انہیں معطل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دراصل ہمیں اس معاملے کے تمام حقائق کا علم نہیں ہے۔“

”اور تمہیں ہے؟“ معلوم ہے کہ تم یہاں اس کرسی پر بیٹھ کر ان قاتلوں کا دفاع کر رہے ہو۔“ کرنل اسٹیڈ چیخا۔ ”کیا تمہیں جانتے کہ اس میکیک نے ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا، گھونسا مارا، اس کا منہ لہان کر دیا اور پھر انتہائی بے رحمی سے اس کے ساتھی کو سر پر ضرب مار کر بے ہوش کر دیا۔ جبکہ سارا جٹ ٹوٹا نے ایک ایسے شخص کو زخمی کیا جو بغیر کسی تشدد کے اپنے آپ کو قانون کے پیرو کرنا چاہتا تھا اور پھر دوسرے شخص کو گولی مار کر مارنے کے بجائے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور گولی بھی اس کی پیٹھ میں ماری۔ کیا یہی ہے وہ وینکلیو جو ریح اللور کی موت میں کام کر رہا ہے۔“

کینٹن براڈوی دونوں ہاتھوں کے درمیان اپنا سر پکڑے کرنل اسٹیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا پھر وہی بھی قسم کے جذبات سے خالی تھا۔

”میری ماتحتی میں اس ملک کا ایک بہترین وینکلیو پتھر ریح اللور اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور اگر تمہیں ہٹھ سے دل سے میری بات سنو تو میں تمہیں ایسے حقائق بتاؤں جنہیں جو ان مارٹن اپنے جڈ باقی ادارہ میں دانستہ نظر انداز کر گیا ہے۔ وہ بد معاش جن کے لیے تم اس قدر تڑپا رہا ہے ہو سائل کے گروہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس عورت کا نام مینی ہے، نا جائز نشیات کی عادی۔ اس کا پولیس ریکارڈ قہارے تصور سے بھی زیادہ طویل ہے گزشتہ ماہ سینٹ لوئیس میں جب اس کے ساتھی ایک گاڑی کو

اپنی اذیت پسندی کا نشانہ بنا رہے تھے تو یہ عورت گاڑی کے نکلے پھروں کو پھینکے ہوئے سگ سے داغ کر گئی تھی بلکہ گریہ بھی اٹھی اور جب بالآخر انہوں نے اس گاڑی کو کھینک کر وہاں عورت نے اس کی پیشانی پر اپنے ہوسے کی مہر ثبت کی۔ بڑی محبت کرنے والی خاتون ہے۔۔۔ اس کا ساتھی جسے میکیک نے ریح اللور کے دستے سے مارا تو وہ تین کل کر چکا ہے اگر ان دونوں کا بس چل جاتا تو وہ میکیک کو اپنے واپسوں سے کچا چٹا لیتے۔ سارا جٹ ٹوٹا کے حصے میں آنے والے دو بد معاشوں کا حال اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ جس آدمی کو اس نے کوئی ماری اس کا نام ساگل تھا۔ وہ ایک ڈاکو اور بہت سے بے گناہوں کا قاتل تھا جن میں ایک پولیس افسر بھی شامل ہے اگر اسے مارا نہ جاتا تو وہ فرار ہو جاتا اور نا معلوم اور کتنے بے گناہوں کا خون بہاتا۔ وہ دوسرا اٹھلا ٹوٹی جو قہارے بھول بغیر کسی تشدد کے خود کو پولیس کے حوالے کر رہا تھا، تشدد پسندی میں ماہر ہے۔ گروہ کے ہاتھوں میں پڑنے والے بد قسمت افراد کے لیے اذیت رسانی کے نٹ سے طریقے وہی ایجاد کرتا ہے اور ان پر اپنے سامنے حملہ آور کر دیتا ہے۔“

”اگر ساگل انتہائی برا اور خطرناک آدمی تھا تو اسے کیفر کر دیا تک پہنچانے کے لیے عدالت میں پیش کیا جانا چاہیے تھا۔“ کرنل اسٹیڈ نے کہا۔ ”جس طرح اب اس بد معاش انگریز پر مقدمہ چلایا جائے والا ہے۔“

”انگریز بھی تک عدالت میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔“ کینٹن براڈوی نے سر دھچکے میں بتایا۔ ”اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم معقول تعداد میں پولیس فورس کے ساتھ نیچے اسٹریٹ کے اس مکان اور خانوشی سے گرفتار کر لیتے مگر ہوا یہ کہ الامکان سکون اور خانوشی سے ایک خاص تجربے کے اطلاع کی کہ ساگل اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اس مکان میں چھپا ہوا ہے اور بہت جلد وہاں سے کسی دوسری جگہ فرار ہو رہا ہے۔ ٹوٹا نے پولیس اسٹیشن فون کیا، تو یہاں صرف وینکلیو میکیک ہی موجود تھا۔ وہ دونوں فوراً نیچے اسٹریٹ پہنچے اور جیساکہ بعد میں ثابت ہوا میں وقت پر پہنچے۔ ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ سب کے سب دوبارہ پولیس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ سارا جٹ ٹوٹا یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہاں صرف یہی چار آدمی تھے یا کچھ اور بھی چھپے ہوئے ہیں۔ موقع ملنے پر ان میں سے کوئی بھی کل کرتے نہیں چھپاتا۔ ان حالات میں اس نے وہی کیا جو بہتر اور مناسب تھا۔“

”کچھ بھی کسی مگر یہ لوگ بہر حال انسان تھے۔“
 کرل اسٹیڈ اب بھی اپنی بات پراڑا ہوا تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ٹویڈ اور میکلیک کو بلا تاخیر معطل کر دیا جائے۔ میں جمہوری ان وضاحتوں سے مطمئن نہیں ہوں، بہتر ہوگا کہ ہم لوگ ابھی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ تم کسی طرح اپنا شعبہ انتظام چلائے ہوئے بلاشبہ جمہوری ذمہ داری ہے اور میں بلاوجہ تمہارے معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتا، لیکن جب تک میں پولیس کسٹرو ہوں اور اس اعتبار سے عوام کے سامنے جواب دہ ہوں۔ تمہیں اور تمہارے تمام ماتحتوں کو ہر معاملے میں قانون کی پابندی کرنا پڑے گی۔“

”تم ایک کامیاب بزنس مین ہو کر گئے۔“ کیتھن نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی یہ مشکل تین ہفتے گزرے ہیں کہ سب نے تمہیں پولیس کسٹرو نامزد کیا ہے اور پولیس کے ساتھ کام کرنے کا تمہارا تجربہ بھی صرف تین ہفتے پرانا ہے جبکہ میں تیس سال سے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر رہا ہوں۔ میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کا چیف ہوں کیونکہ میرے بارے میں یاد کیا جاتا ہے کہ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پکچا کرتا ہوں۔ اب تم تین ہفتوں کے تجربے کے ساتھ ایک اخبار کا جذباتی، حقائق سے گریزاں ادارہ پر پڑھ کر میرے دفتر میں قدم رکھتے ہو اور مجھے بتانا چاہتے ہو کہ میں کس طرح اپنے فرائض انجام دوں۔“

کرل اسٹیڈ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔
 ”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ تم تیس سال سے پولیس میں ملازم ہو یا تین سو سال سے۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر پورا زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جو آدمی بھی قانون شکنی کرتا ہے وہ مجرم ہے، خواہ اس کے بازو پر پولیس کا کوئی بیج لگا ہوا نہ لگا ہو، تم اس مجھے کام ان ہی قوانین کے مطابق چلانے کے پابند ہو کیتھن، جن کی وقاداری کا تم نے حلف اٹھا یا ہے ورنہ خدا کی قسم میں دیکھوں گا کہ تم کب تک اس کرسی پر بیٹھ رہ سکتے ہو۔“

کیتھن براڈلی نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے کندھے پر چپکا لیا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم پولیس کسٹرو ہو۔ جس طرح چاہو گے اس طرح کیا جائے گا۔“
 ”میرے آفس میں اخباری نمائندے سرکاری بیان جاری کرنے کے شہر ہیں۔“ کرل اسٹیڈ نے کسی قدر نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں یہی بیان دوں گا جو اس وقت تمہیں بتا رہا ہوں کہ ٹویڈ اور میکلیک کو معطل کر دیا جائے

گا اور آئندہ اس مجھے کے افراد خواہ وہ افسران ہوں یا عام پولیس کانسٹیبل، قانون کے نفاذ میں اس کی حرف بہ حرف پابندی کریں گے۔“
 جب کرل اسٹیڈ چلا گیا تو کیتھن براڈلی نے ٹیبل بھا کر اپنی بیک بٹری کی بجلی کو بلا یا اور اسے ہدایت کی کہ وہ سارجنٹ ٹویڈ اور میکلیک کو بلا تاخیر اس کے پاس آنے کی ہدایت کرے۔ کچھ ہی دیر کے بعد آفس کے باہر ایک کشتی پولیس کار کے آواز سنائی دی۔ کیتھن اس آواز سے مانوس تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ کشتی کا نمبر سات ہے، اس کا اندازہ درست تھا کیونکہ فوراً ہی آفس کا دروازہ کھلا اور ٹویڈ اور میکلیک اندر داخل ہوئے۔

”ابھی کرل اسٹیڈ آیا تھا۔“ کیتھن نے ان دونوں کو بتایا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم دونوں کسی جگہ چھل کے ٹھہر چلے جاؤ۔“ میکلیک کے ہوتوں پر ایک طنزیہ ہنسی نمودار ہوئی۔ اگرچہ اسے کبھی باڈی چھوڑے ہوئے تیس برس سے زیادہ مدت ہو چکی تھی، لیکن وہ اب بھی اپنے چہرے سے کوئی دیہانتی ہی نظر آتا تھا۔
 ”جب بھی کوئی بلا کسٹرو آتا ہے ہمیں چھل کے ٹھہر چلے جانا پڑتا ہے۔“ وہ بولا اور ٹویڈ کی طرف دیکھا۔ ”اس مرتبہ کہاں چلو گے؟“

”اگر میری جین میں ڈیڑھ سال باقی نہ رہ گیا ہوتا۔“ ٹویڈ نے جواب دیا۔ ”تو میں سیدھا اس اخبار کے دفتر جاتا اور اس مارٹن کے بچے کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا۔“ اس نے اپنی بغل سے ”دی نیوز“ کا تازہ پرچہ نکالا۔ ”میں تقریباً تیس برس سے اس قسم کی تحریروں کو پروا نہ کرتا ہوں اور اب میرا تین سو برس کا چہرہ بڑھ چکا ہے۔“

”تمہیں تو اب تک اس کا عادی ہو جاتا چاہیے تھا۔“ کیتھن نے جواب دیا۔ ”مجھے سے کسی بھدروی کی امید مت رکھنا، میرے لیے میری اپنی۔ پریشانیاں ہی بہت کافی ہیں۔ اب آئندہ ہم کبھی چھپا مارا نہیں کے تو پہلے ہمیں حاشی کا وارنٹ حاصل کرنا ہوگا۔ سوائے اس صورت کے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے کوئی جرم ہوتے دیکھو۔ آئندہ کسی کو بغیر وارنٹ گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ گرفتاری کے فوراً بعد تمام مشکوک و مشتبه افراد کو قید کیا جائے گا، انہیں پولیس اسٹیشن کی حوالات میں نہیں رکھا جائے گا اور ہر قیدی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کرے تو اس سے جبراً کوئی بات نہیں اٹھوائی جائے۔“

میکلیک نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔

”مگر ہمارا انگلش اس امر ازل میں کام نہیں کر سکتا۔“ وہ بولا۔
 ”میں جانتا ہوں۔“ کیتھن نے اذیت میں سر ہلایا۔
 ”مگر کرل اسٹیڈ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہے۔ میں صرف ایک دفتر میں ملازم ہوں۔ ہمیں یا تو وہی کچھ کرنا پڑے گا جو وہ کہتا ہے یا پھر اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو کر پڑیں گے اور میں اب اتنا بڑھا ہوا ہوں کہ حتمی یا بہرہ روزگاری کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بہر حال زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرل جلد یا بدیر اپنا سبق سکھ لے گا۔“

”ضرور مگر اس دوران میں۔“ ٹویڈ نے کہا شرع کیا لیکن کیتھن نے اس کی بات کاٹ دی۔
 ”اس دوران میں ہم احکامات کی پابندی کریں گے۔“ وہ بولا۔ ”مجھے یاد ہے کہ جب میں خانا ملازم ہوا تھا تو ہمارا کسٹرو ایک ایسا ہی آدمی تھا جیسا کرل اسٹیڈ، جسے اسلامی معاشرے کی ایک تحریک کے تحت میں کسٹرو مقرر کیا گیا تھا۔ ہماری ایک ٹھکانہ پانچویں قے کی کسی شہری کو اس وقت تک شراب کے نشے میں نہ بھجا جائے جب تک وہ ہمیں کسی گٹرو وغیرہ میں پڑا ہوا نہ لے لیکن اس نے کسٹرو نے۔ میں اس وقت اس کا نام بھول رہا ہوں۔ یہ ہم جاری کیا کہ تمام شہریوں کو گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کیا جائے اور شرابی کی تعریف ہے کہ پولیس کانسٹیبل اس کے منہ سے شراب کی بدبو آتی ہوئی محسوس کر لے۔“

”معلوم ہوتا ہے وہ بھی اتنا ہی بے خبر تھا جتنا کرل ہے۔“ ٹویڈ مسکرایا۔
 ”اس زمانے میں بوڑھا ریلوے پولیس چیف تھا۔ چنانچہ اس نے ہم سب کو بلا کر ضروری ہدایات جاری کر دیں۔ اب اتفاق سے کسٹرو کا یہ حکم جمعرات کے دن آیا تھا۔ پہلے کی رات کو تمام چھپانیاں پکھیل کر سب کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دے دیا گیا اور ہم سب پولیس اسٹیشن سے اٹھ پڑے۔ جیسے ہی ہمیں اسٹیٹسٹاؤں کے خوش ہونے ہمارا عمل شروع ہو گیا۔ پولیس کے جوانوں نے ہر اس شخص کو گرفتار کیا جس کی سانس سے ذرا بھی شراب کی بو محسوس ہوئی۔ ان گرفتار شدگان میں خود ڈسٹرکٹ انٹاری اور میئر کا والد بھی شامل تھے۔ عدالتیں اور دفاتر ہفتہ اتوار کے لیے بند ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ سب جہ کی میج تک جیل میں بند رہے نتیجہ اس کا ردوائی کا یہ ہوا کہ پورے قصبے میں نئے کسٹرو کا مذاق اڑایا گیا۔ اس پر آئی ٹیلیڈ کی کسی اس نے گگ آکر اپنے عہدے سے استعفا دے دیا اور اس کے بعد پھر

وہی پانچویں چالو ہوئی کہ کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک نہیں سمجھا جائے گا کہ اس نے شراب پی ہے یا شراب کے نشے میں ہے جب تک وہ گٹر میں پڑا ہوا نہ پایا جائے۔“ اتنا کہ کیتھن کچھ دیر کے لیے رکا اور پھر ٹویڈ اور میکلیک کی طرف دیکھا۔
 ”اب تم یہاں سے رو پھر ہو جاؤ۔ ایک دو دن کے لیے کسی کو نظر نہ آنا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن یہی کے پاس کوئی ایسا فون نمبر چھوڑ جاؤ جہاں میں ضرورت پڑے تو ہم سے رابطہ قائم کر سکیں۔ اس درمیان میں ممکن ہے کچھ ایسے واقعات پیش آجائیں کہ ہم دوبارہ اپنے معمول کے مطابق کام کرنے لگیں۔“

☆ ☆ ☆
 پھر واقعی ایک ایسا حادثہ پیش آیا۔ کیتھن کی توقع سے بھی کچھ پہلے، اخبار میں ”ہماری پولیس کی لاٹھوٹیت“ کا ادارہ یہ شائع ہونے کے چھپس گھنٹے کے اندر اندر اس کے معصہ اخبار کے ایڈیٹر مارٹن کو اغوا کر لیا گیا۔ کرل اسٹیڈ کا پیغام پانچ کیتھن براڈلی ایڈیٹر جی اسپتال پہنچا جہاں اس نے مارٹن کی موجودگی کی سوسے ہوئے ہوتوں سے اس اغوا کی داستان سنی۔ وہ بیڈن میں بیٹی ہوئی ایک پٹنگ پر لٹی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی تکلیف کم کرنے کے لیے اسے سکون کی دوا کا ایک انجکشن دے دیا تھا۔

”میں اور مارٹن تھیں دیکھتے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”جب وہاں میں مارٹن نے گیریج کے سامنے کاررو کی اور گیریج کا دروازہ کھولنے کے لیے نیچے اتر اٹھا تو پانچ باڑھ کے تار یک سالیوں سے تین آدمیوں نے نکل کر اسے گھیر لیا۔“ اس نے ایک سکیالی۔

”پھر کیا ہوا؟“ کیتھن نے نرمی سے پوچھا۔
 ”انہوں نے مارٹن کو پکڑ لیا۔ میں اس کی مدد کے لیے دوڑی۔ ایک آدمی نے میرے بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کوئی چیز میرے منہ اور ناک پر ماری۔ میں نے مارٹن کو غصے میں تھیز تھیز لے لیا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی نے میرے سر پر ہاتھ ضربیں لگائیں شروع کیں اس کے بعد میں بے ہوش ہوئی۔“

”مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں کو پکچان لو گی۔“ کرل اسٹیڈ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے پوچھا مارٹن کی بیوی نے قتل میں سر ہلایا۔
 ”وہاں بہت زیادہ اندھیرا تھا۔“ اس نے کہا۔
 ”پریشان مت ہو، مارٹن! کرل نے ایک لگا

کیپٹن براڈی پر ڈالے ہوئے کہا۔ ”جیسے تمہارا شوہر ضرور واپس ملے گا، میں ذاتی طور پر خود اس کیس کا چارج لے رہا ہوں۔“

”اوہ شکریہ۔“ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم اسے ان لوگوں کے قبضے سے ضرور چھڑا لاؤ گے کرنل، مارٹن کو تم پر اعتماد ہے اور وہ تمہاری بہت تحریف کرتا ہے۔“

”اگر تم انہیں شامت نہیں کر سکتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیپٹن براڈی نے بستر پر جھٹے ہوئے پوچھا۔

”لیکن ڈرامور سے سوچ کر جواب دو کہ کیا ان میں سے کسی نے کوئی بات کی تھی؟“

”میرا خیال ہے کہ ان میں سے کسی نے مارٹن کے ادارے کے بارے میں کچھ کہا تھا۔“ مسز مارٹن نے ہلکے پھلکے ہوئے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ کیپٹن نے بہت افزائی کی۔ ”اب یہ بتاؤ کہ یہ محفل کسکی خاص لہجے میں کی گئی تھی مثلاً سرسری طور پر یا جوش کے ساتھ جیڑی ہے؟“

”مجھے تو معمولی ہی آواز لگی تھی اور لہجے میں بھی کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا۔“

مسز مارٹن سے کوئی اور بات معلوم نہ ہو سکی۔ ہیز کوڈر واپس جاتے ہوئے کرنل اسٹیڈ براہ راست موضوع پر بول رہا تھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ اب انخوائسنگ گان کی جانب سے مطالبہ ذکر کا کوئی خط وغیرہ موصول ہوگا۔“ اس نے کہا۔

”مارٹن بہت دولت مند آدمی ہے۔ ہمیں ہر وقت چھکارا ہے کی ضرورت ہے۔“

اس نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔

”ممکن میری بات سے اتفاق ہے یا نہیں؟“

”مجھے سے کیا پوچھ رہے ہو، اس کیس کا چارج تو تم نے لے لیا۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”مگر تم غلط اندازہ لگا رہے ہو۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو مارٹن کا انخوائسنگ کے اس ادارے کا براہ راست نتیجہ ہے، جس پر ہم بڑے جوش میں آگئے تھے۔ مسز مارٹن نے ان لوگوں کو ادارے کے بارے میں جو باتیں کرتے سنا ہے، اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔“

”ذرا وضاحت سے بتاؤ۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”بہت خوب۔“ کیپٹن سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”دی نیوز نے اپنی اشاعت بڑھانے کے لیے ایک پبلیٹی مہم شروع کر رکھی ہے اور مارٹن اپنے نظریات پر لوگوں کو ہم نوا بنانے

کی کوشش کر رہا ہے، وہ ابھی نو جوان ہے اور دوسرے بہت سے افراد کی طرح اسے ابھی زندگی سے بہت کچھ سمجھنا ہے۔ بہر حال پبلیٹی کے خیال سے اصول پرستی کے پروپیگنڈے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مارٹن نے اپنے اداروں میں انگریزوں کے گروہ کی خبر لینا شروع کر دی۔ غواہی راستے اس پبلیٹی سے متاثر ہوئی اور یہ وہاں اس حد تک بڑھا کہ ایک سنس ڈسٹرکٹ اتارنی کا احباب محل میں آیا اور ایک سنس پولیس کسٹمر کا تقرر کیا گیا۔“

”کیپٹن، مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تم۔“

”مجھے امید بھی نہیں تھی کہ تم اسے پسند کرو گے۔“ کیپٹن نے کندھے سے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے میری رائے تو سنی تھی اور وہی میں بتا رہا ہوں۔ نام نہاد اصلاح کی اس مہم کے دوران اخبار ”دی نیوز“ نے کچھ ایسے ثبوت و حواہی حاصل کر لیے جن کی بنیاد پر انگریز کے خلاف کارروائی کی جاسکتی تھی۔ خاص طور پر اس کی جو یہ اسٹیلا کا بیان جو اس نے انگریز کے خلاف دیا تھا۔ اگر وہ یہ بیان عدالت کے سامنے حلف اٹھا کر دے دے تو انگریز کو موت کی سزا ہو سکتی ہے سوائے اس صورت کے کہ خود اسٹیلا کو کوئی حادثہ پیش آجائے اور وہ بیان نندے سکے، انگریز کے بیچے کا کوئی امکان نہیں۔“

”کیا بیکار ہاتھیں کر رہے ہو۔“ کرنل نے ناگواری سے کہا۔ ”اسے کوئی حادثہ کس طرح پیش آسکتا ہے اور اسی اندیشے کے پیش نظر اسٹیلا کو ہمیں یہ حفاظت چھپا دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ خود انگریز بھی جیل میں ہے۔“

”اگر تمہیں یاد ہو تو مارٹن نے ٹھیک یہی کہو اس اپنے ادارے میں بھی کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ پر اعتماد کرنے کے بجائے اخبار ”دی نیوز“ نے خود اسٹیلا کی حفاظت کی فتنہ داری لے لی ہے اور اخبار نے اسے یہ حفاظت چھپا رکھا ہے تاکہ مقدمے کے دوران عدالت میں پیش کر سکتے۔ یہ اس کی حماقت تھی کہ اس نے اپنے جوش میں انگریز کے گروہ کو وہ بات بتادی جس کے بارے میں وہ ابھی شک و شبہ میں مبتلا تھے انہیں جتنی طور پر نہیں معلوم تھا کہ اسٹیلا کس کے پاس ہے۔ یہ جتنی اطلاع مارٹن نے انہیں فراہم کر دی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت بھی انگریز کے آدمی مارٹن پر جبر و تشدد کر رہے ہوں گے کہ وہ انہیں اسٹیلا کا پتا بتا دے۔ اب چونکہ اس کیس کا چارج تمہارے پاس ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ پہلے اس کی فکر کرو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ مارٹن نے اسٹیلا کو کہاں رکھا ہے؟“

”نہیں۔“ کرنل نے غمی میں سر ہلایا۔ ”یہ بات مارٹن

نے صرف اپنی حد تک رکھی ہے۔“

اس نے کیپٹن کے مزید کچھ کہنے کا انکار کیا اور جب وہ خاموش رہا تو خود اس نے سوال کیا۔ ”انگریز کے گروہ میں اس کا نائب سرور کون ہے؟“

”ایک اور یہ معاش جس کا نام ڈونووان ہے۔“ کیپٹن نے بتایا۔ ”انگریز جیل سے اپنے احکامات اپنے وکیل ریکارڈ کے ذریعے بھیجتا ہے اور ڈونووان ان پر عملدرآمد کراتا ہے۔“

”کیپٹن، معلوم ہے کہ یہ آدمی ڈونووان کہاں رہتا ہے؟“ کرنل نے پوچھا۔

”ہم چاہیں تو اس کا پتا لگ سکتے ہیں۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ ”صرف اپنے تجربوں سے بات کرنا ہوگی۔“

”اسے فوراً ہیڈ کوارٹر بلاؤ۔“ کرنل نے ناگواری سے کہا۔ ”اور کیپٹن! میں چاہتا ہوں کہ انگریزوں کے ذریعے کام لینے کا طریقہ ایک دم ختم کر دیا جائے۔ یہ ای لوہیت کی چیز ہے جس طرح حق و باطل ڈگری۔ اسکا بائیں جھکے کی ٹیکہ نامی کو دھبا لگتی ہیں۔“

کیپٹن کو ڈونووان کا پتا لگنے اور اسے ہیڈ کوارٹر پکڑ کر لانے میں دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے۔ اور چونکہ اب قانون پر حرف بہ حرف عمل ہو رہا تھا اس لیے ڈونووان کا وکیل ریکارڈ بھی اس کے ساتھ تھا۔ پولیس کسٹرنے سوال و جواب کی ذمہ داری خود اپنے سر لے لی۔

”دیکھو ڈونووان، میں تم سے بچ بولنے کی توقع رکھتا ہوں۔“ کرنل نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم انگریز کا دایاں ہاتھ ہو۔“

”یہ انگریز کون ہے؟“ ڈونووان نے آنکھیں چندھیا تے ہوئے پوچھا۔ کرنل کو یہ دانست تھا کہ ناگوار کر رہا۔

”انجمن بننے کی کوشش مت کرو۔“ وہ ہمیں یہ بھیس ہو کر بولا۔ ”دی نیوز کے ایڈیٹر مارٹن کو کڑی رات اٹھا کر لیا گیا ہے اور ہمیں شہر ہے کہ اس میں تمہارا کچھ نہ کچھ ہاتھ خروہ ہے۔“

ڈونووان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کا وکیل ریکارڈ بول اٹھا۔

”کوئی جواب مت دینا۔“ اس نے اپنے موکل کو مشورہ دیا اور پھر کسٹرن کی طرف دیکھا۔ ”سنو کرنل تم میرے موکل پر کوئی الزام تراشی نہیں کر سکتے۔ وہ یہاں اس لیے آیا ہے کہ تم نے اسے بلایا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم

دو دن کے کسی بھی گوشے میں اور ملک کے کسی

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سپنس ڈائجسٹ

ماہانہ پاکیزہ ناہائے سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (شمول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے امریکا، انڈیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے لیے ہونے والے رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے لینے والے بہترین فیڈ بک ہو سکتا ہے۔ ہر دن ملک سے قارئین صرف ویٹرن یونین یا می گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمایا۔

ڈیپلڈ خمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C، 11/11، سیکشن 11، نزدیکی انارکلی، لاہور، پاکستان
فون: 35802551، 35895313، فیکس: 35802551

اسے اپنے کسی جال میں پھانسنے کی کوشش کرو۔"

"یہاں کوئی ڈوڈووان کو کسی جال میں پھانسنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔" کرنل اسٹیو نے ہنسے سے کہا۔ "ہم صرف سچائی جانتا چاہتے ہیں۔"

ڈوڈووان کے پیروں پر ایک طنزیہ تاثر نمودار ہوا ہی تھا کہ کپٹن براڈی کی سخت نگاہیں دیکھ کر غائب ہو گیا۔

"بہر حال میرا موکل اس بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔" ریکارڈر بولا۔ "اور اگر ہمیں صرف اتنا ہی کہنا تھا تو ہم اب اجازت چاہتے ہیں۔" وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

کرنل اسٹیو کا چہرہ ہنسے سے سرخ ہو گیا۔

"نہرو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تم دونوں کے ساتھ پوری صفائی اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش آنا چاہا تھا لیکن اگر ڈوڈووان نے میرے سوالات کا جواب نہیں دیا تو میں اسے گرفتار کرنے کا حکم دے دوں گا۔"

"کس جرم میں؟" ریکارڈر نے چیلنج کیا۔

"اگر تم سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی اور اہم آدمی کو تلاش کرو۔" ڈوڈووان نے تڑپتی سے کہا۔

"میرے خلاف تم کوئی بھی الزام ثابت نہیں کر سکتے۔"

"اس آدمی کو گرفتار کر لو کپٹن۔" کرنل چلا آیا۔

کپٹن براڈی اپنی کرسی سے اٹھا۔ ڈوڈووان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ کپٹن نے دفعتاً اپنی جیب پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو ڈوڈووان گھبرا کر ایک کرسی سے اٹھتا ہوا پیچھے ہٹا مگر کپٹن نے اپنی جیب سے صرف رومال نکالا تھا۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔" ڈوڈووان سینہ تان کر بولا۔ لیکن جیسے ہی کپٹن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ سکڑ سا گیا۔

"گھبراؤ نہیں ڈوڈووان۔" ریکارڈر نے اپنے موکل کو تسلی دی۔ "آپنا ہتھ بند رکھنا۔ میں ایک لمحے کے اندر ہمیں آزاد کرالوں گا۔"

اس نے اپنا ہیٹ اور دستاں اٹھائے اور طنز آمیز انداز میں کپٹن اور کرنل اسٹیو کو سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے آفس سے باہر نکل گیا۔ کپٹن نے اسکو ڈروم کا دروازہ کھول کر ایک ڈیٹیلنگ کو بلا دیا۔

"کمزور آدمی کو بند کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اسے لے جاؤ اور حسرت برائے تحقیقات کا اندراج کر کے چل بیچ دو۔"

ڈوڈووان کے جانے کے بعد جب دروازہ بند ہوا تو

کرنل اسٹیو جیب سے رومال نکال کر پیشانی کا پینا خشک کرنے لگا۔

"بے حد ذلیل آدمی ہیں دونوں۔" اس نے کہا۔

"میں نے ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کی کوشش کی تھی۔ خیر، اب ڈوڈووان کو اس وقت تک بند رکھو جب تک وہ شرافت اور تہذیب کی زبان نہ سیکھے۔"

"وہ ایک لمحے کے اندر اعدا آزاد ہو جائے گا۔" کپٹن نے پیش گوئی کی۔ "دیکھاؤ وہ جس بے جا کی درخواست دے گا اور ہمیں یا تو ڈوڈووان کو آزاد کرنا ہوگا یا عدالت کے سامنے اس کی گرفتاری کی معقول وجوہات بتانا ہوں گی اور ظاہر ہے کہ تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے، نہیں کرنل میری بات لکھ لو وہ کچھ فی دیر میں قتل کے باہر کھڑا ہوگا اور پھر غالباً ہمیں میں بے جا کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا کہ تم نے اس کی گرفتاری کا حکم تو دے دیا مگر اس کے خلاف کوئی فرد جرم عائد نہیں کر سکتے۔"

"لیکن..... لیکن تم تو روزانہ یہی کچھ کرتے رہے ہو۔" کرنل نے کہا۔

"ضرور..... لیکن ہم اس وقت تک کسی سوراخ میں داخل نہیں ہوتے جب تک ہمیں اس سے باہر نکلنے کا یقین نہ ہو۔"

☆☆☆

اگلے اڑتالیس گھنٹے غالباً کرنل اسٹیو کی زندگی کے سب سے طویل گھنٹے تھے۔ جیسا کہ کپٹن براڈی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ جس بے جا کی درخواست کے جواب میں عدالت کی طرف سے جاری کردہ فیصلے کے نتیجے میں ڈوڈووان قتل سے آزاد ہو گیا اور پھر اگرچہ پولیس کسٹرنے اپنا ایک پرائیویٹ سرائے رسالہ اس کی عمرانی کے لیے لگا دیا تھا مگر ڈوڈووان اسے جل دے کر نکل گیا۔ قتل سے قدم لگاتے ہی وہ یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھا۔ لیکن کرنل کے لیے صرف ایک ہی مشکل تھی۔ تمام قومی پرہیز کسی فوری اور موثر کارروائی کا مطالبہ کر رہے تھے خاص طور سے "دی نیوز" جو کہ مارن کا اپنا اخبار تھا اس کے رپورٹر سائے کی طرح کرنل کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ان سے تنگ آ کر اسے کپٹن براڈی کے آفس میں پناہ گزین ہونا پڑا۔

"آخر تمہارے کارکنوں کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ کپٹن پر چڑھ دوڑا۔ "پارے دو دن مارن کو غائب ہوئے ہوئے

ہیں اور تمہارے آدمی اس سلسلے میں ذرا سی بھی پیش رفت نہیں کر سکے۔"

کپٹن نے بے پروائی کے انداز میں کندھے اٹکائے لیکن یہ ظاہر وہ کتنا ہی غیر متعلق نظر آ رہا ہو حقیقت یہ سنی کہ جب سے مارن کو اغوا کیا گیا تھا، اس نے اپنی یونٹ پر غلام نہیں اتاری تھی۔

"دوسروں کا نزلہ مجھ پر گرانے کی کوشش مت کرو۔" اس نے کرنل سے کہا۔ "تم اس کیس میں بالکل کسی کتابی جاسوس کی طرح کام کر رہے ہو۔ ہمیں اصرار ہے کہ میرے آدمی ہر طرف کسی سراغ کی تلاش کرتے رہیں، ڈاک پر نظر رکھیں کہ کب اغوا کنندگان کی طرف سے مطالبہ زور کا خط آتا ہے اور کس طرح آتا ہے۔ تم نے سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیٹیلنگ میٹیکس کو معطل کرنے کا حکم دے دیا جو کہ میرے بہترین کارکن تھے۔ تم نے مجھے تمام بدعاشوں کو پولیس اسٹیشن پکڑ کر لانے سے روک دیا کیونکہ تمہارا اعتقاد یہ تھا کہ کوئی گرفتاری وارنٹ کے بغیر نہیں ہونا چاہیے، تم نے عام پبلک میں بیان دیا کہ آئندہ پولیس اپنے مجرموں کو استعمال نہیں کرے گی اور یوں ان سے ہمارا رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ تم نے غلط طریقہ اختیار کر کے پورے کیس کا نیڑا غرق کر دیا ہے اور اب مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میرے کارکنوں کو کیا ہو گیا ہے۔"

کرنل نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تک اغوا کرنے والوں کی طرف سے ہمیں کوئی مطالبہ کیوں نہیں موصول ہوا۔" اس نے کہا۔ "آج سب مارن نے مجھے بلایا تھا۔ وہ بہت مجبور ہی تھی اور اس کی باتوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ذاتی طور پر اس کے شوہر کی کشمکش کا اڑے دار ہوں۔"

"پھر ہمیں اس سے اور کس رومل کی توقع تھی؟"

کپٹن نے جواب دیا۔ "کیس سامنے آتے ہی ساری ذلت داری تم نے سنبھال لی اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس وقت نو جوان مارن انتہائی تکلیف دہ تجربے سے دوچار ہو رہا ہوگا۔ بدعاش اس کی زبان کھلوانے کی پوری کوشش کر رہے ہوں گے، اسے مجبور کر رہے ہوں گے کہ وہ اس جگہ کا پتا بتائے جہاں اس نے اسٹیشن کو چھپا کر رکھا ہے اور اب تک ہم اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کر سکتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مارن اور ہم جیسے لوگوں نے پولیس کے گھنے پر عوام کے احاطہ کو مجروح کر دیا ہے۔ اگر مجھے اسٹیشن کا

سنگھڑے موتی

☆ کسی بھی چیز کی قدر دو وقتوں میں ہوتی ہے ایک نئے سے پہلے اور دوسرا کھونے کے بعد۔

☆ ہر رشتہ رشتہ نہیں بناتا ہر کچھ بنا رشتوں کے ہی رشتے نبھاتے ہیں، شاید وہی لوگ دوست کہلاتے ہیں۔

☆ چار چیزیں بھی نہ توڑوا احمد، دودھ، رشتہ، دل کیونکہ وہ جب نوسنے ہیں تو شور نہیں ہوتا۔

☆ دوستی ایک ایسا پھول ہے جو ہمیشہ احسا و غلوں کی شاخ پر کھلتا ہے۔

☆ حق پر چلنے والے کا پاؤں شیطان کے سینے پر ہوتا ہے۔

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے پر کسی کی دی ہوئی محبت بھی نہ بھلائے۔

☆ جو خطرات سے کھیلنے کی ہمت نہیں رکھتا وہ زندگی بھر کچھ نہیں کر سکتا۔ جو کرتا نہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

مرسلہ: مٹان انصاری، ہائی سکیورٹی یونیورسٹی جیل، ملتان

☆ چا معلوم ہوتا تو میں اس کی حفاظت کے لیے ایک اسکواڈ تعینات کر دیتا۔ موجودہ صورت حال میں تو سوائے انتظار کرنے کے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

"انتظار۔ انتظار۔ انتظار مگر تک؟" کرنل اسٹیو نے ہچکارگی سے کہا اور بڑبڑاتے ہوئے آفس سے نکل گیا۔ اسے گھٹے ہوئے نصف گھنٹا ہوا تھا کہ جیوی سائڈ اسکواڈ کے سارجنٹ متھمبے دکاٹون آیا۔

"میں یہاں لوٹا تھی فورم سے بات کر رہا ہوں۔"

اس نے کپٹن کو بتایا۔ "تقریباً بیس منٹ ہوئے کہ تمہیں سب بدعاش زبردستی اسپتال میں داخل ہوئے اور اسپتال

شہ مات

نظریہ

بسماع کوئی بھی ہو کسی کے حصے میں فتح آتی ہے اور کسی کو مات ہوتی ہے... لیکن جو شہ زور پوتا ہے وہ بہ حال میں فتح مندی چاہتا ہے چاہے زندگی کتنے ہی بڑے نقصان سے دوچار ہو جائے وہ بھی ایک ایسا ہی زور آور تھا مگر اس امتحان میں وہ بری طرح ناکام ہو گیا۔

جذباتی استحصال کا شکار..... رشتوں کا مجب گورکھ دھندا



ابھی میں نے منہ ہاتھ بھی نہیں دھو یا تھا کہ فون کی منوں مٹنی اپنی کرخت آواز کے ساتھ چلانے لگی۔ میرا بس پلے تو میں اس مٹنی کا گلا گھونٹ دوں لیکن میری مجبوری ہے۔ میں اس فون کو نکال کر پیچک نہیں سکتا کیونکہ یہ میری اکلوتی

ان کی پناہ گاہ سے نکالنے کے لیے..... آنسو گیس استعمال کی اور وہ گیس خود اس کی آنکھوں میں بھی گھسنے لگی اور پھر جس وقت سارجنٹ ٹویڈ نے ایک بد معاش کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا تو اس نے دل کھول کر داد دی۔

”شباباش سارجنٹ، بہت اچھا نشانہ تھا۔“
لیکن جب اس نے مارن کو اس کے اٹھارے ہوئے ہاتھوں اور دانے ہوئے پیروں کے ساتھ دیکھا تو برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر کپٹن براڈی کی ملاقات ایک پختہ تک کرل سے نہ ہوئی لیکن کام اتنا زیادہ تھا کہ اس مصروفیت میں اسے کرل کی عدم موجودگی کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسپتال سے مارن کی کیفیت کے بارے میں روزانہ رپورٹ ملتی تھی۔ کئی دنوں تک وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں لٹکا رہا، لیکن آخر کار ماڈرن طریقہ علاج کے کامیابی حاصل کی۔ اسے بچالیا گیا اور جب وہ اپنی داستان بیان کرنے کے قابل ہوا تو اس نے ایک ایسی رو داد سنی جسے سن کر سخت سے سخت دل رپور بھی کاٹے بغیر نہ رہ سکا۔ مارن نے صرف بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اپنے اختیارات کو تائید کر کے یہ پوری قصصیات عام پبلک کی سطومات اور آگاہی کے لیے شائع بھی کیں۔ شاید اسے بھی سبق مل گیا تھا۔

پھر ایک روز سپر کو کرل اسپتال سے کپٹن براڈی کو اپنے آفس میں بلایا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اس سے ایک طویل گفتگو کی۔ اس ملاقات کے بعد کپٹن واپس اپنے دفتر پہنچا تو شام کے چوبیس بجے تھے، اس نے سارجنٹ ٹویڈ اور ڈیپٹی کمشنر میٹنگ کو اپنا منتر پڑایا۔
”میلی نے ہمیں بتایا تھا کہ تم کرل سے ملنے مجھے ہو۔“ سارجنٹ ٹویڈ نے کہا۔ ”ہم جانا چاہتے ہیں کہ کمنٹر نے ہماری معطلی کے بارے میں کیا کیا؟ اس کا ذکر تو ضرور آیا ہوگا۔“

”ہاں آیا تھا۔“ کپٹن براڈی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور یہی ایک بات کیا کرل نے اور دوسری بہت سی باتوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا۔ خلاصہ اس تمام گفتگو کا یہ ہے کہ معطلی کے بارے میں سب کچھ بھول جاؤ اور جہاں تک دیگر احوال کا تعلق ہے تو پھر وہی پرانا طریق کار لوٹ آیا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک شراب کے نشے میں نہیں ہے جب تک وہ کمر میں نہ کرے اور کوئی قانون شکنی قابل مواخذہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ کارگر ثابت ہو۔“

چھٹیاں ختم ہونے پر افسر وہ اور ایک ہاتھ سے ڈونووان کے سر کے بال ابھی طرح کھڑے لیے۔

”کمنٹر صاحب۔“ اس نے بڑے احترام کے ساتھ تجویز پیش کی۔ ”آپ ایک سگار چلائیں تو اچھا ہے۔ ڈونووان کے آدمی اپنے شکار کے کوئے دافا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں سگار دیکھ کر اسے ہماری بات سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی۔“

کرل اسپتال سے آکر چھ سگار نہیں سگیا مگر یہ کھانک کا اعزازہ بالکل درست تھا کہ ڈونووان اسی جسم کی زبان کچھ سکتا ہے۔ ابھی اس کی بات پوری ہوئی تھی کہ ڈونووان کچھ اٹھا کر وہ سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہے۔ کپٹن نے میلی کو بلایا۔ ڈونووان نے بولنا شروع کیا اور کئی اسے شارٹ ونڈ میں لکھتی رہی۔ دس منٹ بعد ڈونووان کو حالات بھیج کر کپٹن براڈی ریو اور اپنے بقی ہولسٹر میں رکھتے ہوئے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

”اب تم یہاں اطمینان سے بیٹھو۔“ اس نے کرل سے کہا۔ ”کارروائی کا کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچنے ہی میں تمہیں ٹون کروں گا۔“

”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔“ کرل نے جواب دیا اور پھر کپٹن کی تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولا۔ ”بھئی ایک تماشائی کی حیثیت سے کپٹن۔ میں بہت کچھ سیکر ہوں۔“

”یہ بات ہے تو پھر آچلو۔“ کپٹن براڈی نے جواب دیا۔ کپٹن اور اس کے جوان بیٹے کو اڑھارے باہر نکلے تو تین کاریں ان کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ایک کار میں پولیس سرجن ڈاکٹر فراسک بھی موجود تھا۔

”ڈاکٹر اسٹرینٹ چلو۔“ کپٹن نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ ”ہم نے مارن کا پتا لگالیا ہے۔ رفتار تیز رکھنا مگر سائزن بچانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

پھر اس نے جمنا تک کر دوسری کار کی طرف دیکھا جس میں کرل اسپتال سارجنٹ ٹویڈ اور دوسرے افراد اور تھے۔
”تمام ضروری سامان رکھ لیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں کپٹن۔“ ایک ڈپٹی نے جواب دیا۔

کرل اسپتال واپس بہت تیزی سے سیکر ہوا تھا۔ جب پولیس نے اس عمارت کو محاصرے میں لے کر حملہ کیا جہاں بد معاشوں کا گروہ اپنے قیدی مارن کے ساتھ چھپا ہوا تھا تو وہ بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ اس نے اس وقت بھی کوئی شکایت نہیں کی جب پولیس نے بد معاشوں کو

اور جینی اس کے بیکادے میں آگئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ایک سرد شام تھی۔ میں اسٹوپر اپنے لیے کافی بنانے کی کوشش کر رہا تھا جب فون کی بجلی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے سب کام وہاں چھوڑا اور بھام بھاگ فون تک پہنچا۔ دوسری طرف میری توقع کے عین مطابق جینی ہی تھی۔ وہ چپک رہی تھی۔

”ڈیڈ! ایک بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اس کرسی کی پختیوں میں ہم دونوں آپ سے ملنے آئیں گے اور ہاں ڈیڈ مجھے کچھ بیویوں کی مزید ضرورت ہے۔ تو آپ بھیج دیں گے نا۔“

میرے کان ساٹھیں ساٹھیں کر رہے تھے۔ میں نے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ جینی اپنی تعلیم مکمل کر لے گی تو میرے ساتھ مل کر کچھ عرصے تک کمائے گی پھر ہم دونوں مل کر اس کے لیے لائف پارٹنر تلاش کریں گے اور پھر شادی کے بعد بھی جینی مجھے اپنے ساتھ رکھے گی مگر ہوا سب کچھ الٹا تھا۔

میں خاموش کھڑا رہ گیا۔ چند لمحوں کے وقف کے بعد ریسپور میں سے جینی کی بے چین آواز پھر ابھری۔

”ڈیڈ کیا آپ کو برا لگا ہے؟ میرا خیال تھا کہ آپ بہت خوش ہوں گے کیونکہ آپ کی جینی بہت خوش ہے۔ مگر آپ۔۔۔ اود ڈیڈ کھیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے پاس رقم نہیں ہے اور آپ اس وجہ سے خاموش ہیں، اگر ایسا ہے تو پلیز فکرمند نہ ہوں میں جیسے تھے گزارا کر لوں گی۔ بس یہ ہوگا کہ کرسی پر میرے پاس نئے کپڑے جوئے خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوں گے لیکن یہ آپ کی پریشانی سے زیادہ نہیں ہوگا۔“

میں نے خاموشی سے جینی کی طویل تقریر پر غور کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح میرا جذباتی استحصال کر رہی تھی۔ کرنی بھی کیوں نہ آخر جینی کس ماں کی تھی؟ جینی کی ماں بھی انکی ہی خود مرض اور مادہ پرست گورت تھی۔ وہ میرے ساتھ چار سال رہی۔ اس عرصے میں اس نے میرا راج معنوں میں خون تک چوس لیا۔ اس کی آنے روز کی فرمائشوں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے میں اچھا خاصا مرقع ہو گیا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میرے پاس اب اس کی ضرورت بات پوری کرنے کے لیے کافی رقم نہیں ہے تو اس نے جینی کو میرے بستر پر پٹا اور ایک زبردست جھٹکے کے بعد مجھے چھوڑ کر کسی نئے ہٹکار کی تلاش میں چلی گئی۔ میں نے جینی کو خود پالا۔ ساتھ ساتھ تو کئی اور کھردروں کو چلا تا بہت

مشکل تھا مگر میں نے یہ بھی کیا۔

جینی قدرے بڑی ہوئی تو مجھے بھی سہولت ہو گئی مگر ہائی اسکول پاس کرتے ہی اسے بورڈنگ میں رہنے کا شوق چڑھا اور دیکھا بات ہے میں اس کی کوئی فرمائش نال نہیں کر سکتا تھا۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے خود سے اور بھیج دیا تھا۔

”ڈیڈ! کچھ بولیں نا۔“ جینی کی آواز نے مجھے سوچوں کے گرداب سے باہر کھینچ نکالا۔ میں نے خود کو سمجھاتے ہوئے مشکل حلق سے آواز برآمد کی۔

”تم فکر نہ کرو جینی! تمہیں رقم مل جائے گی گلدھانے۔“

اس کے بعد میں بہت دیر تک ہر قسم کے قریب بیٹھا رہا تھا۔ مجھے ایک سوہمہ سی امید تھی کہ جینی کو احساس ہو گیا ہوگا کہ مجھے شاک لگا ہے۔ وہ مجھے مٹانے کے لیے وہ بارہ فون کرے گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جینی کو اب ایک پھولی کوڑی بھی نہیں دوں گا مگر جب رات گزر گئی تو میری جینی کے لیے محبت ایک بار پھر اڑ کر آئی اور میں اسے پیسے بھگونانے سے خود کو روک نہ سکا۔ پیسے جینی کو مل گئے۔ کرسی آ کر گزر گئی۔ میرا انتظار انتظار ہی رہا۔ نہ ہی جینی آئی نہ اس کا وہ کھٹا اور آوارہ شوہر آیا۔ بلکہ اس کے بعد جینی کا کوئی فون بھی نہیں آیا۔ میں براہ معمول کی طرح اسے رقم بھجواتا رہا۔

چار ماہ بعد جب میں اس کی طرف سے اچھی خاصی تشویش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جینی کا فون پھر آ گیا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”ڈیڈ! ایک دھوکے باز لڑکا ہے۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ وہ ایک عادی شرابی اور جوئے باز تھا۔ اس نے مجھے بھی واڈر لگا دیا۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کر اپنی ایک کھلی کے کمر میں چھپی ہوئی ہوں۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوں گے میں آپ کے پاس آ جاؤں گی اور ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔“

میرا دل بھڑک کر رہ گیا۔ میں نے اسے تسلی دلا سے دیے۔ اس کے شوہر کو خوب گالیاں دیں اور اسے کھجایا کہ وہ کورٹ کے ذریعے اس نا بھاری سے طلاق حاصل کر کے ہی میرے پاس آئے، میں جانتا تھا کہ اس کام کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہوگی، سو میں نے اپنی بچت کے سارے کھاتے چیک کیے اور جینی رقم اب تک میں انداز کی تھی اسے بھجوا دی۔

ان دنوں میں بہت خوش رہنے لگا تھا۔ یہ بات میرے گاہکوں نے بھی محسوس کر لی تھی۔ مجھے ایک شوخ، پتیلی، قریباً اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ وہ روزانہ صبح ناشتا میرے پاس کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”ہائے اسٹیشن! بہت خوش ہو گیا پر اتنا بڑا ٹکڑا آیا تمہاری بیٹی نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

مجھے اتنی کیا میرے روزانہ کے تقریباً کبھی کا کھک جانتے تھے کہ میں جینی سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں نے خوش دلی سے اسے بتایا۔ ”جینی حقیر پاپ اپنے کھٹا، جوئے باز شوہر سے طلاق لے کر ہمیشہ کے لیے میرے پاس آ رہی ہے۔“

وہ ہنسی پھر بولی۔ ”یہ تو واقعی خوشی کی خبر ہے۔ اچھا اب جلدی سے اسی خوشی میں مجھے اسٹیکس فری دے دو۔ کیونکہ آج میرے پاس ریز گاری کم ہے۔“

میں بھی چونک کر بہت خوش تھا تو میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ پھر پورے دن میں سب ملنے والے مجھے مبارکبادیں دیتے اور میری خوشی پر مسکراتے رہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری خوشی ماند پڑ گئی کیونکہ جینی کی طرف سے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ ایک تو وہ دوسری ریاست میں رہتی تھی۔ دوسرے یونیورسٹی کے علاوہ اس کا کوئی مستقل نمبر نہیں تھا اور وہاں جب بھی میں فون کرتا وہ کھیں نہ کھیں باہر گئی ہوئی ہوتی تھی اور تک سے شادی کے بعد تو اس نے یونیورسٹی اور اس کا بورڈنگ ہاؤس دونوں چھوڑ دیے تھے۔ اب وہ کہاں رہ رہی تھی مجھے علم نہیں تھا اور خود وہ ہمیشہ مجھے پی پی او سے فون کرتی تھی۔

تین ماہ بعد جب میری امید دم توڑنے لگی تو جینی کا فون ایک بار پھر آ گیا۔ وہ اس بار بھی رو رہی تھی۔

”ڈیڈ! ایک نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اس کے کسی دوست کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے اور میں مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں آئندہ کچھ دنوں میں میری ڈیلوری متوقع ہے۔ اس کے لیے ایک خلیہ رقم چاہیے۔ ڈیڈ! میں کہاں سے بندوبست کروں گی؟“

یہ خبر سن کر اصولاً تو مجھے ناراض ہونا چاہیے تھا کہ جب جینی تک کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو یہ کھڑا ک پالنے کی کیا ضرورت تھی مگر میرے اندر سرخوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میری حالت انکی ہو رہی تھی جیسے کسی دوتے ہوئے اداس بچے کو کوئی لالی پاپ تھام دے۔ میں نے خوشی سے لرزتی

حکایات

- (1) ہر لفظ میں مطلب ہوتا ہے اور ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔
- (2) زندگی میں 2 چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔ سانس اور ساتھ۔
- سانس ٹوٹنے سے انسان ایک بار مرنے ہے اور ساتھ ٹوٹنے سے انسان بار بار مرنے ہے۔
- (3) وقت اور پیار دونوں زندگی میں اہم ہوتے ہیں۔ وقت کسی کا نہیں ہوتا اور پیار ہر کسی کے نہیں ہوتا۔
- (4) خیر اور موت خیر آدمی موت ہے اور موت کا دل خیر۔
- (5) وقت اور مجھ۔ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتی ہے کیونکہ اکثر وقت پر کچھ نہیں ہوتی اور کچھ آنے تک وقت نہیں بچتا۔
- (6) عقیم اور دعا عقیم اور دعا نہیں آتی لیکن ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے (دعا میں یاد رکھنا) مرسد۔ راجہ افتخار علی افغانی، چو آسن شاہ

آواز میں کہا۔

”جینی تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی سے قرض لے کر یا کسی بھی طرح تمہیں رقم پہنچا دوں گا۔ بس تم اپنا اور بچے کا بہت خیال رکھنا اور جلد آ جانا بلکہ مجھے اپنا پتہ بتاؤ میں خود آ جاتا ہوں۔“

جینی نے جلدی سے کہا۔

”میں ڈیڈ! اس کی ضرورت نہیں میں اپنی ایک کھلی کے اسٹوپر میں غمبیری ہوئی ہوں۔ آپ کو کہاں رکھوں گی بس زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی بات ہے پھر میں خود آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔“

چند ایک حربہ باتوں کے بعد اس نے فون رکھ دیا اور میں اس کے لیے رقم حاصل کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ جینی کی ماں نے مجھے اچھا خاصا مرقع کر دیا تھا۔ اس کے بعد جینی کی فرمائشوں کی وجہ سے کچھ زیادہ جمع کر ہی نہیں پایا تھا۔ جو کچھ جیسے جیسے بچایا تھا وہ بھی بچھلے دنوں اسے بھجوا چکا تھا۔

اب ڈیلوری کے لیے درکار رقم مجھے کسی نہ کسی طرح

اکٹھی کرتا ہی تھی۔ میرے موجودہ کاروبار میں ایسا کرتا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ اصل میں ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے اپنے پاس موجود رقم سے ایک اچھی حالت کا سٹی ٹرائل خرید لیا تھا۔ یہ ڈرائیو میرا سب کچھ تھا۔ دن میں، میں اسے کسی نہ کسی مصروف سڑک کے کنارے روک کر لوگوں کو کافی، اسٹیکس اور ناشے کا سامان بیچتا اور رات میں اسی میں ایک طرف بستر بچھا کر سو رہتا۔

یہ ڈرائیو پچھلے نو سال سے میرے پاس تھا اور اب اس کی حالت کافی خست ہو چکی تھی۔ اکثر وہ پٹرے کسی اوٹیل ٹوکے طرح چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو مجھے اس دن کی ساری کمائی کسی نہ کسی لینک کے حوالے کرنا پڑتی ہے۔

میں نے گھور کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ چھ بجتے والے تھے۔ ساری رات جینی کے حلقے سوچتے اور رقم حاصل کرنے کے منصوبے بناتے سوتے جانتے گزر گئی تھی۔ ابھی منہ ہاتھ بھی نہ دھو پایا تھا کہ جینی ایک بار پھر جیتے گی۔ میں نے سب کام وہیں چھوڑا اور فون اٹھالیا۔ دوسری طرف جینی تھی۔ اتنی صبح اس نے بھی مجھے فون نہیں کیا تھا۔ میں مختلف اندیشوں میں گھر گیا۔

”جینی خیریت تو ہے؟ اتنی صبح فون کس لیے کیا ہے؟“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ”ڈیڈ ایک سے شادی کے بعد میری زندگی سے خیریت نام کا لفظ نکل گیا ہے۔“ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گئی۔ پھر یوں ”دراصل کل میں بھول گئی تھی۔ اس لیے آج پھر فون کیا ہے میری کھلی کا اکاؤنٹ نمبر نوٹ کر لیں کیونکہ وہی ہے وہی اکائے کی تواری کے اکاؤنٹ میں بھجوا دیں۔“ اس نے نمبر لکھوا کر فون بند کر دیا۔ میں کچھ الجھ سا گیا۔ بہر حال میں نے نمبر نوٹ کر لیا تھا، جب سے تک سے شادی ہوئی تھی جینی نے ہر ہرجرج ایک نئے اکاؤنٹ نمبر میں مجھ سے پیسے منگوائے تھے۔ بہر حال میں نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے چھٹکارا پایا اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ گاٹک آنے لگے تھے۔ میں بھی ان کی مطلوبہ چیزیں فراہم کرنے لگا۔ لیکن میرا دماغ بری طرح مصروف تھا۔ میں ایک بیٹھنے والا پورٹا شخص ہوں۔ کوئی جامعہ یا چنگ بیٹس بھی نہیں ہے۔ لے دے کر ایک سٹی ٹرائل ہے میرے پاس۔ اگر اسے سامان سمیت بیچ دوں تو اتنی رقم ضرور حاصل ہو سکتی ہے جس سے جینی آسانی سے اسپتال اور بچے کے اخراجات پورے کر سکتی تھی مگر پھر میں سڑک پر آجاتا۔ کتا کہاں سے؟ اور

رہتا کہاں؟

اسی اوپر بین میں دو دن گزر گئے۔ مجھے کوئی طریقہ کچھ نہیں آرہا تھا۔ جینی مجھے اتنی عزیز تھی کہ میں اس کی خاطر ڈاکٹنگ مارنے کے لیے تیار تھا مگر اس میں بھی ایک قناعت تھی۔ میری نظر اس حد تک کمزور تھی کہ چشمہ لگانے کے باوجود بھی مجھے بہت احتیاط رکھنا پڑتا تھا اور اسی غرابی کی وجہ سے مجھے اپنی نوکری بھی وقت سے پہلے چھوڑنی پڑی تھی۔ جینی کا فون آئے تیسرا دن تھا میں صبح صبح کافی تیار کر کے ضروری اشیا کو ترتیب سے رکھ رہا تھا تاکہ دس کے وقت میں وقت نہ ہو۔

”اے سڑا ایک کپ کافی لے گی؟“ میں نے سراہا کر اس کرخت لہجے والے قریباً تیس تیس سالہ مسٹر سے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ کسی تہل کی طرح مضبوط اور کسی باجی کی طرح بدست نظر آرہا تھا۔ نشے کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آنکھیں ابھی تک چڑھی ہوئی تھیں، میں نے اس کے گلے میں لٹکتی مختلف شیپوں والی زنجیروں سے نظر ہٹا کر اسے اثبات میں جواب دیا۔

”جلدی سے ساتھ چکے کھانے کے لیے بھی لے آؤ۔“ وہ سڑک کنارے میری گاڑی کے لیے بچائی گئی میز کے گرد بڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے ہوئے بولا۔ میں نے شکل سے ہی بدعاشی نظر آنے والے اس آدمی کے لیے کافی تیار کیا اور اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”کہاں کے رہتے والے ہو؟“ میں نے بات برائے بات ہی پوچھ لیا۔ اس نے ایک اپنی نگاہ مجھ پر ڈالی اور کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”دو دن قبل ہی اس ریاست میں آیا ہوں۔ یہاں میرا ایک عزیز رہتا ہے اسی سے ملنے آیا ہوں۔“ اس کا انداز اتنا کرخت تھا اور لہجہ ایسا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”بڈھے اپنا کام کر۔“ مگر میں نے نظر انداز کر دیا۔ وہ سینڈویچ کے بڑے بڑے ٹوالے اس طرح نگل رہا تھا جیسے کسی قحط زدہ علاقے سے آیا ہو۔ میری جیس کی رگ ایک مرتبہ پھر جھڑک اٹھی۔ میں نے یہ ظاہر اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے پھر پوچھا۔

”تمہارا جسم بہت شاندار ہے۔ کیا تم ہاڈی بلڈ رہو یا ایسے کسی کھیل میں دلچسپی رکھتے ہو؟“ اپنی تعریف سن کر بھی اس کے کرخت چہرے پر نرمی آئی نہ ہی مسکراہٹ۔ اس نے ایک گھورتی ہوئی نظر مجھے دیکھا اور پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ یعنی وہ میری بات کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اب میرے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے خود کچھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا کیونکہ اس طرح کسی کی کھوج کرنا میری عادت نہیں تھی۔ وہ کھانا کھم کر چکا تھا۔ اس نے منہ کھول کر تنواروں کی طرح ایک لمبی ڈکاری اور کرسی پر مزید پھیل کر کافی کی چمکیاں لینے لگا۔ میں اس دوران آنے والے گاٹک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گاٹک کو اس کا مطلوبہ سامان دے کر میں نے ریڈ گاری بکس میں ڈالی۔ وہ اتنی دیر میں اٹھ کر میرے پاس آ گیا تھا۔ میں ایک کرور جسامت کا پورٹا شخص ہوں اس کے سامنے تو سر یہ جینی لگ رہا تھا، اس نے یہ غور میری طرف دیکھا پھر کھلے لہجے میں بولا۔

”دو چیزیں سنو بچ پیک کر دو۔“ مجھے اس کا لہجہ بہت برا لگا مگر جب اس نے اپنا پرس کھول کر ایک بڑا نوٹ میری طرف بڑھا دیا تو میرا منہ خود بخود بند ہو گیا۔ میں نے اپنے تاثرات پر شکل سے قاپو پایا، میں نے نوٹ ہاتھ میں تھام کر اس کا یہ غور معائنہ کیا۔ وہ نوٹ بیکار ہے ہوئے بولا۔

”بڈھے جلدی کرو میرا وقت ضائع نہ کرو۔“ میں نے جلدی سے اپنے لپٹے کو ٹکڑے کر کے لپٹا لیا اور کہا۔

”معاف کرنا جناب! میری نظر حد سے زیادہ کمزور ہے۔ یہ پانچ سو ڈالرز کا نوٹ ہے۔ میں اگر بنا دیتا تو اسے رکھ لوں تو ایک دن میں فٹ ہاتھ پر آ جاؤں گا۔ کیونکہ میں ایک خراب آدمی ہوں۔“ وہ کیڑو زنگیروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے جلدی سے نوٹ بکس میں ڈالا اور اپنے پاس موجود ساری رقم نکال کر گئی۔ وہ چار سو پچاسی ڈالرز تھے۔ میں نے رقم اس کے سامنے ڈال دی۔ میری خواہش تھی کہ وہ رقم قبول کرے اور مجھے یہ نوٹ اسے واپس نہ کرنا پڑے۔ میں نے لپٹا لیا۔

”جناب! اس وقت میرے پاس بھی رقم ہے۔ گیارہ ڈالرز کم ہیں، آپ شام میں لے جانا۔“ ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ بگڑ گیا پھر اس نے جھپٹنے کے بعد انعام میں رقم اٹھائی اور سینڈویچ کا ٹیک لے کر چل دیا۔ میرے بدن میں سستی پھیل گئی۔ میں اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اس کے ٹوے میں ایسے پانچ سو ڈالرز کے اور بھی نوٹ دیکھ لیے تھے اور مجھے جینی کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ابھی میں شش و پنج میں تھا کہ رینگ آ گئی۔ ”ہائے اولڈ ٹائم، کیا ہوا بڈھے؟“ اس نے جھٹک کر کہا تو میں جلدی سے آگے جھٹک کر بولا۔

”جینا! میں شام میں تمہیں دس ڈالرز دوں گا اگر تم

تلقین

سمندر کے کنارے ایک شخص نے دیکھا کہ ایک نو عمر لڑکا گرداب میں پھنس گیا ہے اور بے رحم لہریں اس کی جان کے درپے ہیں۔ وہ درمندہ سمندر میں کود پڑا اور لہروں سے لڑتا بھڑتا ڈوبتے ہوئے لڑکے کو کنارے تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔

شدید ذہنی صدمہ سے لڑکے کو کچھ اتفاق نہ ہوا تو اس نے اپنے محسن کا شعر یہ ادا کیا۔
اس شخص نے لڑکے کو تھکن کی کہ ”میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اب تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہاری زندگی واقعی اس لائق تھی کہ اسے بچایا جاتا۔“
مرسلہ۔ اظہر حسن پکارا ہزار، جوتی

ہوشیاری سے اس آدمی کا گھریا رہا کھل دیکھ آؤ۔ میرا اس کے ساتھ کچھ جھگڑا ہے۔ خیال رہے وہ تعاقب سے آگاہ نہ ہو۔“ جینا حیران تو ہوئی مگر اس کے پیچھے چل پڑی، آدھے گھنٹے کے بعد میں Cops کے ہمراہ ٹینا کے بتائے ہوئے سٹے سے موٹی کی طرف جا رہا تھا میرا خیال تھا کہ اس سٹینڈ سے کو مجھے دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگے گا کیونکہ وہ مجھ جیسے بھول بڈھے سے ایسے عمل کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے کمرے میں پہنچ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا جب میری نظر بند پر پڑی ہوئی جینی پر پڑی۔ وہ بھی ہٹا ہٹا مجھے دیکھ رہی تھی۔ سارا جنت نے انہیں گرفتار کر لیا۔

میں روٹی ہوئی آنکھوں سے اسے پولیس وین میں بیٹھ کر جاتے دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ بھی جینی نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ وہ کسی طرح جہانم پیشہ گروہ میں شامل ہو گئی تھی۔ اس گروہ میں دو مرد اور دو عورتیں تھیں۔ پانچ ماہ قبل انہوں نے ایک کسٹم میں ڈاکا ڈالا تھا اور کامیابی سے روپوش ہو گئے۔ کسٹم کے مالک نے اخبار میں اطلاع دہندہ کے لیے انعام کا اعلان کیا تھا۔ جس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نوٹ نشان زدہ ہیں۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہی نشان پہچان لیا تھا کیونکہ میں ایک تجربہ کار بینک لیبر تھا۔ انہی نشان زدہ نوٹوں کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے جینی کو رقم کی ضرورت تھی جو اسے فراہم کرنے کے لیے میں نے یہ بھاگ دوڑی تھی۔



دہانے کی حق غرضیوں سے تیرا زماں اور گمشدہ خوابوں کی تلاش میں سرگرداں ایک مسافر کی یادگار احتشام

کسی کے دل میں اترنے کا آسان راستہ محبت کا ایسا زینہ ہے جس کے ہر قدم پر خلوص و وفا کی میراثیت کرنی پڑتی ہے مگر کچھ لوگ یہ میراثیت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور بھول بھلیوں میں بھٹکنے والوں کو رستہ نہیں ملتا... یہی ان کی آزمائش اور یہی ان کی مستقل مزاجی کا بھرم ہوتا ہے... زندگی کے کئی مقام پر کتنے ہی چہرے اس کے ذہن کے آئینے میں عکس بن کر رہ گئے تھے۔ جو دھیرے دھیرے وقت کی بھول میں دبتے جا رہے تھے کہ اچانک ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ سارے دھندلے چہرے پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہو گئے... مگر وہ ان خدو خال میں بچپن تلاش کر سکا نہ جو انہی... زمانے کی چہرہ دستیوں نے اس کی زندگی کا پر قیمتی لمحہ عفریت بن کر نگل لیا تھا... دل کی خاموش دھڑکنوں نے جب شور مچایا تو اس کی ذات ایک تھلکہ خیز بھونچال کا شکار ہو گئی... آفرین ہے اس ضبط پر کہ تنہا دھڑکنوں کو تھپکنے کا پتہ لگایا... کوئی رشتہ اس کے پاس نہ تھا لیکن ایک زمانہ اس کا گرویدہ تھا اور وہ جس کا شہدائی تھا وہ چہرہ... وہ لمس... وہ ساتھ تو جانے کیاں کھو گیا تھا... پھر رفتہ رفتہ صبر و استقامت کی انہی منزلوں نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔



بالآخر بشو تک کر بالکل چور ہو گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی یا شاید رات ہو چکی تھی۔ بشو کو وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں تھا، اسے تو صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ بہت دیر تک چلتا رہا ہے۔ جب روانہ ہوا تھا تو تیر چٹیلی، تاریک دھوپ پر سو چٹیلی ہوئی تھی اور اب چاروں طرف اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں درد اور محنت کے باعث کانپ رہی تھیں اور سر میں سائیں سائیں ہوری تھیں۔ کچھ اس طرح جیسے بالکل ہوا جاڑھنڈروں میں شور مچا رہی ہو۔ اس کا ذہن بھی ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ شکست، ویران اور آسیب زدہ جس میں مختلف سوچوں کے بھوت پھرتے پھرتے تھے۔ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ یہ سوال ایک خوفناک حقارت کی طرح اس کے دماغ میں اچھل پھانڈ کر رہا تھا مگر کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں پر زبان پھیر لی اور پھر وہ ریلے سے لائن کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

دور تک سناٹا اور آسمان سے رستا ہوا ہلکا اندھیرا تھا۔ بشو ہر اس انٹرفروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ چائیں وہ کون سا علاقہ تھا، کتنی دور تک کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی۔ نہ کین روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اس تاریکی اور ویرانے میں دور دور تک اگلی ہوئی جھاڑیوں اور درختوں کے سیاہ بولے بڑے خوفناک لگ رہے تھے۔ بشو کچھ دیر خاموش بیٹھا اس لرزہ خیز منظر کو دیکھتا رہا پھر اس نے سوچا کہ چلنا چاہیے۔ کیا پتا کہن اور بادشاہ اسے ڈھونڈتے ہوئے آجائیں مگر ارادے کے باوجود وہ حقن کی وجہ سے اٹھ نہیں سکا اور پھر اگر اٹھتا تو جاتا کہاں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس جگہ ہے اور وہاں سے قریب شہر یا گاؤں کس سمت میں اور کتنی دور ہے۔ چنانچہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور بولے بولے اپنا پیٹ دبا تا رہا کیونکہ اب اسے بھوک لگنے لگی تھی۔ پیٹ میں بہت جلن ہوری تھی۔ ساتھ ہی پیٹوں میں درد بھی ہونے لگا تھا مگر وہ کیا کرتا۔ وہاں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ جنگلی چھل وغیرہ تلاش کر سکتا تھا لیکن رات میں یہ بھی ممکن نہ تھا۔

پھر اس کا خیال کہن کی طرف چلا گیا۔ یہ خیال اتنا وحشت ناک تھا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ کر رہ گیا۔ ایک بار پھر اسے گمان گزرا کہ جو کچھ ہوا تھا وہ حقیقت نہیں پتا تھا لیکن اگر وہ پتا تھا تو پھر وہ فرار کیوں ہوا اور اس وقت بھوکا پیاسا، تھکا مائدہ اس ریلے سے لائن کے پاس کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ نہیں وہ پتا نہیں تھا، حقیقت تھی اس نے واقعی کہن کے

سر پر لوہے کی سلاخ سے وار کیا تھا اور پھر گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے دیکھا تھا کہ کہن کا سر پھٹ گیا ہے اور سرخ خون سے اس کا چہرہ اور گردن تر ہو گئے ہیں۔ بشو نے پکا ایک آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہونٹ زور سے جھنجھکی لیے۔ اس طرح شاید وہ لاشوری طور پر کہن کے خیال سے بچنا چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، تاہم کامیاب نہیں ہوا۔ کہن کا چہرہ اس کی نشتے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اور بڑی بڑی نوکدار مونچھیں بشو کے تصور میں ناچتی رہیں۔ اس وقت سہ پہر ہوری تھی، جب کہن نے اسے کمرے میں بلایا تھا۔ بادشاہ پھلو اور ٹیکے کو لے کر صبح ہی سے کہن چلا گیا تھا۔ رختاں بھی غائب تھی۔ گھر میں صرف کہن اور بشو ہی تھے۔ جب کہن نے اسے آواز دی تو وہ ڈر گیا کہ شاید اب پھر پٹائی ہوگی۔ کہن غصے کا بہت غراب تھا۔ جب بشو، پھلو یا ٹیکے سے کوئی غلطی ہو جاتی تو کہن آگے سے باہر ہو جاتا تھا۔ غلطی کا لیاں دیتا اور اس بری طرح مارتا کہ ان کی ہڈیوں میں کئی کئی دن تک درد ہوتا رہتا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور کہن ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہی، کیا بات ہے؟“

”یہاں آ۔“ خلاف معمول کہن نے مسکرا کر خوش مزاجی سے کہا۔

بشو آگے بڑھا۔ کہن چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر ایک کچھے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قریب ہی ایک اسٹول پر گھرے کی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ کہن کافی دیر سے پی رہا تھا اور اب ضرورت سے کچھ زیادہ پی گئے تھے۔ اس کی زبان تر تھوڑی سی تھی، آنکھیں چرمی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر چٹیلی ہوئی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی وحشتانہ کیفیت اور سفاکی تھی۔ جب بشو قریب پہنچا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں ہے؟“

بشو کی آنکھ میں نہ آیا کہ یہ کیا سوال ہے۔ اس نے ذرا سہم کر جواب دیا۔ ”تن۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔“

”پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔“ کہن نے کہا اور

مگر کہن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے نظر انداز کر دیا۔ گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پھر، ایک بڑی جھالی پھر مسکرا کر بشو کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر بشو کی کٹائی پکڑ لی اور اسے اپنی جانب کھینچا۔ بشو منتنا یا۔

”مجھے جانتے دو۔۔۔“

”ابے پھر تو سارے امرا کیوں جا رہا ہے؟“ کہن نے کہا۔

بشو سر سے ہر تک لرز کر رہ گیا۔ خوف اور وحشت کی بنا پر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بشو نے خوف سے تھوک لگا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ساتھ ہی اس نے زور سے اپنے ہاتھ کو جھکا دیا۔ شاید گرفت مضبوط نہیں تھی یا شاید کہن کو بشو کی طرف سے کسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی، اس بنا پر اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ بے ہوشا دورہ اڑے کی طرف بھاگا۔ کہن ایک دم برافروختہ ہو گیا۔ گالیاں دیتا ہوا بشو۔۔۔۔۔ کی طرف بھجنا۔

”ابے رک جاو رت تجھے زندہ دفن کر دوں گا۔“

مگر قسمت مہربان تھی۔ کہن کو اتنا موقع نہیں ملا کہ بشو کو پکڑ سکے۔ شاید زیادہ نشے کی بنا پر یا شاید زیادہ غصے کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ بشو نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ایک کر وہ سلاخ اٹھا لی جو دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ سلاخ اٹھا کر وہ کہن کی طرف بھجنا۔ کہن اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، بشو نے سلاخ دونوں ہاتھوں میں قیام کر پوری قوت سے کہن کے سر پر دے ماری۔ سلاخ بھی وزنی تھی اور وار بھی پھر رہا تھا۔ کہن کے حلق سے ایک خچ باند ہوئی۔

بشو نے اسی خراپے والی جھنجھکی میں سنی تھی۔ اس نے کہن کے سیاہ جسم کو کسی شہتیر کی طرح دہاڑہ مارتے ہوئے دیکھا اور خوفزدہ ہو کر دروازے کی طرف بھاگا مگر باہر نکلنے سے پہلے اس نے پلٹ کر ایک بار پھر کہن پر نظر ڈالی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور سرخ سرخ خون اس کے چہرے اور گردن پر پھیل رہا تھا اور اس کے حلق سے شرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دوسرے لمحے بشو دروازے سے باہر نکل گیا۔

پھر وہ بے ہوشا بھاگتا چلا گیا۔ یہ سمجھے اور سوچے بغیر کہ کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ ذہن میں بس ایک دھن تھی کہ جلد از جلد، جتنی دور بھاگ سکا ہے، بھاگ جائے۔ اسی صورت میں جان بچاؤ ممکن تھی چنانچہ وہ جسم و جان کی پوری

قوت سے دوڑنا چلا گیا۔ جس جگہ مکان تھا، وہاں سے داغیں ست کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ بشو چند بار بادشاہ اور رختاں کے ساتھ وہاں گیا بھی تھا مگر اس وقت جب وہ جان بچا کر بھاگ رہا تھا، اس نے قصداً شہر کا رخ نہیں کیا، جانتا تھا کہ جب وہ لوگ اسے تلاش کریں گے تو سب سے پہلے شہر کی طرف جائیں گے لہذا وہ جان کر باہر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس طرف میلوں تک جنگل میدان پھیلا ہوا تھا۔ صرف کہیں کہیں کچھ کھیت تھے، چونکہ اس علاقے میں بارش پرانے نام تو تھی مگر پانی کا کوئی بندوبست نہیں تھا، اس لیے بیشتر زمین غیر آباد تھی۔ چند ایک گاؤں ضرور تھے مگر وہ بھی فاصلے پر تھے۔ بشو گرد و پیش کی پروا کے بغیر بھاگتا رہا۔ جب بہت تھک جاتا تو دھیرے دھیرے چلنے لگتا یا کسی ٹیلے کی آڑ میں بیٹھ کر سستا لیتا، اس کے بعد پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ ہر چند کہ وہ مکان سے بہت دور نکل آیا تھا مگر دل میں بیٹھی ہوئی وحشت کم نہیں ہوتی تھی۔ کہن کا خوف یہ دستور اس کے حواس پر طاری تھا۔ بار بار کہن کا پھٹا ہوا سر اور سر سے بہتا ہوا خون اس کے تصور میں تپتے لگتا اور وہ وحشت زدہ ہو کر جیسے جیسے گھوم کر دیکھنے لگتا۔ کہن ہے کہن کو ہوش آگیا ہوا اور وہ اب اس کے تعاقب میں آ رہا ہو یا پھر کہن ہے، بادشاہ اور رختاں وہاں آ گئے ہوں اور حقیقت حال سے واقف ہونے کے بعد بشو کی تلاش میں نکل پڑے ہوں۔ اگر ایک بار انہوں نے بشو کو تلاش کر لیا تو پھر۔۔۔۔۔

یہ خیال ایسا ہولناک تھا کہ بشو سر سے ہر تک کانپ کر رہ جاتا۔ ناچوں میں سناہٹ ہی ہونے لگتی، سینے کے اندر کچھ ایسی تھر تھراہٹ ہوتی جیسے کوئی اس کے دل کو ٹھکی میں لے کر دبا رہا ہو۔ گھبرا کر وہ اور تیز بھاگنے لگا۔ سہ پہر کی سنہری دھوپ رفتہ رفتہ ماند پڑتی گئی۔ آسمان دھندلا گیا اور پھر دھیرے دھیرے اندھیرے کی آستین چادر حد نظر تک مسلط ہوئی۔ بشو اس وقت تک بہت تھک چکا تھا۔ ایک ایک قدم یوں اٹھا رہا تھا، جیسے پیروں میں وزنی پتھر بندھے ہوں، پھر اسے ریلے سے لائن نظر آئی اور وہ بے دم ہو کر وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

وقت رینگ رینگ کر گزرتا رہا۔ اب ہر طرف تاریکی، سکوت اور ہولناک ویرانی تھی۔ بشو کو اس سناٹے اور اندھیرے سے ڈر لگنے کا محروم کرنا بھی کیا۔ اسے نہ سٹوں کا کوئی اندازہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ قریب ترین شہر یا گاؤں وہاں سے کتنی دور ہے چنانچہ وہ چپ چاپ بیٹھا

ابھی روٹی پکائی ہوں۔ اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ اتم کہاں ہو، دیکھو، میں اس وقت اس تاریک رات میں، اس ویرانے میں تنہا یاد کر رہا ہوں۔ مجھے آواز دو۔۔۔ اماں مجھے آواز دو۔۔۔ وہ چپکے چپکے روتا رہا، روتے روتے سسکیاں بھرنے لگا پھر جانے کیسے اسے نیند آگئی اور وہ بے خبر سو گیا۔

جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ڈبے میں تیز روشنی چمکی ہوئی ہے۔ اس نے پورے بٹائے اور بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں بیٹھیں ڈبے میں نہیں تھیں۔ البتہ پورے اسی طرح رکے ہوئے تھے۔ وہ پوچھتا ہوا دروازے پر آئی اور دشت بھری نظروں سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے دور تک پڑیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اس کے بعد جنگلا اور جنگل کے باہر اونچے درختوں کے جھنڈ اور دور تک پھیلی ہوئی عمارتیں۔ نامی و محب چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو بٹو کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ جا رہا کیا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں ساری بات واضح ہوئی۔ غالباً اس کے سوجانے کے بعد مال گاڑی روانہ ہوئی ہوگی اور پھر ساری رات اور دن کے بیشتر حصے میں سڑک کرنے کے بعد اب کسی شہر میں پہنچ گئی تھی۔ بیٹھیں تو اتاری جا چکی تھیں لیکن پورے اسی طرح رکے تھے اور چونکہ وہ یوروں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اس لیے کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ جب یہ ساری بات اس کی سمجھ میں آئی تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ کتنی عجیب بات ہے، وہ سوچتا رہا اور بیٹوں تک کا سفر طے ہو گیا اور اب وہ کسی شہر میں پہنچ چکا ہے۔ یہ تپان کون سا شہر ہے؟ اس نے سوچا مگر لگتا ہے کوئی بڑا شہر ہے پھر وہ نیچے اترا اور ابھی دوی قدم چلا تھا کہ معاً آنکھوں میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ ٹائیس اس بری طرح لرزیں کہ وہ لاٹھڑا گیا۔ اگر جلدی سے بیٹھ نہ جاتا تو یقیناً گر پڑتا۔ زمین پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاریکی تھی اور تاریکی میں ناچنے والے ان سخت دائرے تھے۔ دراصل بھوک کی شدت اب انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ غارت گاہت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس کے ہاتھ پیر کاٹنے لگے تھے۔ چائیس کہتے سے زیادہ ہو چکے تھے کہ اس کے پیٹ میں ایک دانہ تک نہیں گیا تھا اور ایک گیارہ سال لڑکے کے لیے چائیس گھٹنے تک بھوکا رہتا معمولی بات نہیں تھی۔ بٹو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ ہو۔ پیٹ کے اندر آتھیں یوں اینٹھ رہی تھیں، جیسے کوئی انہیں زور زور سے چل رہا ہو۔ کئی منٹ۔۔۔ تک وہ سر تھا، بیٹھائیں

لمبی سانس لیتا رہا پھر حواسِ قدرے بحال ہوئے، آنکھوں کی روشنی واپس آئی اور ٹانگوں کی لرزش کم ہوئی تو وہ بہت کر کے اٹھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نے دائیں جانب دیکھا، قدرے فاصلے پر اسٹیشن تھا، جہاں کئی گاڑیاں ٹھہری تھیں اور پلیٹ فارم پر بے شمار لوگ نظر آ رہے تھے۔ بٹو نے ہونٹ جانے اور بولنے سے قدم ہٹا کر آگے بڑھا یا۔ جنگل کی ایک سلاخ ٹوٹی ہوئی تھی لہذا اس کو باہر نکلنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جنگل کے دوسری طرف کچھ دور تک کیا میدان تھا پھر ڈھلان اور اس کے بعد سڑک۔ بٹو سڑک پر پہنچ کر دائیں طرف چلنے لگا۔ کوئی نصف فرائیگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا تھا۔ بٹو چرہ پر پہنچ کر خود بخود بائیں جانب مڑ گیا اور آگے چلنے لگا۔ یہ سارا محل بالکل غیر ارادی تھا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ ابھی شہر تھا، ابھی لوگ تھے اور ابھی سڑکیں اور گھیاں تھیں اور وہ ایک کھوپا ہوا لڑکا تھا جو اپنے جاسن کے درخت، پتھری بکری اور یورپی ماں سے چھڑ گیا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جانے اور کیا کرے۔ بھوک کی شدت اور جسمانی طاقت کی بنا پر حواسِ متعین ہو رہے تھے، ذہن پر تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ اگر اتنی سخت حالت نہ ہوتی تو شاید وہ کسی بڑے چھوٹے کدو کس شہر میں ہے اور یہ کہ اسے کیا کرنا چاہیے مگر اسے ہوش ہی کہاں تھا۔ اس کے قدم بھی بغیر ارادے کے اٹھ رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسری سڑک آئی، دوسری کے بعد تیسری سڑک آئی۔ وہ سراسیمہ، پاگوں کی طرح۔ لوگوں کو، عمارتوں کو اور آتی جاتی کاروں، بسوں اور ٹانگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا، دھیرے دھیرے دھوپ دھندلانے لگی۔ سد پھر ماند پڑ گئی۔ پھر وہ ایک گلی میں داخل ہوا اور حیران ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں طرف کھلے دروازوں میں کئی ستوری عورتیں بیٹھی تھیں، اکثر عمارتیں وہ منزل تھیں اور ان کے چاروں پر بھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ سر سے سر تک سخی ہوئی، ہونٹوں پر سرنی لگے، آنکھوں میں کابل رچانے اور طرح طرح کے خوب صورت لباس اور زیور پہنے ہوئے۔ بعض گھروں سے موسیقی اور گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ "چچی ذرا سیان کی ہے ہم کھدے دے" گلی میں بڑی پھل پھل چلی، لمبے کا سا سانا تھا۔ طرح طرح کے لوگ آ جا رہے تھے، کئی کے ہاتھ میں پھولوں کے گجرے تھے۔ آنے جانے والے مرد عورتوں سے فنی

ملاقات اور فکرسے بازی بھی کرتے جا رہے تھے۔ بٹو بڑا حیران ہوا۔ یہ کئی دنیا ہے، کیسے لوگ ہیں اور یہ کتنی عورتیں ہیں۔ یہ عورتیں دروازوں اور چاروں پر کیوں بیٹھی ہیں۔ اس نے اتنی بہت کی خوب صورت اور دلہنوں کی طرح کئی ستوری عورتیں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ اتنا کہ کچھ دیر کے لیے وہ بھی بھول گیا کہ وہ چائیس کھٹوں سے بھوکا ہے۔ حیران حیران نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ گلی آگے جا کر دائیں طرف مڑی تھی اور سڑک پر قدرے چوڑی ہو گئی تھی۔ بٹو کا ایک رک گیا اور بولے بولے پسیوں کو دبانے لگا کیونکہ پسیوں کے نیچے ہلکا سا دروہور ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں بیٹھ جاتا چاہیے، اب اور چلنا مشکل نظر آتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ابھر اور نظر دوڑائی۔ دائیں ہاتھ پر ایک پان سگریٹ کی دکان تھی۔ پچھلے پر ایک کھٹے ٹھکر، الے بانوں والا گورا چٹا، تومند آدمی بیٹھا بھری سے پان لگا رہا تھا۔ دکان کے قریب ہی ایک عذوق سایہ قائم آدمی پھولوں کے بار اور گجرے بیچ رہا تھا، آس پاس چند ایک دکانیں اور گھر لکھیں کباب، روٹی اور کٹے بک رہے تھے، کھیں چائٹ اور کھیں عورتوں کے سنگار کا سامان، البتہ پان کی دکان سے آگے والی دکان بندھی اور اس کا چھوٹا بائیں بائیں خالی تھا۔ بٹو نے ایک لمبے سوچا پھر حیران نظروں سے کباب عموں کی دکان کو گھورتا ہوا بند دکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا چھٹا خاصا چوڑا تھا۔ برابر میں اوپری منزل کی بیڑیاں تھیں، بٹو پچھلے پر بند دروازے سے سرٹکا کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ زور سے ایک دوسرے میں پھنسا لیے۔ بھوک کی شدت اور کمزوری اب انتہا کو پہنچ چکی تھی، اس کے ہاتھ پیر سن رہے تھے۔ سر کے اندر کچھ ایسی گونج پیدا ہو رہی تھی، جیسے ہوا سیانیں بجا رہی ہو۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی ایک چادری تھی ہوئی تھی، دھوپ کی طرح اور اس دھوپ کی دوسری طرف جو کچھ بھی تھا، دروازے، کھڑکیاں، دکانیں اور پچھلے پچھلے لوگ، سب کچھ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ بٹو کچھ دیر دھند کے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور لمبی سانس لیتے لگا۔

پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا یا شاید دو گھنٹہ گزر گئے، پھر بٹو کے کان میں ایک آواز آئی۔ ایک نرم نسوانی آواز اس نے بولے سے پائیس کھٹوں۔ پہلی نظر میں تو کچھ نظری نہیں آیا پھر اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی سامنے کھڑی ہے۔ سرخ رنگ کے کپڑے پہنے بارہ تیرہ

سال عمر دی ہوگی۔ بٹو کو وہ ایک دھندلی تصویر کی طرح نظر آئی۔ اس نے آہستہ سے سر کو جنبش دی اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لڑکی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پھر کہا۔ "اسے کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

بٹو نے بڑی بہت کر کے کہا۔ "بٹو۔"

"کیا، بٹو۔ اچھا۔ اچھا۔ لڑکی اونچی آواز میں بولی۔ "کدھر سے آئے ہو تم؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

بٹو نے کچھ کا لیکن خود اسے اعزاز نہیں تھا کہ اس نے کیا کہا۔ شاید لڑکی کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ اس نے پھر اونچی آواز میں پوچھا۔ "کیا تم باہر ہو؟ طبیعت خراب ہے؟"

بٹو نے پھر کچھ کہا۔ اس کی آواز مدھم تھی، لڑکی کو جھک کر اور دھیان دے کر سننا پڑا۔ پھر وہ بولی۔ "بھوکے ہو؟"

بٹو کا سر شاید آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔ لڑکی نے دوبارہ اس کے شانے پر کھٹی دی پھر ہمدردی سے کہنے لگی۔ "اچھا۔ اچھا۔ تم سیکھیں ضرور، میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی اور بیڑیوں میں غائب ہو گئی۔ بٹو نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ سمیٹ کر بیٹھ گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ لڑکی نے کیا کہا لیکن اگر کچھ میں آج بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ وہ اس قافل میں تھا کہ کہیں جاتا۔ ہاتھ بیڑوں میں جان نہیں تھی، ذہن طاقت کے باعث مافوف سا ہو چکا تھا، ہنڈا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر گزر گئی پھر اس کے شانے پر دباؤ پڑا اور لڑکی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"اے۔۔۔ بٹو۔"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے المونیم کا ایک ٹشما موجود تھا، جس میں سروس کا ساگ، دو روٹیاں اور ایک گلاس پانی رکھا تھا۔ بٹو نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گردن اٹھا کر لڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں آسودوں سے میٹھی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

تیکم احسان نے بڑے تاز سے ذرا اٹھلا کر کہا۔ "جائے بڑے وہ ہیں آپ۔"

تک طاہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ تو محض آپ کا حسن ظن ہے ورنہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ آپ ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔"

بیم احسان نے یہ دستور باز بھرے انداز میں کہا۔ "میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی معذرت، کوئی نہ کوئی بہانہ دیتا رہا ہوں۔ یہ تو آپ کو خوب آتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ کسی کے دل پر کیا گزر جائی ہوگی۔ ذرا بھی تو خیال نہیں کرتے۔"

"بھلا ایسا کون ہے جسے میرے خیال کی اتنی پروا ہے؟"

"فرض کیجئے، میں ہی ہوں وہ۔" بیم احسان پھر اٹھ اٹھا۔
 صبح طاہر بولے سے مسکرائے۔ انہوں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن موقع نہیں ملا۔ اچانک دور سے فریدہ شوکت نے زور سے غور لگایا۔ "ارے طاہر صاحب! آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو کب سے تلاش کر رہی ہوں۔"

صبح طاہر مسکرائے گئے۔ انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "بہن! میں تو کافی دیر سے یہاں ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ کو نظر نہیں آیا۔"

جواب میں فریدہ شوکت بھی مسکرائی۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے کن انہیوں سے بیم احسان کی طرف دیکھا۔ "میں نے سنا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ نصیب دشمنان ساز ہوگی؟"

"ہاں۔" صبح طاہر نے جواب دیا۔ "کچھ کھانسی بخار کی شکایت ہوئی تھی مگر اب اچھا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ بیم احسان آڑی تریچھی نظروں سے فریدہ شوکت کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ناگوار صاف چمک رہی تھی، جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہوں، یہ کینت کیوں نازل ہوگئی ہے۔ یہی کیفیت فریدہ شوکت کی تھی۔ بار بار بیم احسان کی طرف یوں کن انہیوں سے دیکھ رہی تھی گویا اسے بیم احسان کی موجودگی ناگوار گزر رہی ہو اور وہ سن ہی سن میں دعا کر رہی ہو کہ اب یہ مجھ سے یہاں سے دفع ہی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ صبح طاہر دونوں خواتین کی اس کیفیت سے اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بیم احسان اور فریدہ شوکت میں چٹھک چلتی رہتی ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نہ صرف یہ دونوں خواتین بلکہ اور بھی کئی خواتین ہیں جو ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ رہتی ہیں مثلاً نسرتین چودھری جو شہر کے ایک بہت بڑے افسر کی صاحبزادی تھیں اور کچھ ہی عرصہ قبل ایم اے کر کے قاری ہوئی تھیں اور اب اس بات پر اصرار رکھتے تھیں کہ صبح طاہر کی محکوم نظر بن

کے رہیں گی، پھر مسز اور علی تھیں۔ عمر بیاس سال، کئی بڑاڑ ایکڑ زمین اور کئی کارخانوں کی مالک تھیں۔ ساولا رنگ، ناک خوش بے حد گھٹا، چند سینے کی اسٹین شاپر مسز انوار علی کو مستحق قبرستان میں دفن کر کے قاری ہوئی تھیں اور اب اپنی تنہا، ویران زندگی کو صبح طاہر کی قربت سے پروہن بنانا چاہتی تھیں۔ گو وہ صبح طاہر سے سال چھ ماہ بڑی ہی تھیں تاہم ان کا خیال تھا کہ ان کی کروڑوں کی دولت اور جائیداد نے ان کی ذات میں ایک ایسی خوبی پیدا کر دی ہے جو جو ان سے زیادہ شیش انگیز ہے اور انجام کار، وہ صبح طاہر کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گی۔ ایک اور خاتون۔۔۔ تھیں۔ شاذ بہ نیکو، ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کے صوبائی جنرل سیکریٹری کی دختر تھیں اور نیک اختر بھی۔ وہ اس طرح کے ولایت سے کئی ڈگریاں حاصل کر کے کوئی تھیں، خوب صورت جوان تھیں اور ذہین بھی اتنی کبھی ہمیشہ ہر امتحان میں اول آتی رہی تھیں اور اب ان کا تازہ ترین امتحان صبح طاہر تھے۔ دوسروں کو شبہ ہو سکتا تھا لیکن خود شاذ بہ نیکو عرف شاذی کو یقین تھا کہ وہ اس امتحان میں بھی آخر کار اول ہی آئیں گی۔ ان خواتین کے علاوہ دو چار خواتین اور بھی تھیں۔ صبح طاہر ان کی نگاہ احتساب کا مرکز تھے اور ان خواتین کو بھی یقین تھا کہ لائری انجام کار ان ہی کے نام لگے گی۔ صبح طاہر یہ ساری باتیں سوچتے سوچتے معاہولے سے مسکرائے لیکن ان کی مسکراہٹ میں مسرت کا فقدان تھا۔ کچھ عجیب سی مسکراہٹ تھی، چمکی، پڑمردہ، جیسے خود انہیں اپنے آپ پر رخصت آگیا ہو۔ انہوں نے دفعتاً زور سے سانس لی اور فریدہ شوکت کی طرف دیکھا جو بڑی شوقی سے کہہ رہی تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ اب آپ آج بھی ہیں، مگر یہ تو بتائیے یہ آپ نے پارٹی کس خوبی میں دے ڈالی ہے؟"

"میں نے کوئی پارٹی واری نہیں دی ہے۔" صبح طاہر نے وضاحت کی۔ "یہ تو بس خود بخود ہو گیا ہے۔ لوگ ملنے کے لیے آتے گئے اور خود بخود ایک پارٹی ہی ہو گئی۔"

اور یہ بات بالکل ٹھیک تھی، صبح طاہر نے کوئی پارٹی نہیں دی تھی۔ لوگ ایک ایک کر کے ان سے ملنے کے لیے آتے گئے اور اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ اب اس وقت ان کے وسیع ڈرائنگ روم میں متعدد افراد موجود تھے۔ شہر کے امرا و رذسا، لاکھوں کا بیر پچھرنے والے تاجر، مرکزی افسر۔ سیاسی لیڈر اور طرح دار خواتین۔ یہ سب کے سب بڑے لوگ تھے، ایک ایسی دنیا میں رہنے والے جس کا عام

انسانوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ قلعوں پر چلتے تھے اور کاروں میں سفر کرتے تھے اور صرف بڑے بڑے ہندسوں کی گنتی جانتے تھے، بشرطیکہ اس گنتی کا تعلق نوٹوں اور سکوں سے ہو اور یہ لوگ صرف بڑے بڑے منصوبے بناتے تھے۔ بڑے ہوئے، بڑے کارخانے اور بڑی عمارتیں۔ جن کے پاس لاکھوں تھے، وہ کروڑوں کی فٹریں تھے اور جن کے پاس کڑوں تھے، ان بے چاروں کو اپنی انتہا کا خود ہی علم نہیں تھا۔ یہ لوگ اکثر دیگر صبح طاہر کے وسیع اور خوب صورت گھنے میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑے لوگ بڑے لوگوں سے ہی ملتے ہیں اور کچھ اس بنا پر کہ ان میں اکثر کی کوئی نہ کوئی غرض یا کوئی نہ کوئی مفاد صبح طاہر سے وابستہ تھا۔ مثلاً سیٹھ اکرام تھے، جو ایک بہت بڑا ایلا زبانا چاچے تھے اور ان کے لیے انہیں صبح طاہر کی پانچر شپ کی ضرورت تھی۔ چودھری رتنی چند پریڈر کا ایک بڑا کارخانہ لگانے کے لیے صبح طاہر کے تعاون اور ساجھے داری کے منتھی تھے۔ پھر سیاسی پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے، جو کئی ماہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ صبح طاہر ان کی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لیں، کیونکہ ان کی پارٹی کی پوزیشن کچھ اچھی نہیں تھی اور یہ بات قریب قریب طے تھی کہ آنے والے الیکشن میں ان کی پارٹی مشکل سے چند نشستیں ہی حاصل کر سکے گی لیکن اگر صبح طاہر پارٹی میں شامل ہو جائیں تو صورت حال تبدیل ہونے کا نمایاں امکان تھا۔ صبح طاہر کی دولت اور نیک نامی کی بدولت بے شمار ووٹرز پارٹی کی جھولی میں آسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پارٹی کے جنرل سیکریٹری اکثر صبح طاہر کی مزاح پر ہی کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ سیٹھ اکرام، چودھری رتنی اور جنرل سیکریٹری کے علاوہ حزان پری کے لیے آنے والوں میں اور بھی کئی لوگ تھے۔ دوسرے الفاظ میں صبح طاہر ایک ایسی مرفی تھی جو کئی ملاؤں میں حرام ہو رہی تھی لیکن وہ بھی کسی سے کچھ کہتے نہیں تھے۔ سب کی سنتے تھے اور مسکرا کر چپ ہو جاتے تھے۔

بیم احسان نے چند باتیں اور کہیں پھر خوشونت آمیز نظروں سے فریدہ شوکت کو گھورتی ہوئی دوسری طرف چلی گئیں۔ کچھ اس انداز میں، گویا زبان بے زبانی سے کہہ رہی ہوں، اچھا چل چلیں کہوں کی تھہرے، بیم احسان کے جانے کے بعد فریدہ شوکت نے اطمینان کی۔ سانس لی اور تازہ بھرے انداز میں بولی۔ "کوئل آ رہے ہیں آپ؟"

"ہل، کہاں؟" صبح طاہر نے تعجب سے کہا پھر چونک

کر بولے۔ "ارے ہاں، کل تو چھاری ساگر ہو۔"

"دیکھیے، دیکھیے۔ آپ تو ابھی سے بھول گئے تھے۔" فریدہ شوکت نے مصمتی لہجے سے شکایت کی۔ "یہ تو کچھ اچھی بات نہیں۔ آپ کو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔"

"نہ۔ نہ۔ نہ۔ ناراض نہ ہو۔" صبح طاہر خوش دلی سے مسکرائے۔ "بے شک میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی لیکن انداز میں تو درج ہے، کل سیکریٹری ضرور مجھے یاد دلا دیتا اور میں نے تمہارے لیے خود بھی خرید لیا ہے۔"

"اچھا۔" فریدہ خوش ہو کر بولی۔ "بتائیے۔ بتائیے نا، کیا دے رہے ہیں آپ مجھے؟"

"ابھی نہیں، کل دوں گا جب دیکھ لیتا اور نہ سارا لطف قارت ہو جائے گا۔" اتنا کہتے کہتے صبح طاہر نے گردن گھما لی اور ان کی نظر کس شائستہ گھڑار پر جم گئی، جو دو تین خواتین کے ساتھ کھڑی تھی لیکن بے تابانہ اور پر شوق نظروں سے صبح طاہر کو ہی دیکھ رہی تھی۔ شائستہ گھڑار پر چند کھیر کے آکر ان کنگ کی لڑکی بھی لیکن خود بچھووں کی طرح نرم و نازک تھی گو کہ کچھ ایسی زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر دلکشی اور جاذبیت کی کئی جدید فیشن کے لباسات، زینرات اور میک اپ سے پوری کر گئی تھی۔ صبح طاہر کی طلب کاروں میں اس کا نمبر ساتواں یا آٹھواں تھا۔ جب صبح طاہر نے اس کی جانب دیکھا تو اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک اجلی اور رسمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بولے سے ایک آنکھ دھالی۔ شائستہ گھڑار کی یہ حرکت فریدہ شوکت نے اتفاق سے دیکھ لی۔ اس نے دفعتاً بھون سیڑ کر کہ درجہ نگاری اور طے سے کہا۔

"مجھے یہ عورت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

"وہ کیوں؟"

"ارے آپ دیکھتے نہیں، کیسی دیدہ دلیر ہے۔ نہ جانے کینت اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ نہ صورت ہے نہ فعل لیکن پھر کیلے کپڑوں سے ہر وقت لدی رہتی ہے اور میک اپ تو بس اتنا کرتی ہے کہ کچھ نہ چھو نہیں۔"

"مگر مجھ سے لگا تو عورت کا فطری حق ہے۔"

"میں مانتی ہوں۔" فریدہ شوکت نے پہلے ہی جیسے جیسے اور صبح لہجے میں کہا۔ "مگر سلیطہ اور گھمورے پن میں کوئی فرق ہوتا ہے طاہر صاحب۔ آخر میں بھی تو ہوں۔ کیا آپ نے بھی مجھے بھی ایسا سگار کرتے دیکھا ہے کہ ابھی خاصی اشتہار نظر آؤں؟"

صبح صاحب نے جواب میں کچھ نہیں کہا، مسکرا کر چپ

ہوئے انہیں معلوم تھا کہ فریاد شوکت کے ان سخت زاریاں کس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر فریاد کے بھانے شاکست اس وقت ان کے قریب ہوتی تو وہ فریاد شوکت پر اسی قسم کے اعتراضات کرتی۔ وہ اس قسم کی باتیں سنتے تھے اور چپ ہو جاتے تھے۔ ضرورت بھی کیا تھی کہ اپنی رائے کا اظہار کرتے۔

فریاد شوکت نے شاکست کو گھر کے دو چار میب اور گنوائے۔ جن کا طریم از کم اس کی دانست میں شیخ طاہر کو نہیں تھا۔ پھر اس نے شیخ طاہر کو مشورہ دیا کہ اگر انہوں نے شاکست کو گھر کو دریا بھی لٹ تو وہی تو ایک بھیا نک لٹلی ہوئی۔ شیخ طاہر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے مشورے کا ہر حال میں دھیان رکھیں گے۔ پھر وہ یہاں بتا کر کے در پیچ کی طرف بڑھ گئے، جہاں میز پر مشروبات کے علاوہ پانی کی ٹنری تھی بھی رکھی تھی۔ انہوں نے ایک پان اٹھا کر گنگے میں دیا یا پھر وہ گھوم ہی رہے تھے کہ پانک رازنی نے انہیں پھیر لیا۔

”شیخ صاحب!“ اس نے عادت کے مطابق ناک سمجھا کر کہا۔ ”میں اب تک آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ آخر کب آپ میرے لیے وقت نکالیں گے؟“

”کاش کہ اسے اسے وقت چاہیے بھائی آپ کو؟“ شیخ طاہر نے ذرا اٹکھٹے سے پوچھا۔

”اتر ویو، جناب اتر ویو۔“ رازنی نے کہا۔ ”یاد ہے، میں تین بار آپ سے درخواست کر چکا ہوں لیکن آپ کو وقت ہی نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے کہ اب اور نہ ملے۔ لوگ آپ کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں۔ آپ کی شخصیت، آپ کی بے مثال کامیابی، آپ کے کارنامے، یہ ساری باتیں لوگ جانتا چاہتے ہیں لہذا حضور والا میں سمجھتا ہوں کہ کسی دن، کچھ وقت مجھے بھی عنایت فرمائیے، صرف چند ہی باتیں پوچھوں گا اور اطمینان رکھیے، ایسا آرٹیکل لکھوں گا کہ آپ کا شیخ خوش ہو جائے گا۔ ہاں، تو کب حاضر ہو جاؤں؟“

رازنی ایک مقامی اخبار کار پور پڑھا۔ خبروں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ نمایاں اور نامور شخصیتوں کے انٹرویو لینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی شہرت خاصی مستند اور ممتاز تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک جرأت مند اور ایسا انداز اخبار نویس ہے، لگی پٹی نہیں رکھتا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے میں اسے کمال حاصل ہے۔ کسی تعویذ یا خوف کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ باتیں میں اس نے متعدد دلیرانہ اور بڑے انصاف کے کچے چھتے کھولے تھے اور ان کے اصل چہرے عوام کے سامنے رکھے تھے اور ہر

چند کراسے کی بار مصائب کا سامنا کرتا پڑا تھا، نیل کی بو بھی کھائی تھی مگر اس نے بھی پردا نہیں کی اور اپنے اصولوں پر کار بند رہا لیکن لوگوں کا ایک حلقہ ایسا بھی تھا جو اس رائے سے متعلق نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ رازنی دراصل ایک خود غرض، موقع پرست اور حدود درجہ بالا شخص ہے۔ شیخ کیا تھا یہ کسی کو علم نہیں تھا۔ انہیں بھی نہیں جو رازنی سے بہت قریب تھے جبکہ خود رازنی کا کہنا یہ تھا کہ وہ تو ایک عملی کتاب کی طرح ہے۔

شیخ طاہر نے قدرے توقف کے بعد مسکرا کر خوش دلی سے کہا۔ ”مگر بھی رازنی صاحب! میں تو ایک سادہ سا آدمی ہوں، عام قلم کار۔ میرے بارے میں لکھ کر آپ اپنے اخبار کے صفحے کیوں ضائع کریں گے۔ لوگوں کو بھلا مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

”خیر حضور، یہ تو نہ کہیے۔ آپ عام ہیں یا خاص، یہ طے کرنا آپ کا نہیں ہمارا کام ہے۔“ رازنی نے ہنس کر کہا۔ ”رہی صفحے ضائع ہونے کی بات تو اطمینان رکھیے کہ صفحے ضائع نہیں ہوں گے۔ ہاں، تو میں کب حاضر ہو جاؤں؟“

شیخ طاہر نے لمبے لمبے تھوڑے وقفے کیا۔ ”دیکھیے، ابھی ذرا مصروف ہوں، پھر وہ منہ نہیں جائیے، پھر میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔“

”ابھی بات ہے جناب والا! ہم انتظار کر لیں گے۔“ رازنی خوشی سے مسکرایا، پھر کہنے لگا۔ ”ویسے شیخ صاحب! میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ آپ کے اس خوب صورت نکتے میں مجھے برے نہیں لگتی ہے، مگر کیا اس اچھی لگتی ہیں، پردے، قائلین اور یہ جہاز بھی اچھا لگتا ہے۔ مگر صرف ایک چیز اچھی نہیں لگتی۔“

”وہ کیا؟“ شیخ صاحب نے پوچھا۔

”۔۔۔ رازنی نے گھاس فٹاس نہیں لہرایا۔“ آپ کے یہاں یا تو کوکا کولا پیتا پڑتا ہے یا پھر اورج جوس“

”کیا کروں بھائی۔“ شیخ طاہر نے قدرے معذرتی انداز میں کہا۔ ”شراب میں نہیں پیتا اور نہ ہی یہ پسند کرتا ہوں کہ میری صحت کے نیچے کوئی دوسرا پے۔ مجبوری ہے۔“

رازنی ہنسنے لگا۔ ”شیخ صاحب! میرا ذاتی خیال ہے، آپ فلیک کہتے ہیں، آدمی کو اپنے اصولوں پر سختی سے عمل کرتا چاہیے، یہ بڑی اچھی عادت ہے۔ اچھا خیر، اب میں چلتا ہوں لیکن دیکھیے، مجھے لگتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا پہلا انٹرویو سب سے پہلے میرے ہی اخبار میں چھپے۔“

”ضرور ضرور۔ میں خیال رکھوں گا، آپ فکر نہ

کریں۔“

رازنی مسکراتا اور ہاتھ جھلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی رخصت ہونے لگے۔ کمرے میں کوئی نہیں رہ گیا۔ شیخ طاہر وہاں در پیچ کے قریب کھڑے ملازموں کو برتن سینٹے دیکھتے رہے۔ اس دوران وحیدہ بیگم کمرے میں آئیں اور انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر شیخ طاہر کو روک دیا۔

”پورے شہر میں ایک وحیدہ بیگم ہی ایسی ہستی تھیں، جو شیخ طاہر کو ”تم“ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں، باوجود اس کے کہ وہ شخص ایک ملازمہ تھیں لیکن شیخ طاہر کو بھی وحیدہ بیگم کا طرز عمل اور انداز خطاب برا نہیں لگا تھا بلکہ انہیں تو ایک نامعلوم ہی مسرت ہوتی تھی۔ ایک بار بیگم احسان نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا۔

”مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ یہ عورت آپ کو تم کہہ کر مخاطب کرے۔“

”کیوں؟“

”ارے طاہر صاحب! تو کوئی ہے، اسے اپنی حیثیت اور اوقات نہیں بھولنا چاہیے۔ بھلا تو کر لیں مالک کو ”تم“ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور وہ بھی ایسے اعزاز میں گویا کھڑے رہی ہو۔“

”مگر بھی، اس لفظ جرم میں بڑی اپنایت ہے۔“

”تو کیا ہم آپ کے نہیں ہیں۔“ بیگم احسان نے بڑی لگاؤ سے کہا۔ ”مگر میں تو اب آداب کا بڑا خیال رکھتی ہوں۔ آخر غریب بھی تو کوئی چیز ہے۔“

شیخ طاہر نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مسکرا کر چپ ہو گئے۔

ملازم برتن لے گئے اور وحیدہ بیگم بھی چلی گئیں تو شیخ طاہر ہولے ہولے چلتے ہوئے غصے برآمدے میں آ گئے۔ سامنے وسیع و عریض پائیں باغ تھا جو درختوں پر سیر کرنے والی خاتونوں کی چپکارسے گونج رہا تھا۔ شیخ طاہر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور خالی خالی نظروں سے پائیں باغ پر اترتے ہوئے رسمی اندھیرے کو دیکھنے لگے۔ شیخ طاہر اس اندھیرے میں چپ چاپ بودوں کو دیکھتے رہے اور پردوں کی پچھلے ہارٹ سنتے رہے اور ہولے ہولے ان کے دل میں ایک سنا سنا پھیلنا چلا گیا۔ ایک ایسا سنا جس میں اداسی اور یاسیت تھی۔ ان کا دل بھی بھی ایک بے کنارہ سحران جاتا تھا، دل اختیار اور بے آپ و گماہ۔ اس سحر میں ہر طرف ریت ہی ریت تھی، نہ روشنی تھی نہ کوئی آواز تھی، نہ بارش کا کوئی

چھینٹا پڑتا تھا اور نہ کوئی کوئل پھونکتی تھی۔ ہاں، کبھی کبھی ہوا چلتی تھی، رنج اور بے بسی کے گنگے گنگے جھونکے چلتے تھے تو صحرای ریت پر طرطوط طرح کی نیم تصویریں بنی تھیں۔ شیخ طاہر چشم تصور سے ان مدام تصویروں کو دیکھتے رہتے۔ کچھ اس طرح جیسے انہیں دیکھتے، انہیں پچھاننے کی کوشش کر رہے ہوں مگر تصویروں کے خدو خال دھندلے ہی رہتے، کبھی واضح نہ ہوتے۔

کافی دیر گزر گئی، شیخ طاہر اسی طرح کرسی پر خاموش اور ساکت بیٹھے رہے اور دور دور تک پھیلے اندھیرے کو گھومتے رہے۔ تم سم اپنے آپ سے، اپنے کرد و پیش سے بے خبر، یوں جیسے وہ ہاں نہیں لگتا اور تھے، ان کے چہرے پر کنگے گنگے دکھ کی پر چھائیاں تھیں اور انہوں میں آنسو۔ پتا نہیں کیوں ان کی آنکھ پھرنے لگی تھی۔ پھر سادہ چہرے کے اور گھوم کر برآمدے کی مغربی کانسٹی کی طرف دیکھنے لگے جہاں سے چوں چوں کی آواز آرہی تھی۔ دراصل کانٹس کے ایک کونے میں گوریا نے ایک گھونٹا بنا رکھا تھا اور چوں چوں کی آواز گوریا کے چوں کی تھی۔ ایک بار ایک ملازم نے گھونٹا بنانے کی کوشش کی تھی مگر شیخ طاہر نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ آئندہ بھی ایسی حرکت مت کرنا۔ یہ گھونٹا اس چڑیا کا چھوٹا سا گھر ہے جہاں وہ امن و سکون سے رہتی ہے، اگر اس کا گھر اجاڑ دے تو یاد رکھو، یہ بات اللہ تعالیٰ کو ہرگز اچھی نہیں لگے گی۔“ شیخ طاہر چند تھپتھپاتے چوں کے چوں کی موسیقی ریز آواز سنتے رہے، پھر یکھٹ دواٹھے۔ کرسی اٹھا کر آہستہ سے کانٹس کے قریب دھکی اور اس پر چڑھ کر گھونٹے میں جھانکنے لگے۔ چڑا گھونٹے میں نہیں تھا لیکن چڑیا بھی اور وہ چھوٹے چھوٹے بچے اس کے پونے سے گنگے بیٹھے تھے اور چوں چوں کر رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ چڑیا شیخ طاہر کو جھانکتے دیکھ کر ڈڑی نہیں۔ بس ابھی بھی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی، شیخ طاہر نے چڑیا کی طرف نہیں دیکھا، ان کی نظریں تو بچوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے سر سرخ، ان کے بدن پر نرسے نرسے پر لکھنا شروع ہو گئے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک بے ممکن لیکن معصومی چمک تھی، زندگی کے حسن اور سچائی سے معمور۔ شیخ طاہر چند لمبے ان بچوں کو دیکھتے رہے پھر یکا یک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

بٹو نے پانوں کی پڑیا زینت کی طرف بڑھائی تو وہ اٹھلا کر بولی ”یہ تم میرے پان میں تین چار لالچیاں کیوں

”پتا نہیں، بس یو ٹی۔“ بشو جیپ گیا۔
 ”اور اگر کسی استاد سند کو پتا چل گیا تو؟“
 ”تو کیا ہوا، وہ کچھ نہیں کہیں گے، مجھے معلوم ہے۔“
 ”بشو نے ہنس کر کہا پھر دارک کر یولا۔“ دوسرے ذینت ہم پان
 مت کیا کیا کرو۔“
 ”کیوں؟“

”تمہارے دانت اتنے اچھے ہیں۔“ بشو دارشاہر کر
 یولا۔ ”پان کھاؤ کی تو خراب ہو جائیں گے۔“
 ”چل، چل، بڑا آیا صحت کرنے والا، تو کیوں
 میرے دانتوں کی فکر کرتا ہے۔“ ذینت نے شوقی سے کہا۔
 پھر ہاتھ بڑھا کر چٹکی میں سونف اٹھائی اور منہ میں ڈال کر
 یولی۔ ”پچھلی کھائے گا؟“
 ”اس وقت پچھلی کہاں سے آئی؟“ بشو نے حیرت
 سے پوچھا۔

”ارے رات میں وہ چھوٹے چودھری آئے تھے
 نا۔“ ذینت بتانے لگی۔ ”انہوں نے ہی پچھلی، کباب، مٹھائی
 اور نہ جانے کیا کیا منگوایا تھا۔ وہ جب بھی آتے ہیں، ایسا ہی
 کرتے ہیں۔ بڑے آدمی ہیں، اسی لیے خوب پیسا خرچ
 کرتے ہیں۔ رات میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت سا کھانا بچ
 گیا تھا۔ اگر تو کبے تو پچھلی لے آؤں۔ جی، بہت اچھی پچھلی
 ہے۔“

بشو نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ ٹھوڑی دیر کچھ عجیب سی
 نظروں سے ذینت کو دیکھتا رہا۔ پھر گردن جھکا کر یولا۔ ”خیر
 تم کہتی ہو تو میں پچھلی کھاؤں گا، ابھی کھاؤ بھی نہیں کھایا ہے
 میں نے، لیکن ایک بات کہوں؟“
 ”کیا؟“

”یہ جو تمہارے چھوٹے چودھری ہیں، یہ مجھے بالکل
 اچھے نہیں لگتے۔“

”پچھلی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے چھوٹے چودھری
 نہیں ہیں۔“ ذینت نے پھر ہاتھ بڑھا یا، سونف اٹھا کر منہ
 میں ڈالی۔ ”اور دوسری بات یہ ہے کہ۔۔۔“ اس نے اپنا
 جملہ پورا کیا۔ ”وہ تجھے بھلا اچھے کیوں نہیں لگتے؟“
 ”پتا نہیں۔“ بشو کے لہجے میں ہلکی سی بے بسی تھی۔
 ”شاید اس لیے کہ وہ بڑا آدمی ہے اور خوب پیسا خرچ کرتا
 ہے۔“

”ارے تو کیا ہوا؟“ ذینت نے بے پروائی سے
 جواب دیا۔ ”تجھے یا مجھے اس سے کیا، وہ تو بڑی آپا کے

پاس آتے ہیں ان کا بھراسنے کے لیے، بھلا تیرے لیے اس
 میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔“
 ”پتا نہیں، بس یوں ہی۔“
 ”تو تو بچی بے غصوں کی باتیں کرتا ہے۔“ ذینت
 ہنسی۔ ”اچھا میں جانتی ہوں۔ ورنہ پتا چلتا اچھی چوہارے سے
 چلا نہیں کی۔“

ذینت اپنے چوہارے کی میزبوں کی طرف چل
 پڑی۔ بشو اسے دیکھتا رہا۔ کچھ اس طرح خوب ہو کر گویا اسے
 آس پاس کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔ جب وہ میزبوں میں قاصد
 ہوئی تو بشو نے کچھ زور سے سانس لی اور بے دھیانی سے
 اپنے چہرے کے سگے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس
 سے اسے ایک عجیب سی اداسی نے گھیر لیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا
 جیسے دل میں کوئی ہولے ہولے چنگیاں لے رہا ہو۔ ایسا
 کیوں ہوتا تھا، یہ بشو کو نہیں معلوم تھا لیکن ایسا اکثر ہوتا تھا۔
 خاص طور پر جس رات چھوٹا چودھری آتا اور ذینت کے
 چوہارے پر خوب دھوم دھام سے بجا رہتا تو بشو کو ایک سہ
 چنگی سی گھبر لگتی۔ چودھری کی عمر کوئی پانچ سال یا اس سے
 اوپر کی۔ بڑا سہج و سلیقہ، لمبا چوڑا آدمی تھا، سونے چاندی
 کے کام والا مٹائی کسا پیتا تھا اور اس کی پکڑی کا شلہ بہت
 اونچا تھا اور اس کے پیچھے خوشامدیوں اور ملازموں کی ایک
 پوری فوج ہوتی تھی۔ جب بھی بشو اسے دیکھتا تو اس کے دل
 میں ایک نامعلوم سا خوف سر اُبھارنے لگتا۔ حالانکہ اس
 خوف کی یہ ظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ ذینت نے خود کہا تھا کہ
 اسے چودھری سے بھلا کیا لینا دینا ہے، وہ تو بڑی آپا کے
 پاس، جو ذینت کی بڑی چچی زاد بھتیجی تھی، آتا ہے مگر اس کے
 ہاؤس جو بشو کو ڈر لگتا تھا چودھری سے، اس کے مٹائی کسے سے
 اور اس کے اونچے شلے سے اور اس کے ملازموں سے۔ اس
 نے کئی بار چودھری کی طرف سے اپنے دل میں پیدا ہونے
 والے اس خوف اور نا پسندیدگی کو کبھی کی کوشش کی مگر اس کی
 سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر گردن موڑ کر ذینت
 کے چوہارے کی طرف دیکھا جو خالی پڑا تھا، اس نے ہاتھ
 اٹھا کر ناک کھائی اور زور سے سانس لے کر پالوں کی ڈلیا
 اپنی طرف کھینچی۔ اسی وقت کرم داومنیاری والے نے زور
 سے آواز دی۔

”ارے بھی بشو! کیا ہو رہا ہے پتر؟“
 کرم داومنیاری والے کی دکان بالکل سامنے تھی۔
 بشو نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور اونچی آواز میں یولا۔

”کچھ نہیں جی، پان لگا رہا ہوں۔“
 ”استاد کدھر گیا؟“
 ”جی، وہ اپنی بہن سے ملنے گئے ہیں۔“
 ”اچھا، اچھا۔“ کرم داو نے اپنے پیچھے سر کو زور زور
 سے ہلایا۔ ”استاد سند بڑا اچھا آدمی ہے۔ اس کا دل سند
 کی طرح بڑا ہے۔ سب کا خیال رکھتا ہے، اللہ اسے خوش
 رکھے۔ کب آئے گا وہ؟ مجھے ذرا کچھ کام تھا۔“
 ”کیسا کام؟“ بشو نے پوچھا۔

”اب پتر تجھے بتانے کی بات نہیں۔ یکجہری عدالت
 کا معاملہ ہے۔ استاد سند ٹھوڑی سی مدد کرو گے گا تو میرا بڑا
 کام بن جائے گا۔“
 ”وہ تو پانچ پیچھے آج ہی آج ہی آج ہی۔“
 ”اچھا تو میں شام کو ہی اس سے بات کر لوں گا۔“
 کرم داو نے کہا، پھر رک کر یولا۔ ”بشو! ایک پان مجھے کھلا
 دے پتر، منہ بڑا پیچھا ہو رہا ہے۔ اللہ تجھے خوش رکھے، بہت
 اچھا پیچھے ہے تو۔“
 ”اچھا جی، ابھی لایا۔“ بشو نے ہنس کر کہا۔

بشو کرم داو کو پان دے کر آیا اور پھر چڑھ پان لگانے
 میں مصروف ہو گیا۔ کبھی بھی وہ گردن اٹھا کر ادھر ادھر بھی
 دیکھ لیتا۔ کبھی گلی سناٹا اور دیرانی تھی۔ چاروں طرف تیز
 دھوپ چھلی ہوئی تھی۔ اس تیز چھلکی دھوپ میں بھی کبھی کوئی
 شخص گزر جاتا، کسی وقت کوئی کچھ رک کر پان یا سگریٹ
 خریدتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس کے بعد پھر وہی سناٹا اور
 خاموشی۔ بشو نے پھرتی سے پان کے اوپر کھانک لگاتے
 گردن اٹھا کر ذینت کے چوہارے کی طرف دیکھا مگر وہ
 خالی پڑا تھا۔ پھر اس نے طائرانہ انداز میں گردن وچٹ میں نظر
 ڈالی۔ ذینت کے بعد سرداراں کا کونھا تھا، اس کے بعد
 صابرو اور پھر پٹا اسر سرداری کے چوہارے تھے مگر سب کے
 ہانچوں پر پردے پڑے تھے۔ کرم داومنیاری والے کی
 دکان کے مین اوپر رہنمائی کا چوہا رہا تھا اور وہ اپنے پیچھے پر
 کرسی پر بیٹھی دھوپ میں اپنے بال کٹھا رہی تھی۔ گہرے
 سانولے رنگ والی دلیلی پکڑی رہنمائی جب رات میں بن
 سنور کر چوہارے میں بیٹھی تھی تو ابھی بجلی کوہ قاف کی پری
 نگر آتی تھی مگر اس وقت اسے دیکھ کر کسی عمر رسیدہ بھتیجی کا
 خیال آتا تھا۔ رہنمائی کے برابر میں سنور استاد کی کاچہ بارہ
 تھا، جہاں سے تو کھار کی اونچی اونچی آوازیں سنائی دے رہی
 تھیں۔ شاہد سنور استاد کی دونوں بیویاں مہرن اور نامرہ
 میں پھر جھگڑا ہو گیا تھا۔ سنور استاد کی پہلی بیوی مہرن تھی، بعد

میں وہ کہیں سے نامرہ کو پکڑ لایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ سنور
 استاد نے اسے کسی سے چند ہزار روپے میں خریدا تھا۔
 حقیقت کیا تھی، یہ کسی کو علم نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو یہ جاننے کی
 فرصت یا ضرورت تھی۔ اس بازار سے تعلق رکھنے والوں کا
 اپنا ایک رویہ ہوتا ہے، ان کے اپنے خاص نوعیت کے تہذیبی
 اور معاشرتی تقاضے ہوتے ہیں جن پر وہ شعوری یا لا شعوری
 طور پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ نامرہ نے بھی اس بازار۔
 کے رویوں اور تقاضوں کو قبول کر لیا تھا مگر یہ دوسری بات
 ہے کہ سنور استاد کی جی پہلی بیوی مہرن نے نامرہ کو قبول
 نہیں کیا تھا۔ پہلے وہ ہمیشہ چپ چاپ رہنے والی ایک سیدھی
 سادی عورت تھی لیکن نامرہ کے آنے کے بعد بڑی تیز
 وطرار ہو گئی تھی۔ دونوں عورتیں اکٹرو ویشتر بڑی باقاعدگی
 سے اس طرح لڑتیں کہ سننے والے دم خود وہ جاتے۔ استاد
 سند بھی کبھی کبھی کالوں میں اٹھیاں ٹھونس لیتا اور گھبرا کر بشو
 سے کہتا۔

”عد ہو گئی پتر! حد ہو گئی۔ ان عورتوں نے تو کہاں ہی
 کر دیا ہے، شیطان بھی اگر یہاں آئے تو دم دبا کر بھاگ
 لگتے۔“

بشو کچھ دیر سنور استاد جی کے چوہارے کی طرف
 دیکھتا رہا اور۔۔۔ پھر اس کی نگاہ اگلے چوہارے کی طرف اٹھ
 گئی جو بھتیجی کا تھا۔ مشرق اور مغرب میں بیک وقت دیکھنے
 والی بھاری بھر کم ہنکار یکدم ہلا کر اسے متوجہ کر رہی تھی۔
 بشو نے بلند آواز میں پوچھا۔

”کیا بات ہے چاچا؟“
 ”اسے ہے پتر! میرے لال اڈر اڈر اچھے سے پان
 دے جا۔ لگا بہت خشک ہو رہا ہے مگر دیکھ، لا ابھی ذرا زیادہ
 ڈالیو، سمجھ گیا نا؟“
 ”ہاں، چاچا! فکر نہ کرو۔“ بشو نے کہا۔ ”میں ابھی
 لایا۔“

بشو بھتیجی کو پان دے کر آیا اور دکان کے اندر پور
 سے ایک لگا کر بیٹھ گیا۔ گلی میں بد دستور سناٹا تھا اور یہ کوئی
 تعجب کی بات نہیں تھی۔ جیسے جیسے دن ڈھلتا، روشنی بڑھنے
 لگتی، تلاش بیٹوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ پھول
 والے، کباب، بھون، والے اور چچی والے آ جاتے۔ مختار
 بیکمر، صابرو اور ذینت کی بڑی آپا کی سربلی آوازیں گلی میں
 سر بکھیر تھیں۔ یہ ہر روز ہوتا تھا کیونکہ اس گلی میں دن اس
 وقت طلوع ہوتا ہے، جب ساری دنیا میں رات شروع ہوتی
 ہے۔ بشو خاموش بیٹھا رہا اور گلی کی گھسوری ایتھوں والے فرش

پر چمچاتی دھوپ کو دیکھتا رہا۔ استاد سمندر کے ساتھ رہتے اور اس کی دکان پر کام کرتے ہوئے اسے کوئی ایک سال ہو گیا تھا حالانکہ اس میں اس کی خواہش یا ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بات تو بس خود بخود ہو گئی تھی جیسے انسان کی زندگی میں اکثر باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔ بشو کو وہ شام یاد تھی جب وہ بھوکا پیاسا سا لگی میں آیا تھا اور ایک لڑکی نے اسے کھانا دیا تھا۔ وہ پورا مہتر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں اس طرح نقش ہو چکا تھا کہ اگر وہ چاہتا بھی تو اس مہتر سے چمچا کر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس رات کھانے سے فارغ ہو کر کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا تھا۔ لڑکی کچھ دیر بعد آکر تسلا اور گلاس نے لگی تھی اور اس نے شاید بشو سے کچھ باتیں بھی کی تھیں لیکن بشو کچھ شیک شیک ظلم نہیں تھا کہ لڑکی کیا پھر رہی ہے اور وہ جواب میں کیا کہہ رہا ہے۔ دراصل چالیس گھنٹوں کے بعد اس کے خالی معدے میں اچانک کھانا پینا تھا اور اس وجہ سے اس پر ایک عجیب سی تھابت اور نئے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی چنانچہ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور حیران حیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ عجیب و غریب میاں اور عجیب لوگ تھے۔ سامنے سگریٹ پان کی دکان تھی جس کے اوپر ایک خوب صورت سا بوڑھا لگا تھا۔ دُلہا پان ہاؤس۔

پروچانٹر استاد سمندر۔ اور پھر چوبداروں اور دروازوں میں کئی سواری گوریوں جو بشو کی اور ہی دیا کی تھوکی نظر آتی تھیں۔ یہ سب کیا تھا، یہ کیسے لوگ تھے اور چوبداروں سے آنے والی موٹیلی اور گانے کی آواز لگتی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر کچھ دیر بعد جب اس کے اوسان بھال ہوئے، ناگوں میں ذرا جان آئی اور آنکھوں کی دھندلاہٹ دور ہوئی تو وہ اچانک اٹھا اور ایک طرف چل پڑا، اگرچہ خود اسے معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے۔ وہ بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹک رہا۔ پھر جب بہت تھک گیا اور خیندگی سامنے لگی تو ایک پارک میں پڑ کر سو گیا۔

دوسرا دن بھی یوں ہی گزرا۔ ایک آوارہ کتے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے۔ بے آس، بے امید، بے مقصد، جب شام ہوئی، بھوک نے شدت اختیار کی اور کچھ جھجھک میں نہ آیا تو وہ پھر بازار حسن جا پہنچا، حرکت کرتی تھی مگر جھجھک میں نہ آیا کوئی اندرونی تحریک ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گئی تھی۔ وہ اسی بند دکان کے پچھلے پردے پر کھڑے کھڑے غالی غالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی میز میوں سے اتری اور سیدھی استاد سمندر کی دکان پر گئی۔ پھر جب وہ پان

لے کر واپس آئی تو اسے دیکھ کر اچانک خشک گئی۔
 ”اسے کیا کر رہے ہو یہاں تم؟“
 ”کچھ نہیں، بیٹھا ہوں بس۔“ بشو ذرا اکہم کر پڑا۔
 ”گھر نہیں ہے تمہارا کوئی؟“
 اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 لڑکی نے اسے غور سے دیکھا پھر نرم لہجے میں بولی۔
 ”بھوک لگی ہے کیا؟ کھانا کھاؤ گے؟“
 اس کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔
 یہ دوسرا دن تھا۔ اس کے بعد اگلے تین دن تک بھی ہوتا رہا۔ بشو سارا دن بازار مارا پھرتا اور شام کو بازار میں پہنچ جاتا۔ وہی دکان، وہی پینا۔ لڑکی اسے کھانا دے دیتی۔ ان کے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ کو یا خود بخود ہو گیا تھا۔ بشو کو معلوم تھا کہ ہاں کھانا ضرور مل جائے گا اور لڑکی جانتی تھی کہ بشو ہاں آنے کا ضرور۔ یہی وجہ ہے کہ شام ہوتے ہی وہ بار بار پچھلے اتر کر دیکھتی کہ بشو کچھ آیا کہ نہیں، چند دن یونہی گزرتے۔ اس دوران دوسرے لوگ بھی اسے پہچانتے گئے۔ ایک شام استاد سمندر نے اسے بلایا اور نرمی سے پوچھا۔
 ”کیا نام ہے تمہارا پتر؟“
 ”بشو۔“
 ”کہاں سے آئے ہو؟ گھر کہاں ہے تمہارا؟ یہاں کیوں پڑے رہتے ہو؟“ استاد سمندر نے پوچھا۔ اس نے اور بھی کئی سوالات کیے لیکن بشو کوئی معقول جواب نہیں دے سکا۔ اسے تو خود بھی شیک شیک نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے، اس کا گھر کہاں ہے۔ اپنے بچپن کی، اپنے گھر کی محسوس چند تصویریں ہی اس کے ذہن میں محفوظ تھیں اور وہ تصویریں بھی بہت دھندلی تھیں لہذا وہ کیا بتاتا۔ استاد سمندر نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا کہ اس بازار کا کہنی دستور تھا، دوسرے کی زندگی میں صرف اتنا ہی چھانو جتنی وہ اجازت دے۔ خود استاد سمندر نے اپنی زندگی میں زیادہ چھانے کی اجازت کسی کو نہیں دی تھی۔ لہذا اس نے بشو کو بھی زیادہ کریم نامناسب نہیں سمجھا۔ قدرے غمگین اور مہربان لہجے میں لہا۔
 ”کام کرو گے؟“
 بشو ایک خوش ہو گیا۔ ”ہاں جی ضرور کروں گا۔“
 ”تو پھر شیک ہے۔ میری یہ دکان چھوٹی تو ضرور ہے لیکن اچھی چلتی ہے۔ تم اس پر میرے ساتھ کام کیا کرو اور رات میں دکان بند ہونے کے بعد اسی کے پچھلے پردے پر سو جاؤ

کرو۔ میں تنخواہ کے علاوہ تمہیں کھانا اور کپڑے بھی دوں گا۔“ استاد سمندر نے رک کر اسے غور سے دیکھا۔ ”منظور ہے؟“
 بشو کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ تنخواہ کیا ملے گی۔ اسے تو صرف اس بات سے غرض تھی کہ ایک ٹھکانا میسر آجائے گا اور اسے دور دراز بھٹکانے پڑے گا چنانچہ اس نے فوراً ہاں کر دی۔ اب اس بات کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ شروع میں، جیسا کہ استاد سمندر نے کہا تھا وہ دکان کے پچھلے پردے پر ہی سوتا رہا لیکن جوں جوں وقت گزرا، استاد سمندر کے احساسات بھی اس کے لیے بدل گئے۔ وہ بشو کے ساتھ زیادہ شفقت سے پیش آئے لگا۔ چند ماہ بعد وہ اسے اپنے گھر لے گیا جو ایک قریبی لگی میں تھا اور جہاں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ ”پتر! اب تم یہاں میرے ساتھ رہا کرو۔“ اس نے حسب عادت نرم لہجے میں کہا۔ ”دکان کے پچھلے پردے پر سوتے ہو۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“
 استاد سمندر کو اب بڑھاپے کی وجہ سے پر دستک دے رہا تھا، لیکن ابھی اس کی شخصیت میں بڑا ایمین تھا۔ اونچا، لمبا قد، ٹھٹھکا لے ہال، ٹھٹھکا ناک، نقش اور سرخ و سفید رنگت، جواب دہیرے دھیرے زردی مائل ہونے لگی تھی۔ جوانی میں یقیناً بڑا اوج پور ادا تھا اور رہا ہوگا۔ دھیرے گزرتا ہوگا، لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے ہوں گے مگر اب اس کی شخصیت میں وہ زور نہیں رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی عمر اور بیماری نے اس کے قوی جسم کو کمزور کر دیا تھا۔ وہ اور ایک ایسی عمارت کی طرح نظر آنے لگا تھا جس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ وقت کی دیمک بہر حال ہر شے کو چاٹ جاتی ہے۔ حسن کو، جوانی کو، عکرائی کو اور ضرور و کھیر کو۔ ہاں ایک ایسا شے ہے جو پھر بھی باقی رہتی ہے اور وہ ہے آدمی کا کردار۔ استاد سمندر کی جسمانی شان و شوکت کھلتے ہی زوال پزیر ہو چکی تھی مگر اس کے کردار کی بنیادیں ذرا بھی کمزور نہیں ہوئی تھیں۔ کرم داد کے بقول اس کا دل ایک سمندر کی طرح تھا، جس میں دنیا بھر کی غلطیاں اور کٹھن فتنیں جھیل ہو کر مٹ جاتی ہیں اور سرخ پرانے غلطیوں کا کوئی ٹکس نظر نہیں آتا۔ استاد سمندر ہر ایک کے کام آنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ برسوں سے اس بازار میں، دلہا پان ہاؤس کی دکان چلا رہا تھا۔ جہاں حسن و جوانی کا کاروبار کرنے والی عورتیں چاروں طرف موجود تھیں اور ان میں سے کئی ایسی تھیں جنہوں نے مختلف اوقات میں استاد سمندر کو شیشے میں اتارنے بلکہ کرم داد کے الفاظ میں اسے شکار کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر

کوئی بھی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ برسوں اس بازار میں گزارنے کے باوجود استاد سمندر آج بھی روز اول کی طرح پاک و صاف تھا۔ وہ اکثر بشو سے کہتا تھا۔ ”پتر! آدمی کو زندگی اس طرح گزارنا چاہیے، جیسے کچھڑ میں کنول ہوتا ہے۔ پاک، صاف، اسے کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے کہ روز قیامت اسے رب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔“
 اور استاد سمندر نے بلاشبہ ساری زندگی اس طرح گزار لی تھی کہ کنول کی طرح اس کے دامن پر بھی کوئی دھبہ نہیں لگا تھا۔
 یوں استاد سمندر کی زندگی میں بشو خود بخود شامل ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی بس آپ ہی ہو گئی، جیسے قسمت کا ناویدہ ہاتھ اس کا ہاتھ تمام کر اسے بازار حسن لے گیا تھا اور جیسے لڑکی نے خود بخود اسے کھانا دیا تھا، ویسے ہی خود بخود استاد سمندر کے چھوٹے سے گھر کا ایک ممبر بن گیا۔ اس نے بہت جلد اپنے کام کو سمجھ لیا۔ کیسے پان لگاتے ہیں، کیسے کھانا تیار کرتے ہیں اور گاہکوں سے کس طرح خوش آتے ہیں۔ استاد سمندر کو جب پورا اطمینان ہو گیا تو اس نے دکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔ خاص طور پر دو پہر کے اوقات میں وہ بھی اپنی بہن سے ملنے چلا جاتا، بھی چائے سے اور کبھی سیتھ سے۔ بشو اکیلا ہی دکان سنبھالتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دکان پر گزارنے کا شوق اس لیے تھا کہ اس طرح اسے بار بار زینت کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کا موقع ملتا تھا۔ زینت کوئی اور نہیں، وہی لڑکی تھی جس نے اسے کھانا دیا تھا۔ زینت عمر میں بشو سے تین یا چار برس بڑی تھی۔ دلی، پتلی، رنگ سا نوالا، لمبے لمبے بال اور جیسے نقش۔ بھوئی طود پر اسے حسین نہیں کہہ سکتے، ہاں قبول صورت بھی تاہم اس کے باوجود وہ بشو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس کا جی کرتا، وہ ہر وقت زینت کو دیکھتا رہے، اس کی آواز سننا رہے۔ وہ دکان پر بیٹھا ہوتا تو دھتے دھتے سے بار بار چوبارے کی طرف دیکھتا رہتا۔ جب بھی زینت چوبارے پر آتی تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی۔ اس کے علاوہ زینت دن میں بھی بار بار پچھلے آتی۔ اکثر اس کی دکان پر، پان یا سگریٹ لینے۔ بشو اس سے دو چار باتیں کر لیتا اور جب بھی وہ زینت کو دیکھتا یا اس سے باتیں کرتا تو ایک عجیب سی مسرت ہوتی۔ ایک ایسی سرور کن کیفیت اس کے ایک اکھ میں دوڑ جاتی جیسے کھتا خود بشو کے لیے بھی دشوار تھا۔ یہ بات بے حد عجیب تھی۔ بشو صرف بارہ سال کا تھا بہت کیا ہوتی ہے، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ اس کے باوجود اسے زینت

سے ایک نامعلوم سا لگاؤ تھا۔ شاید اس ذہنی راجا کا سبب یہ ہو کہ ذہنیت نے اس وقت اس کے ساتھ میرانی کا سلوک کیا تھا جب وہ چائیں کھتے کا بھوکا تھا اور اس بنا پر ذہنیت اس کے احساسات کا مرکز بن گئی تھی۔ ان احساسات میں ذہنیت کے لیے عزت و احترام بھی تھا اور انہایت بھی اور غالباً اسی بنا پر اسے ڈر لگتا تھا۔ جب ذہنیت کے یہاں مجھے کی گھٹلیں نہیں چھوچھو چھو رہی آتا تو ذہنیت کی بڑی آپا یا چاچی کو دیکھتا تو اسے بڑا ڈر لگتا۔ کچھ عجیب ہے، بے نام سے دوسرے اس کے دل میں ہر اچھا کرتے ایسا لگتا جیسے کہیں کوئی ایسی بات ہے جو غلط ہے اور جیسے نہیں ہونا چاہیے مگر وہ ہو جائے گی۔ کچھ کھو جائے گا۔ کچھ چھن جائے گا مگر کیا؟ کیا بات ہے جو ہو جائے گی اور کیا ہے جو کھو جائے گا، بشو بھی کبھی حیران ہوتا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، وہ کس بات سے اور کیوں ڈرتا ہے؟ بشو کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی اور وہ ڈر جو اس کے دل میں کی بیٹے سے بیٹھا ہوا تھا، بکلیا ہوتا رہا۔

دن دھیرے دھیرے اصل کیا، دھوپ باندھ پڑ گئی۔ ماٹھی آٹیا اور گئی میں چمڑکاؤ کر کے چلا گیا۔ وہ کانیں جو دن میں بند رہتی تھیں، رفتہ رفتہ کھل گئیں۔ پھول والے اور کتاب کھنڈے والے اور عطر والے آگئے۔ گلی آباد ہو گئی چوہاڑے اور کدو کے دروازے بج گئے۔ گلی میں۔۔۔ آدورف بڑھ گئی، لوگ آنے جانے لگے، طرح طرح کے رنگ کالے، گورے، خوش چہرے، بد چہرے ایسے جو ان لڑکے جن کی ابھی سسکی نہیں تھی جھپکی تھیں۔ ایسے مرید و لوگ جن کی جوانی مدت ہوئی رخصت ہو چکی تھی اور جو شاید اپنے حلقوں میں بہت شریف اور پرہیزگار سمجھے جاتے ہوں گے۔ آنے والوں میں وہ بھی تھے جو بدنامی اور پشیمانی سے بچنے کے لیے چہرہ و مال سے چھپا کرتے تھے اور ادھر ادھر دیکھ کر اور نظر بچا کر جلدی سے دروازے میں گھس جاتے تھے اور وہ لوگ بھی تھے جنہیں کسی بدنامی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ایسے لوگ کلائی میں بھر ڈال کر اور ہوتوں پر پان کی دھوڑی بھا کر سینہ تان کر سرگرمیت کا دھواں اڑاتے ہوئے آتے اور بے فکر سے چوہاڑے کی سیریاں چڑھ جاتے۔ شروع میں یہ منظر بشو کے لیے نیا بھی تھا اور خوب خیر بھی مگر اب وہ اس منظر کا جادو ہو چکا تھا اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں کیسے لوگ آتے ہیں۔ وہ اس بازار کے حراج اور طریقوں سے واقف ہو چکا تھا لہذا اب وہ متحجب نہیں ہوتا تھا اور اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔ اس وقت بھی یہی صورت تھی کہ وہ دھواڑ پان لگا رہا تھا۔ گا بکوں کو ٹھنرا رہا تھا۔ سچ سچ میں

وہ گردن موڑ کر ذہنیت کے چوہاڑے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جہاں اس کی بڑی آپا پار سنگار سے آراستہ کرسی پر برادھان بچے جھانک رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ استاد سندھ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور وہ اب تک نہیں لوٹا تھا۔ یہ عجیب کی بات تھی۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنی دیر تک غائب رہا ہو۔ وہ شام ہونے سے پہلے ضرور آ جاتا تھا۔ بشو کے دل میں الجھن سر اٹھانے لگی۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہے کہاں گیا استاد سندھ؟ کہیں کوئی پریشانی کی بات نہ ہو گئی ہو۔ پار بار سوچ رہا تھا۔

عادت کے مطابق اس نے ایک بار پھر گردن جھکائی، ذہنیت کی بڑی آپا کو دیکھا پھر اس کی نظر نیچے اتر گئی اور سامنے گلی میں بیٹھی گئی اور جب دیکھا کہ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ہاتھ خود بخود رک گئے اور چہرے پر ایک رنگ سا آکر چلا گیا۔ گلی میں چھوٹا چوہری حسب عادت جھوم جھوم کر چلتا ہوا آ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے پیڑے بے داغ تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس کی چٹری کا شعلہ بہت اونچا تھا۔ بشو کا ایک سب کچھ بھول گیا اور حد درجہ گیند تو نظروں سے چھوٹے چوہری کو گھورتے لگا حالانکہ اپنی اس حالت کا اسے خود کوئی احساس نہیں تھا۔ یہ کیفیت تو غیر ارادی تھی۔ وہ غلط انگیز نظروں سے چوہری کو گھورتا رہا اور وہ خوف جز مینوں سے اس کے لاشعور میں موج دھما، دم بدم بڑھتا رہا۔ چوہری کھل بھی آیا تھا، اب پھر آگیا آخر کیوں؟ بشو نے زور سے سانس لی اور ہوتوں پر زبان پھیر گئی۔ چوہری مسکراتا ہوا ہاتھ ہلاتا ہوا سیریاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ گلی کسی گاہک نے کہا۔

”اسے بلو، کہاں کھو گیا ہے؟ پان دے تیار آتی دیر سے کھڑا ہوں۔“

”اچھا، جی، اچھا۔“ بشو چونک کر اور کسی حد تک غفل ہو کر بولا۔

☆☆☆☆

شیخ طاہر کے غمی ڈرامنگ روم کی خوب مندرت سا گواہی میز پر غفل سے ہٹا ہوا ایک وسیع نقشہ پھیلا ہوا تھا جسے وہ بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک ایک مقام پر انہوں نے اگلی رکھ رکھا۔ ”تو یہ ہے فیکٹری؟“

”جی ہاں۔“ ان کے بچہ صدر الدین نے جواب دیا۔ ”فیکٹری زیادہ بڑی نہیں لیکن آس پاس زمین کافی ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو فیکٹری کو بڑھا دیا جاسکتا ہے۔“

”اور یہ کیا ہے؟“ شیخ طاہر نے ایک اور مقام پر اگلی

”اصل میں تو یہ پارک ہے۔“ صدر الدین بولے۔ ”فیکٹری کے بالکل نیچے واقع ہے لیکن اسے پارک کہنا مشکل ہے۔ بس ایک اجازت میدان کچھ نیچے۔ کھاس نام کوئیں کسی کارپوریشن نے کچھ گھنٹوں رکھوائی تھیں جو ٹوٹ بھوٹ کر غائب ہوئیں۔ پھول اگر ڈھونڈے تو دوڑا کے لیے بھی نہ ملیں گے۔ ایک حوض ہے جو شاید کبھی صاف تھرا اور خوب صورت رہا ہو مگر اب گندے پانی سے بھرا رہتا ہے اور اس بنا پر پھر کوئی کچھ ڈھار کے لیے نہایت موزوں ہے۔“

”تو کیا اس پارک کی کوئی دیکھ بھال نہیں ہوتی؟“

”نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ بلدی والے برسوں سے وہاں یہ دیکھنے بھی نہیں گئے کہ پارک موجود ہے بھی۔۔۔ یا غائب ہو گیا۔“

”مطلب یہ ہے کہ اگر پارک چوری ہو جائے تو کارپوریشن والوں کو پتا بھی نہ پلے گا؟“

”بالکل، بالکل۔“ صدر الدین نے کہا اور پشیمانی صدر الدین بڑے حیرے کے آدی تھے۔ عرف عام میں شیخ صدر الدین کہلاتے تھے۔ انہوں نے ایک مقامی کانج سے ایم اے کیا تھا پھر سرکاری وٹیفے پر کسی قسم کا کورس کرنے کی مغربی ملک بھی گئے۔ اس وقت تک وہ بڑے فحاش بات سے سوٹ پہنتے تھے لیکن چند ماہ مغربی ملک میں گزار کر وہاپس آئے تو ان کی گایا پیٹ چکی تھی۔ سوٹ چھوڑ کر وہ چوڑی دار پاؤں پہن کر اور اچھن پہنتے گئے۔ خوب صورت سی ڈاڑھی بھی رکھ لی۔ پاؤں میں ر۔۔۔

”کے باہر جانے سے پہلے بھی کھار نماز پڑھتے تھے۔ وہاں آئے تو تھوڑے ہی پڑھنے لگے۔ لوگوں نے اس تبدیلی کا سبب پوچھا تو مسکرا کر جواب دیا۔

”جی، کیا کرواں پارک جا کر ہی اپنے آپ کو بچکانے کا موقع ملا ہے۔“

وہ پچھلے کئی سال سے شیخ طاہر کے پاس ان کے منبر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ شیخ طاہر کے ایک نہیں بلکہ مختلف قسم کے کئی کاروبار تھے پھر پانائت، زمینیں اور متعدد کمرشل بلڈنگز بھی تھیں۔ شیخ صدر الدین تقریباً سبھی امور کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بڑے مرتعاج مریخ قسم کے آدمی تھے۔ نیک، نکلیں اور قاصد پند۔ اپنی ضرورت سے زیادہ لینا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ گزشتہ سال شیخ طاہر نے ان کی خواہ میں چند ہفتہ اضافے کی پیشکش کی تو ٹھہرا کر کہنے

”ارے نہیں شیخ صاحب ہرگز نہیں۔“

”کیوں؟“

”دیکھئے آپ جو تنخواہ مجھے دیتے ہیں وہ پہلے ہی میری ضرورت سے زیادہ ہے پھر اور لے کے کیا کروں گا۔“

صدر الدین نے جواب دیا۔ ”بھڑ ہوگا کہ آپ یہ رقم کسی ایسی جگہ لیں جس سے حق لوگوں کو قافہ نہ پہنچے۔“

صدر الدین چند تائے پشیمانی رہے۔ شیخ طاہر بھی لطف اندوز ہوئے۔ کیونکہ پارک چھانے والا لطیفہ کافی دلچسپ تھا پھر انہوں نے کہا۔ ”اور یہ فیکٹری کے عین اطراف میں آبادی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”آپ کی معلومات کیا ہیں ان بستیوں کے بارے میں؟“ شیخ طاہر نے استغیاہے نظروں سے صدر الدین کو دیکھا۔

”معلومات کی بات نہیں میں خود کچھ کر آیا ہوں۔“

صدر الدین نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ ”یہ بستیایں پھر کسی ہاتھ نہ منسوبہ بندی کے قائم ہوئی تھیں جسے جہاں جگہ ملی وہیں جو تیزی ڈال لی۔ چٹائیں، زمین کی چادروں وغیرہ کی جھونپڑیاں ہیں بعد میں کچھ لوگوں نے دیواریں اٹھا کر کے مکان بھی بنالے۔ گھیاں مل گئی ہیں۔ گندے پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں یعنی پانی نام کی کوئی چیز ان بستیوں میں نہیں پائی جاتی۔ نتیجہ ہوتا ہے کہ گھنٹوں میں گنداپانی بھرا رہتا ہے جس میں پھر، مٹی اور طرح طرح کے کچڑے کھڑے پیدا ہوتے ہیں۔ روٹی کا کوئی انتظام نہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک شہری آبادی میں جو سبکس ہوتا چاہئیں اس سے پہلے بالکل محروم ہیں۔“

”مگر کبھی یہ تو بڑے انوس کی بات ہے۔“ شیخ طاہر نے قد سے پریشان لہجے میں کہا۔

”یہ تو میں نے صرف پہلا مصرعہ عرض کیا ہے۔“ شیخ صدر الدین نے جواب دیا۔ ”اب مصرعہ ثانی ملاحظہ فرمائیے۔ لوگوں کی روزنی کا بڑا ذریعہ فیکٹری ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لوگ اس فیکٹری ہی کی وجہ سے اس علاقے میں آباد ہوئے تھے مگر اب اس وقت صورت یہ ہے کہ فیکٹری کھس جڑ و قی طور پر چل رہی ہے۔ کافی سختیں بند کر دی گئی ہیں اور اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کبھی میں حدود جہ غربت اور پریشانی کا دور دورہ ہے۔ دوسری سبکس بھی ناپید ہیں مثلاً کوئی شفا خانہ یا اسکول نہیں ہے۔ لوگ اپنے

بچوں کو اسکول نہیں بھیجے یا ٹھیک دتی کی وجہ سے بھیج نہیں سکتے اور یہ بات شاید ٹھیک بھی ہے۔ جب ہیٹ بھر نے کے لاسے پڑے ہوئے ہوں تو بچوں کو اسکول بھیجے کی مجالش کہاں سے لے سکے۔ اب اس شعر کا کافی عجیبی ملاحظہ فرمائیے۔ بستی کے جنوب میں جہاں آبادی خاصی تھی نہ زمین کا ایک بڑا قطعہ ملک شیش نے خریدنے کا فیصلہ کیا ہے جہاں وہ غالباً بڑے بڑے کو دام بنائیں گے۔

”اور جو لوگ اس زمین پر آباد ہیں وہ کہاں جائیں گے؟“ شیخ طاہر نے پوچھا۔

”شیخ صدر الدین نے جواب دیا۔“ ”میں سوال میں نے ملک شیش کے غیر سے کہا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ لوگ کہاں جائیں گے۔ میرے مزید استفسار پر انہوں نے کہا زمین خریدنے کے بعد آباد کاروں کو زمین خالی کرنے کے لیے قانونی طور پر نوٹس بھیجائے جائیں گے۔ اگر ان لوگوں نے شرافت سے زمین خالی کر دی تو ٹھیک ہے ورنہ جبراً انہیں بے دخل کر دیا جائے گا۔“

”بھئی صدر الدین صاحب اچھے تو یہ پوری غزل سی وزن اور بحر سے خالی معلوم ہوتی ہے۔“ شیخ طاہر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”یعنی روشنی نہیں، پانی نہیں، ہوا بھی جیسا کافی کثیف ہوگی۔ اوپر سے بے روزگاری اور بھرے دھلی کا خوف۔ تاہم سوال یہ ہے کہ فیٹری آخر چلتی کیوں نہیں؟“ ”عدم دلچسپی کے سوا اچھے تو اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“ صدر الدین نے کہا۔ ”میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر محنت کی جائے تو فیٹری کی کامیابی سے پہل مل سکتی ہے۔“

شیخ طاہر تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا۔ ”اس فیٹری اور متعلقہ زمین کا مالک کون ہے؟“ ”فیٹری اور کچھ زمین کے مالک چودھری ظفر حیات ہیں جبکہ باقی زمین کارپوریشن کے قبضے میں ہے۔“ شیخ طاہر نے چند لمحوں کے لیے غور کیا پھر ہلکا کر بولے۔ ”میں ساری صورت حال کو بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ یہ واقعی بڑی افسوس ناک بات ہے کہ تھریب و ترقی کے اس دور میں کچھ انسان سمجھ رہے سرور سامانی اور بد حالی کے عالم میں زندگی گزار رہے اور کوئی بھی ان کے لیے کچھ نہ کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کے تمام آدوش اور انسانی ارتقا کی پوری کہانی ایک الم ناک لطیف بن جاتی ہے۔“ وہ رکے پھر کہنے لگے۔ ”خیر اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم لوگ اس نہیں ہیں کچھ کرنا چاہیں تو آخر کیا کر سکتے ہیں؟“

”شیخ صدر الدین نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ پھر خاموش رہے پھر انہوں نے ذیبا کھول کر ایک پان تھار کھلے میں دیا پھر شیخ طاہر کی جانب دیکھا۔“ ”شیخ صاحب! انہوں نے کہا۔“ ”آپ غریبوں اور مستحقین کے لیے اب بھی جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ ساری دنیا آپ کے امدادی کاموں سے واقف ہے۔ اس بستی میں بھی آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ فیٹری کو کچھ خطوط پر چلایا جائے۔ دو ایک چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں اور کھولی جائیں۔ ان سے لوگوں کو روزگار ملے گا۔ اس کے بعد پانی، بجلی کا انتظام کیا جائے۔ گلیاں پختہ کی جائیں اور نالیاں بنوائی جائیں۔ کم از کم ایک اسکول اور شفا خانے کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ شیخ صاحب، یہ ایک بڑا منصوبہ ہے وقت بھی بہت لگے گا اور وہ بھی بہت خرچ ہوگا مگر آپ مرکزی حکومت سے مناسب امداد لے سکتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ جب یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا تو پھر آپ کے اوپر کوئی مالی بوجھ نہیں رہے گا۔ یہ فیٹری انشا اللہ بہت منافع دے گی اور غریبوں کی جو دعائیں میں کی جناب اس کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔“

شیخ طاہر صدر الدین کے آخری جملے پر ہنسنے لگے پھر بولے۔ ”خیر بھئی، تو اب بعد کی بات ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کیا چودھری ظفر حیات اور کارپوریشن زمین اور کارخانہ بھیجے پر تیار ہو جائیں گے؟“ ”کم از کم ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔“ صدر الدین نے کہا۔

”تو پھر ضرور کوشش کیجیے۔“ شیخ طاہر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ اس بستی کے مکینوں کی جانب سے مجھے ایک درخواست موصول ہوئی تھی جس میں ان لوگوں نے اپنے مصائب کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ہدیہ درخواست کی تھی۔ اس پر تین سو سے زائد افراد کے دستخط ہیں۔ مجھے بھی سے بڑی فکری چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کام کو جتنی جلد ہو سکے مکمل تک پہنچا دیے۔“ ”ضرور ضرور آپ بالکل غلط نہ کریں۔“ صدر الدین نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا پھر ذرا رک کر رو اوروں کے انداز میں اضافہ کیا۔ ”وہی شیخ طاہر صاحب، سیاسی پارٹی کے جنرل سیکریٹری آج صبح پھر دفتر آئے تھے۔“ ”اچھا کیوں؟“

”آپ تو جانتے ہیں۔“ صدر الدین نے مسکرا کر ذرا شوش سے کہا۔ ”ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ آپ ان کی پادشاهی

میں شامل ہو جائیں اور غالباً دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی آپ کے ساتھ کرنے کی فکر میں ہوں۔ اسی لیے دونوں باپ بیٹی آئے دن پکڑ لگاتے رہتے ہیں۔“ شیخ طاہر ہنسنے لگے۔ ”میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”وہی شیخ طاہر، آخر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“ کب تک یوں تباہ زندگی گزارتے رہیں گے؟ اور آپ کے لیے تو کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ شہر کی ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں آپ کی ایک نگاہ التفات کی منتظر رہتی ہیں۔ میری مائے تو آپ شادی کر ہی ڈالے۔“ شیخ طاہر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب تم نے بھی پتھر شروع کر دیا، وجہ یہ تیکم کی طرح وہ بھی دن رات مجھے ذاتی ذہنی دہتی ہیں کہ آخر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کب تک یوں چلے چھانٹ بھرتے رہو گے۔ اگر اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کرو۔ میں اب بیوی بھی ہوں کب تک گھر سنبھالوں گی وغیرہ وغیرہ۔“

”تو پھر آخر آپ کر کیوں نہیں لیتے؟“ ”کر لوں گا بھائی، کر لوں گا جب دل راضی ہوگا۔“ ”اور دل کب راضی ہوگا؟“

یہ جملہ صدر الدین نے اگرچہ بڑی سادگی سے کہا تھا مگر اس جملے میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ شیخ طاہر نے یا ایک دونوں باتوں کی انگلیاں زور سے ایک دوسرے میں پھنسا لیں اور کچھ عجیب سی نظروں سے صدر الدین کو دیکھنے لگے۔ دل کب راضی ہوگا، ہاں یہ دل، یہ کینٹ، نامراد دل کب راضی ہوگا۔ زندگی کے سنگار راستے پر دل کا یہ تنہا مسافر کب سے آبلہ یا پتنگ رہا ہے اور کب وہ دن آئے گا جب یہ دل، یہ دیوانہ اندل کی آجمل کے سہارے اور مٹی زلفوں کے مرطوب و معطر سائے کا مستحق ہوگا۔ شیخ طاہر آخر کیسے بتائیں کہ ان کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اپنی تمام تر دولت و امارت کے باوجود وہ ایک تنگدست و تنگی داما آدمی ہیں۔ یہ سوال تو سب کر سکتے ہیں کہ وہ شادی کب کریں گے اور کس سے کریں گے اور بھی کبھی وہ اس نیت سے مختلف خواتین کو دیکھتے بھی ہیں۔ شاید گلزار کو اور فریدہ شوکت کو اور نسرین چودھری کو اور نیکم احسان کو مگر کوئی بھی ان کی نگاہ میں نہیں جیتی اور وہ کسی کو یہ بتا بھی نہیں سکتے کہ کیوں نہیں جیتی۔ وہ کچھ دیر تک بے چینی اور تذبذب کے ساتھ صدر الدین کو دیکھتے رہے پھر زور سے سانس لے کر بولے۔

”احتساب“

”خیر فی الحال اس ذکر کو چھوڑو۔ جب دل راضی ہوگا تو میں بتا دوں گا۔ آج تو میں تم سے سیاسی پارٹی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں مجھے شمولیت اختیار کر لینا چاہیے؟“

صدر الدین نے ذیبا سے ایک اور پان نکالا۔ کھلے میں دیا۔ ”در اصل۔“ انہوں نے کہا شروع کیا۔ ”پارٹی والوں کا خیال ہے کہ اگر آپ ان کی پارٹی میں شامل ہو گئے تو ان کی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ انہیں آپ سے مالی امداد ہی ملے گی بلکہ آنے والے الیکشن میں آپ کی شہرت اور نیک نامی کے باعث ان کی جیت کے امکانات بھی بہت بڑھ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کو الیکشن جیتنے کے بعد وزیر اعلیٰ بنانا چاہتے ہیں۔ اب رہ گیا سوال میری رائے کا تو میں کہوں گا۔ ہاں آپ کو شامل ہو جانا چاہیے۔“

”صرف اس لیے کہ وہ مجھے وزیر اعلیٰ بنانا چاہتے ہیں؟“

”اور شیخ صاحب، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ترقی اور کامرانی کی اس پبندی پر جھلا سکتے لوگ کتنے ہیں؟“ ”خیر، جسے تم ترقی کہہ رہے ہو ضروری تو نہیں کہ دوسرے کی نظر میں بھی وہ ترقی ہی ہو۔“ شیخ طاہر نے جواب دیا۔ ”میں تو اس معاملے کو ایک اور منظر سے دیکھ رہا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ ”دیکھو، مجھے وزیر اعلیٰ تو کیا کسی قسم کا بھی وزیر بننے کا کوئی شوق نہیں لیکن میرے متبادل اور دلچسپیوں سے تم واقف ہو۔ لوگوں کی فلاح و بہبود میرا ہمہ نظر ہے۔ چنانچہ اگر میں وزیر اعلیٰ بن گیا تو مجھے زیادہ اختیارات مل جائیں گے اور میں زیادہ آزادی سے اپنے پروگراموں کو زیر عمل لاسکوں گا۔ جب کہ ابھی کی طرح کی دھواں یوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اکثر کام یا تو شروع ہی نہیں ہو پاتے یا پھر ادھورے رہ جاتے ہیں۔“

”آپ کا خیال ٹھیک ہے اور اسی لیے میں کہتا ہوں کہ آپ کو فوراً پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیے۔“ ”خیر، میں چند روز اور غور کروں پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔“ شیخ طاہر نے کہا۔ ”فی الحال تو آپ اس کام کا شروع کیجیے، یہ زیادہ ضروری ہے۔“

اسی وقت یگانا ایک دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا اور وحیدہ نیکم اندر داخل ہو گئی۔ حسب عادت ان کے چہرے

پر تھوڑا سا غصہ تھا جو سراسر مصنوعی تھا۔ انہوں نے معمول کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں پچھا کہ شیخ طاہر نے دو اکھاڑی یا نہیں۔ جواب اثبات میں ملنے پر انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلا یا اور پھر کہنے لگیں۔ "ایک صاحب آئے ہیں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کون تھا؟"

"میں کیا جانوں، پہلے بھی یہاں نہیں آئے۔ اپنا نام بشیر احمد بتاتے ہیں۔"

"اوہ۔" معاصر الدین نے کہا۔ "شیخ صاحب، یہ وہی بشیر احمد ہیں جن کا آپ سے میں نے ذکر کیا تھا۔ شریف اور قابل احمد آدمی ہیں۔ میں نے آج ہی کے لیے ملاقات کا وقت دیا تھا انہیں۔"

"اچھا اچھا۔" شیخ طاہر نے کہا پھر وحیدہ بیگم کی طرف گھومے۔ "آپ انہیں بیروانی کمرے میں بٹھائیں اور چائے وغیرہ کا بندوبست کریں انہیں چند منٹ میں آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہہ کر وحیدہ بیگم دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

کوئی دس منٹ بعد شیخ طاہر بیرونی کمرے میں داخل ہوئے۔ نوادہ جس کا نام بشیر احمد تھا سونے پر نیم دا سرگرت پی رہا تھا۔ اس نے سیاہ چٹون اور بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر گہرے رنگ کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ گواں کی عمر زیادہ تھی لیکن صحت حیرت انگیز طور پر اچھی تھی اور اس کی کشادہ پیشانی سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے شاندار انداز میں شیخ طاہر سے مصافحہ کیا پھر خوش گوار لہجے میں کہنے لگا۔

"شیخ صاحب، میں خائبانہ طور پر آپ سے خوب واقف ہوں اور ایک میں ہی کیا، ایک دنیا آپ کو جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب معاصر الدین نے بتایا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ فرمائیے، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ پالیس میں تھے؟" چند لمبے کے توقف کے بعد شیخ طاہر نے پوچھا۔

"جی ہاں، برسوں پہلے پالیس میں رہا پھر کئی سال ہی آئی ڈی کی کرائم برانچ میں گزارے۔ ابھی چند سال پہلے ریٹائر ہوا ہوں۔ گاؤں میں کچھ زمین ہے جو گزراوقات کا ذریعہ ہے لیکن پرانے پیسے سے اب بھی تھوڑا بہت ملتی ہے۔ باضابطہ طور پر نہیں بلکہ بالکل نجی طور پر کیونکہ ہمارے

یہاں قانونی طور پر پرائیویٹ سرائے دسواوٹی کی ملکیت نہیں ہے مگر میں صرف عام نوعیت کے کام ہاتھ میں لیتا ہوں جیسے گمشدہ افراد یا پرانی دستاویزات کی تلاش وغیرہ۔"

"کیا میں آپ پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟" شیخ طاہر نے جس آسیر لہجے میں سوال کیا۔

"بے شک آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کے اعتماد کو دھکا نہیں دیا۔ ابھی بے ایمانی اور دھوکے کا ماحول نہیں ہوا کہ یہ میرے مسلک کے خلاف ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسی بات بھیجے بتانے والے ہیں جس کا افشاء ہو آپ کو پسند نہیں تو اطمینان رکھیں، آپ کا راز میرے سینے میں بیٹھ دینا میرے گوارہ کی کسی کو اس کی ہوائ تک نہیں لگے گی۔"

"میں۔" آخر کار شیخ طاہر نے طویل سانس لی۔

"ایک بہت اہم کام آپ کے سپرد کرتا چاہتا ہوں۔"

☆ ☆ ☆

وقت کا بے نیاز دیوا بہتار ہا۔ بے آواز، چپکے چپکے حتی کہ تین سال گزر گئے۔ ایک ہزار پچانوے دن، ایک ہزار پچانوے راتیں۔ یہ مدت کچھ ایسی زیادہ طویل نہیں۔ تاہم یہ اہم بات ہے کہ بشیر پر یہ وقت بہت بھاری گزرا۔ کبھی بھی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی جتھے ہونے سمرا میں سفر کر رہا ہے۔ جتھے سرانگے پاؤں، سر پر گڑی دھوپ ہے اور نیچے چلتی ہوئی ریت اور دور تک گئیں کوئی سایہ نہیں کہ جہاں وہ دو گھڑی سستالے۔ بس ہر طرف، دور تک ریت ہی ریت ہے۔ جتنی ہوئی چلتی ہوئی اور اسے اس ننگے ویران صحرا میں یونہی گھسٹ گھسٹ کر سفر حیات طے کرتا ہے۔ تین سال میں اس پر کئی قیامتیں گزریں، کئی چھوٹے بڑے دکھ دینے والے دل آزار واقعات بھی اور گونڈی دھوپ چھاؤں سے مہارت ہے لیکن یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں کی زندگی میں دھوپ ہی دھوپ ہوتی ہے جس میں ان کی زندگی کی ساری خوشبو میل جاتی ہے۔ پھول مریجا جاتے ہیں اور اس کے سارے جتنو اپنی روٹنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان تین برسوں میں بشیر جن قیامتوں سے گزرا، ان میں پہلی قیامت یہ تھی کہ استاد سمندر نے ایک دن یکایک رخت سفر باندھا۔ ان گنت نیکیوں، محبتوں اور دعاؤں کا زور اور ساتھ لیا اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔

اس روز دو اچھا بھلا اپنی چائی سے ملنے گیا تھا جو شہر کی کچھ مصافحاتی اپنی میں رہتی تھی وہاں آیا تو طبیعت خشک نہیں تھی۔ سینے میں ہلکا ہلکا درد ہوا تھا چنانچہ وہ سر شام ہی گھر چلا گیا۔ باقی وقت بشیر نے دکان سنبھالی لیکن کوئی

سائے بارہ بیچے کے قریب جب وہ دکان بند کر کے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ استاد سمندر چار پانی پر بے سرحہ پڑا ہے۔ اس کا سارا بدن پیسے سے شرابور تھا اور پھر شدت تکلیف سے سرخ ہو رہا تھا۔ بشیر ایک دم گھبرا گیا اور اس کے قریب کرکری پر بیٹھ کر گھبراہٹ سے کہنے لگا۔ "استاد کیا بات ہے۔" یہ کہنا پھینکا کیوں نکل رہا ہے؟

استاد سمندر نے آنکھوں کا زواہ بدل کر بشیر کو دیکھا۔ اس کے سفید ہوتے ہوئے ہونٹوں پر مگر اہم پھیل گئی۔ ایک ایسی سترگاہت جس سے شدید کرب و اذیت کا اظہار ہوا پھر اس نے زور سے سانس لے کر کہا۔ "شاید یہ موت کا پیمانہ ہے پتر؟"

بشیر ابھی گھبرا گیا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو استاد؟"

استاد سمندر نے پھر کئی لمبی لمبی سانس لیں اور دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر زور زور سے دہاتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں پتر اٹھائیں میں خشک کبر ہا ہوں یا شاید میں لٹل کبر ہا ہوں مگر تو گھڑ کر۔ ذرا مجھے ایک گلاس پانی دے۔"

بشیر جھگڑ کر پانی لایا پھر چار پانی کی پتی پر بیٹھ کر اس نے استاد سمندر کو اپنے سینے میں مدد دی۔ استاد سمندر نے پانی چا جو آدھا اس کے منہ میں گھس گیا آدھا باچھوں سے ادھر ادھر ہو گیا۔ بشیر نے ایک اور گلاس رکھ کر اسے لٹایا پھر کہنے لگا۔

"تم نے دو اکھاڑی استاد؟"

"ہاں پتر دو دفعہ کھانچا ہوں۔" استاد سمندر نے تکلیف سے سر کو دایاں بائیں گھمایا۔ "مگر دو کمرے نہیں ہو رہا بلکہ شاید بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

بشیر کرسی پر بٹکا ہوا سا بیٹھا۔ کبھی کبھی نظروں سے استاد سمندر کو دیکھتا رہا۔ استاد سمندر کے پیچھے کی سرئی اب کچھ اور بڑھ گئی تھی پتینا بھی زیادہ نکل رہا تھا۔ صاف چٹا چٹا تھا کہ اسے بہت زیادہ اذیت محسوس ہو رہی ہے حالانکہ سینے کا یہ درد کوئی نئی بات نہیں تھی کافی پرانا مرض تھا۔ اکثر اس کے سینے میں درد اٹھتا تھا مگر نہ تو آبی دیر رہتا تھا اور نہ آبی تکلیف ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک ٹیبلٹ تجویز کی تھی جو ہر وقت استاد سمندر کے پاس رہتی تھی۔ جب بھی درد شروع ہوتا، وہ دو گولیاں کھا لیتا اور کچھ دیر میں آرام آ جاتا۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا تھا کہ دو اکھاڑے کے بعد بھی کئی گھنٹے تک درد رہا ہو۔ یہ کیفیت تو پہلی ہی بار ہوئی تھی اور اگرچہ بشیر کو معلوم نہیں تھا کہ موت کی علامت کیا ہوتی ہیں پھر بھی اسے ڈر لگ رہا تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ نہیں ضرور تھی جو اس کی کچھ میں نہیں آ رہی تھی مگر جو یقیناً لٹل تھی اور جسے نہیں ہوتا چاہیے

تھا لیکن اس کا ہونا شاید ملے پاچا تھا اور بشیر خواہش کے باوجود اسے نہیں روک سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بشیر نے کہا۔ "استاد اور دو ادویں؟"

"نہیں، اب شاید اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" استاد سمندر نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایسا لگتا ہے پتر اب میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" بشیر کھٹ کھٹ کر لپٹ کر قریب قریب رو بیٹھے والے انداز میں بولا۔ "ایسا مت کہو استاد۔ ایسا مت کہو۔"

"ہاں پتر، شاید مجھے کہنا تو نہیں چاہیے پر یہ حقیقت ہے جب اپنے رب کی طرف سے بلاوا آ جائے تو بندے کو جانا ہی پڑتا ہے۔ کبھی سچ ہے۔ بندہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی شاید مالک نے بلا بھیجا ہے۔"

بشیر کو معاذ اللہ کچھ ایسا لگتا جیسے اس کا دل سکڑ کر یکایک چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس کا پورا بدن دفعتاً زور زور سے کانپنے لگا پھر وہ کچھ سوچ کر ایک دم جمجھٹ کر اٹھا اور دروازے کی طرف بھاگا تو استاد سمندر نے پچھلی پچھلی آواز میں کہا۔

"بشیر! کہاں جا رہے ہو پتر؟"

"میں۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ پتر۔ یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو اور میری باتیں ذرا دھیان سے سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

بشیر دروازے میں رک گیا اور گھٹو کے انداز میں استاد سمندر کو دیکھنے لگا۔ جیسے اس کی کچھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کرے پھر استاد کے پیچھے پر چھلے ہوئے اکتاہٹ کا اثرات نے اسے مجبور کر دیا چنانچہ وہ پلٹ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور استاد سمندر کا سینہ بولے بولے اٹھانے لگا۔ استاد سمندر چند لمبے آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور پورا دم سکھول کر لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا پھر اس نے آنکھیں کھولیں، حسرت سے بشیر کو دیکھا اور کمر و لہجے میں بولا۔

"پتر اٹھائیں میرا دوسرا قسط لکھ لکھ شاید ابھی زندگی کے کچھ دن باقی ہوں لیکن اگر میں نہ ہوں تو۔"

"نہیں، نہیں استاد ایسا مت کہو۔ تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔" بشیر نے جالے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز بھرا کئی۔ الفاظ طعن میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ استاد سمندر نے بولے سے اس کے ہاتھ پر چھکی دی پھر کہنے لگا۔

موٹاپا کریں کم...
Young!!
rahیں slim، فٹ اور

(میں بھی تھیں)



طیبی
عرق
اوبیسول

موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا

100 فیصد قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

- جسم سے زائد چربی نکالتے کرتے ہے
- ہاضمہ درست اور متحرک کرتے ہے
- امیابت صاف لاتا ہے
- آنتوں کی سوزش دور کرتا ہے
- ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ دیتا ہے

طیبی

دوا خانہ (ہزارہ روایت) لمیٹڈ

کراچی۔ پاکستان www.tayyabi.com.pk



”مجھ میں مت بول پتر۔ میری بات دھیان سے سن۔ اگر میں مر جاؤں تو میری لاش میرے گاؤں میں دفنانا۔ وہاں میری ماں کی قبر ہے میری قبر۔ میری ماں کے قدموں میں بنانا۔ برسوں پہلے میں گاؤں سے آیا تھا پھر یہی پلٹ کر نہیں گیا۔ اب مرنے کے بعد جانا چاہتا ہوں۔ اس بات کا خیال رکھنا اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا جو کچھ بھی ہے۔ دکان مکان اور روپیہ یا سب تیرا ہے۔ میں نے تجھے بے نیکی طرح چاہا ہے پتر۔ انہوں میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ اب جو کچھ بھی ہے وہ سب تیرے حوالے کرتا ہوں یہ ایک اور بات یہ ہے کہ ہمیشہ اچھا آدمی بننے کی کوشش کرتا۔ کبھی بھوت نہ پڑانا۔ کبھی کسی کو دکھ نہ دینا اور ہمیشہ ان کے کام آنے کی کوشش کرنا جو ہمد کے محتاج اور مستحق ہوں۔ بول پتر میری بات یاد رکھنے کا؟“

بھوک کی وجہ حالت تھی۔ اس کا دل کی خشک تپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے تصور میں ایک تصویر کے مانند گزرتی چلی گئی۔ وہ دن یاد آیا جب وہ اپنی ماں سے اور بہن سے اور جامن کے درخت سے اور چنگیری بکری سے چھڑا تھا پھر بادشاہ، کن، وختان اور مال گاڑی کا اذیت بھرا سفر، کسی کسی قیامتیں اس پر گزرتی تھیں۔ کیا وہ اب ایک اور قیامت سے دوچار ہونے والا تھا؟ نہیں، نہیں وہ استاد مسند سے چھڑتا نہیں چاہتا۔ وہ ایک بار پھر بے سہارا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا جی چاہا رہا تھا کہ ہاتھ جوڑ کر استاد مسند سے کہے۔

استاد اسیامت کو ہم تم نہیں کہتے۔ ابھی تم بہت دن جو گے لہذا میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا مگر استاد مسند کے چہرے پر چھائی ہوئی ہے کسی اور اچھے اس کی زبان روک لی۔ اس نے اپنی دانست میں صرف استاد مسند کا دل رکھنے کے لیے کہا۔

”ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں مگر.....“

”مگر کیا؟“

”مگر تم یہ سب کچھ مجھے کیوں دے رہے ہو۔ تمہارے اپنے رشتے دار ہیں۔ چاہتا، بہن اور بھتیجا انہیں دے دو یہ تو ان کا حق بھی ہے۔“

”نہیں پتر اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔“

”مگر.....“

”سنو سنو آج میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ استاد مسند نے پھر اس کے ہاتھ پر چمکی دی۔ ”پتر میں آج وہ کہانی تمہیں سناتا ہوں جس کا کسی کو علم نہیں۔ برسوں گزرے،

محبت کرنے والی عورت بار بار نہیں ملتی پتر۔ وہ تو ایک اصول پر رچی جو مجھ سے کچھ چکا تھا۔ میں بہت سادہ گاؤں میں رہا مگر وہاں کی ہر چیز مجھے کائنات کو دھڑکی لگاتی تھی لہذا میں نے اپنا سب کچھ دیا اور شہر میں چلا آیا۔ پہلے ادھر ادھر کچھ کام کیے پھر اس بازار میں دکان کر لی۔ یہ صرف اتفاق تھا مجھے وہاں کی عورتوں سے بھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ میں نے تو وہاں میچوں کے کنول کی طرح زندگی گزاری ہے پتر ایک صاف، مثالی کے بعد پھر بھی کوئی عورت مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں نے ساری عمر اسی کی یاد میں بتائی ہے۔ اس نے مجھ سے وفا کی تھی میں نے اپنے آپ سے کہا دلچیز استاد سمندر تو بھی بے وقامت بننا اور پتر میں نے بھی اپنی مثالی سے بے وفا نہیں کی۔ استاد سمندر ایک لمحے کے لیے رک پھر ہوتوں پر زبان پھیر کر کیا۔ "ایک بات کہوں پتر؟"

"ہاں کہو استاد۔"

"دیکھ تو بھی اس بازار میں ہے۔ روز صبح سے رات تک دکان داری کرتا ہے۔ وہاں قدم قدم پر ترغیب اور لالچ موجود ہے لیکن تو اپنے دامن پر بھی دھیان نہ دیتا۔ پتر! آدمی وہی ہے جو چڑھ میں پلے تو بھی بے داغ گر جائے۔"

"طمینان رکھو استاد میں اپنا دامن ہمیشہ صاف رکھوں گا۔" بٹو نے کہا۔ "مگر استاد کیا تم نے پتا کرنے کی کوشش کی تھی کہ آگ کیسے لگی تھی؟"

"آگ لگی نہیں تھی پتر لگتی تھی تھی۔" استاد سمندر جھرجھراتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "یہ کام میرے ریشے داروں کا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنی اس توہن کا بدلہ لیا تھا جو میں نے ایک غیر برادری کی لڑکی سے شادی کر کے کی تھی۔ شاید مائے کا یہ بھی خیال رہا ہو کہ اگر مثالی مرگئی تو میں اس کی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔ بہر حال صرف اس بنا پر ان کمپنوں، خاندانوں سے میری مثالی کو مار ڈالا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی مگر میں پلے کے پاس نہیں جاسکتا تھا کیونکہ ثبوت نہ تھا کہ میں پتر! میں ایک کام کر سکتا تھا یعنی ان لوگوں سے انتقام لے سکتا تھا اور میں انتقام لینا بھی ضرور اس طرح کرنا ہی نہ بد کے بچوں پر زمین و آسمان تک ہوجاتے۔ میں ان کے کھیلوں میں آگ لگا دیتا۔ ان کے کھیت اہار دیتا اور مثالی کی ایک ایک جگہ کے بدلے میں ایک ایک کا زخم کات ڈالتا۔ میں ایسا ہی آدمی تھا پتر۔ بہت جوشیلا اور غصہ مگر میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک بار مثالی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں کوئی ایسی دکان بات ہو تو میں کسی سے بدلہ نہیں لوں گا بلکہ اپنے دشمنوں کو معاف کروں گا۔"

پتا مجھ میں نے انہیں معاف کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بدلہ لیتا ہوں تو میں میری مثالی کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور یہ مجھے بخیر نہ تھا لہذا میں نے انہیں کچھ نہیں کیا اور گاؤں چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے بعد میں اپنے کسی رشتے دار سے بھی نہیں ملا۔ یہ جو بہن، بھتیجا اور چاہتا وغیرہ ہیں یہ میرے کوئی نہیں ہیں میں بے چارے غریب اور ضرورت مند لوگ ہیں اور اللہ تعالیٰ جتنی تو توفیق دیتا ہے۔ میں اتنی ان کی مدد کرتا ہوں۔ بھتیجا تو خیر اب نہیں چلا گیا ہے۔ بہن جلد ہی دوسری شادی کرنے والی ہے۔ انہیں اب میری مدد کی ضرورت نہیں رہے گی ہاں چاہتا روح جاتی ہے بے چاری بیوہ ہے، کوئی اولاد بھی نہیں۔ بہت اکیلی اور وحشی عورت ہے میری طرح اور حیرتی طرح اس کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں۔ استاد سمندر پیک پیک رک پھر لہی سانس لے کر بولا۔ "ایک بات کہوں پتر؟"

"ہاں استاد کہو۔"

"دیکھ جب میں نہیں رہوں گا تو تو اکیلا رہ جائے گا۔ ابھی تیری عمری کیا ہے تیرے سر پر کسی بڑے کا ہاتھ ہونا ضروری ہے۔ اگر مناسب سمجھے تو چاہتا کو یہاں اپنے پاس لے آؤ، مجھے اس کا پتا تو معلوم ہی ہے؟"

"نہیں استاد، مجھے اس کا پتا نہیں معلوم۔ تم نے بھی بتایا ہی نہیں۔"

"کرم داد سے پوچھ لیتا، وہ جانتا ہے۔ اگر چاہتا یہاں آجائے تو بڑا اچھا رہے گا۔ تم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن جاؤ گے۔"

استاد سمندر نے جملہ پورا کیا ہی تھا کہ معا اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ سینے کا درد ایک دم بڑھ گیا اور چہرے کا رنگ حقیر ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر بٹو ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے استاد سمندر کو دو گھنٹ پانی پلا یا اور پھر ایک اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ استاد سمندر نے کھلی کھلی آواز میں اسے آواز دی۔ وہاں آنے کے لیے کہا مگر بٹو نہیں رکا۔ اس نے بے حد توجہ میں دروازہ کھولا اور وحشت بھرے انداز میں اندھا دھندگی میں دوڑتا چلا گیا۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور ساری گلیاں ویران پڑی تھیں۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھا جسے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بٹو چمکتے چاند کے نیچے ہر طرف سے بے خبر ہو کر دوڑتا چلا گیا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سارا بدن پیسے سے شرابور تھا اور ناخوش خشک پتے کی طرح کانپ رہی تھی مگر

اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اس نے ایک گلی عبور کی پھر دوسری پھر تیسری اور پھر دوسرے سوک پر چاہتا چلا گیا ڈاکٹر رضا کا مطلب تھا۔ اوپر کی منزل میں ان کی رہائش تھی۔ بٹو نے تیزی سے میڑھیاں ملے کیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔

کوئی پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر رضا سوٹ سے اٹھ کر آئے تھے۔ اس لیے کافی پرہم تھے لیکن بٹو پر نظر پڑتے ہی ان کی کھٹائی کی کھٹکیں غائب ہو گئیں۔ گھبرا کر بولے۔ "کیا بات ہے بٹو؟ کیا بات ہے تم پر دو کیوں رہے ہو؟"

بٹو نے جلدی جلدی ساری بات بتائی۔ "اچھا خیر وہ میں اپنا تکلیف لے کر آتا ہوں۔"

لیکن دس منٹ بعد جب ڈاکٹر رضا اور بٹو گھر میں داخل ہوئے تو استاد سمندر چاہتا تھا۔

استاد سمندر کی موت کوئی ایسا سا فتنہ نہیں تھا جسے بٹو آسانی سے بھیل جاتا۔ بہت دن تک وہ گم سم مار رہا۔ کوئی شے اسے اچھی نہ لگتی۔ ہر شخص اسے اجنبی اور بے مہر نظر آتا۔ ایسا لگتا جیسے وہ کسی گھنے جھل میں گھو گیا ہے اور بھجو کے باوجود اپنا راستہ تلاش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے شب و روز کا معمول بڑا میکانیکی سا ہو گیا۔ صبح اٹتا، ناشتا کرتا اور دکان پر چلا جاتا۔ رات مجھے گھر جاتا اور چار پانی پر لیٹنے لیٹے چھت کی کڑیاں لٹکا کر وقت دیر سے دیر سے ہر زخم کو مندل کر دیتا ہے۔ بٹو بھی بالآخر دکھ اور بے سہارے پن کے گرداب سے نکل آیا۔ اس کے کلی سب تھے۔ احساس ذمے داری کے ساتھ اس کے ارد گرد ایسے ہی لوگ موجود تھے جو اسے سہارا دیتے تھے۔ کرم داد اور دوسرے کئی لوگ تھے اور بھگت زیت تھی جو اس کے لیے اندھیری رات میں چمکتے والے اس چاند کے مانند تھے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بٹو بھی زیت کے چاند جیسے چہرے کو دیکھتا تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا۔ مایوسی کی تاریکی چھٹ جاتی اور اسے زندگی کا راستہ نظر آتے لگتے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا اگر زیت نہ ہوتی، ہاں اگر زیت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ اس کے چاروں طرف کھلی تاریکی ہوتی۔ گہری، دم گھونٹ دینے والی تاریکی جس میں وہ ساری عمر بھٹکتا رہتا مگر زیت موجود تھی۔ اندھیری رات میں چمکتے والا چاند جس کی روشنی میں مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں اور اس چاند کی موجودگی بٹو کے لیے سب سے بڑا سہارا تھا اور ہر چہرہ

ان کے درمیان ایک بڑا بے نام اور خیر و رنج رہا تھا جس کی کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ ایک ایسا لگا جو کم از کم بٹو کے دل میں منونیت کے احساس کی بنا پر پیدا ہوا تھا لیکن بٹو خود اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اسے تو صرف اس بات سے غرض تھی کہ زیت اسے اچھی لگتی ہے اور اس بلا اشعوری طور پر اس کی خواہش تھی کہ زیت ہمیشہ اسی طرح اس کے آس پاس موجود رہے۔

ایک اور سہارا چاہتی کا تھا۔ استاد سمندر کی خواہش کے مطابق وہ چاہتا کہ اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چاہتی کوئی عمر رسیدہ عورت ہوگی مگر اس کی عمر چالیس کے گنگ جگہ تھی چونکہ استاد سمندر اس کے شو پر کو جو استاد سمندر سے عمر میں بڑا تھا چاہتا کہ کبھی اس کا مطلب کرتا تھا لہذا اسی ناتے سے وہ اسے چاہتا کہنے لگا تھا حالانکہ وہ عمر میں استاد سمندر سے چھوٹی تھی۔ چاہتی کا رنگ سانولا تھا۔ ناک نقش اتنا اچھا تھا کہ اگر وہ چاہتی تو اب بھی کسی اچھے آدمی سے اس کی شادی ہو سکتی تھی مگر اسے اپنے مرحوم شوہر سے بڑی محبت تھی۔ اسی بنا پر وہ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بہت نیک اور خدمت کرنے والی عورت تھی۔ گھر کو اپنے ہاتھوں کی برکت سے جنت بنا دینے والی۔ جب وہ بٹو کے گھر آئی تو شروع میں چند دن ٹھوڑا سا تکلف رہا پھر وہ مکمل مل گئے اور ایک دوسرے کے ہم دم ساز بن گئے۔ چاہتی کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے بٹو کو اپنی مائی یاد آ جاتی کیونکہ وہ بھی دسکی ہی نیک اور مہربان تھی۔ کبھی کبھی بٹو سوچتا ایسا تو نہیں کہ قدرت نے چاہتی کی شکل میں میری مایا مجھے واپس کر دی ہے لیکن اس نے اپنے اس احساس کا ذکر کبھی چاہتی سے نہیں کیا۔

وہ ایک جلتی ہوئی دوپہر تھی۔ بٹو دکان میں پاؤں پیارے بیچا کتاب پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک کاپی اور قلم رکھا ہوا تھا۔ رفت رفت اس نے کوشش کر کے نگہت پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ گلی میں سب معمول وہی لگتی تھی۔ بٹو کتاب پڑھتے پڑھتے کسی کسی وقت نظر اٹھا تا اور ادھر ادھر دیکھ لیتا۔ کرم داد اپنی دکان میں آجائیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس کی دکان کے نیچے تالی میں فقیر سے کا دم کٹا کٹا بیٹھا بڑی سی زبان نکالے بانپ رہا تھا۔ سارے چہرے خالی تھے اور اکثر دکھائیں بند تھیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ابھی اس گلی میں صبح نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی تو آدھی رات تھی اور جب تک صبح نہیں ہوگی چہرے ویران اور گلی مستان ہی رہے گی۔ بٹو نے ہاتھ اٹھا کر کان کھپایا اور گردن اٹھا کر زیت کے چہرے کی

طرف دیکھا مگر زینت چہ بارے پر نہیں تھی، سبز جلیوں سے اتر رہی تھی۔ بٹو سے آتے دیکھ کر پکڑ لیا۔ سبیل کر چھ گیا۔ زینت نے گلابی شلوار چیر بکھن رکھا تھا۔ وہ بیٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ سیاہ بالوں کی ایک موٹی سی چوٹی اس کی کمر پر لہرا رہی تھی۔ وہ اب بڑی ہوئی تھی۔ سترہ سال کے لگ بھگ کھرا بھی تھی۔ دیکھی ہی دیکھی تھی۔ چہرے کے ایک تاثر سے اگر بدستور لوگوں کا اظہار ہوتا تھا تو دوسرا تاثر فوراً اعلان کرتا تھا کہ اب وہ جوانی کی وادیوں میں قدم رکھ رہی ہے۔ سالوں رنگت کے باوجود اس کے سینے نقش اب زیادہ چمکے ہوئے تھے اور اس بنا پر وہ زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ کم از کم بٹو کو بہت زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ چمکے چمکے قدم اٹھاتی ہوئی دکان پر آئی اور دم لچے میں ہوئی۔ "بٹو سگریٹ کی ایک دو ڈیادے اور چار پان، ایک میں تو مزیداد والا۔"

بٹو کو ایک نامعلوم سی خوش محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے کتاب بند کی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "آج تو صبح سے جھین دیکھا ہی نہیں، کہاں میں تم؟" "مگر میں بھی اس اور کہاں ہوتی؟" زینت نے بٹو کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"بٹو، پر بھی نہیں آئیں؟" "جیسے پر آکر کیا کرتی؟" "کچھ نہیں، میں نے تو دیئے ہی کیا۔ کیا آج کہیں جا رہی ہو؟"

"میں تو کیوں؟" "یہ اتنے اچھے اچھے کپڑے جو پہنے ہیں آج تم نے؟" "کہاں جاتا ہے بٹو۔" زینت نے کہا۔ اس کے لچے اور چہرے دونوں ہی سے ایک عجیب سی تھکاوٹ اور زاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ "بس ویسے ہی کپڑے پہن لیے ہیں لیکن جانتا نہیں ہے۔ لا جلدی سے پان دے، ورنہ کر۔"

ایک ایک بٹو کو زینت کے بدلے ہوئے روپے کا احساس ہوا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ زینت نے ایسے چمکے چمکے انداز میں بات کی ہو بغیر مکرانے ہوئے بغیر اسے چھیڑے ہوئے۔ "کیا بات ہے زینت اتنی محصل کیوں نظر آ رہی ہے؟" اس نے فوراً زینت کے اداں چہرے کو دیکھا پھر تشویش بھرے انداز میں بولا۔

"کیا بات ہے زینت، تم اتنی پریشان کیوں ہو تمہاری طبیعت تو فیک ہے؟"

"کوئی بات نہیں بٹو میری طبیعت فیک ہے تو ذرا جلدی سے پان دے دے۔"

"نہیں، نہیں،" بٹو بچوں کی طرح چل گیا۔ "پہلے بتاؤ کیا بات ہے ورنہ میں پان نہیں دوں گا۔"

زینت نے پہلی بار گردن اٹھائی اور بٹو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ واقعی دھندلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں گہری سیاست تھی جیسے وہ اندر ہی اندر کسی شدید اذیت سے دوچار ہو۔ وہ چہرے کے کچھ تذبذب اور کچھ حسرت سے بٹو کی ہنسی رہی پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "دیکھ بٹو، تنگ نہ کر جلدی سے پان دے دے۔"

"نہیں، پہلے بتاؤ۔ پہلے بتاؤ۔" بٹو نے پھر ضد کی۔ زینت نے بٹو کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے لمبے سفر پر جانے والا آدمی اپنے ساروں کو حسرت سے دیکھتا ہے پھر وہ غصہ سی سانس لے کر کہنے لگی۔

"کیا بتاؤں بٹو اتنی ہی کیا کچھ میں آئے گا۔ دیکھ، جلدی سے پان دے دے میرے اچھے بٹو! اچھے میری قسم۔"

بٹو نے پھر کچھ نہیں کہا۔ زینت نے اپنی قسم جو دے دی تھی۔ اس نے پانوں کی پڑیا زینت کی طرف بڑھائی پھر ایک پان میں چار الائچیاں ڈال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ "لو یہ تم کھالو میری طرف سے۔"

زینت گردن جھکا کر ہوئے واپس ہو گئی۔ چمکے چمکے قدموں سے اس نے گلی طے کی۔ بٹو اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

زینت نے کہا تھا۔ "حیرتی کیا کچھ میں آئے گا۔" بٹو بے شک ابھی لڑکا تھا اور ساری زندگی کچھ باتیں تو بہر حال کچھ ہی سکتا تھا۔ زینت کی اداسی اور بیزار کی سبب دوسرے دن اسے معلوم ہو گیا۔ جب اس نے یونہی روارو کی میں کرم داد سے کہا۔

"چاہا، چاہا نہیں یہ زینت کو کیا ہو گیا ہے۔ فیک سے بات ہی نہیں کرتی؟"

"مجھے نہیں معلوم؟" کرم داد نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، کیا کوئی خاص بات ہے؟"

کرم داد نے چٹکی بھرا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ "چتر بات یہ ہے کہ زینت کی شادی ہو رہی ہے۔"

"شش۔ شادی ہو رہی ہے۔" بٹو حیرت سے بولا۔

"کب، کس سے مجھے تو پتا ہی نہیں چلا؟"

"چھوٹے چوہری سے۔" کرم داد نے اطمینان

احساس

سے کہا۔ "مگر یہ وہ شادی نہیں ہے چتر جو تم سمجھ رہا ہے۔ یہ دوسری طرح کی شادی ہے اور یہ صرف لڑکوں کی ہوتی ہے مگر یہ حیرتی کچھ میں نہیں آئے گا۔"

بٹو دم بٹو دسا بیٹھا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئی اور ان میں کچھ ایسی بے اعتباری تھی جیسے اسے کرم داد کی ہوش مندی پر شبہ ہو۔ کئی لمحے اسی حالت میں گزر گئے پھر وہ اٹھکے ہوئے سچے میں بولا۔ "چاہا، میری کچھ میں واقعی تمہاری بات نہیں آتی۔ تم کہہ رہے ہو کہ اس کی شادی چھوٹے چوہری سے ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی؟"

بٹو کی لہجہ تنک چپ رہا اور گوگو کے عالم میں کرم داد کو دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "تو کیا زینت بھی راضی ہے؟"

"زینت کی رضامندی یا تا رضامندی سے بھلا کیا ہوتا ہے؟" کرم داد حیرت سے بولا۔ "میں نے کہا نا کہ یہ تو ایک رواج ہے جسے ہر وہ پورا کرتی ہے۔ اس میں رضامندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا پتر۔"

بٹو کی کچھ میں پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک کئی سوال موجود تھے۔ شاید یہ کہ زینت رضامند نہیں ہے تو کوئی جبر اسے شادی پر کیسے مجبور کر سکتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ کیسی شادی ہے کہ وہ شادی کے بعد بھی بوی نہیں ہوئی اور حیرتی بات ہے کہ زینت چھوٹے چوہری سے کم از کم پچیس سال چھوٹی ہے پھر اس کے گھر والے اس کی شادی چھوٹے چوہری سے کیوں کر رہے ہیں مگر اس نے یہ سارے سوال نہیں کیے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے صرف اتنا ہی پوچھا۔

"یہ شادی کب ہے چاہا کرم داد؟"

"پہ سو لپا۔"

دو دن کسی کیڑے کی طرح رینگ رینگ کر گزرے۔ بٹو بہت تنوش اور ہراساں تھا۔ کچھ ایسی کیفیت تھی اس کی جیسے دو کوئی چیز نہیں رکھ کر بھول گیا ہو اور باوجود کوشش کے یاد نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا چیز تھی اور اسے وہ کہاں رکھ کر بھول گیا ہے چاہی کہ نئی بار سے نوکا۔

"کیا بات ہے بٹو، تم اتنے کھوٹے کھوٹے کیوں ہو۔ تمہاری طبیعت تو فیک ہے؟" فریڈ نے بھی نوکا جسے اس نے دکان پر جڑوئی کام کے لیے ملازم رکھا تھا مگر اس کی کچھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دے۔ اسے تو اپنی حالت کا خود ہی ادراک نہیں تھا پھر مگر کی اور کو کیا بتاتا۔ دو دن یونہی

گزر دے پھر تیسرا دن آیا اور وہ تیسرا دن بھی بہت طویل، بہت دیران اور بہت اداس گزرنے والا تھا۔ بٹو سارا دن دکان میں بیٹھا رہا اور بار بار زینت کے چہ بارے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار بڑے جاؤ سے لگا کر کھکا تھا۔ اس میں چار الائچیاں ڈالیں اور کھنکر رہا شاید زینت آجائے۔ صرف ایک بار تو اسے پھر پان کھلا دے گا۔ شاید آخری بار مگر زینت نہیں آئی۔ وہ سارا دن چہ بارے پر بھی نظر نہیں آئی۔ جب شام ہوئی اور گلی کی روشنی میں اضافہ ہوا تو اس نے چھوٹے چوہری کو دیکھا۔ حسب معمول وہ جھوم جھوم کر چل رہا تھا۔ اس شام اس کی بجائے کچھ نرالی ہی تھی۔ جسم پر گلابی رنگ کا کڑھا ہوا کر۔ اور سلیڈ لا چا تھا۔ کپڑی بالکل نئی تھی اور اس کا شلہ پہلے سے بھی ادھیا تھا۔ اس کے گلے میں گلاب اور چٹیلی کے کئی ہار تھے۔

کھانوں میں پھول تھے اور کانوں میں بھی کھیاں اڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں کامل رچا تھا اور ہونٹوں پر پان کی سرخی اس کے چہرے اس کے کئی صاحب تھے۔ بٹو کا ایک سبیل کر بیٹھ گیا اور اس نظر سے چھوٹے چوہری کو گھورنے لگا جس نظر سے آدمی اپنے بدترین دشمن کو گھورتا ہے۔ اس کی آنکھیں مل رہی تھیں۔ بدن سننا رہا تھا اور دل میں کچھ ایسی تکلیف ہو رہی تھی جیسے کوئی سوئیاں چھو رہا ہو۔ یہ ساری کیفیت غیر شعوری اور غیر اختیاری تھی۔ اگر وہ اپنی حالت کا تجزیہ کر سکتا تو شاید اسے خود توبہ ہوتا کہ وہ ایسا کیوں محسوس کر رہا ہے۔ اگر چھوٹا چوہری زینت سے شادی کر رہا ہے تو اسے کیا؟ زینت آخر اس کی کون تھی؟ اس کا زینت پر کیا حق ہے اور اگر زینت چھوٹے چوہری سے شادی نہ کرے تو اسے کیا حاصل ہوگا؟ مگر اسے ان باتوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ چھوٹا چوہری ایک لہیرا ہے اور اس کی دنیا لوٹنے آیا ہے۔

چھوٹا چوہری مسکراتا ہوا کسی قلع کی طرح آیا۔ کئی لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس سے ہاتھ ملایا پھر وہ اپنے معائنہ کے جلوس میں بیڑھیاں چڑھا کر ادھر چلا گیا۔ بٹو کچھ دیر خاموش بیٹھا جھپٹی ہوئی نظروں سے چہ بارے کو گھورتا رہا پھر کیا ایک نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے فریڈ سے کو آواز دے کر دکان دیکھنے کے لیے کہا اور خود اتر کر ایک طرف چل پڑا۔ کچھ دیر میں وہ سڑک پر آ گیا جہاں شام کا کھجور داں دواں تھا۔ ہوئی اور دکان میں آباؤ میں لیکن بٹو کو کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ وہ ایک عالم وحشت میں سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اس بات سے بے نیاز

اور بے خبری کہ اسے کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے؟ بیروں کے لیے سنگین زمین کی سر پر کھن آسمان تھا جہاں چمکتا ہوا چاند موجود تھا جسے دیکھ کر مسافر اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بشو اسی چاند کے نیچے بہت دیر تک بیٹھ کر رہا۔ کشتہ، بے خبر۔ ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک گلی سے دوسری گلی اور رات کا اندھیرا دیر سے دیر سے گھر پہنچا اور سونے کے لیے لیٹا تو اچانک اس نے چاچی سے کہا۔

”چاچی، میں دکان لے کر رہا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

ایک باب پورا ہوا۔ ورق پلٹا گیا اور وقت نے کتاب زندگی پر نیا باب لکھنا شروع کیا۔ اگلی طرح میں کیا ہوگا، اگلے پیر اگر آف میں کیا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا۔ بشو بھی نہیں جانتا تھا۔ مستقبل ایک تاریک سمندر ہے اور اس سمندر میں کہاں کہاں رخ پر سکون ہے اور کہاں کہاں مدھن ہے یہ کسی کو نہیں معلوم، شاید زندگی کی ساری کشش اور سارا حسن اسی میں ہے کہ آدمی کچھ نہیں جانتا۔ وہ تو بس تاریک سمندر میں اپنی ناؤ سکھاتا رہتا ہے۔ کبھی ساحل تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کسی بیوی بچال یا طوقان میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ بشو نے دکان چلی تو اس نے شہر کے ایک خاصے اچھے علاقے میں دوسری دکان حاصل کر لی۔ وہی پان کے بچے، چوہا، کھانا اور سگریٹ کے پیکٹ اس کے چاروں طرف تھے اور بشو بالکل مطمئن تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہی اس کی انتہا ہے۔ اس نے کبھی آگے بڑھنے اور کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں مگر یہ تو اسے معلوم ہی تھا کہ اگلی طرح میں کیا ہے۔

بشو کی دکان بہت ہی اچھی چلنے لگی تھی۔ اتنی کہ خود اسے گمان تک نہ تھا۔ اس کی آمدنی آٹھ ماہات سے کئی گنا زیادہ تھی، حالانکہ اسی سڑک پر پان سگریٹ کی اور بھی دکانیں تھیں مگر وہ لوگ پیسے یہاں مارا کرتے اور بشو کا بکوں کو ٹھانے ٹھانے تلک آجاتا۔ خریدہ دستور اس کے ساتھ تھا۔ یہی بھی وہ نہیں کر سکتا۔

”بشو بہادر، حیرے ہاتھوں میں چمکتا رہے۔ بلی کو بھی ہاتھ لگائے گا تو سونہ بن جائے گی۔“ اس کی عادت تھی کہ وہ بشو کو ہمیشہ بشو بہادر کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

شاید خریدے کی بات درست تھی۔ بشو نے اتنی ترقی کی کبھی کبھی خود اسے تعجب ہوتا مگر وہ یہ سوچ کر خود اسادھی بھی ہو جاتا کہ یہ کبھی خوش نصیبی ہے کہ وہ اپنی ماں اور بہن

سے بچھڑ گیا۔ استاد سمندر بھی مہربان ہستی کو کھو بیٹھا اور زندگی کی دید سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا لیکن دوسری طرف کاروبار میں بے حد کامیاب ہے۔ یہ واقعی خوش نصیبی ہے یا قسمت کا کوئی انوکھا قسم۔ وہیے کاروبار میں جو کامیابی اسے حاصل ہوئی اس میں اس کی خواہش یا ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ تو بس خود بخود ہوتا تھا جیسے اور بہت سی باتیں اس کی زندگی میں ہوئی تھیں۔ کچھ مدت بعد اس نے جوتے چمیل کا ایک کارخانہ مسز می عبدالبہار کے مشورے پر خرید لیا۔ کارخانہ چھوٹا تھا اور مسلسل نقصان میں چل رہا تھا۔ مسز می عبدالبہار نے جو کارخانے میں نوکریں تھے اور بشو کے پردوں میں رہتے تھے، بشو سے کہا کہ کارخانہ اچھا ہے اور منافع بخش ہے چنانچہ بشو نے کارخانہ خرید لیا۔ اس کے ہاتھ میں واقعی کوئی پتھرا تھا۔ ادھر کاغذات پر مالک کا نام تبدیل ہوا ادھر کارخانے کی قسمت بدل گئی۔ کچھ دن بعد مزید پیش پیش لگائی گئی۔ مزید ملازم رکھے گئے اور وہ چھوٹا سا کارخانہ ایک بڑے کارخانے میں تبدیل ہو گیا۔ کارخانے کے سمندر شو اور زندگی میں بدل گئے۔ اسے مقبول تھے کہ دن بدن ان کی مالک بڑھتی گئی اور پردوں پر روشن پوری کرنے کے لیے پھر اور پیش پیش لگوانی گئی۔ یہ سب کچھ بشو کے لیے ایک خواب کی طرح تھا۔

ایک خوب صورت اور نشاط انگیز خواب جو ہر شخص دیکھتا ہے لیکن جو محو ناپورا نہیں ہوتا مگر بیشک معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اس کے خواب جو اس نے جان کر نہیں دیکھے تھے پورے ہو رہے تھے۔ کارخانے کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد اس نے ایک ادھوری کمرشل بلڈنگ خرید کر مکمل کی جس میں نیچے دکانیں اور اوپر دفاتر تھے۔ یہ مرحلہ طے ہوا اور کچھ مدت گزری تو اتفاق سے کپڑے کا ایک کارخانہ اسے مل گیا۔ اگرچہ وہ اس معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا مگر بیشک بغیر نہ کہا۔ ”بشارت صاحب، آپ فکر کیوں کرتے ہیں ہم آپ کو پوری پوری سپورٹ دیں گے۔“

”مگر بھئی، اس کارخانے کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔“ بشو نے اعتراض کیا۔

”بے شک لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کارخانہ خرید لیں تو اس کی حالت بدل جائے گی۔“

چنانچہ بشو نے کپڑے کی خریداری اور اس کا نام بدل دیا۔ اب کارخانے کے وسیع گیت پر ایک نیا سبز رنگ کا پورٹ لگا گیا۔ سمندر کی کھال غلامیٹہ کچھ ہی دنوں میں کارخانے کی حالت واقعی بدل گئی۔ نقصان منافع میں تبدیل ہو گیا۔

احتساب

مزید پیش پیش گئیں۔ مزید کاروبار کے گئے۔ سمندر کی کھال غلامیٹہ کی بلی سمندر زمین اور زمین سائن تو بہت مقبول تھی۔ بشو نے مل کے عقب میں ایک بہت بڑی کالونی بھی بنائی۔ جہاں صرف ان کارکنوں اور مزدوروں کو مکان اور کوارٹر دیے گئے جو تنگ دلی کے باعث زیادہ کرانے اور ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کالونی میں تمام بنیادی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں۔ اسکول، شفا خانہ، فیز پرائس شاپ، ایک خوب صورت پارک اور ایک مسجد۔ بشو کے ذہن میں مسجد کا ایک خاص مقام تھا لیکن میں جب وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا تو اس کی گلی میں ایک چھوٹی سی خوب صورت سی مسجد تھی جس کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ اس کے کندہ کے ساتھ چار کے بجائے صرف ایک ہی مینار تھا اور دوسری خصوصیت یہ تھی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود اس کے پانچ دروازے تھے۔ درمیانی دروازہ جو خارجی تھا سب سے بڑا اور بلند تھا اور اس کے اوپر سنگ مرمر کی ایک سلی نصب تھی جس پر پوری سورہہ رحمن لکھی تھی۔ بشو نے اسی مسجد کے سامنے میں مکمل کوہر چھین کے چند سال گزارے تھے۔ وہ اپنی زندگی کی مکمل غماز پڑھتی تھی اور وہیں الف لامیم شروع کی تھی۔ یہی تھے اس کے ذہن میں یہ اعتقاد جیسا تھا کہ مسجد پر کثرت کی علامت ہوتی ہے اور جس طرح وہ اپنی ماں اور بہن کو بھی نہیں بھول سکتا تھا، اسی طرح واحد متاثر اور پانچ دروازوں والی مسجد کی یاد اس کے حافظے سے کبھی نہ نہیں ہوتی تھی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جب اس نے کالونی بنائی تو سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی۔

ایک شام وہ اپنے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے، قارئین پر پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس ایم اے کے کورس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ بھی چاچی ایک گلاس میں دودھ لے کر آئیں اور اس کے قریب بیٹھ کر کہنے لگیں۔

”بشو، میں نے سنا ہے کہ تم کچھ زمین خرید رہے ہو؟“

بشو نے کتاب بند کر کے ایک طرف دھکی۔ ”ہاں چاچی۔“ اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مگر کچھ نہیں بلکہ کئی سو ایکڑ زمین ہے۔ حکومت نظام کر رہی ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں خرید لوں۔“

”مگر تم زمین کا کیا کرو گے؟“

”جو کچھ کاشت کاری کے لیے استعمال ہوگی کچھ میں پھلوں کے باغات لگائیں گے اور باقی زمین پر ایک بڑا پالٹری فارم بنے گا۔“

”وہ تو عجیب ہے مگر تمہیں ضرورت کیا ہے؟“ چاچی نے اگلا سوال کیا۔

”آپ عجیب کہتی ہیں چاچی۔ ضرورت تو کوئی نہیں۔“ بشو کہنے لگا۔ ”مگر پھر میں بھی خرید رہا ہوں وجہ یہ ہے کہ استاد سمندر مرحوم کو گاؤں اور زمینوں سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ ان کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا اور صرف اسی بنا پر میں زمین خریدنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ اس سے استاد مرحوم کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن مجھے خوشی ہوئی۔“

”چلو عجیب ہے، خوشی کی بات ہے تو ضرور خریدو۔“ چاچی نے تعویذی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”مگر تمہیں زمین یا کاشت کاری کا تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کھن ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں پڑ جاؤ۔“

”مجھے تو کسی بات کا تجربہ نہیں تھا لیکن دیکھیے دیر سے دیر سے سب ہی کچھ ہوتا چلا گیا۔“ بشو ہنس کر کہنے لگا۔

بات دراصل یہ ہے چاچی کہ جب اللہ تعالیٰ کرم کرتا ہے تو ہر کام کے لیے مناسب وسیلہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ چمیل کا کارخانہ خریدنا تھا تو مسز می عبدالبہار لگے تھے۔ اسی طرح ٹیکنیکل مل کے موقع پر ہوا تھا کہ مجھے قاش اور دیانت دار لوگ مل گئے تھے۔ اب ایک صاحب ملے ہیں صدر الدین، بہت ایمان دار اور قاش آدمی ہیں۔ ولایت سے کئی ڈگریاں لے کر آئے ہیں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن اور انگریزی پھر دونوں ہی میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف زمینوں کو بلکہ میرے دوسرے کاروبار کو بھی دیکھیں گے۔ دراصل انہی کے مشورے پر میں نے زمین خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”خیر تم جالو۔“ چاچی گلاس لے کر چلی گئیں۔

یہ ساری ترقی اور کامیابی بلاشبہ بے حد محنت انگیز تھی۔ کسی مجھڑے کی طرح اور فطری طور پر بشو کو بے حد خوشی بھی ہوتی تھی لیکن یہی بھی وہ اداں بھی ہو جاتا تھا۔ کئی ویران، بھلائے میں جب یادوں کے قبرستان میں جی چھوٹی چھوٹی قبروں پر نئے نئے خیمے چل اٹھے تو وہ اداں ہو جاتا۔ اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا اسے محسوس ہوتا کہ وہ ابھی تک وہی بھوکا اور کھال لڑکا ہے جو زندگی کے چھو پارے کے نیچے، بند دکان کے پیچھے پر شمع شمع کی حالت میں بڑا رہتا تھا۔ وہ پورا سحر اس کی آنکھوں میں گھوم جاتا، اس کی ذوقی ہوئی نظر میں، زندگی کا حصد لایا ہوا چہرہ، المونیم کا تسلا اور اس میں رکھا ہوا ساگ اور روٹیاں۔ اس کے دل میں یکا یک ایک ہو کر سی اٹھتی۔ خدایا۔ خدایا آخر میں کیا کروں؟ آخر کیا حاصل ہے اس دولت

وامارت سے۔ اس عزت و شہرت اور اس شان و شوکت سے، کچھ نہیں۔ سب بے کار ہے، لاعلم ہے۔ اس بھکاری کی طرح جس کی گدڑی میں ابل ہوئے ہیں لیکن جو دن رات فاقے کھاتا ہے۔ اسے اپنی ماں یاد آتی، اس کی ممتا کے نور سے دکھتا ہوا چہرہ یاد آتا پھر چھوٹی بہن یاد آتی۔ سیدھی سادی اور معصوم، جس کی آنکھوں میں ان گنت پنے ہر وقت چاہتے رہتے تھے۔ پتا نہیں وہ اب کہاں ہوں گی۔ زندہ بھی ہوں گی یا نہیں؟ شاید زندہ ہوں مگر وہ انہیں کہاں اور کیسے تلاش کرے۔ اسے تو اپنے شہر یا اپنے محلے کا نام نیک یاد نہیں۔ پتا نہیں کون سا شہر ہے اور نہ جانے ملک کے کون سے حصے میں ہے۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے پر یاد نہیں آیا تو پھر وہ انہیں کیسے ڈھونڈے اور کہاں ڈھونڈے۔ بٹوسو چتا رہتا اور اس کے تصور میں بے شمار لوہے پتے بگڑتے رہتے۔ مسجد اور اس کا پلندہ مینار اور پانچ دروازے اور ماں، بہن، نہیں چاہیے مجھے یہ سب دولت، شہرت اور عزت، کچھ بھی نہیں چاہیے۔ یہ سب کچھ مجھ سے لے لو اور مجھے میری ماں اور بہن دے دو۔ ان کے سوا مجھے اور کسی شے کی ترس نہیں مگر کون ہے جو بٹو کی یہ آرزو پوری کرے؟

جوں جوں کاروبار بڑھا بیٹھنے وہ مکان بھی چھوڑا اور ایک خوب صورت جڑنگ میں منتقل ہو گیا لیکن جب زمین خریدی گئی تو اس کے کچھ حصے بعد اس نے شہر کے سب سے خوب صورت علاقے میں ایک بنگلا بنوانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ خود اسے بنگلے میں رہنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ تو ایک سادہ سا آدمی تھا۔ ایک چھوٹا سا مکان ہی اس کے لیے کافی تھا لیکن جس اونچے طبقے میں وہ خود شامل ہو گیا تھا کچھ تو اس کا تقاضا تھا اور کچھ چاہی فریڈ سے اور صدر الدین کا مشورہ کہ اس نے بنگلا بنوانے کا ارادہ کر لیا۔ زمین حاصل کی گئی، نقش بنا اور تعمیر شروع ہو گئی۔ یہ ایک بڑا بنگلا تھا۔ بہت وسیع پائیمیں بارگ، کوئی درجن بھر کمرے، ڈرائنگ روم، لائبریری، مین اطراف میں وسیع برآمدے، دو ڈرائنگ روم۔ جب بنگلا تیار ہو گیا اور آرائشی کام بھی ختم ہو گیا تو بنگلے کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس دن شہر کے تمام کبار، رؤسا اور کئی بڑے سرکاری افسر موجود تھے۔ سارا بنگلا وہیں کی طرح سجایا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا خوب تھا جسے کامیابی کا اظہار عروج کہا جاسکتا ہے مگر یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ ان کرشموں کو دیکھ کر کہتے تھے کیونکہ وہ دنیا سے محروم ہیں۔ مہمان مگر اسکا کراہتو سے کچھ ملار ہے تھے۔

اسے مبارک باد دے رہے تھے اور اسے جاکر مبارک ہونے کی دعا دے رہے تھے۔ لوگ بیٹھا خوش تھے، بٹو بھی خوش نظر آ رہا تھا مگر انکم اس کے ہنسنے سے بھی پتا چلتا تھا لیکن حقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ اندر سے بے حد ٹوٹا ہوا، بے حد دکھی تھا۔ اس وقت جب وہ شہر کے بڑے بڑے رئیسوں اور خوب صورت اور طرین دار خواتین کے جمرے میں گھرا ہوا تھا تو اسے اپنی ماں اور بہن یاد آ رہی تھیں۔ کاش وہ بھی اس وقت یہاں ہوتیں۔ اس جشن میں، منگراہٹوں اور قہقہوں کے اس جشن میں شریک ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ سب کچھ اسے مل جاتا جس کی ترس کوئی بھی انسان اس دنیا میں کر سکتا ہے۔

جب سارے مہمان جمع ہو گئے اور مبارک باد کے مراحل بھی طے ہو گئے تو بٹو کی معیت میں وہ سب گیت پر آئے۔ گیت کے دائیں اور بائیں ستون نیک سرس کے تھے اور ان پر بزم رنگ کے چھوٹے چھوٹے ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ بٹو کی فرمائش پر شہر کے ایک بڑے عالم نے آیت کریمہ کی تلاوت کرنے کے بعد ایک پردہ ہٹا دیا۔ ستون پر ایک سنہری پلٹ کا پردہ ہٹا دیا۔ دیکھی ہی سنہری پلٹ تھی اور خوب صورت نقوشوں میں درخشاں تھا۔

”خج بشارت ملابھ“
کسی نے پوچھا۔ ”خج صاحب! آپ نے بنگلے کا نام آسے یاؤں کیوں رکھا ہے؟“
”کیونکہ آسے میری ماں کا نام تھا۔“

اس رات جب سارے مہمان چلے گئے اور بنگلے میں چاہی فریڈ سے اور دو چار نوکروں کے سوا کوئی نہیں رہ گیا تو خج بشارت ملابھ کی فرمائش پر چاہی فریڈ نے بڑے اہتمام سے سرسوں کا ساگ اور روٹی لپکاٹی اور خاص طور پر خریدے گئے المونیم کے تسے میں رکھ کر بٹو کو کھانا دیا جو اس نے زمین پر بیٹھ کر کھا دیا اور برسوں کے بعد اس کھانے میں اسے وہی لذت ملی جو برسوں پہلے اس وقت ملی تھی جب چالیس گھنٹوں سے فاقے کے مارے ہوئے بٹو کو زینت نے کھانا دیا تھا اور بٹو اس کھانے کی لذت اور نئے کھانے کی بھول سکا تھا۔

☆ ☆ ☆
خج بشارت ملابھ کے غلی ڈرائنگ روم میں کھری خاموشی تھی۔ اتنی گہری کہ گوسنی گرتی تو اس کی آواز بھی سنئی جاسکتی تھی۔ لمبی چوڑی سا گوانی میز کے ایک طرف خج ملابھ اور دوسری طرف بشیر احمد بیٹھے تھے۔ میز پر چائے کا سامان

رکھا تھا اور دو چالیسوں میں چائے پھری ہوئی تھی مگر دونوں میں سے کسی نے بھی چائے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کئی منٹ یونہی گزر گئے پھر خج ملابھ نے طویل سانس لی اور دم لہجے میں بولے مگر بشیر احمد صاحب، آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟“

بشیر احمد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ بے چینی سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے اسے بے چینی میں دشواری ہو رہی ہو کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ کچھ دیر تک تذبذب کے عالم میں میز کی سطح بچانے کے بعد اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور قدرے ٹھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

”خج صاحب! ایک ماہ ہوا جب آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا۔ اس ایک ماہ میں، میں نے ہزاروں میل کا سفر کیا ہے۔ ان گنت چھوٹے موٹے شہروں میں گیا ہوں، کسی ایسی مسجد کی تلاش میں، جس کا صرف ایک مینار اور پانچ دروازے ہوں، آسان بھی ہو سکتی ہے اور مشکل بھی۔ بد قسمتی سے اس معاملے میں یہ تلاش خاصی وقت طلب ثابت ہوئی کیونکہ مجھے کیوں کی بناوٹ اور کچھ دوسری باتوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ آپ کی یادداشت میں کی باتیں غلط معلوم ہو گئی تھیں۔ اس بنا پر بھی مجھے بڑی دشواری ہوئی لیکن میری یہ عادت ہے کہ جب بھی کسی کام کو ہاتھ میں لیتا ہوں، اسے جتن تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں چنانچہ اس معاملے میں بھی میں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ خج صاحب، قصہ یہ ہے کہ اس دوران اخبارات برابر میری نظر سے گزرتے رہے جن سے مجھے پتا چلا کہ آپ نے ایک بڑی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے اور آنے والے انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یہ بھی قیاس آرائی ہو رہی ہے کہ پارٹی آپ کو مختصر یہ وزیر اعلیٰ کے طور پر نامزد کرے گی اور آپ اسی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیں گے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں یہ سچ ہے۔“ خج ملابھ نے الجھ کر کہا۔ ”مگر ابھی آپ نے کہا تھا کہ میں اپنے بچپن کے گھر، ماں، بہن اور زینت کی تلاش کا مرکز ترک نہ کروں تو کم از کم کچھ عرصے کے لیے بٹو کی کردوں۔ آخر اس بات کا میرے الیکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے سے کیا تعلق ہے؟“

”خج صاحب، مجھے یہ بات کس طرح کہنی چاہیے، یہ میں نہیں جانتا۔ تاہم کوشش کرتا ہوں۔“ بشیر احمد نے کہا شروع کیا۔ ”بات یہ ہے۔ خج صاحب کہ آپ کی شخصیت

کوئی معمولی نہیں۔ آپ ایک ممتاز سادھی مرتبے کے مالک ہیں۔ گزشتہ ان گنت برسوں میں آپ نے اس شہر کے بے شمار غریب اور دلی لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب بھی کر رہے ہیں اور یہ سب بے لالچ ہے کہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور شاید آپ نے اسی نیت سے وزیر اعلیٰ بننا قبول کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اس شہر میں ایک خاصی عزت اور احترام کے مالک ہیں اور مجھے خوف ہے کہ آپ ایسا نہ ہو کہ آپ کی ماں، بہن اور زینت کی تلاش آپ کے مستقبل کے لیے ضرر رساں ثابت ہو۔“

خج ملابھ نے ہر سوزنظروں سے بشیر احمد کو گھورا۔ ”میں سمجھا نہیں کہ آپ کے خوف کا سبب کیا ہے؟ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ ان کے شے سے میری نیک نامی کو نقصان پہنچے گا، میں الیکشن ہار جاؤں گا، آج جو نظریں مجھے احترام سے دیکھتی ہیں، عداوت سے دیکھنے لگیں گی تو آپ کا خیال ہے شک درست ہے مگر آپ ایک بات بھول رہے ہیں۔“

بشیر احمد نے جس آئینہ نظروں سے خج ملابھ کی طرف دیکھا۔ خج ملابھ کے چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ ان کے اعصاب کشیدہ ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر جو پٹل پٹی ہوئی تھی، ان کے ہاتھوں، ہونٹوں اور آنکھوں کی ایک ایک حرکت سے اس کا اعتبار ہو رہا تھا۔ انہوں نے بشیر احمد کو قریب قریب گھورتے ہوئے کہا۔ ”بشیر صاحب! یہاں، اس بیٹے کے اندر ایک دل ہے۔ اس دل کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ کچھ اپنے معیار اور پیمانے ہیں اور یہ دل باہر کے کسی اصول، کسی پیمانے کو نہیں مانتا، نہ کسی لالچ، مصلحت اور خوف کو خاطر میں لاتا ہے لہذا آپ میرے مستقبل کی فکر نہ کریں۔ یہ بتائیں کہ آپ نے انہیں تلاش کر لیا ہے؟“

”میں نے آپ کا عرض و سونہ لیا ہے۔“
”اچھا۔“ خج ملابھ کا ایک آگے جھک گئے اور میز کے کنارے کو انہوں نے زور سے جھکایا۔ ”کہاں ہے میرا گھر؟“
”ایک چھوٹا سا شہر ہے کچھ ایسا زیادہ معروف نہیں۔ یہاں سے بہت دور ہے۔“
”اور میری ماں؟“
بشیر احمد نے دفعتاً زور سے سانس لی اور گردن جھکا کر دم آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے۔ خج صاحب! آپ کی ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“
خج ملابھ کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آواز نکلی جو

و اس میں بھی۔ آیا وہ محض ایک سسکی تھی یا انہوں نے کچھ کہا تھا پھر وہ پیچھے سرک کر بیٹھنے لگا اور کچھ اس طرح بھیر احمد کی طرف دیکھنے لگے جیسے دور میں غلامیں دیکھ رہے ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھالنے میں انہیں کافی مشقت لگ گئی پھر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور آہستہ سے کہا۔ "اور میری بہن؟"

"وہ اب وہاں نہیں رہتی۔" بشیر احمد نے جواب دیا۔ "اپنی حق کے نتیجے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی دس بارہ سال ہوئے جب آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت آپ کی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد آپ کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ نہ صرف مکان بلکہ شہری چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر کی بے باعث آپ کی بہن کی شادی ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی تھی جس کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔"

چند لمبے چپ رہ کر شیخ طاہر نے پوچھا۔ "اور زینت کے بارے میں آپ نے کیا معلوم کیا؟"

"شیخ صاحب، زینت کی تلاش کچھ آسان بات نہیں۔ اب اس بات کو چوتیس سال گزر گئے ہیں جب وہ چھوٹے چودھری کے ساتھ گئی تھی۔ میں چھوٹے چودھری کی زمینوں پر گیا تھا۔ بڑی چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوا کہ زینت کوئی پانچ سال چھوٹے چودھری کے پاس رہی تھی پھر وہاں سے چلی گئی۔ خود کوئی یاد چودھری نے اسے نکال دیا۔ یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا۔ اس باب میں مختلف لوگوں کے مختلف بیان تھے مگر ایک بات طے ہے کہ وہ اس شہر میں نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس دوران اس کی چائنی اور بڑی آپا بھائی سے نکلتی اور چلی گئی تھیں چنانچہ زینت بھی کہیں اور چلی گئی۔" بشیر احمد یکا یک رکا، غور سے شیخ طاہر کو دیکھا پھر نرم لہجے میں اس نے پوچھا۔ "شیخ صاحب! آپ کی ماں اور بہن کی بات تو خیر ٹھیک ہے لیکن آپ زینت کو کیوں تلاش کرنا چاہتے ہیں؟"

شیخ طاہر اٹھ کھڑے ہوئے اور سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ ان کی ایک ایک حرکت سے عیاں تھا کہ ان کے دل و دماغ میں ایک الجھن سی پٹی ہوئی ہے۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں ہر قسم کا ہرجا۔

"بشیر احمد! وہ کبہ رہے تھے۔" اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ کو میرے دل میں جھانکنا ہوگا، میرے احساسات کو پرکھنا ہوگا میرے دکھ اور اس کے رد عمل کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو میرے آئیں۔ تیس سال تک

احساس کی سولی پر مضبوط رہا ہوں۔ ہر آدمی شاید نہ سمجھ سکے۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس کے سامنے میں نے اپنے چہرے کے کئی خواب اٹھائے ہیں پھر ہوگا کہ میں پوری کہانی ہی آپ کو بتا دوں۔ اس طرح غالباً آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔" شیخ صاحب جھپٹے رہے اور کہتے رہے اور ان کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آواز کمرے کے غیر روشن، نیم تاریک ماحول میں اس طرح گونجتی رہی جیسے کسی گہرے کوئیل سے آری ہو۔ ان کی آواز ایک تصویر بن رہی تھی جو دھندلی لیکن دھیرے دھیرے واضح ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے دائرے اور خطوط ابھر رہے تھے۔ ایک ویران یں سڑک پر ایک اجاڑ سا گودام ہے جس کی چھت گر چکی تھی۔ گودام سے کچھ فاصلے پر ایک گلی ہے۔ گلی کے اندر کہیں ایک مسجد ہے جس کا صرف ایک جنا نظر آ رہا ہے۔ جو بہت بلند ہے۔ گودام کے کھلے درمیان ایک سات سالہ لڑکا ربر کی کینڈ سے کھیل رہا تھا۔ بھی ایک آدمی یکا یک وہاں آتا ہے۔ وہ لڑکے سے کچھ باتیں کرتا ہے پھر لڑکے کو کچھ ٹافیاں دیتا ہے اور اسے سائیکل پر بٹھا کر سیر کروانے کی پیشکش کرتا ہے۔ لڑکے کے انداز سے تو جھجک کا اظہار ہو رہا ہے مگر وہ سائیکل پر بیٹھ جاتا ہے اور سائیکل ایک جانب روانہ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک منظر ہے جو دھیرے دھیرے بن رہا ہے پھر معدوم ہو جاتا ہے۔ اب شیخ طاہر کے الفاظ۔

"منظر بن رہا ہے۔ ایک اجاڑ سا گھر ہے۔ گھر کے ارد گرد ہمارے بچوں سے اسے ہوئے میدان ہیں یا گھر کہیں کہیں کھیت ہیں، آبادی کوئی نہیں، گاؤں وہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اس گھر میں اس لڑکے کے علاوہ دوسرے ہیں۔ بادشاہ اور کنن اور ایک عورت سے رہتال، دو بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور بھی ہیں۔ جو مختلف مقامات سے بہکا کر یا اٹھا کر کے لائے گئے ہیں۔ دراصل بادشاہ، کنن اور رہتال کا پیش پیر ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کو اٹھا لاتے ہیں۔ ان کو طرح طرح سے اذیت پہنچاتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو ان میں وہ ایک جسمانی عیب پیدا کر دیتے ہیں اور پھر ان سے بھیک منگواتے ہیں یا چوری کرواتے ہیں۔ اگر لڑکی ہو تو اسے تیرہ چودہ سال کی عمر تک حفاظت سے پالتے ہیں اور پھر کسی بد قسمتی قسم کے زمین دار کے ہاتھ چل دیتے ہیں۔ نیا آنے والا لڑکا جو بٹو کے سوا اور کوئی نہیں تھا بہت خوف زدہ تھا۔ وہ روتا ہے اور کئی بار مجھے بھی کی کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اس طرح طرح سے زرد وک بک کیا جاتا ہے، اڑتیں دی جاتی ہیں اور یہ اس مار پیٹ اور خوف و ہشت کا

احساس

ی نتیجہ ہے کہ اس کی یادداشت تھوڑی ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے ضمیر کا نام پتا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بچپن کے سارے منظر اس کی یادداشت میں دھندلے ہو جاتے ہیں۔ اسی خوف و ہراس اور کرب و اذیت کے عالم میں چار سال گزر جاتے ہیں۔ یہ دوسرا منظر تھا۔ اب تیسرا منظر شروع ہوتا ہے جو چھوٹے چھوٹے کئی کلاؤں میں ہے۔ شیخ طاہر کمرے میں کھل رہے ہیں اور ان کی آواز اگلے مناظر کو بیان کر رہی ہے۔

"میں کی لاش کا منظر پھر بٹو کے قرار ہونے کا منظر پھر اس کا مال گاڑی میں سوار ہونا، اب وہ بڑے شہر میں پہنچ گیا ہے اور سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکا پھر رہا ہے پھر بازار حسن میں بھوکا بھار سا دھند دکان کے چپے پر نیم کھنی کی حالت میں پڑا ہے اور زینت اس سے پوچھ رہی ہے۔

"اے کون ہو، کیا نام ہے تمہارا؟"

شیخ طاہر یکا یک چپ ہو گئے اور یکا یک کمرے میں اتنا گہرا سکوت چھا گیا کہ اگر سوئی بجی گئی تو اس کی آواز سی جاسکتی تھی پھر شیخ طاہر اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور خالی غالی نظروں سے میری رخ کو گھومنے لگے۔ دونوں خاموش تھے اور گزرتے گھنٹوں کی نامی چاپ کو سن رہے تھے۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں گزری پھر آخر کار شیخ طاہر نے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھیں خشک کیں اور بھی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔

"بشیر صاحب! یہ ہے پوری کہانی اور یہ ایسی کہانی ہے کہ آپ نے شاید پہلے نہ سنی ہو۔ اس سے آپ میرے احساسات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ماں اور بہن کی طرح زینت بھی میرے لیے ایک ناگزیر حیثیت رکھتی ہے حالانکہ خود مجھے نہیں معلوم کہ اگر زینت مل جائے تو میں کیا کروں گا لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ ایک بار وہ مجھ مل جائے۔ جب وہ چھوٹے چودھری کے ساتھ گئی تھی تو میں لاشوری طور پر ہر وقت اس کا منتظر رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چھوٹے چودھری کے ہاں سے ایک دن وہ ضرور واپس آئے گی۔ اسی لیے میں کئی بار اس بازار میں بھی گیا مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا حتیٰ کہ چھ سال گزر گئے۔ زینت کی بڑی آپا اور چائنی اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلی گئیں پھر میں ایک بار چھوٹے چودھری کی زمینوں پر گیا مگر جیسا کہ آپ نے بیان کیا، زینت اس وقت وہاں سے جا چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع سے اپنی بہن، ماں اور زینت کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی۔ اخباروں میں اشتہارات بھی دیے مگر

کوئی کامیابی نہیں ہوئی پھر میں نے چاہا کہ انہیں بھول جاؤں اور میر کرلوں تاہم یہ بھی ناممکن ثابت ہوا۔ مجھے ماں، بہن اور زینت کے تصور سے کبھی چھٹکارا نہیں سکا۔ ان تمام برسوں میں، میں انہیں یاد کرتا رہا ہوں اور انہیں پانے کی قتا کرتا رہا ہوں لیکن کبھی میں نہیں آتا تھا کہ میں انہیں کہاں اور کیسے تلاش کروں۔ پھر ایک دن اتفاق سے صدور الدین صاحب نے آپ کا ذکر کیا اب مجھے خیال آیا کہ شاید آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں۔"

بشیر احمد نے بیانی اٹھائی اور غصہ کی چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر بولا۔ "مجھے آپ کی اس اذیت ناک اور دکھ بھری کہانی کا کوئی علم نہیں تھا لیکن یقیناً مائے، آج میں نے یہ کہانی سنی ہے تو میرے دل میں آپ کی عزت کھٹی نہیں اور بڑھتی ہے۔"

شیخ طاہر کے ہونٹوں پر ایک جھلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بشیر صاحب! وہ سہ ماہی کے کہنے لگے۔" یقیناً یہ باتیں آپ کو عجیب سی لگتی ہیں مگر صورت یہ ہے کہ اب میں چالیس برس کا ہو چکا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔ چائنی و حیدہ بیگم بھی دن رات اصرار کرتی ہیں اور میں خود بھی چاہتا ہوں کہ شادی کروں۔ میرے ارد گرد اعلیٰ تعلیم یافتہ خوب صورت اور دولت مند عورتوں کا ایک ہجوم موجود ہے اور میں جس سے بھی چاہوں شادی کر سکتا ہوں لیکن ان میں سے کسی کو بھی جب میں اپنے تصور میں بیوی کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو فوراً زینت یاد آ جاتی ہے۔ ایک عداوت سی گھیر لیتی ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نہ صرف زینت کے ساتھ جگہ اپنے ساتھ بھی دھوکا کر رہا ہوں۔ کوہ بات عجیب ہے، مگر میں کیا کروں اپنے احساس کے حصار سے لگتا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار۔۔۔ ماں صرف ایک بار زینت مجھ مل جائے تو شاید مجھے اس غلطی سے نجات مل جائے اور شاید میں اس قابل ہو سکوں کہ کوئی فیصلہ کر سکوں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔۔۔ شیخ صاحب! میں سمجھتا ہوں۔" بشیر احمد نے سر ہلا کر کہا۔ "میرا مقصد تو صرف یہ تھا کہ اگر آپ اس ارادے کو اپنی تک ملتی کیوں تو نہ زیادہ بہتر ہوگا۔ اگرچہ اس سارے قصے سے میرے اور آپ کے علاوہ کوئی بھی واقف نہیں لیکن فرض کیجیے۔

"میں فرض نہیں کر سکتا۔" شیخ طاہر نے بے حد مضطرب ہو کر کہا۔ "اور نہ ہی مزید انتظار کر سکتا ہوں۔ اگر

آپ نے میرا گھر تلاش کر لیا ہے تو میں فوراً وہاں چلنا چاہتا ہوں۔"

بشیر احمد نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا، چند لمبے لمحے طاہر کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے دکھایا گیا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے۔ دل ہی دل میں شیخ طاہر کو داد دے رہا ہو پھر اس نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اچھی بات ہے شیخ صاحب، اب تو خیر رات ہو چکی ہے ہم کچھ میٹیں گے۔"

"کل نہیں۔" شیخ طاہر اور زیادہ بے چین ہو کر بولے۔ "میں صرف آج پر چین رکھتا ہوں لہذا ہم آج ہی میٹیں گے، ابھی اور اسی وقت۔"

دس منٹ بعد شیخ طاہر کی لمبی سیاہ کار تنگے سے باہر نکل گئے وہ خود ہی چلا رہے تھے۔ بشیر احمد ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کار دائیں طرف مڑی اور رات کے اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت بائیں جانب، تنگے سے کوئی تین فٹ کے فاصلے پر ایسا تھوڑا ایک کھٹے درخت کی آڑ سے ایک شخص نکلا اور لپک کر سرخ رنگ کی ایک پرانی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ دوسرے لمبے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور شیخ طاہر کی کار کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆☆

وہ ایک قدیم طرز کا بازار تھا۔ گھوڑی اینٹوں والی سڑک دونوں طرف خستہ حال دکائی دیتی تھی، کچن ریزے اور کھوکھے شیخ طاہر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے، ہراساں، تجسس، مضطرب، کشمکش میں مبتلا۔ یہ کیا ہے، یہ سب کیا ہے؟ یہ دکانیں، یہ آتے جاتے لوگ، کھٹے درخت اور ٹھونپے والوں کی آوازیں، کیا وہ اس پورے منظر کو چمکاتے ہیں؟ کیا وہ بھی اس بازار سے گزر رہے ہیں؟ ہاں شاید گزر رہے ہیں۔ یہ منظر کچھ شام سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ چیمپوں کا بازار لگتا ہے کہ پہلے دیکھا ہے۔ اس کے بعد ایک پرانا مندر ہوگا جو ہمیشہ بند رہتا تھا، کچھ دکانیں جو جاباٹ کے لیے کوئی نہیں آتا تھا۔ پھر آگے جا کر یہ سڑک ایک جگہ ختم ہوگی جہاں برگلہ کا ایک پرانا اور گھٹا درخت ہوگا۔ شیخ طاہر سوچتے رہے اور آگے قدم بڑھاتے رہے۔ پھر سڑک ختم ہوئی اور ایک ایک برگلہ کا درخت سامنے آ گیا۔

"اب کیا کریں؟" شدید مضطرب اور بد مزاج کے عالم میں شیخ طاہر نے سوچا، دائیں طرف میٹیں یا بائیں

طرف میٹیں؟ نہیں نہیں، دائیں طرف ہی چلنا چاہیے۔ یہ سڑک کچھ ناخوشی لگتی ہے۔ شاید اس طرف ایک پرانا سما گھر ہوگا اور پھر کافی آگے جا کر وہ گودام آنا چاہیے، جہاں میں کینے سے کھل رہا تھا۔ بشرطیکہ وہ اب بھی موجود ہو۔ شیخ طاہر نے دل ہی دل میں یہ کیا اور پھر آگے بڑھے۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جو قریب ترین بڑے شہر سے کوئی ستر میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ شیخ طاہر کو اس شہر تک پہنچنے کے لیے ساری رات سڑک نہ پڑا تھا۔ اگر راستے میں بیڑول فیم نہ نہ تو اور کچھ جگہ میں حد درجہ خراب نہ ہوتی تو وہ کچھ مسرت بھی نہ ہوتی۔ کچھ گھر کے ہوتے گھر نہ ہوتے دھارویں کی بنا پر انہیں شہر تک پہنچنے پہنچنے میں ساڑھے دس بج گئے تھے۔ بشیر احمد انہیں خود ان کے گھر تک لے جانا چاہتا تھا مگر شیخ طاہر نے منہ نہ کھولا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنا راستہ خود تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ بشیر احمد ان کے احساسات کو بخوبی سمجھتا تھا لہذا اس نے اصرار نہیں کیا۔

لاریوں کے اڈے کے پاس ہی گھر گیا۔ البتہ اس نے یہ تاکید ضرور کر دی تھی کہ اگر شیخ طاہر کو ذرا بھی دھاری ہو تو وہ فوراً اس کے پاس واپس آ جائیں۔

شیخ طاہر آگے بڑھتے گئے۔ ان کا ایک ایک قدم کچھ اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے وہ خواب میں چل رہے ہوں مگر ان کی یادداشت دھیرے دھیرے لوٹ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس سڑک کے مختلف حصوں کو پہچان رہے تھے۔ کچھ آگے بڑھے تو وہ سنیا آ گیا۔ اس کی عمارت ابھی تک پہلے ہی کی طرح خستہ حالت میں تھی اور اس میں کوئی پرانی رقم دکھائی جا رہی تھی۔ سنیا کو کچھ کچھ شیخ طاہر کو ایک عجیب سی طمانیت اور مسرت محسوس ہوئی۔ اس پہلے کی طرح جو امتحان میں پہلی بار کامیاب ہوا ہو۔ وہ چند سیکنڈ سنیا کی عمارت کو دیکھتے رہے، پھر انہوں نے قدم آگے بڑھایا۔ کوئی ایک فرلانگ آگے جا کر ایک پرانا نکلا تھا۔ اس کی جگہ کے قریب ایک بوڑھا خستہ حال فقیر بیٹھا تھا۔ شیخ طاہر نے اسے مہربان آہٹیں نکالیں۔ اس کی ایک آنکھ غالباً کسی بیماری کے سبب ختم ہو گئی تھی۔ بدن پر کئی زخم تھے۔ وہ ایک بوسیدہ اور انتہائی کندی گدڑی اوڑھے ہوئے تھا۔ شیخ طاہر کو توجہ پا کر اچانک اس نے حقارتاً ہی بولی آواز میں کہا۔

"باپو، اللہ کے نام پر کچھ دے دو، کل سے ہوگا

ہوں۔"

شیخ طاہر نے ایک روپیہ نکال کر اس کے پیچھے ہوئے

احساسات

دعوت زدہ ہاتھ پر رکھا اور آگے بڑھ گئے۔

مگر ابھی وہ دس قدم ہی گئے تھے کہ ایک ایک اس طرح رک گئے جیسے زمین نے ان کے قدم پکڑ لیے ہوں۔ ان کے اعصاب میں ایک شدید سسٹناہٹ سی ہوئی، دل زور سے دھڑکا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، شاید انہیں دھوکا ہوا ہے، مگر کیوں نہیں ہو سکتا۔ زندگی اتفاقات سے بھری پڑی ہے اور ان کی زندگی میں تو یوں بھی بے شمار اتفاقات ہوتے رہے ہیں۔ عجیب و غریب، ناقابل فہم، تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے۔ شیخ طاہر نے دھیرے دھیرے قدم اٹھائے اور فقیر کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ فقیر انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔

شیخ طاہر اس کے سامنے اٹکڑا بیٹھ گئے۔ بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ "تم۔ تم۔ تم کون ہو؟"

فقیر نے چونک کر شیخ طاہر کو دیکھا، پھر اٹھتے ہوئے لہجہ میں بولا۔ "تم کون ہو باپو؟"

"میری بات کا جواب دو، تمہارا نام کون ہے؟"

"باپو میں کون ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

فقیر سر ہلا کر کہنے لگا۔ "اب تو میں اپنا فقیر ہوں۔ سب کچھ چلا گیا، کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اب یہاں پڑا رہتا ہوں۔ کچھ مل جاتا ہے تو کھا لیتا ہوں۔ ایک دن مر جاؤں گا، مگر کون ہو، تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

شیخ طاہر اسے غرت انگیز اور کینہ توڑ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تو یہ ہے اس شخص کا انجام، جس نے مجھے میری ماں سے محروم کیا تھا جس نے مجھ پر ان گنت ظلم توڑے تھے، قاتل کر کے تھے اور اذیتیں دی ہیں اور یہ سارے ستم صرف مجھ پر ہی نہیں اور مجھ سمیت بچوں پر کیے تھے۔ کیسی الکڑھی اس کی گردن میں اور کیسا گھمٹا تھا اس کی آواز میں گراہ بھری بھی باقی نہیں رہا۔ سب کچھ مٹ گیا۔ اب یہ ایک تصویر جھرت ہے، ایک عذاب ہے، ایک سزا ہے، ایک گالی ہے۔ وقت بھی کسی کو معاف نہیں کرتا، مگر کون کر ایک ایک گناہ کا حساب لے لیتا ہے۔ اب یہ شخص جب تک ہے، اسے جرموں کی سزا کے طور پر ہے۔ شیخ طاہر کو لڑتے کے ساتھ ساتھ ایک بے نام سزا تم بھی محسوس ہوا۔ انہوں نے دھیرے سے سانس لے کر کہا۔

"اور بادشاہ اور تھان کہاں ہیں؟"

کچھ انہیں بھی

جانتے ہو۔"

"ہاں۔"

کچھ چہرے چپ رہا اور اپنی واحد دھندلائی ہوئی آنکھ سے شیخ طاہر کو دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔ "دونوں سر گئے باپو، دونوں سر گئے۔ رختاں کو بادشاہ نے قتل کر دیا تھا۔ اسے عرقید ہوئی، لیکن وہ جیل سے واپس نہیں آیا، وہیں مر گیا۔ اس کی لاش پر کوئی روٹنے والا بھی نہیں تھا۔ میری لاش پر بھی کوئی نہیں روٹے گا، مگر تم کون ہو، بتاتے کیوں نہیں، مجھے کیسے جانتے ہو؟"

اس سے شیخ طاہر کے احساسات کچھ ناقابل بیان سے تھے۔ کچھ نہیں آ رہا تھا کیا کہیں، کیا کریں۔ کچھ ان کے رگ و پے میں ایک آتشیں لمبی آگنی۔ نفرت، عداوت اور انتقام کے زہر سے بھری ہوئی، کچھ انہیں ترس آتا۔ وقت نے پہلے ہی کچھ بہت سزا دے دی تھی۔ انہوں نے قدرے تو وقت کے بعد کہا۔ "تمہیں یاد ہے کچھ؟ ایک دن تم نشے میں تھے۔ جب تمہارے سر پر ایک لڑکے نے سلاخ سے وار کیا تھا اور تم۔"

کچھ لپکا لپکا بولا۔ "تو۔ تو کیا تم بشو ہو؟"

شیخ طاہر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں تو کبھی تھا کہ اس دن تم میرے تھے۔"

"سری کیا ہوتا باپو تو اچھا تھا، تیرا اور جیتا، نہ اور زیادہ گناہ کرتا اور نہ ہی سزا ملتی۔"

شیخ طاہر چھٹانے چپ رہے، پھر انہوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے کچھ ان کو کچھ تم نے مجھ پر بہت ظلم کیے تھے، لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں اور خدا سے دعا کروں گا کہ وہ بھی تمہیں معاف کر دے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ عجیب دن تھا۔ ایسا کہ ایسے دن بہت کم لوگوں کی زندگی میں آتے ہیں۔ پانچ تین قسمت کی دیوی ان پر مہربان تھی، یا تا مہربان، ان کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی یا تنک چھڑک رہی تھی۔ اس دن قسمت کی دیوی نے شاید طے کر لیا تھا کہ سارے پردے اٹھا دے کی اور کوئی بھی راز باقی نہیں رہے گا۔ جب شیخ طاہر آگے گئے تو انہیں اپنی گلی ملی۔ البتہ گودام نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک عمارت بن گئی تھی۔ شیخ طاہر دیوانوں کی طرح اپنی گلی میں گھومتے رہے۔ اپنے گھر کو باہر سے دیکھا جہاں اب جان کا درخت نہیں تھا اور مکان میں کچھ تبدیلیاں بھی ہو گئی تھیں۔ پھر انہوں نے مسجد دیکھی۔ اس کا خوب صورت مینار اسی طرح پر شکوہ انداز میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ پانچوں دروازے بھی موجود تھے اور درمیانی دروازے کے اوپر سورۃ الرحمن بھی نقش تھی۔

سر نہ کھجائیں! Healthy ہو جائیں! ۰۰

English



5 خف میں جوڑیں اور لیکسوں سے مکمل نجات

”ہم سب کی زندگی ایک ایسی ناؤ کی طرح رہی ہے نازیہ، جو اتفاقات کے شوریدہ ہر سمندر میں تین تندرلوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ میں زینت کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرا کوئی بھی سہارا نہیں تھا۔ اس وقت زینت نے میری طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا۔ بعد میں وہ مجھ سے بچھڑ گئی، جسے میں تم سے اور ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ پھر برسوں گزر گئے مگر اس کا کوئی پتا نہیں ملا اور اب اتنی مدت کے بعد۔“

”زینت نے بھی بڑے غم اٹھائے ہیں۔ بس ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔“ نازیہ کہنے لگی۔ ”بہت تیار ہے وہ بچے کی کوئی امید نہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔“

”شیخ طاہر کی آنکھوں سے آنسو چمک پڑے۔ مجھے معلوم ہے۔“ شیر احمد نے بتایا تھا، کہاں ہے وہ؟“ ”اس کمرے میں، آؤ میں تمہیں لے چلوں۔“ نازیہ نے ایک بگلی دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ”نہیں، نہیں، میں خود ہی جاتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر بعد آ جا۔“

”اچھا، تو میں تمہارے لیے چائے بناؤں؟“ نازیہ نے پوچھا۔

”ضرور۔ ضرور۔“ شیخ طاہر نے کہا۔ ”آج پہلی بار تمہارے ہاتھ کی بتی ہوئی چائے پیوں گا۔“

نازیہ نے کھن میں چلی گئی۔ شیخ طاہر نے ارد گرد دیکھا۔ خستہ حال دیواروں اور کچریں کی، جالوں سے بھری چھت کو دیکھا۔ وہ مکان کہاں تھا، ایک آسیب زدہ کنڈر سائلنگ تھا۔ اس مکان کی ہر شے زبان حال سے مجبور اور تنگ دستی کی کہانیاں کہہ رہی تھی۔ شیخ طاہر کچھ دیر کھڑے رہے اور اپنے دل کو سنبھالتے رہے۔ پھر مٹی کڑا کر کے قدم اٹھایا، دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ نیم تاریک

دیواروں پر برسوں سے سفیدی نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں جو سامان تھا، وہ بھی بوسیدہ تھا۔ سامنے چھلکی سی چار پائی تھی اور چار پائی پر ایک عورت لیٹی تھی، ایک میلا سا مٹیس اوڑھے ہوئے۔ اس کے خشک بال نیچے پر بکھرے ہوئے تھے اور گودہ جنس بڈیوں کا ایک ڈھانچا سی نظر آرہی تھی اور شیخ طاہر نے اسے پورے چوبیس سال بعد دیکھا تھا پھر بھی کسی دشواری کے بغیر پہچان لیا۔ وہ زینت تھی۔

شیخ طاہر ایک شگفتہ سی کرسی پر چار پائی کے قریب بیٹھ گئے اور زینت کو چمک چمکاتے بغیر دیکھنے لگے۔ زینت کے

سائولے رنگ کی۔ اس کے کال چمکے ہوئے تھے، آنکھوں گرد ملنے تھے، جسم کو یاد یوں کا بچر تھا اور اس کے چہرے پر دکھ درد کی اور بے بسی کی چار کی اور لذت و نامرادی کی ان گنت کہانیاں لکھی ہوئی تھیں، جنہیں پڑھنا شیخ طاہر کے بس کی بات نہیں تھی۔ گودہ بڑے دولت مند تھے، بڑے جاہ و خشم والے اور بہت عزت و توقیر والے تھے لیکن اس لئے انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان سے زیادہ بے مایہ، بے وقعت اور نکال اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

وہ عورت نازیہ تھی، وہ اسے پہچانتے نہ تھے۔ تین سال کی تھی جب وہ اس سے جدا ہوئے تھے مگر خون کی نگار نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ان کی بہن ہی ہے۔ نازیہ کی بھی عجیب حالت تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے جو جس کم ہو گیا ہے مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اب وہ اتنا بڑا آدمی بن چکا ہے۔ نہ ہی اسے بھی پتہ تھا کہ یہ مکان ہوا تھا کہ وہ بھائی یوں اچانک مل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کا ایک شیخ طاہر کو اپنے سامنے پا کر بے حد حیرت ہو گئی تھی۔

یہی اس کا بدن ایک دم ساکت ہو جاتا اور بھی یوں۔۔۔

”تھرر! لکھا، جیسے دوسرے لئے وہ گر پڑے کی۔ دونوں بچہ جی خطرے رہے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور لمبے گزرتے گئے۔ جانے کئی دیر گزرنی، شاید صدیاں رست گئیں پھر شیخ طاہر نے ہاتھ بڑھایا، نازیہ آگے بڑھی اور شیخ طاہر کے سینے سے لگ گئی اور پھر دونوں بہن بھائی رونے لگے۔

بہت دیر بعد شیخ طاہر نے کہا۔ ”نازیہ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا تھا۔“ وہ رکے پھر بولے۔ ”اور ماں اور زینت کو بھی۔“

”ماں کا تو اشتغال ہو گیا۔“ نازیہ نے ہنسیوں کے درمیان کہا۔

”ہاں، شیر احمد نے بتایا تھا۔“

”بھیا! میں نے بہت دکھ اٹھائے تھیں۔ ہم دونوں نے، زینت اور میں نے۔ زندگی حرام ہو گئی تھی ہم دونوں پر۔“ نازیہ رو کر بولی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ شیخ طاہر نے محبت سے نازیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”مگر ابھی کچھ نہ کہو۔ ابھی تو میں تمہیں ہی پھر گردن دیکھنا چاہتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد نازیہ نے پوچھا۔ ”اور بھیا، تم زینت کو کیسے جانتے ہو؟“

”شیخ طاہر نے خفشی سانس بھر کر کہا۔

بہت ارمان تھا۔ "زینت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر ایک جھنجھکی مگر حسرت آمیز مسکراہٹ تھی۔ "مکروہی کہیں نہیں، جیسی اس بازار والیاں آئے دن بنا کرتی ہیں۔ یا جیسی کہیں مجھے چھوٹے چودھری نے بنایا تھا بلکہ جگجگ کی دہان۔ ویسی ہی جیسی چادر اور چار دیواری والی شریف عورتیں بنتی ہیں۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں؟ ہاتھوں میں مہندی رہتی ہو، ڈھیر ساری چوڑیاں زیور، بنگا، جھنگے اور سرخ جوڑا۔ اور باقاعدہ میرا نکاح ہو، مگر بٹوا کتنے دکھ کی بات ہے، میری یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔"

زینت بھر دینے لگی۔

فتح طاہر ہونٹ پر ہونٹ بھانے خاموش بیٹھے تھے اور کچھ عجیب، حسرت اور دکھ سے زینت کو دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے زینت کے آنسو پونچھے، اس کا ہاتھ چھو چھوایا پھر آہستہ سے کہا۔ "زینت، تم آرام سے لیٹی رہو، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ اللہ کر بھاری قدموں سے باہر آئے۔ صحن میں تازیہ اور شیر اُچھ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ فتح طاہر نے شیر اُچھ سے کہا۔ "شیر صاحب، آپ کسی طرح سے فوراً پیغام بھجوایئے اور چائیا، فریڈ سے اور صدر الدین کو یہاں بلائیے، بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ خود جا کر انہیں لے آئیں۔"

☆ ☆ ☆

رات خوب صورت، برہنہ سکون اور پرفسوں تھی۔ آسمان پر پورا چاند تھا جسے دہکن کے ستارے پر تنگ کا ہوا جھومر اور اس کنارے سے اس کنارے تک ستاروں کی برسات تھی کی جیسے دہکن کی پیشانی پر چٹکی ہوئی افشانی۔ ہر سوانوشی کا طقس طاری تھا۔ آبادیوں پر، دیواروں پر ہوائیوں چپکے چپکے ٹوخروم تھی جیسے سہاگ رات کی کچھ دیواروں پر دہکن شرماء کر بولے سے اگڑائی نکلتی ہے۔ اس رات زمین، آسمان، چاند اور ستارے، سب کے سب ایک خوب صورت، دہکنی خواب کا حصہ بن گئے تھے۔ کیونکہ اس رات، زینت دہکن تھی۔ سر سے لے کر پاؤں تک، اس کے بدن کا پورا پورا اور انگ ایک مریض تھا۔ اس کی پیشانی پر دھنکا ہوا جھومر تھا، کانوں میں طلائی جھنگے اور گلے میں ہنٹ لڑکی ہار کے ساتھ مٹھن گوبند۔ اور اس کی نگاہیں چوڑیوں سے اور کڑوں سے بھری ہوئی تھیں اور پاؤں میں پانچ پانچ تھی اور ہاتھوں اور جڑوں میں مہندی رہتی ہوئی تھی، سرخ، لچکتے، شعلہ فروزاں کی طرح اور اس کے بدن پر لپٹا ہی عریض تھا، سنہری اور طلائی کام اور موتیوں سے مزین۔ ستارنگ اور مریض۔ اور اس کی

فتح طاہر نے سوچا، زینت کو چپ کرائیں، اسے تسلی دیں مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ سوچ کر کہ۔ "زینت کو رونے دیں، اپنا دکھ بیان کرنے دیں۔ دل کا غبار نکل جائے گا تو اس کی طبیعت، بہتر ہو جائے گی، چنانچہ وہ چپ رہے اور زینت روتی رہی اور رو رو کر کہتی گئی۔ "بٹوا میرے ماں باپ میرے بچپن میں مر گئے تھے۔ چائیا نے مجھے پالا تھا، اس بازار میں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس بازار سے اور وہاں کی ہر شے سے، ہر بات سے نفرت تھی۔ میں سوچتی تھی کہ جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو اس ماجمل سے نکل جاؤں گی۔ کسی ایسے سے آدمی کا ہاتھ پکڑ لوں گی اور شریعت نہ کرے گی۔ زینت کی کسی بھونپڑی میں ہی کیوں نہ کر رہے، لیکن میں خوش رہوں گی۔ کم از کم اگر تو ہوگا، اپنی چادر، اپنی چار دیواری مگر قسمت نے میرے ساتھ بڑی دغا کی بٹوا۔ ابھی میں نے اچھی طرح ہوش بھی نہیں سمجھا تھا کہ چائیا اور بڑی آپا نے مجھے چھوٹے چودھری کے ہاتھ بیچ دیا۔ پانچ سال اس جمل میں گزارے، جو چھوٹے چودھری کی حوصلہ کیلائی تھی۔ پھر اس نے مجھے نکال دیا۔ اب اتنی بڑی دنیا تھی اور ایک ایلی میں۔ کیا کرتی، کس کا سہارا، حوصلہ نہ تھی۔ پہلے میں نے سوچا، بڑی آپا کے پاس واپس چلی جاؤں مگر یہ اچھا نہیں لگا۔ دوسرے بھی وہ لوگ وہاں سے جانچتے تھے پھر میں ادھر ادھر پھرتی گئی۔ تنہا، بے آسرا اور اہلہ۔ اب بھی یہ خواہش تھی کہ اس بازار میں واپس نہ جانا پڑے مگر شاید یہ میرے نصیب میں ہی نہ تھا، جو بھی مجھے ملا اور جس پر بھی میں نے بھروسہ کیا، وہی دھوکا دے گیا۔ زندگی بونہی عروسی، خوف اور بے کسی کے عالم میں گزری۔ پھر بنیادی نے مجھے بھگایا۔ بٹوا میرے پاس تو پھونکی کوڑی بھی نہ تھی لیکن یہ جو تازیہ ہے، نا، بے چاری بڑی اچھی عورت ہے، شاید اس لیے کہ میری ہی طرح بد نصیب ہے۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا۔ بے چاری بیڑیاں بناتی ہے، کپڑے سکتی ہے اور میرا علاج کرانی ہے مگر کوئی قاعدہ نہیں، اب وقت پورا ہو چکا ہے۔ بس گھڑیاں گن رہی ہوں۔ دو چار دن اور ہیں۔ پھر نہ میں ہوں گی، نہ دکھ ہوں گے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے زینت کا لہجہ حد درجہ استہزائی اور طنزیہ ہو گیا۔ جیسے وہ خود اپنے آپ پر طنز کر رہی ہو۔ پھر وہ رونے لگی۔ فتح طاہر چپ چاپ بیٹھے رہے اور بولے بولے زینت کا ہاتھ چھتے رہے۔ پھر زینت کہنے لگی۔ "ایک بات بتاؤں بٹوا؟" وہ پھر دیر سانس لینے کے لیے کہی۔ "پتا نہیں کیوں۔ لڑکپن ہی سے مجھے دہکن پسنے کا

فرق پڑے گا۔ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا ہے۔ بس کچھ ہی سانس باقی رہ گئی ہیں۔ شاید چند دن اور جیوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ "مکرم تو اچھے ہو؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہی ہوں۔" فتح طاہر بڑی محبت سے کہنے لگے۔ "اور زینت، تم بالکل ٹھیک نہ کرو۔ میں تمہیں لے چلوں گا۔ کراچی، لاہور یا لندن میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی زینت، تم اچھی ہو جاؤ گی۔" زینت کی دیر ان آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "ایسے محبت بھرے بولوں کے لیے میں بہت تری ہوں بٹوا۔" فتح طاہر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے۔ "روڈ نہیں زینت! حوصلہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر انہوں نے سوچا کہ اسے تازیہ کے بارے میں بتائیں لیکن ارادہ بدل دیا۔

کبھی ایسا نہ ہو کہ زینت کے لیے یہ انکشاف کچھ زیادہ بھاری ثابت ہو۔ انہوں نے طے کیا کہ مناسب وقت آنے پر اسے یہ بات بتائیں گے۔ چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔ "زینت! یاد ہے نہیں، میں تمہارے پان میں چار چارالہ بچیاں ڈال کرتا تھا؟" زینت کے ہونٹوں پر ایک جھنجھکی، پھر وہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہاں یاد ہے۔" "اور کیا نہیں یہ بھی یاد ہے کہ کتنے برس گزر گئے ہیں، ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے؟" فتح طاہر نے زینت کو محبت سے دیکھا۔ "چھبیس سال، پورے چھبیس سال۔"

زینت نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر لی اور فتح طاہر کی جانب دیکھا۔ اس کی اندر کی جانب دھنکی ہوئی آنکھوں میں کرب بھی تھا، اذیت بھی تھی اور حسرت بھی۔ پھر وہ پکا ایک رونے لگی۔ "اور تم نہیں جانتے بٹوا! ان چوبیس برسوں میں مجھ پر کیا کڑ گئی ہے، کتنی قیامتیں، کیسے ظراب اور سختی آزمائیں۔ زندگی ایک ایسا ناموس بن گئی جس سے ہر وقت سب رتی رتی ہے۔ ایک ایک لمب، ایک ایک سانس بھاری تھی میرا چاہتی تھی، پر موت بھی نہیں آئی تھی۔ تازیہ نہ ہوتی تو جانتے کیا ہوتا۔ بس ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں، ایک دوسرے کی تم گسار ہیں۔ ہم دونوں روتی ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے آنسو پونچھتی ہیں اور پھر روتی ہیں۔ بونہی دو رو کر اسے برس گزر گئے۔"

چہرے پر جھانپاں تھیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے، گال چپکے گئے تھے اور ہونٹوں پر بیڑیاں بھی ہوئی تھیں اور اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ ایک شدید گہرے دکھ اور بچھتاوے نے پکا ایک فتح طاہر کو گھیر لیا۔ خدا یا، یہ کیا ستم ہے؟ کیسی بد نصیبی ہے یہ؟ وہ عورت ہے جو ہمیشہ ان کے تصور میں بٹی رہی، جس کے خیال سے وہ بھی ناقص نہ ہو مگر یہ عورت اب ملی ہے تو اس حالت میں کہ زندگی سے منہ موڑنے والی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کی ساری دولت، شہرت اور عزت لے لی جائے اور اس عورت کو زندگی کے چند سال عطا کر دیے جائیں، آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

معاً زینت کو احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب بیٹھا ہے۔ اس نے گردن موڑ لی اور حیران نظروں سے فتح طاہر کو دیکھنے لگی۔ "آپ۔۔۔ آپ کون ہیں؟" "میں۔" فتح طاہر نے محبت سے نرم لہجے میں کہا۔ "میں بٹوا ہوں زینت! یاد ہے وہ لڑکا جو پان کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔"

زینت کے چہرے پر الجھن کی جھلک نظر آئی۔ قاعدہ نے اس کے ذہن کو دھندلا دیا تھا، اس لیے اسے سوچا پڑا۔ پھر ایک لمحے اس کے چہرے پر حیرت کی ایک لہر سی گئی۔ "تم۔۔۔ تم بٹوا ہو مکرم یہاں کیسے آئے؟" اس کا جسم معاً زور سے لرزا، ساتھ ہی اس نے اپنا سر دائیں بائیں زور زور سے ہلایا۔ فتح طاہر کو نہ صرف افسوس ہوا بلکہ دل بھی لگا، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حیرت کا یہ جھٹکا زینت کے لیے ضرور سناں بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ انہیں زینت کے سامنے آنے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا مگر فکر ہے کہ زینت اس صدمے کو سہہ گئی۔ اس نے چوٹوں میں خود کو سنہال لیا۔ فتح طاہر نے اس کا سیاہ اتھوڑا ہاتھ اپنے۔۔۔ ہاتھ میں لے لیا، پھر دم لہجے میں کہا۔ "زینت میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتا تھا۔"

"اچھا۔" "ہاں۔" انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں کبھی نہیں بھولا اور میں نے تمہیں تلاش بھی بہت کیا تھا۔ برسوں اسی جستجو میں میں گزر گئے، میں چھوٹے چودھری کی زمینوں پر بھی گیا تھا، لیکن تمہارا کوئی پتا نہیں ملا۔ اب اسے برسوں بعد تم ہی ہو۔" "ہاں اب ملی ہوں کہ جب مرنے والی ہوں۔" "نہیں، نہیں ایسا مت کہو۔" زینت نے ایک شیطانی سانس لی۔ "نہ کہوں تو کیا

آنکھوں میں، ان آنکھوں میں جہاں برساتوں، دھکوں اور محرومیوں نے بسیرا کیا تھا۔ اور جو جن دنیا کو سدا کے لیے حوزہ جہاں کر چکی تھیں، انہی آنکھوں میں اس رات ایک چہان رنگ و نور آدھا تھا اور ایسی طمانی تھی ان میں جیسے ان آنکھوں نے زندگی کو بخیر کر لیا ہو۔

زینت نے کہا تھا۔ "تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے بڑا ارمان تھا کہ لیکن ہوں۔ ویسی ہی دیکھیں جس چادر اور چادر یواری والی ایک عیال بنتی ہیں۔"

اس رات قاضی کے سامنے اس نے کہا تھا۔ "ہاں، میں نے قبول کیا۔"

رات کے روشنی کے لیے بیگ رہے تھے۔ چاند نور تھا اور ستارے سوتے جاتے، جاتے سوتے چلیں جھپک رہے تھے۔

نئی جگہ عروسی میں شیخ طاہر کے سامنے بیٹھی ہوئی بنیاد و ناتواں زینت نے آہستہ سے کہا۔ "ابو! اب مجھے اپنے مرنے کا کوئی انکس نہ ہوگا۔"

"انکی باتیں نہیں کرتے۔" شیخ طاہر نے محبت سے فہمائش کی۔

زینت مسکرائی۔ اس نے دم لہجے میں کہا۔ "جانتے ہو یہ رات۔ یہ رات میری زندگی کا حاصل ہے۔"

دوسرے دن اس کی آنکھوں کے سورج ہمیشہ کے لیے تاریک ہو گئے۔

☆☆☆

شیخ طاہر جب واپس ہوئے تو ان کا عجیب حال تھا۔ شکستہ، اجڑے ہوئے، ہراساں اور غمزدہ، ہر شخص کو شک کی نظر سے گھورتے۔ بھی بھی خود اپنے آپ سے بھی انہیں ڈر لگتا۔ اپنے ہاتھوں کو یوں گھومتے جیسے ان کے ہاتھ ہی زینت کی موت کے ذمے دار ہوں۔ گھر میں بیٹے ہوتے تو درد و اوج انہیں تلک و تار یک زندان کی طرح محسوس ہوتے۔ باہر جاتے تو جہم سے وحشت ہونے لگتی۔ بھی بھی شہر سے باہر لگ جاتے اور کھیتوں کے درمیان سناٹا چلنے والوں پر مارے مارے پڑتے۔ پھر کچھ ہی دیر بعد دیرانی اور تنہائی بھی کاٹنے کو دوڑتی۔ انہیں اپنا وجود، اپنی زندگی اور اپنی تمام دولت و عزت باطل فصول، وابہیات، لالچی اور بے قیمت اشیاء محسوس ہوتیں۔ کیا فائدہ ایسی دولت کا جو زینت کی زندگی نہ بچا سکی۔ بھی بھی وہ کسی گداگر کو دیکھتے تو انہیں ایسا لگتا جیسے وہ گداگر ان سے زیادہ دولت مند ہے۔ ان کا یہ غم، یہ بچتا ہوا کچھ ایسا ہے جا بھی نہیں تھا۔

گزشتہ چند دنوں میں دو جن حالات اور اتفاقات سے بے در بے دو جا رہے تھے، انہیں سہارے اور جھیلنے کے لیے پتھر کے بکری ضرورت تھی، جو ان کے پاس نہیں تھا۔ اپنے بچپن کے گھر کا بلانا، ماں کی موت کی خبر، پھر گھر سے ملاقات اور اس کے عبرت ناک حالات، یہ سب قیامیں تھیں جو ان کے دل پر سے گزری تھیں۔ پھر ناز و اور زینت کا ایک ہی جگہ ملنا، ان کی الٹا ناک زندگی کے شب و روز کی درد ناک کہانی۔ وہ دولت نگاہ ہے تھی اور عزت اور مرجہ اور شہرت۔ اور ان کی بہن عزت بی بی تھی۔

خدا یا۔ خدا یا! اب سے زیادہ تم اور کیا ہوگا؟ اس سے زیادہ بد نصیبی اور کیا ہوگی؟ بلکہ شاید بد نصیبی کو بھی ان پر ترس آتا ہوگا۔ شیخ طاہر کو یقین نہ آتا کہ یہ سب کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا۔ ممکن ہے، یہ سب خواب ہو۔ ہاں ہو سکتا ہے۔ بھی بھی خواب ایسے بے شک، ڈراؤنے اور غیر محتمل بھی تو ہوتے ہیں گھر نہیں، اگر یہ سب کچھ خواب ہوتا تو نازیہ اس وقت ان کے شکے میں موجود ہوتی۔ تو کو کیا یہ سب سچ ہے۔

زینت اور نازیہ انہیں ملی تھیں اور انہوں نے زینت سے شادی کی تھی۔ (بچپن سے مجھے بڑا ارمان تھا کہ وہاں ہوں۔)

سچ سچ کی دیکھیں، جیسی چادر اور چادر یواری والی ایک عیال بنتی ہیں) چنانچہ وہ دیکھیں تھی جی اور پھر وہ سمجھنے بعد ان کے سامنے سکون سے مرنے لگی۔

چوبیس سال کی محتاج و جستجو اور انتظار کا حاصل یہ تھا کہ زینت انہیں ملی تھی۔ نہیں ملی تھی۔

شکے میں فریدے، چاہتی اور نازیہ موجود تھیں اور وہ ہر ممکن طریقے سے شیخ طاہر کا دل بھلاتے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ شروع شروع میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ چاہتی، نازیہ اور صدر الدین تو صدر چکر مند ہو گئے تھے کہ انہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مگر پھر شیخ طاہر دھیرے دھیرے سنہلنے لگے۔ اس لیے انہیں کہ ان کے سینے میں سسکی، دکھ اور بچتا دوسے کی آج دم پڑ گئی تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی خود اختیار کردہ ذمے داریوں کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ صدر الدین نے ان سے کہا۔ "ذرا ان لوگوں کا تصور کریں، جنہیں آپ کے سہارے کی ضرورت ہے، ان لوگوں میں پڑنے والے خیم اور غربت بچے، بیوہ عورتیں اور وہ تمام پریشان حال لوگ جو آپ کی امداد کے سہارے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔" شیخ طاہر کو احساس ہوا کہ زندگی کے ان گنت معنی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی بھی اپنے لیے کس دوسروں

کے لیے جیتا ہے۔ انہیں بھی دوسروں کے لیے جیتنا چاہیے چنانچہ انہوں نے رفتہ رفتہ خود کو تنہا لیا اور پہلے کی طرح ایک بار پھر اپنے شب و روز کے معمولات میں واپس لینے لگے۔

کچھ دن گزرے پھر ایک شام پارٹی کے چرل سیکریٹری صاحب تشریف لائے۔ ٹیک سلیک اور ری ٹنگو کے بعد سیکریٹری صاحب نے کہا۔ "آپ نے آج کے اخبارات دیکھے؟"

شیخ طاہر ہولے سے مسکرائے۔ "ہاں دیکھے ہیں۔ آپ لوگ میرے نام کی کچھ زیادہ ہی پکڑی کر رہے ہیں۔"

"یہ ضروری ہے شیخ صاحب۔" چرل سیکریٹری نے کہا۔ "آپ کا نام پارٹی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کی بدولت ہم کم از کم اپنے صوبے میں تو ضرور ایکشن جیت میں گے۔ حال ہی میں ہم نے ایک سروے کیا ہے جس سے صاف پتا چلتا ہے کہ لوگ اس بات سے بے حد خوش ہیں کہ آپ انتخابات کے بعد صوبے کے وزیر بنیں گے۔"

خیر، یہ بات تو آپ لوگ بہت دن سے کہہ رہے ہیں۔ شیخ طاہر ہنس کر بولے۔

"مگر اب اس کے اعلان کا وقت آچکا ہے۔ کل شام پارٹی کی میٹنگ طلب کی گئی ہے جس میں یا سنا بطور پر آپ کی نامزدگی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ یہ عام پبلک میٹنگ نہیں ہے، محض ایک پریس کانفرنس ہے جس میں پارٹی کے عہدے دار، شہر کی کچھ اہم ہستیاں اور اخباری نمائندے شریک ہوں گے۔ آپ کو اس موقع پر ایک مختصر تقریر بھی کرنا ہے جو ہم نے تیار کر لی ہے۔"

"چرل سیکریٹری نے ایک لمحہ رک کر اپنے بیگ سے نکلے گاواں رنگ کے دو سٹے برآمد کیے اور شیخ طاہر کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔ "آپ اسے دیکھ لیں اور مناسب تمہیں تو اس میں کچھ ترمیم و اضافہ بھی کر لیں۔"

شیخ طاہر نے تقریر پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر کہا۔ "کس وقت پڑھنا ہے؟"

"مجھے ہے۔" چرل سیکریٹری نے جواب دیا۔ پھر وہ معاش طرح رک گئے جیسے کسی تذبذب میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے گردن موڑ کر دروازے پر نظر ڈالی جو بند تھا۔ پھر شیخ طاہر کی طرف دیکھا اور جھپکے ہوئے کہا۔ "شیخ صاحب، آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھیے۔" شیخ طاہر نے کہا۔

"چرل سیکریٹری نے جواب دیا۔ پھر وہ معاش طرح رک گئے جیسے کسی تذبذب میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے گردن موڑ کر دروازے پر نظر ڈالی جو بند تھا۔ پھر شیخ طاہر کی طرف دیکھا اور جھپکے ہوئے کہا۔ "شیخ صاحب، آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھیے۔" شیخ طاہر نے کہا۔

"جھپکے کچھ دیکھو۔ آپ کے شکے میں ایک خاتون رو رہی ہیں۔" چرل سیکریٹری نے شرمندگی اور محسوس کے لیے جھپکے انداز میں کہا شروع کیا۔ "میں ان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو بار خاطر نہ ہو۔ گو وہ آپ کی بہن ہیں۔ جیسا کہ آپ نے بتانا تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ پردے میں رہتی ہیں۔ لیکن شیخ صاحب، کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے کس بھیج دیا جائے؟ دیکھیے، آپ مجھے ملنا نہ دیکھے گا۔ میرا مقصد برا نہیں۔"

ایسا میں صرف احتیاط کا کردار ہوں۔"

شیخ طاہر کا ایک کچھ چنگے اور محسوس نظروں سے چرل سیکریٹری کو گھورتے ہوئے بولے۔ "میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت کیجیے، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

چرل سیکریٹری کے ماتھے پر پینا پھوٹ آیا تھا اور وہ خامے حواس پختہ سے نظر آ رہے تھے۔ "بات یہ ہے شیخ صاحب، انہوں نے شک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنا شروع کیا۔ "کہ انتخابات اب زیادہ دور نہیں اور میں اس موقع پر احتیاط کرنا چاہیے۔ خام طور پر اس صورت میں کہ ایکشن کے بعد آپ کو وزیر اعلیٰ بننا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم انہیں ایکشن کے انعقاد تک کھنسا باہر بھیج دیں اور ان کے بارے میں کوئی چرچا نہ ہونے دیں تو یہ ہم سب کے حق میں سودمند ہوگا۔"

"مگر کیوں، آخر ایسی کیا بات ہے؟ وہ تو میری بہن ہے بھی۔" شیخ طاہر اسے حیرت زدہ تھے کہ ان کا چہرہ قہقہہ ہو گیا تھا۔

چرل سیکریٹری نے گھبرائے ہوئے انداز میں توضیحات دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں لیکن لوگوں کا کیا کیا جائے، وہ باتیں بناتے ہیں۔ اب دیکھیے نا، آپ کی بہن یہاں نہیں تھیں تو ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا مگر اب وہ اجاگرت آگئی ہیں تو لوگوں میں جیس پیدا ہو گیا ہے۔ اگرچہ کسی کو ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں معلوم مگر آپ لوگوں کی ذہنیت سے واقف ہیں، خواہ مخواہ بات سے بات لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کل۔"

"لوگ آخر کیا باتیں بنا رہے ہیں؟" شیخ طاہر نے برہم ہو کر پوچھا۔

"اب میں کیا کہوں، بس یوں سمجھ لیں کہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔"

"اور اگر لوگ بدستور باتیں بناتے رہے تو کیا

”شیخ صاحب، مجھے یہ حد افسوس ہے اور شرمندگی بھی کہ یہ باتیں کر رہا ہوں لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ سیاست کس قسم کا مکمل ہے۔ اگر یہ قیاس آرائیاں اور افواہیں اسی طرح اڑتی رہیں تو پوزیشن والے ان کی اور تشہیر کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اس بنا پر یہی مناسب سمجھا گیا اور پارٹی کے صدر کی بھی یہی خواہش ہے کہ انہیں کچھ مدت کے لیے کہیں بھیج دیا جائے اور عام لوگوں کو بتا دیا جائے کہ وہ“

”کہہ میری کوئی نہیں ہے۔ محض غلطی ماننے آئی تھی اور اب جا چکی ہے، یہی بات ہے نا۔؟“ شیخ طاہر کا لہجہ غصے کی شدت سے چل رہا تھا۔

”دیکھیے، اس میں کوئی ہرج نہیں۔ بس کچھ دلوں کی بات ہے۔ اس کے بعد ہم انہیں واپس لے آئیں گے۔“ جنرل سیکریٹری نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”شیخ صاحب! یہ ہم سب کے حق میں بہتر ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اس پر غور کریں گے۔“

شیخ طاہر بدستور حیرت زدہ تھے اور حد درجہ غصے میں بھی اور وہ جنرل سیکریٹری سے ابھی کچھ اور پوچھ کچھ کرنا چاہتے تھے مگر انہیں موقع نہیں ملا۔ جنرل سیکریٹری فوراً ہی چلے گئے کہ انہیں اسی میں اپنی عاقبت نظر آئی تھی۔ شیخ طاہر وہیں بیٹھے رہے۔ ہکا بکا، غصے میں اور ذہنی طور پر منتشر۔ جو کچھ انہوں نے سنا تھا، اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بھلا ایسا کیوں اڑ رہا تھا اور یہ افواہیں کس قسم کی نازیہ تھیں تو ان کی بہن ہے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ یہ شیک ہے کہ انہوں نے زینت اور نازہ کی تلاش، زینت سے شادی اور پھر اس کی موت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کی یہ ظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی مگر انہیں گمان تک نہ تھا کہ لوگ ان کے گھر میں نازیہ کی موجودگی کو لے کر بات کا پتلا بنانا شروع کر دیں گے مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ انہیں اپنی کوئی پروا نہیں مگر اپنی بہن کی رسوائی وہ گوارا نہیں کر سکتے اور اگر اس سلسلے میں کچھ نہ کیا گیا تو اس میں شک نہیں کہ ایوزیشن والے یقیناً کچھ اور کھوکھلے کامیں گے اور تشہیر کریں گے اور یوں نازیہ کی بدنامی ہوگی۔ تو پھر وہ کیا کریں؟ کیا جنرل سیکریٹری کی بات مان لیں اور نازیہ کو کہیں بھیج دیں؟ ایسا کرنے سے بے شک پارٹی کو اور خود ان کی ذات کو فائدہ پہنچے گا مگر سوال یہ ہے کہ پھر وہ اپنے خیمہ

کو کیا جواب دیں گے؟

شیخ طاہر سوچتے رہے، مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن یہ تو محض ایک چھوٹا سا کٹر تھا جو جنرل سیکریٹری ان کے ذہن کے پرسکون سمندر میں چبک کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن کسی ناویدہ ہاتھ نے ایک بہت بڑی چٹان لڑھکادی اور ان کا ذہن ایک شدید بدحواسی کا شکار ہو گیا۔ یہ چٹان ایک خط کی شکل میں تھی جو بدھ پیری ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ بچے بھروسے رنگ کے ایک عام سے کاغذ پر کسی اخبار سے الفاظ کا کراس طرح پیکانے کئے تھے کہ پورا مضمون تیار ہو گیا تھا۔ شیخ طاہر نے خط پڑھنا شروع کیا اور دم بہ دم ان کا چہرہ زرد ہوتا گیا جیسے کوئی ناویدہ ہاتھ ان کے بدن سے خون چھوڑ رہا ہو۔ خط میں لکھا تھا:

”شیخ طاہر صاحب!

آپ اس خط کی عمارت پڑھ کر خوش نہیں ہوں گے کیونکہ اس میں خوش ہونے کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ افسردہ کے چکر میں پڑے بغیر میں مقدمہ کی طرف آتا ہوں۔ شیخ صاحب، آپ کے پاس بہت زیادہ دولت ہے، جب کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ دس لاکھ روپے مجھے عطیہ فرمادیں۔ یقیناً آپ سوال کریں گے کہ کیوں؟ میرا جواب یہ ہے کہ مجبوری ہے آپ کی بھی اور میری بھی، اور وہ مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے اور آپ کی زندگی میں کچھ راز ہیں، جن کا افشا ہونا آپ پرست نہیں کریں گے، چنانچہ آپ مجھے روپیہ دیے دیں۔ میری زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ یہ قطعی طور پر اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والی بات ہے، جو کہ امید ہے، آپ کے لیے قابل قبول ہوگی۔“

”شیخ صاحب! یہاں میں یہ وضاحت کروں کہ آپ بشیر احمد پر شہریت کیسے کھینچے۔ وہ بے چارہ شریف آدمی ہے اور اس معاملے میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل ہوا یہ کہ میں بشیر احمد سے واقف ہوں۔ چنانچہ جب میں نے اسے آپ کے شکے میں خاصی احتیاط کے ساتھ آتے جاتے دیکھا تو مجھے شبہ ہوا اور میں اس کے پیچھے لگ گیا اور دن رات اس کے اور بعد ازاں آپ کے تعاقب میں لگا رہا۔ یوں مجھے ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ آپ کے بچپن سے لے کر اب تک کے تمام حالات۔ نہ صرف یہی بلکہ میرے پاس تصویریں بھی تھیں۔ زینت کی اور آپ کی بہن کی اور شادی کے سرٹیفکیٹ کی ایک فوٹو کافی بھی ہے۔ ان کے عوض میں صرف دس لاکھ روپے طلب کر رہا ہوں جو کہ آپ کے لیے

کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔“

شیخ صاحب، میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے، اس دنیا میں سب باتیں اچھی نہیں ہوتیں اور ابھی لوگ شیخ بیانات طاہر نہیں ہوتے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ اخلاقیات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بجائے میں مطلب کی بات کروں۔ شیخ صاحب، آج شام پارٹی کی میٹنگ ہے جہاں ہونے والے وزیر اعلیٰ کے طور پر آپ کی موجودگی کا اعلان کیا جائے گا۔ اس وقت جو سیاسی فضا ہے، اس کے پیش نظر یہ قطعی ممکن نظر آتا ہے کہ آپ کی پارٹی انیشن جیت لے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک عظیم الشان مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ پہلے صوبے کے وزیر اعلیٰ اس کے بعد ممکن ہے کہ مرکزی وزیر اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد ازاں اگر قسمت مہربان ہو تو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملے۔ یہ کیا بیانی معمولی نہیں۔ صرف بڑے نصیب والے ہی اس بلندی تک پہنچتے ہیں، لیکن شیخ صاحب، فرض کیجیے، آپ کی زندگی کے تمام راز، پوری کہانی، تصویریں اور لکچر ناے کا کس اخبارات میں شہریت جائے یا ایوزیشن پارٹیوں کے ہاتھ لگ جائے تو کیا ہوگا؟ ذات و رسوائی جو ہوئی، رسوائی لیکن یہ بات جیسی ہے کہ آپ انیشن بھی پار جاتیں گے۔ ایک ایسے شخص کو کوئی بھی دودھ نہیں کھکے گا جس نے ایک انتہائی گھٹیا طوائف سے شادی کی ہو اور جس کی بہن چند سکوں کے عوض اپنی عزت چھٹی رہی ہو۔“

”شیخ صاحب، مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ آپ شام کو میٹنگ میں تشریف لے جائیں۔ میں کل صبح آپ سے رابطہ قائم کروں گا اور یہ بتاؤں گا کہ کب، کہاں اور کیسے آپ مجھے ادا ملکی کر سکتے ہیں۔ آپ ایک سمجھ دار آدمی ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس موقع پر بھی سمجھ داری کا مظاہرہ کریں گے۔“

خط ختم ہو گیا۔ شیخ طاہر یوں ساکت و صامت بیٹھے رہے جیسے ان کا خون جم ہو گیا ہو۔ ان کی رنگت سفید پڑتی تھی انہوں کے ذہیلے اور ہائیں ساکت ہو گئی تھیں اور انہوں نے میز کا کنارہ ہاتھیں ہاتھ سے اتنی قوت سے پکڑ رکھا تھا کہ کھن کوشت میں دھس گئے تھے اور داگیوں سے خون رستے لگے تھا مگر انہیں اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا۔

یہ ایک اور قسم تھا جو ان کے دل پر ہوا، یہ ایک اور گھاؤ تھا جو ان کی روح پر لگا، یہ ایک اور دور تھا جس پر۔ ستم ایذا قسمت انہیں لے آئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اب وہ کیا

سچے موتی

ہذا قرآن ایک ایسا درجہ ہے۔ جس سے اگلا جہان دیکھا جاسکتا ہے۔

ہذا چینی ہوئی پوری بھی بھری نہیں جاسکتی۔ اسی طرح خواہشوں کا اسیر شخص کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

ہذا کسی کی مدد کر کے اسے بھول جاؤ۔

ہذا جو بلا و جہان راض ہوتا ہے۔ خود ہی مان بھی جاتا ہے۔

ہذا اپنے بچوں کی خاطر آپ دنیا کے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔

ہذا اگر چہ یاں حمد ہو جائیں تو شیر کی کھال سمجھ سکتی ہیں۔

ہذا زندگی میں ایسا لمحہ بھی آجائے گا۔ جب آنکھوں میں آنسو تو ہوں گے مگر ان کو پوچھئے والا کوئی نہیں ہوتا۔

ہذا فخر سے بچ، کیونکہ جو سنی سے پیدا ہوا اور مرنے کے بعد سنی میں چلا جائے گا۔ کیڑے مکوڑے اسے کھا جائیں گے، ایسے شخص کو فخر کیا ضرورت؟ (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

مرسلہ: ریاض بیت از حسن ابدال

ہذا اللہ کا خوف ہی سب سے بڑی دانائی ہے۔

ہذا حرص سے روزی میں اضافہ نہیں ہوتا مگر آدمی کی قدر میں کمی ہو جاتی ہے۔

ہذا محض مندوہ ہے جو ہر کام میں مینا نہ روی اختیار کرے۔

ہذا بہتر انسان کا بہترین دوست ہے۔

ہذا حیرے سب سے بڑے دشمن حیرے ہم نصیب ہیں۔

مرسلہ: عارف نواز شاہین۔ ادا روتی

انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس خط کا ایک ایک لفظ سانپ بن کر انہیں ڈس رہا ہے۔ اتنا مجبور اور بے بس انہوں نے خود کو محسوس نہیں کیا، اس وقت بھی نہیں جب کہن نے انہیں اغوا کیا تھا، یا اس وقت جب وہ بھوکے پیاسے نیم فٹنی کی حالت میں زینت کے چہ دارے کے نیچے پڑے تھے اور نہ ہی اس وقت جب استاد مسند مرزا تھا یا زینت نے ان کے سامنے دم توڑا تھا۔ اس وقت تو انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے ان کے ہاتھ پرجھک کاٹ دیے گئے تھے اور ایک تیز دھار والا تاجران کے زخموں پر اس طرح لٹکا دیا گیا ہے کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کریں گے تو ان کا زخموں کاٹ جائے گا تو پھر وہ کیا کریں؟ کیسے اس عذاب سے نکلیں؟ شیخ طاہر مضطربانہ انداز میں کمرے میں بیٹھے رہے اور سوچتے رہے۔ کیا وہ اس نامعلوم شخص کی بات مان لیں؟ ان کے پاس بلاشبہ بہت دولت ہے اور وہ بڑی آسانی سے دس لاکھ روپے ادا کر سکتے ہیں مگر کیا یہ مناسب ہوگا؟ لیکن اگر نہیں دیں گے تو کیا ہوگا؟ اخبارات کے صفحات ان کے تصور میں ابھرے جن پر زینت اور تازیہ کی اور خود ان کی بڑی بڑی تصویریں چھپی ہوئی تھیں اور ان کی زندگی کا سارا کیا پتلا درج تھا۔ وہ تصور کر سکتے تھے کہ اگر یہ سب کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ دولت، رسوائی، ساری عزت اور مزہ جہانک میں مل جائے گا۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، مخالفین کچھڑا چھائیں گے اور وہ شیخ بشارت طاہر سے بیکار پھر بیٹھیں جائیں گے۔ حقیر، بے مایہ، بے عزت۔ شیخ طاہر سوچتے رہے اور اپنے آپ سے اٹھتے رہے۔ پھر وہ دفعتاً ایک عالم وحشت میں مبتلا سے لگے اور پیدل ہی ایک جانب چل پڑے۔

جب وہ کانفرنس ہال میں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ تقریباً سبھی لوگ آچکے تھے۔ چونکہ یہ عام پبلک میٹنگ نہیں تھی، اس لیے صرف خاص خاص افراد ہی مدعو کیے گئے تھے۔ پارٹی کے اہم عہدے دار، شہر کے کچھ معززین اور تمام اہم اخبار نویس۔ شیخ طاہر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور میٹنگ کی کارروائی سننے لگے۔ پارٹی کے صوبائی نائب صدر تقریر کر رہے تھے اور وہ بڑے پرجوش انداز میں اپوزیشن کے بعض لیڈروں کے قول و فعل کے نیچے آدھڑنے میں مصروف تھے۔

جن پر اخباری رپورٹر بیٹھے تھے، ہینسلین، ٹوٹ بک اور کیمبرے سنبھالے ہوئے۔ وہ بار بار تصویریں اتارتے اور پھر لوٹ لیتے میں مصروف ہو جاتے۔ چھپتی قطار کے سرے پر رازی بیٹھا تھا اور اس کی انگلیوں میں پختی ہوئی ہینسلین چیز کی سے ٹوٹ بک پر چل رہی تھی لیکن اس کی نظریں بار بار شیخ طاہر کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو ہونٹ پر ہونٹ بجائے خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ پیکا تھا جس سے ان کے اندرونی کرب کا اندازہ ہوتا تھا۔ جب جرنل سیکریٹری کی رپورٹ ختم ہوئی تو اس نے شیخ طاہر کی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں چند الفاظ کہے اور پھر اعلان کیا کہ آئندہ انکیشن جیتنے کی صورت میں وہ وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ ابھی جرنل سیکریٹری نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ ایک سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

دیر تک تالیاں بجتی رہیں، دیر تک کیمروں کی لیلیش چلتی رہی اور دیر تک لوگ بڑھ بڑھ کر شیخ طاہر کو مبارکباد دیتے رہے۔ اور ہر چند کہ شیخ طاہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ مسکراہٹ کیسی ہے۔ اس مسکراہٹ میں خوشی نہیں تھی، بلکہ ایک افسردگی تھی، ایک لاپرواہی تھی۔ جیسے کوئی آدمی حد درجہ بے کسی کے عالم میں خود اپنے آپ پر مسکراتا ہے۔ شیخ طاہر کی وہ مسکراہٹ بھی دراصل ایسی ہی تھی۔ تاہم یہ اور بات ہے کہ کسی کو اس کا احساس نہیں ہو سکا۔ جب تالیوں اور مبارکباد کا طوفان تھا تو شیخ طاہر کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

شیخ طاہر اٹھے، آہستہ آہستہ خود کو گھمٹا اور ماتنگ کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور وحشت بھری نظروں سے حاضرین کو دیکھنے لگے۔ ہال میں خاموشی چھا چکی تھی اور لوگ شیخ طاہر کی آواز کے منتظر تھے۔ وہ کئی لمبے خاموش رہے اور دم بہ دم خشک ہوتے ہوئے زبان پھیرتے رہے۔ پھر انہوں نے گنگناہار گانگرا صاف کیا۔

”خواتین و حضرات!“ آخر کار انہوں نے لب کھولے۔ ”میں اس عزت افزائی کے لیے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن ہلکڑا کر ہونا ایک بات ہے اور سخت ہونا دوسری بات ہے۔ یہاں آنے سے قبل میں خود سے بار بار یہ سوال کرتا رہا ہوں کہ میں اس عزت اور سحر کا

جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کے پیش نظر اس تقریر کی اب کوئی ضرورت نہیں اور اب جو کچھ کہنے والا ہوں، وہ صاف، سیدھی اور دونوں باتیں ہیں اور سیاست کے مروجہ اصولوں سے قطعاً الگ ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ باتیں آپ میں سے بہتوں کو پسند نہیں آئیں گی۔“

حضرات! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ حیران ہورہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو حیران ہونا بھی چاہیے، لیکن میری گزارش ہے کہ آپ لوگ صبر و سکون سے میری باتیں سن لیں کیونکہ آج کے بعد اس قسم کا موقع شاید پھر بھی نہ آئے۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج کے بعد آپ میں سے بہت سے لوگ شاید مجھ سے ملنا بھی پسند نہ کریں اور اگر ایسا ہوا تو مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔ آپ کا بھیا احسان کچھ کم نہیں ہے کہ آپ اس وقت میری باتیں سن رہے ہیں۔ خیر تو میں اب اصل بات کی طرف آتا ہوں خواتین و حضرات! میں گزشتہ ساری رات اور آج سارا دن بے حد پریشان رہا ہوں۔ ایک ناقابل بیان کرب و اذیت مجھے گھیرے رہی ہے اور میں مسلسل سوچتا رہا ہوں لیکن یہ طے نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آج مجھے ایک لڑکا بری طرح یاد آتا رہا ہے۔ حضرات، اس لڑکے کی عمر گیارہ سال تھی، وہ چالیس گھنٹے کا بچہ تھا اور ایک بیٹام طوائف کے چہ دارے کے نیچے حد درجہ لاپرواہی اور ختم فٹنی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت اس لڑکے پر طوائف کی لڑکی نے ترس لکھا تھا جو آگے چل کر خود بھی طوائف بنی۔ شاید آپ جانتا چاہیں گے کہ وہ لڑکا کون تھا اور میرا اس سے کیا تعلق تھا تو میں آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ لڑکا کوئی اور نہیں، خود میں تھا۔“

ہال میں بیکار ایک تیز جھنڈاٹ کی آواز بلند ہوئی۔ کئی لوگوں نے شیخ طاہر کو قابض کر کے کچھ کہنا چاہا۔ جرنل سیکریٹری نے آگے بڑھ کر انہیں روکنے کی کوشش کی مگر شیخ طاہر نے سختی سے منع کر دیا اور ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور لوگ خاموش ہو گئے تاہم ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں پھر بھی گونجتی رہیں۔ شیخ طاہر نے ان آوازوں کی پروا نہیں کی۔ سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے رہے۔ ان کا چہرہ سیاہ تھا، ان کا بدن دھیرے دھیرے رگڑا ہوا تھا، ان کا دماغ کمزور ہو رہا تھا۔

رہی تھی۔ شیخ طاہر نے سب کچھ بیان کر دیا ہمارے پردے ہٹا دیے، سارے داغ دھبے نمایاں کر دیے۔ بشو کے کچن سے لے کر زینت سے شادی اور اس کی موت تک۔ پھر وہ بیکار رک گئے اور ہال میں موجود ایک ایک فرد کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ مدد صاحب کو اور جرنل سیکریٹری کو اور رازی اور آکرن کنگ اور کاشن کنگ اور بادشاہ مگر اور نیلو فرکو۔ ان سب کے چہرے پچھلے پڑ گئے تھے اور وہ شیخ طاہر کو بولیں دیکھ رہے تھے جیسے وہ جیتے جاگتے انسان نہ ہوں، کوئی آسیب ہوں۔ کئی تک یہ شیخ خاموشی کے بعد آخر وہ... انہوں نے پھر کہا۔

”خواتین و حضرات! یہ ہے میری کہانی۔ مجھ سے میری پارٹی کے سربراہ اور وہ لوگوں نے کہا ہے کہ میں اس کہانی کو چھپا لوں۔ کوئی بھی زینت اور تازیہ کے بارے میں نہ جاننے پائے کیونکہ اگر یہ کہانی عام ہوئی اور لوگوں کو میری زندگی کے سارے راز معلوم ہو گئے تو نہ صرف یہ کہ حد درجہ ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ ہم انکیشن بھی پار چاہیں گے لیکن حضرات! باتیں سنیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ایک اور قسم یہ ہے کہ مجھے ایک خط موصول ہوا ہے جس کا مضمون اخبار سے الفاظ کاٹ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اب چونکہ میں اس اخبار کی کثابت اور طاقت کو چھپاتا ہوں، اس لیے میں جان گیا ہوں کہ خط لکھنے والا کون ہے مگر اس کا نام نہیں بتاؤں گا کہ اس کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس خط میں مجھے دھمکی دی گئی ہے کہ اگر میں نے دس لاکھ روپے ادا نہ کیے تو میرا سارا کیا چھٹا مع تصاویر کے اخبارات میں شائع کر دیا جائے گا پھر نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی حقیر، رسوائی اور انتقامات میں شرمناک شکست۔“

شیخ طاہر نے بیکار رک کر زور سے سانس لی اور جیب سے خط نکال کر نفا میں لہرایا۔ ”حضرات! یہ ہے وہ خط اور جب یہ خط مجھے ملتا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ مجھے اپنی پارٹی کی اور بلیک میل کی بات مان لینا چاہیے۔ زندگی میں ایسے مواقع بار بار نہیں آتے جب آدمی کامیابی اور مرے کی ایسی پابندی پر پہنچ سکے۔ اگر ہم انکیشن جیت جائیں تو میں وزیر اعلیٰ ہوں گا۔ اس کے بعد ممکن ہے ہر کمزور وزیر لے لیا جائے اور پھر پھر مدد صاحب، رگڑا، رگڑا، رگڑا۔“